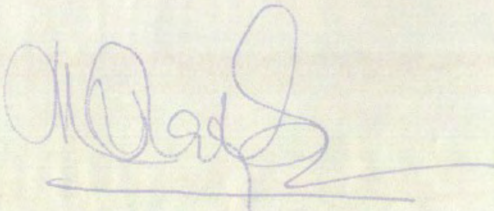
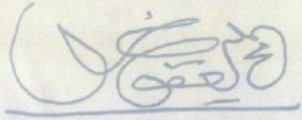
# نظریہ پاکستان

چوہدری حبیب احمد



چوہدری حبیب احمدؒ





# نظریۂ پاکستان

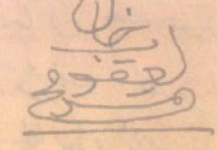
ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر
(حکیم الامت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ)

جناب میاں مسعود اختر صاحب
سپرنٹنڈنٹ انجینیر انہار میانوالی سرکل
ذوقِ مطالعہ کی نذر - حبیب احمد

تیری خودی میں اگر انقلاب ہو پیدا
عجب نہیں ہے کہ یہ چار سو بدل جائے
"اقبال"

چودھری حبیب احمد

شائع کردہ
ادارۂ نظریۂ پاکستان
بی-۲۶- مندر گلی - لائل پور




کتاب ———— نظریۂ پاکستان

مؤلف ———— چودھری حبیب احمدؒ

ناشر ———— ادارہ نظریۂ پاکستان۔ بی ۲۶۔ منڈی گلی۔ لائلپور
فون نمبر ۴۴۱۴

پریس ———— لائلپور تحقیق پرنٹنگ پریس لائل پور

طابع ———— مظفر حسین ظفرؔ

نقش ———— اوّل فروری ۱۹۶۹ء

تعداد ———— ایک ہزار

قیمت ———— [illegible] روپے


## ملنے کا پتہ

۱۔ مکتبہ نبویہ داتا گنج بخشؒ روڈ۔ لاہور۔

۲۔ مکتبہ پاکستان۔ چوک انارکلی۔ لاہور۔

۳۔ مکتبہ دین و دانش۔ چوک اردو بازار۔ لاہور۔

# انتساب

اُن فرزندانِ اسلام کے نام جو دُنیائے انسانیت میں توازن بدوش ماحول کے لئے فضا سازگار بنانے اور عالم آرائی کے لئے خوشحال و خوشگوار معاشرہ تشکیل و ترتیب دینے کی تڑپ و آرزو رکھتے ہوں۔

اس ظلمت کدۂ عالم کے اُن سحر خیز قائدوں کے نام جو خالق و مخلوق میں حائل پردوں کو (خواہ وہ پیرانِ کلیسیا ہوں یا جمہور کے ابلیس اربابِ سیاست) اُٹھا کر تسخیرِ کائنات کو معرفتِ حق (لقائے رب) کا اصولِ اوّلین قرار دیں اور خُدا کی نعمتوں کے دروازے خُدا کی مخلوق کے لئے یکساں طور پر کھلے رکھیں۔

ایسے قافلہ سالاروں کے نام جو قافلۂ آدمیّت کو نسل و وطن۔ رنگ و خُون کے امتیازات اور کاروانِ انسانیت کو معاشرتی و معاشی تفریقات کی یورشوں سے بچانے اور کشتیٔ انسانیت کو ناہمواریوں اور نا اُستواریوں کے طوفانوں سے محفوظ کرنے کے لئے نظریۂ پاکستان کے نقوش و خطوط کے مطابق مملکت پاکستان میں مثالی معاشرہ متشکل کرنے کا عزم کر چکے ہوں۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۝

# پیش لفظ

اقبالؒ نے کہا تھا کہ مسلمان ایک جداگانہ قوم ہیں۔ متحدہ قومیت فریب ہے۔ مغربی اندازِ جمہوریت مسلمان کے لئے قابلِ قبول نہیں۔ یہ رہبرِ فرزانہ کس طرح درجہ بدرجہ۔ قدم بقدم۔ منزل بہ منزل اس عظیم الشان نصب العین (نظریۂ پاکستان) کی طرف قوم کو کھینچ لایا اور صحتِ مقصد کے یقینِ محکم نے کس ولولہ و جوش سے فرزندانِ ملّت کو عملی جدّ و جہد کے لئے آمادہ کر دیا۔ تاریخ مسلم کا یہ ایک درخشندہ و تابناک باب ہے۔

ہمارا دَور اس ضرورت کا متقاضی ہے۔ کہ اپنی اُبھرتی ہوئی نسل کے یہ ذہن نشین کرایا جائے کہ "نظریۂ پاکستان" کیا ہے۔ مدّتوں یہ احساس میرے دل میں کروٹیں بدلتا رہا۔ یہی عزم تھا جس نے مجھے "جماعت اسلامی کا رُخِ کردار"۔ "تحریک پاکستان اور نیشنلسٹ علماء" ترتیب دینے پر مجبور کیا۔ ۸ جولائی ۱۹۶۲ء کے ہفت روزہ "اقدام" میں میرا مضمون "نظریۂ پاکستان کا تحفظ" اسی سلسلۂ آرزو کی ایک کڑی تھا۔ اور یہی اظہار برسوں پہلے روزنامہ "مشرق" میں کیا۔

ذہنی راستوں سے ریب و تشکیک کی خاردار جھاڑیاں صاف کرنے کے لئے کس قدر کوہ شکن ہمت اور فلک پیما عزم کی ضرورت ہوتی ہے اس کا اندازہ کچھ مشکل نہیں۔ اپنی پہلی دونوں تالیفات کی وجہ سے جہاں میں نے مخالفینِ قیام پاکستان کی شدید ناراضی مول لی اور منافقینِ اسلام کی زبانوں سے بے سروپا مذموم افسانے سُنے وہاں اس اظہارِ مسرّت میں مجھے کوئی باک نہیں۔ کہ میری اس حقیر سی کوشش سے فرزندانِ ملّت کے اذہان و قلوب میں ایک خوشگوار انقلاب آرہا ہے۔ اور نظریۂ پاکستان کے نعروں سے شعور و آگہی کی فضائیں ارتعاش سا پیدا ہو گیا ہے۔ صدرِ مملکت کے اس فرمان نے کہ طلبا کے دل و دماغ میں نظریۂ پاکستان کو راسخ کرنے کے لئے نصاب کی کتابوں کو اس کے بنیادی اُصولوں کی روشنی میں مُرتّب کرنا چاہیئے۔ ماہرینِ تعلیم کو یہ ہدایت دے کر اس زندہ حقیقت پر مُہرِ تصدیق ثبت کی ہے۔ کہ اس نظریاتی مملکت کے استحکام و بقا کے لئے یہ نظریۂ اساسی

حیثیت رکھتا ہے۔

میری یہ خوش بختی اور میرے لئے یہ امر باعثِ سعادت ہے کہ اب اربابِ اقتدار و اختیار اور اصحابِ علم و دانش نے یہ محسوس کیا ہے۔ کہ نونہالانِ ملّت کے ذہنی صحراؤں میں اس تخمِ فکر کا بویا جانا اور پاکستان کی جغرافیائی سرحدوں سے اس کی ذہنی سرحدوں کی حفاظت زیادہ ضروری ہے۔

پاکستان میں ایک تاریک دَور ایسا بھی گزرا ہے۔ جب نظریۂ پاکستان کو دل و دماغ سے محو کرنے کے لئے نہایت باریک چالیں چلی گئیں۔ اس زمانہ میں نوجوانوں کی بے بصری کا یہ عالم تھا۔ کہ نادان زہر کو تریاق سمجھ کر قبول کئے جا رہے تھے۔ اس عہدِ تاریک میں کچھ دردمندانِ ملّت ایسے تھے۔ جنہوں نے اپنے قلب و دماغ کے بہترین جوہر اس نظریۂ حیات کے نکھارنے اور اس بلند و بالا مقصد کو نوجوانانِ ملّت کے ذہن نشین کرانے کے لئے وقف کر دئے۔ اور انہیں وہ چشمِ امتیاز عطا کی۔ کہ نیک و بد میں تمیز کر سکیں۔

میرا یہ دعویٰ قطعاً نہیں کہ مَیں نے اپنی کتابوں میں کوئی نئی بات کہی تھی۔ مَیں یہ بھی نہیں کہتا کہ میری طرح کوئی دُوسرا اس محاذ پر ستیزہ کار اور اس نظریۂ کو عام کرنے کے لئے خود افروز و جگر سوز نہیں رہا۔ لیکن یہ عرض کرنے میں مجھے کوئی تامّل نہیں۔ کہ مَیں نے بھی اپنی بساط کے مطابق قافلۂ گم کردہ راہ کے قدموں کی حرکت بدل کر اسے حکیم الامّت علّامہ اقبال علیہ الرّحمۃ کی متعیّن کردہ راہوں پر پھر سے گامزن کیا ہے۔ اس لحاظ سے قافلۂ ملّت کو سفرِ حیات کے مدّعا و مقصد کا احساس دلانے میں مقدُور بھر میرا بھی حصّہ ہے۔ اَب میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہُوں کہ منزل فراموش کردہ قافلۂ زندگی کی صحیح سمتوں کی طرف بڑھنے کے لئے مضطرب و بے قرار ہے۔ اور ہر فردِ قافلہ اُبھرے ہُوئے نشاناتِ راہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ اَب ملّت کا ہر وُہ فرزند جس کے بازوؤں میں قوتِ شاہین اَور جس کی رگوں میں خونِ شباب موجزن ہے۔ اقبالؒ کی متعیّن کردہ راہوں پر جادہ پیمائی کے لئے کمرِ ہمّت کس رہا ہے۔

خدائے لم یزل کی بارگاہِ احدیت و صمدیت میں میرا سرِ نیاز عجز و انکسار

سے جھکا جا رہا ہے۔ کہ میرے ایسے تحریکِ پاکستان کے حقیر کارکن کو یہ توفیق بخشی کہ وہ قافلۂ ملّت کو سفرِ حیات کے مدّعا و مقصد کا احساس دلانے اور حیاتِ باشرف کا راز سمجھانے میں کامیاب ہو جائے۔

میں چشمِ تصوّر سے دیکھ رہا ہوں۔ کہ وہ جہانِ نو۔ وہ دُنیائے جدید بن کر رہے گی۔ جس کی حکیم الامّتؒ نے آرزو کی تھی۔ ہر بیدار آنکھ دیکھ رہی ہے۔ کہ فضائے پاکستان کا ذرّہ ذرّہ کروٹ بدل رہا ہے۔ اور اقبالؒ کے اس جہانِ آرزو میں حیاتِ تازہ انگڑائیاں لے رہی ہے۔ غنچوں کے چٹکنے کی آوازیں کان سُن رہے ہیں۔ اور زندگی ہر شاخ سے تڑپ تڑپ کر باہر آ رہی ہے۔ مجھے یقینِ محکم ہے کہ نظریۂ پاکستان کے آفتابِ حقیقت سے ظلمت کدۂ عالم ضیا بار ہو کر رہے گا۔ تاریکیاں کافور ہوں گی۔ اور کاروانِ انسانیت زندگی کی منوّر راہوں کو پالے گا۔ یہ جو کچھ بھی ہوگا زمانے کے مقدّرات اور فطرت کے اٹل قاعدے کے مطابق ہوگا۔ ورطۂ کفر میں ڈوبی ہوئی انسانیت اپنی حقیقی زندگی کا بھید پالے گی۔ آتشِ عقل کے سرکش شعلے اور علمِ بے باک کے شرارے جہاں بھی ہوں گے۔ وحی کی روشنی اپنے شعلۂ قوت سے اس نارِ حیات کو نُورِ حیات عطا کرے گی۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ نظریۂ پاکستان پر یقینِ محکم رکھنے والے فرزندانِ ملّت عملِ پیہم کے لئے نُورِ ایمان سے روشن سینے اور جذبوں سے معمور دل لے کر آگے بڑھیں۔ اور مفلوج و منافق طبقہ کو پیچھے دھکیل کر کشتیٔ ملّت کے چپّو اپنے ہاتھ میں لیں اور اسے ساحلِ مراد تک لے جائیں۔ پھر کیا عجب ہے کہ قافلۂ آدمیت اور کاروانِ انسانیت اس فضا سے اُبھرے ہوئے پیکرانِ انسانیت کے سہاروں اور بھروسوں۔ ان کی قیادت اور راہنمائی سے اس منزلِ حیات کو پالے جو نوعِ انسان کی زندگی کا انتہائی مقصد ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ اربابِ عزم و ہمّت اور اصحابِ فکر و نظر جہالت کی تاریکیوں میں لُٹنے والی مظلوم انسانیت کی کشتیٔ حیات کو امن و سلامتی کے ساحلوں سے ہمکنار کر دیں گے۔ میری دیدہ ریزی اور جگر کاوی اسی لئے ہے۔ کہ ابنائے اسلام راہ فراموش اور جادہ ناشناس انسانیت کو ایک مرکز پر لانے کے لئے فکرِ اقبالؒ کی گہرائیوں میں ڈوب کر اس پیامِ آخریں کو سمجھ لیں۔ جو فکرِ اقبالؒ

کا مرکز و محور ہے۔

جوانانِ ملّت اُمّی نورِ حیات سے اپنے قلوب کو منوّر کریں۔ جس "دل کے نور" کو لے کر اقبالؒ معرکہ دین و وطن۔ نزاع حق و باطل اور ستیزہ گاہ کفر و اسلام میں مصروف جہاد رہا۔ اور اس آتشِ حیات سُوز سے اپنے کاشانۂ دل کو محفوظ و مامون کریں۔ جو آوارگانِ مغرب کی فکری گمراہیوں اور کم نظر و کم سواد مُلّا کی جہالت کی وجہ سے چار سُو جہاں سُوز ہے۔

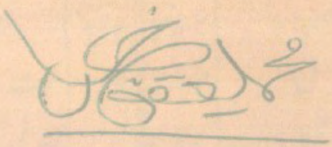
میرے نزدیک نظریۂ پاکستان حکیم الامتؒ کے سوز و سازِ حیات کا حاصل اور دینی فکر آرائی کا آخری جوہر ہے۔ اور یہی نظریۂ قابلِ رشک عالم آرائی کا ذریعہ بن سکتا ہے۔

اقبالؒ کا سرچشمۂ فکر قرآن ہے۔ اور نظریۂ پاکستان قرآن فہمی کا جوہر۔ اللہ تعالےٰ سے دُعا ہے۔ کہ وہ مجھے توفیق و ہمّت عطا فرمائے۔ کہ مَیں اپنے اظہار و اعلان کے مطابق اپنی کتاب "نظریۂ پاکستان" پیش کر سکوں۔

ما توفیقی الا باللہ العلی العظیم

چودھری حبیب احمدؒ

# فہرست



## پہلا باب

# پاکستان کی بُنیاد

ہندوستان میں سب سے پہلے یہ خیال سر سیدؒ کے اُفقِ ذہن سے اُبھرا کہ اس ملک میں الگ الگ نظریہ حیات کی وجہ سے ہندو اور مسلمان دیر تک اکٹھے نہیں رہ سکتے۔ کچھ عرصہ بعد حقیقت شناس اقبالؒ نے انہی خیالات کا اظہار کیا۔ اس زمانہ میں جب ہندو کانگریس نیشنلسٹ علماء کی تائید و حمایت سے متحدہ وطنیت اور متحدہ قومیت کا دلفریب اور ایمان سوز نعرہ بلند کر رہی تھی اُس وقت حکیم الامت علامہ اقبالؒ نے یہ حقیقت افروز اور باطل سوز اعلان کیا کہ :-

"بنا ہمارے حصارِ ملت کی اتحادِ وطن نہیں ہے"

آپ نے واشگاف الفاظ میں واضح طور پر بتایا کہ مسلم قومیت کی اساس کلمۂ توحید ہے۔ اس کی بنیاد نسل و وطن۔ رنگ و خون اور زبان قرار نہیں دی جا سکتی۔ ابتدا میں جب انہوں نے اپنے اس نظریۂ کا اظہار کیا کہ ہمیں ہندوستان میں ایک خطۂ ارض چاہیئے جس میں ہندی مسلمان اپنے دین کے مطابق معاشرہ تشکل کر کے اپنا تشخص قائم کریں تو لوگوں نے اسے شاعر کا خواب سمجھ کر خاص توجہ نہ دی۔ اور یہ کہا کہ جذبات کی قوس قزاحوں میں تصورات کے جھولے جھولنے والے شاعر لوگ ایسی ہی ناقابلِ عمل باتیں بنایا کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ ابتدائی ایام میں قائداعظمؒ نے بھی نظریہ پاکستان سے اتفاق نہ کیا۔ دین شناس اقبالؒ جنہوں نے اپنی شمشیرِ خودی کو فسانِ توحید سے تیز کیا تھا۔ اس نظریۂ کو ہر موقعہ پر عمائدین ملت کے سامنے لاتے رہے۔ اُن کے حقیقت افروز احساسات و ملاقات نے جہاں چند اور زعمائے ملت کو ہمنوا و ہمخیال بنا لیا وہاں جناحؒ بھی اپنائے بغیر نہ رہ سکے۔ یہ مردِ عمل نظریہ پاکستان کا پرچم ہاتھ میں لے کر ہندی

مسلمانوں کو ایک مرکز پر جمع کرنے کے لئے تنظیم ملّت کے بھرپور جذبوں سے میدان عمل میں آگیا۔ اس پیکرِ خلوص و عمل کی شبانہ روز سعی و کوشش سے مسلمان جوق در جوق مسلم لیگ کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے۔ اور حضرت قائداعظمؒ کی قیادت میں حصولِ پاکستان کے لئے عملی جدّو جہد کا آغاز کر دیا گیا۔ اس دور کے کچھ ایسے جگر سوز افسوسناک واقعات بھی ہیں۔ جن پر اسلام آج تک اشک افشاں ہے۔ تاریخ کی زندہ شہادتیں قیامت تک اس گھناؤنے کردار پر اظہار نفریں کرتی رہیں گی۔ تاریخِ تحریک پاکستان کا یہ ورق ان پیشانیوں کے لئے سیاہ داغ بن گیا ہے۔ جو وار دھا کے آستانۂ سیاست پر سجدہ ریز رہیں۔ اس پُرآشوب زمانہ میں جب اقبالؒ اور اُن کے ہم نوا عزم و استقلال کے بازوؤں سے پاکستان کا عَلم بلند کر رہے تھے۔ عین انہی دنوں نیشنلسٹ علمار کے سرخیل ابوالکلام آزاد اور مولوی حسین احمد مدنی ہندو کانگریس کے نظریہ متحدہ قومیت کے لئے قرآن و حدیث سے دلائل تراش رہے تھے۔ اقبالؒ دین کو ضابطہ حیات (CODE OF LIFE) کی صورت میں پیش کر کے دین کے قیام کے لئے ایک خطہ زمین کا (جسے آجکل کی سیاسی زبان میں اسٹیٹ کہا جاتا ہے) مطالبہ کر رہے تھے تو یہ کانگریسی مفسّرِ قرآن اور شیخ الحدیث اسلام کو محض پوجا پاٹ کا مذہب سمجھ کر سادہ لوح مسلمانوں کو یہ تأثر دے رہے تھے کہ متحدہ ہندوستان میں سجدے کی اجازت سے بھی اسلام آزاد ہوگا۔ اور کچھ اس قسم کا گنگا جمنی اور سوراجی اسلام لوگوں کے ذہن نشین کرانے میں مصروف تھے کہ عالمگیر سچائیاں تمام مذاہب میں یکساں ہیں۔ اسلام نیک عملی کی تعلیم دیتا ہے۔ اس انداز سے مسلمانوں کو انفرادی نیکی اور انفرادی نجات کا تصور دے کر متحدہ وطنیت کی ترغیب دے رہے تھے۔ اور اپنی خاص وضع قطع اور جبّہ و دستار کے مقدّس فریب سے ان طائرانِ حرم کو آنند بھون کے عیّار شکاری کے زیرِ دام لانے کے لئے اپنی تمام صلاحیتیں بروئے کار لے آئے تھے۔ اغراض و جاہ پسندی کے غلاف میں لپٹے ہوئے یہ لوگ اپنے زیرِ اثر مسلمانوں کو اس رازِ حیات سے بے خبر رکھنے اور انہیں نظریہ پاکستان کی تائید و حمایت سے روکنے کے لئے اقبالؒ و جناحؒ پر طرح طرح کے رکیک حملے کر رہے تھے۔ اس معرکۂ دین و وطن اور کشمکشِ حق و باطل میں یہ حقیقت آشکار ہو گئی :-

ملا کم شناسد رمزِ دین را

اور یہ بھی واضح ہو گیا کہ

شیخ ملت با حدیثِ دل نشین
بر مرادِ او کند تفسیرِ دین

ہماری تاریخ کا ایک الم انگیز اور تأسف خیز پہلو اور بھی ہے کہ جب یہ پیشوائے[1] دین ہندو کانگریسی مقاصد کی تکمیل کے لئے اوروں کی عیاری اور اپنی سادگی کے تاروں کا بنا ہوا متحدہ قومیت کا جال لے کر طائرانِ حرم کو واردھائی سیاست کا شکار بنانا چاہتے تھے۔ مولانا مودودی[2] اسی زمانہ میں یہ فتویٰ صادر فرما رہے تھے کہ "مسلم لیگی قیادت میں سے ایک کی نظر بھی مسلمان کی نظر نہیں" یہ اس طریق سے گویا حکیم الامت اور قائداعظمؒ سے لے کر تحریکِ پاکستان کے ایک ادنیٰ کارکن تک کو کافر بنا کر مسلمانوں کو اس تحریک سے متنفر و بیزار کر رہے تھے۔ جب یہ حضرات ان مذموم سرگرمیوں میں منہمک تھے۔ قدرت حقارت کی خفیف ہنسی ہنس کر ان کی اس مکروہ تگ و تاز کو مردود قرار دے رہی تھی۔

تاریخ کا اجمالی ساخاکہ اس مقام پر اس لئے دیا گیا ہے کہ قاری کا ذہن نظریہ کو سمجھنے کے لئے صاف ہو جائے۔ ساتھ ہی تاریخ قیام پاکستان کا وہ دلخراش منظر بھی سامنے آجائے کہ نیشنلسٹ علماء اور مودودی صاحب نے اسلام کے مقدس نام پر اس نظریاتی مملکت کے قیام کی مخالفت کی تھی دگرنہ مقصود و مطلوب یہاں نظریۂ پاکستان کی پیش کش ہے۔

## نظریۂ پاکستان

جیسا کہ ابتدائی سطور میں عرض کیا جا چکا ہے۔ نظریۂ پاکستان محض اقبالؒ کا ذہنِ تخیل نہیں اس کی اصل قرآن ہے۔ امن و سلامتی کی یہی وہ شمعِ جہاں تاب ہے جس سے آپ کو ضیائے شعور اور نورِ بصیرت حاصل ہوا۔ اقبالؒ کے ذہن میں اسلام کا تصور ایک عالمگیر قانون کی صورت میں تھا۔

---

[1] تفصیلی معلومات کے لئے میری کتاب "تحریک پاکستان اور نیشنلسٹ علماء" دیکھئے۔

[2] تحریکِ پاکستان میں مودودی صاحب کا کردار سمجھنے کے لئے "جماعت اسلامی کا رخِ کردار" کا مطالعہ کیجیے

ان کے نزدیک نسل و وطن اور رنگ و خون کے ساحلوں میں گھری ہوئی جوئے حیات کبھی بیکرانہ انداز میں نہیں بہہ سکتی۔ اور نہ ہی حسب و نسب کے امتیازات و تعصبات کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی انسانیت اس حقیقی زندگی سے آشنا ہو سکتی ہے۔ جو قرآن اسے عطا کرنا چاہتا ہے۔

اقبالؒ کے تصوّرات و نظریات۔ احساسات و خیالات اور رجحانات و میلانات سے یہ صاف طور پر عیاں ہے۔ کہ وہ شدّت سے یہ محسوس کر رہے تھے کہ دُنیا میں اکثر خُون ریزیاں اور فساد انگیزیاں انہی امتیازات و تعصّبات کی وجہ سے رُونما ہوتی ہیں۔ اور یہ کیا ستم ہے کہ رنگ و خُون کے امتیاز۔ اور نسل و وطن کے اختلاف پر انسان نوعِ انسان کا شکار کر رہا ہے۔ اس تمام فسادِ آدمیت کی وجہ ربّ العالمین اور رحمۃ للعالمینؐ کے مفہوم سے نا آشنائی اور ذکر للعالمین کے بغیر اپنی مشکلاتِ زندگی کا حل تلاش کرنے کا جنون ہے۔ اب قرآنِ عزیز اور حضورِ اقدسؐ کا وہ انسانیت ساز فرمان پیش کیا جاتا ہے جسے نظریۂ پاکستان کی بُنیاد کہا جا سکتا ہے۔ اقبالؒ احترامِ آدمیت کے اس قرآنی اُصول کو سمجھ چکے تھے۔ کہ ہر انسانی بچّہ محض انسان ہونے کی وجہ سے واجب الاحترام ہے۔ اس مردِ خبیر و بصیر نے دُنیا سے فسادِ آدمیت ختم کرنے کے لئے نظریۂ پاکستان کے آئینے میں قرآن کی مستقل اقدار میں سے اس قدر کو پیش کیا۔

**قرآنِ عزیز** | يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَى وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ ط (۴۹/۱۳)

ترجمہ:۔ اے نوعِ انسانی ہم نے تمہیں نر اور مادہ کے (خلیے) سے پیدا کیا اور تمہیں قبیلوں اور خاندانوں میں تقسیم کر دیا (تم نے اپنے لئے قبائل اور خاندان بنا لئے) مقصد اس سے صرف یہ ہے کہ تم پہچانے جا سکو (ورنہ جہاں تک عزّت و تکریم کا تعلق ہے اس اُصول کو یاد رکھو کہ) تم میں سے اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ واجب التکریم وُہ ہے۔ جو سب سے زیادہ تکمیل یافتہ ہے۔"

یعنی عزّت و تکریم کا معیار انسان کے جوہرِ ذاتی ہیں۔ حسب و نسب۔ ذات پات۔

اور رنگ و خون کی اضافی نسبتیں نہیں۔

## فرمان سالارِ انسانیت صلعم

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں ارشاد فرمایا:۔

ایھا الناس - الا ان ربکم واحد - وان اباکم واحد - الا لا فضل لعربی علیٰ عجمی ولا لعجمی علیٰ عربی - ولا لاحمر علیٰ اسود ولا لاسود علیٰ احمر الا بالتقویٰ۔

ترجمہ:۔"اے نوعِ انسانی (سن رکھو کہ تمہارا سب کا رب ایک ہے اور تم ایک ہی اصل کی شاخیں ہو۔ اس لئے عربی کو عجمی پر۔ سُرخ کو سیاہ پر اور سیاہ کو سُرخ پر کوئی فضیلت نہیں۔ مگر تقویٰ کے سبب۔

غور فرمائیے کہ انسانیت کی نشو و نما اور آدمیت کے عروج و ارتقاء میں سب سے بڑی رکاوٹ انسانوں کی جغرافیائی تقسیم (وطنیت) اور نسب (نیشنلزم) کی حدود و قیود ہیں۔ حُریتِ نواز رسولؐ نے اس منشورِ مساواتِ انسانیہ میں سب سے پہلے ان انسانیت سوز معیاروں پر خطِ تنسیخ کھینچ کر اعلان فرما دیا۔ کہ بنی نوعِ انسان بلا امتیازِ نسل و وطن ایک عالمگیر برادری ہے اور عزت و شرف کا معیار نشو و نما یافتہ ہونا ہے۔

دیکھئے کتنے حقیقت کُشا اور حیات افروز جملے ہیں۔ جو رہبرِ آدمیت نے تکمیلِ دین پہنچا دینے کے بعد قدوسیانِ ارض کے اس عظیم الشان اجتماع میں ارشاد فرمائے۔

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا - (قرآن عزیز)

ترجمہ:۔"آج میں نے تمہارے لئے دین کو مکمل کر دیا۔ اور (اس طرح) اپنی نعمت کا اتمام کر دیا۔ اور تمہارے لئے اسلام کا دین انتخاب کر لیا"۔

یہ پیامِ آخریں تھا۔ جو نوعِ انسان کو دیا گیا۔ آپؐ کا یہ پیغام ہر مدعیٔ نسل و وطن اور رنگ و خون کے ذہنی پتھروں کے نیچے دبی ہوئی مظلوم و بیمار انسانیت کے لئے نسخۂ شفا ہے۔ آدم جب تک شجرِ انسانیت سے حسب و نسب کے تعصبات

کی اکاس بیل نہیں اُتارے گا۔ نخلِ آدمیت کبھی سرسبز اور ثمرآور نہیں ہو گا۔
اب قرآنِ عزیز اور فرمانِ رسولؐ کی روشنی میں تصورِ اقبال ملاحظہ فرمایئے:۔

**تصورِ اقبالؒ** مسلمان اور دیگر اقوامِ عالم میں امتیازی فرق یہ ہے۔ کہ اسلام کا تصورِ قومیت نہ وطنی ہے، نہ لسانی، نہ نسلی ہے نہ الوانی۔

(خُطبہ علی گڑھ ۱۹۱۰ء)

**ارشاداتِ قائدِ اعظمؒ** اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیشِ نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خُدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآن مجید کے احکام اور اُصول ہیں۔

اسلام میں اصلاً کسی بادشاہ کی اطاعت ہے، نہ پارلیمان کی۔ نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآنِ کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔

اسلامی حکومت، دوسرے الفاظ میں، قرآنی احکام کی حکمرانی ہے اور حکمرانی کے لیئے لامحالہ ایک علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہے۔

(عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن ۱۹۴۱ء)

۸ مارچ ۱۹۴۴ء کو پاکستان کے تصور سے کیا مطلب ہے۔ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں فرمایا:۔

"پاکستان اُس دن وجود میں آگیا تھا۔ جب ہندوستان میں پہلا غیر مسلم، مسلمان ہوا تھا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب یہاں مسلمانوں کی حکومت بھی قائم نہیں ہوئی تھی"

دیکھیئے ان دو فقروں میں پاکستان کے مطالبہ کی ساری تاریخ سمٹ کر آگئی ہے۔ محولہ بالا سطور میں جناحؒ قیامِ دین کے لیئے جُداگانہ مملکت کی اہمیت کو کس طرح واضح کر رہے ہیں اور اسلام کے اس بنیادی نکتہ اور مستقل اُصول کو کس حسین انداز میں سمجھا رہے ہیں کہ انسان کی پیشانی اپنے ہاتھوں سے نسل و وطن کے تراشے ہوئے معبودوں اور نہ ہی اپنے ایسے انسان (بادشاہ) کے سامنے جھکنے کے لیئے بنی ہے۔ مسلمان صرف قرآنی احکام کی اطاعت کے لیئے ہے۔ لیکن قانون کے نفاذ کے لیئے ایک اسٹیٹ کی ضرورت ہے۔ یہ ہے وہ اسلام شناس جناحؒ جسے نظریۂ پاکستان کے مخالفین اسلام

سے بیگانہ کہہ کر سادہ مسلمانوں کو پاکستان کی مخالفت کے لئے اُبھارا کرتے تھے۔
اب نظریۂ پاکستان کی وضاحت میں مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے صدارتی خطبہ کا اقتباس دیکھئے:۔

**شبیر احمد عثمانیؒ** "کیا بعید ہے کہ جیسے مدینہ کا پاکستان انجام کار فتح مکہ پر منتہیٰ ہوا اور سارے جزیرۃ العرب کو اس نے پاکستان بنا دیا۔ اسی طرح یہ ہندی پاکستان بھی اللہ کے فضل و رحمت سے وسیع تر ہوتا چلا جائے۔

ہمارا ہندوستان سے کٹ جانا ہندی مسلمان سے کٹ جانے کے مرادف نہیں سمجھنا چاہیئے۔ مسلمانوں کے باہمی تعلقات کے راستے میں جغرافیائی حدود بندی کوئی شئے نہیں۔" صدارتی خطبہ لاہور

از تجلیات عثمانی صفحہ ۶۸۹ - ۶۸۸

کتنا واضح ہے کہ مولانا کے نزدیک پاکستان کا مفہوم جغرافیائی حدود نہیں۔ اور ملّتِ پاکستانیہ سے مُراد وطن کی چار دیواری میں گھری ہوئی قوم نہیں بلکہ وہ انسانوں کو قرآن کی اصطلاح میں کفر و ایمان کی بنیاد پر تقسیم کرتے ہیں۔ اور اسلام کا منتہیٰ یہ قرار دیتے ہیں کہ ساری دُنیا میں ایک ہی نظام قائم ہو۔ ان کے نزدیک بنی نوع انسان کی خوشحالی و ترقی اور امن و سلامتی قرآن کی مستقل اقدار کے نفاذ اور تحفظ میں مضمر ہے مولانا ایسی نظریاتی مملکت کا قیام مسلمانوں پر فریضۂ خداوندی سمجھتے ہیں۔ آپ رنگ، نسل، زبان اور وطن کی بنا پر انسانوں کو مختلف گروہوں (قوموں) میں تقسیم کرنے کے خلاف ہیں۔ ان کے نزدیک تمام انسان بلا امتیاز رنگ و خون ایک وحدت ہیں اور تفریق و تخصیص کا معیار صرف آئیڈیالوجی کا فرق ہے۔ جو لوگ اس نظریہ پر ایمان رکھتے ہیں کہ انسانی اتحاد کا نقطہ ماسکہ توحید خداوندی ہے۔ آفاق و انفس میں اسی کا قانون جاری و ساری ہے۔ جو وحدت خالق، وحدت مخلوق اور وحدت قانون کے قرآنی اصول کو عقیدہ کے طور پر مانتے ہیں۔ وہ ان کے نزدیک ایک قوم کے افراد ہیں (خواہ وہ دُنیا کے کسی حصّے کے رہنے والے اور کسی نسل و قبیلہ سے متعلق ہوں۔ اور جو لوگ اس نصب العین کے خلاف کوئی دُوسرا نصب العین۔ اس نصاب العین

حیات کے علاوہ کوئی دوسرا قانونِ حیات اختیار کرتے ہیں۔ وہ دوسری قوم کے افراد ہیں۔ اس کے بغیر کوئی معیارِ قومیت عثمانیؒ کے ہاں قابل قبول نہیں۔ ایک وسیع تر پاکستان کی تمنا و آرزو سے یہ حقیقت عیاں ہے کہ ان کا پاکستان جغرافیا محض نہیں، نظریہ ہے۔ اور یہ تمام افرادِ انسانیہ کو ایک قانون، ایک مرکز، ایک اُمت دیکھنا چاہتے ہیں۔

تحریکِ قیام پاکستان کے صفِ اوّل کے دو جانثاروں نے ایک کتاب "پاکستان کیا ہے اور کیسے بنے گا؟" قیام پاکستان سے قبل شائع کی تھی۔ موضوع کی موزونیت کے لحاظ سے اس کتاب کے یہ دو اقتباسات نہایت اہم اور وقیع نظر آئے۔ آپ کو ان سے یہ بھی اندازہ ہو سکے گا کہ کارکنانِ تحریکِ پاکستان نے اس دور میں نظریۂ پاکستان کو کیا سمجھا تھا۔ اس لئے جہاں قائدینِ تحریکِ قیامِ پاکستان کے فرمودات آپ کی نذر کئے گئے ہیں۔ وہاں اس زمانہ کے نوجوانانِ ملّت کی نمائندگی میاں محمد شفیع ایم۔ اے اور خان عبدالستار خان نیازی ایم۔ اے کرتے ہوئے نظر آئیں گے۔

ملاحظہ فرمائیے :-

پہلا اقتباس

"دیکھو مسلمان کسی نسل کا نام نہیں۔ مسلمانوں کی کوئی خاص رنگت نہیں کوئی خاص شکل نہیں۔ جرمنوں یا انگریزوں کی طرح ہماری رگوں میں ایک خون کا جوش مشترک نہیں۔ مسلمان تو انسانوں کے ایک ٹولے کا نام ہے۔ جن کی صفت مشترک محض اسلام ہے"

(پاکستان کیا ہے اور کیسے بنے گا؟ صفحہ ۱۴ تا ۱۵)

دُوسرا اقتباس :-

"دراصل پاکستان کی بنا پیغمبرِ اسلام محمد علیہ السلام نے اُس روز رکھ دی تھی جب اسلام کا انقلابی نظریہ انسان کے سامنے پیش کیا گیا تھا۔ تاریخ بنی آدم میں اسود و احمر سب کو پہلی مرتبہ یا ایھا النّاس کہہ کر خطاب کیا گیا۔ زبان، رنگ، نسل، دولت اور علم کے تمام امتیازات نظر انداز کر کے

صرف تقویٰ کو تمدنی اعزاز کا معیار مقرر کیا گیا۔ اسی روز مسلمان اور غیر مسلم کے درمیان ایک خلیج حائل ہو گئی" (پاکستان کیا ہے اور کیسے بنے گا؟ صفحہ ۲۲)

جناب مرزا عبدالحمید صاحب نے جو تاریخی خطبہ استقبالیہ مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے صدر کی حیثیت سے دیا تھا اس کا ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے:-

"اسلام جو قانونِ فطرت ہے۔ عالمگیر مساوات کا پیغام دیتا ہے۔ آدمیت کا احترام سکھاتا ہے۔ اس نے نسل، وطن، رنگ، زبان، قوم اور قبیلہ کے بتوں کو پاش پاش کر دیا۔ اور تمام امتیازات کو جو ان امور کی بنا پر پیدا ہو سکتے ہیں مٹا دیا۔ اس تخریب کے بعد اس نے عقلی بنیادوں پر قومیت کی تعمیر کی جو شخص قرآنِ مجید کو دستورِ حیات تسلیم کرے، وہ ایک قوم کا فرد ہے اور جو انکار کرے وہ دوسری قوم کا فرد ہے۔ صاف صاف ظاہر ہے کہ مغربی نظریۂ قومیت جس کی رو سے قوم کی بنیاد وطن ہے اسلامی نظریۂ قومیت کی ضد ہے۔ اور اس لئے یہ نظریہ کسی مسلمان کے لئے قابلِ قبول نہیں ہو سکتا"

(از خطبہ استقبالیہ پاکستان کانفرنس ۱۹۴۱ء)

**دورِ جہالت**

سابقہ صفحات میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ اقبالؒ نے نظریۂ پاکستان کی اساس قرآن کے اس زرّیں اصول اور مستقل قدر کو قرار دیا ہے۔ جو انسانیت کو نسل و وطن کے امتیاز سے نہ تو تقسیم کرتی ہے اور نہ ہی رنگ و خون کے اشتراک کو معیارِ قومیت بناتی ہے۔ اس لئے حکیم الامتؒ کے نزدیک فسادِ آدمیت کی وجہ وہ معیار ہے جس کی رو سے انسان صرف اپنے ملک اور اپنی قوم کے مفادات کے لئے ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہے۔ چونکہ انسانیت کی مجموعی فلاح و بہبود (مفادِ ہمہ) کا حیات بخش اصول اُن کے سامنے نہیں ہوتا اس لئے ایک قبیلہ دوسرے قبیلے، اور ایک قوم دوسری قوم۔ اور ایک ملک دوسرے ملک کو دبانا اور ان کے مال و متاع کو چھیننا جائز سمجھتا ہے۔ تاریخِ قومیت کے اوراق اُلٹیے تو صاف نظر آتا ہے کہ وہ آتشِ بغض و حسد کا شائبہ انسانیت آج تک جس کی زد میں ہے۔ وہ انہی تعصبات و امتیازات کی بھڑکائی ہوئی ہے۔ انسانوں کی جماعتیں جنہوں نے اپنے اپنے الگ نام رکھے ہوئے ہیں۔ ان میں لڑائیوں کا سبب

شاید ہی اس کے سوا کچھ اور ہو۔ یہ تمام نفرت اور حقارت حسب و نسب اور وطن و قوم کے امتیازات کی وجہ سے ہے۔ اور ایک قوم دوسری قوم سے اس بنا پر متصادم ہے تفریقِ انسانیت کا یہ معیار عہدِ کہن میں قبائلی سیاست کے مہرہ بازوں نے اپنے اقتدار و مفادات کے حصول و تحفظ کے لئے تراشا تھا۔ دورِ حاضر میں قومیت اب سیاسی نظریہ نہیں رہی بلکہ اس نے عقیدے کی شکل اختیار کر لی ہے۔

## جغرافیائی تقسیم (وطنیت) اور نسب (نیشنلزم) کا آغاز کب ہوا

اس کے متعلق عرض ہے کہ انسانوں کی تمدنی زندگی کی ابتدا قبیلہ کے نام پر تقسیم سے ہوئی۔ قبیلہ درحقیقت خاندان ہی کی شکل کا دوسرا نام تھا۔ اس اختلاف و امتیاز کا نتیجہ یہ تھا کہ شعوب و قبائل میں عداوت و مخالفت کی آگ بھڑکتی رہتی تھی۔ اس تفریق و تقسیم کی وجہ سے ایک قبیلہ دوسرے قبیلے کے خون کا پیاسا تھا۔ ذرا سے اشتعال پر ایک قبیلہ کی تلواریں دوسرے کے خلاف میان سے باہر نکل پڑتی تھیں۔ اس سے انسانوں کے حقوق دوسرے انسانوں کے ہاتھوں کسی بھی حالت میں محفوظ نہیں رہتے تھے۔

آج کا انسان دوسرے میدانوں میں خواہ ترقی کی راہوں پر گامزن ہے۔ اور زندگی کے میدان میں خاطر خواہ طور پر آگے بڑھ رہا ہے۔ کہیں ستاروں پر کمندیں ڈال رہا ہے۔ تو کہیں چاند میں پہنچ جانے کی فکر میں ہے۔ تسخیرِ کائنات میں اس کا قدم جس تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ اس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ یہ قدرت کے مخفی رازوں اور کائنات کے مدفون جوہروں کی آشکارائی میں آج نہیں تو کل کامراں ضرور ہوگا

لیکن انسانی زندگی نسل و وطن کی غیر خدائی تقسیم و تفریق کے سبب آج بھی اس مقام پر کھڑی ہے جہاں دورِ کہن میں تھی۔ اس فرق و تمیز کے ساتھ کہ عہدِ جہالت میں جہاں اس اختلاف و تمیز کو خاندان و قبیلہ کا نام دیا جاتا تھا۔ اب اسے (نیشن) قوم کا نقاب اوڑھا دیا گیا ہے۔ آج قوم کی بنیاد کہیں نسل کے اشتراک پر اور کہیں وطن کے اشتراک پر رکھ کر انساں کو انساں سے جدا کر رکھا ہے۔ اور اس طرح اگر ایک قوم کی خوں ریزی ایک قوم کے نزدیک جائز ہے تو دوسری قوم کا دوسری قوم پر (محض نسلی تفوق کے لئے) چڑھ دوڑنا عین درست۔ آج اقوامِ عالم میں وجہ

نزاع وہی تعصبات ہیں۔ جو عہدِ تاریک میں شعوب و قبائل کی دشمنی کی بنیاد بنتے تھے۔ اقبالؒ کی نگۂ پردہ سوز نے اس حقیقی خرابی کو بھانپ لیا تھا۔ اسی لئے آپ نے اپنے نظریۂ کو قرآنِ عزیز کے انسانیت ساز پروگرام کی روشنی میں پیش کیا۔ کہ انسانوں کا باہمی فرق و امتیاز محض آئیڈیالوجی کی بنا پر ہے۔ رنگ و خون۔ حسب و نسب اور قوم و وطن کے معیار سے نہیں۔

**عصرِ رواں**

عہدِ حاضر کا کوئی انصاف پسند انسان اس کھلی حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ آج مختلف اقوام و ممالک میں وہی عداوت اور مخاصمت وہی نفرت اور دشمنی موجود ہے جو عصرِ تاریک میں مختلف قبائل میں ہوتی تھی۔ بلکہ کہیں کہیں یہ نفرت عمیق اور عداوت اس سے کہیں زیادہ شدید ہے۔ فسادِ عصرِ حاضر کی ایک وجۂ عظیم یہ بھی ہے کہ مفاد پرستوں نے نسلِ انسانی کو مختلف گروہوں، فرقوں اور مختلف قوموں میں تقسیم کر کے آدمی کو آدمی کا دشمن بنا رکھا ہے۔ اور اس طریق سے اپنے سرمایہ دارانہ مفادات کے تحفظات کیے ہوئے ہیں۔ اگر کوئی وطن کو دیوی سمجھ کر اس کی پرستش کرتا ہے تو دوسرا قوم پر جاں نثاری کو شہادت کا مرتبہ دیتا ہے۔ آج افرادِ نسلِ انسانیہ کی اکثریت قوم و وطن کے بتوں کی پوجا میں منہمک ہے۔ کیونکہ ؎

باوطن اہلِ وطن را نسبتے است
زانکہ از خاکش طلوعِ ملتے است

اس طرح وطن کی دیوی کے مندروں سے فساد و دشمنی کے شعلے بھڑک رہے ہیں۔ وطن کی حدود و قیود نے ایک انسان کو دوسرے ملک میں رہنے والے انسان کا دشمن بنا رکھا ہے۔ یہ جغرافیائی لکیریں وہ زہریلے سانپ ہیں۔ جو انسانیت کو ڈستے چلے جا رہے ہیں۔ دوسری طرف قرآنی تقاضے اس شاہسوارِ دوراں کی تلاش میں ہر اٹھتی ہوئی گرد کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ جسے اس جہنم کدہ جہاں میں اس دور کا ابراہیم کہا جا سکے۔

**مفکرین عصرِ حاضر اور نیشنلزم**

عہدِ حاضر کے مفکرین و محققین شدت سے یہ محسوس کر رہے ہیں۔ کہ قومی تقسیم کا اس معیار

نے دُنیا کو جہنم کدہ بنا دیا ہے۔ انمیاز رنگ و خُون کی آتش ریزیوں اور فساد انگیزیوں کی وجہ سے قصرِ انسانیت جل رہا ہے۔ اس دَور میں نیشنلزم ایک مشرکانہ مذہب کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ اور یہ فسادِ آدمیت اور تفریقِ انسانیت کے لئے ایسا طاقت وَر ہے۔ کہ وحدتِ انسانیت اور فلاحِ آدمیت کی کوئی تحریک اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ نیشنلزم کے تحفے خُون ریزی اور اخلاق سوزی کے سوا کچھ نہیں۔ احترامِ آدمیت کے تمام عقائد اس کے نزدیک باطل ہیں۔ علیحدگی، تکبّر، انانیت، نفرت اور جنگ اس کے رہنما اُصول ہیں۔

نیشنلزم کی تباہ کاریوں سے دُنیا آج بلبلا اُٹھی ہے۔ اس کی امن سوز آگ نے انسانیت کے خرمنِ سکوں کو جلا ڈالا ہے۔ انسان کے خُون کا پیاسا انسان درندوں کی طرح ایک دُوسرے پر جھپٹ رہا ہے۔ اس کی ہلاکت آفرینیوں سے خُونِ آدم بہت ارزاں ہے۔ آدمیت امن و راحت کی تلاش میں جہاں میں پناہ جُو ہے۔ آج تڑپتی۔ سِسکتی۔ بلبلاتی اور خاک و خُون آلود انسانیت جہاں میں اماں کی تلاش میں ہے کہ کہیں اسے گوشۂ عافیت میسّر آ جائے۔

نیشنلزم کے نفرت انگیز تصوّر نے سوسائٹی۔ نیشن اور اسٹیٹ کو خدا بنا لیا ہے۔ اسی لئے حقیقی خُدا کے تصوّر سے دل خالی ہو کر شیطان کا گھونسلہ بن گئے ہیں۔ اس فلسفۂ حیات کی رُو سے انسانوں کا ایک گرُوپ انسانوں کے دُوسرے گروہ پر غلبہ و تسلّط حاصل کرنے کے لئے ہر حربہ کو جائز سمجھتا ہے۔ غرضیکہ اسٹیٹ نیشن کے تحفّظ کے لئے ہر قسم کا تشدّد اور فریب عین ضروری ہے۔ واعظانِ قومیت ہر جگہ یہی وعظ کہتے ہیں۔ کہ فرد کو اپنا سب کچھ اسٹیٹ کے سُپرد کر دینا چاہئے۔

قومیت پرستی کے متعلق ہرٹز (HERTZ) لکھتا ہے کہ:۔

دورِ حاضر کی حقیقت پرستی، مذہب کے باب میں اپنے آپ کو عجیب اُلجھن میں پاتی ہے۔ ایک طرف اس کی یہ حالت ہے کہ وُہ اپنے متبعین کے جذبۂ اطاعت و وفا کیشی کو خُدا اور قوم کے درمیان بانٹنے کے لئے تیار نہیں۔ یہ قوم کو ایک بُت بناتی ہے اور قومیت پرستی کو خود مذہب کی حیثیت دیتی ہے۔ لیکن دوسری طرف، نیشنلسٹ طبقہ میں[1] اتنی جرأت بھی نہیں کہ وُہ اپنی مذہب دشمنی کا اظہار

---

[1] دیکھئے یہ تحریر نظریۂ پاکستان کے مخالف نیشنلسٹ علماء پر کس طرح صادق آتی ہے اور ان کے کیرکٹر کی کیسی عکاسی کرتی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ انہیں کے لئے لکھی گئی ہے

کھلے بندوں کریں۔ کیونکہ اس سے اُن کے بہت سے متبعین کے جذبات کے مجروح ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔"

NATIONALITY IN HISTORY AND POLITICS P.121

نیشنلزم۔ جسے یورپ صدیوں سے انسانیت کے لئے آیۂ رحمت تصوّر کئے چلا آرہا ہے۔ لیکن اس آیۂ رحمت اور نوائے سعادت نے تجربے کے بعد جو بھیانک، ہولناک اور انسانیت سوز نتائج پیش کئے ہیں۔ انہیں دیکھ کر اب وہاں کے مفکّرین و مدبّرین کی اس طرح چیخیں نکل رہی ہیں۔ جیسے کوئی شخص آتش فشاں پہاڑ کے لاوے کی زد میں آکر اپنی موت آنکھوں کے سامنے دیکھ رہا ہو۔ مفکّرین مغرب اب شدّت سے محسوس کر رہے ہیں کہ نیشنلزم کا آتشیں سیلاب پُوری کی پُوری دُنیا کو راکھ کا ڈھیر بنا کر رکھ دے گا۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ نیشنلزم کی بنیاد کس جذبہ پر ہے؟ پروفیسر کوہن کی کتاب (THE CRISIS OF CIVILISATION) کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمایئے جس میں وہ لکھتا ہے:۔

"قومیت پرستی کا احساس نفرت سے پیدا ہوتا ہے اور عداوت سے پرورش پاتا ہے۔ ایک قوم کو اپنی ہستی کا احساس ہی اس وقت ہوتا ہے جب وہ کسی دوسری قوم سے متصادم ہو۔ پھر ان اقوام کا جذبۂ عداوت و پیکار اپنی قومی وحدت کی تکمیل پر ہی ختم نہیں ہو جاتا۔ جوں ہی کوئی قوم اپنے حق استقلال و خودمختاری کو مسلّط کر لیتی ہے تو ان اقوام کو دبانا شروع کر دیتی ہے جو اپنے لئے خودمختاری کی مدّعی ہوں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ان تمام وجوہات کی بنا پر اس نتیجہ پر پہنچا جائے گا۔ کہ کسی نظامِ حکومت کے لئے قومیت پرستی کی بنیاد بڑی خطرناک ہے۔" (صفحہ ۱۶۶)

نیشنلزم کی تباہ کاریوں اور انسانیت کی فطری تقسیم کے متعلق پروفیسر ولیم برینڈ اپنی کتاب (FOUNDATIONS OF HUMAN CONFLICTS) میں لکھتا ہے:۔

"آج ایک برِّاعظم کی مثال یُوں سمجھئے کہ ایک زرخیز کھیت ہے۔ جس میں انسانوں نے نہایت نامعقولیت سے دیواریں کھڑی کر رکھی ہیں یعنی وادیوں کے اطراف و جوانب، سڑکیں، دریا وغیرہ۔ جن کا مصرف اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ انہوں نے

ایک گروہ کو دوسرے سے الگ کر رکھا ہے۔ اور جذبۂ وطنیت وہ سیمنٹ ہے۔ جو اُن زندہ اینٹوں کو باہمدگر مربوط کئے ہے جس سے انسان خود ساختہ جیل خانوں میں محبوس ہیں۔" (صفحہ ۵۷)

وطنیت کا جذبہ، اتحادِ انسانی کے راستے میں سب سے بڑا پتھر ہے ۔

(ADAM DEHEGEDUS) نے (THE STATE OF THE WORLD) کے نام سے ۱۹۴۶ء میں یہ اہم کتاب شائع کی جس میں دوسری جنگِ عظیم کے بعد دنیا کے اضطرابی جہنم کا جائزہ لیا گیا تھا۔ وہ لکھتا ہے:۔

"مسئلہ کس قدر پیچیدہ کیوں نہ ہو، یہ واقعہ ہے کہ ہمارے دور کی دونوں عالمگیر لڑائیاں نیشنلزم کی پیدا کردہ تھیں اور یہی چیز ہمارے زمانہ میں سب سے بڑی سیاسی قوت ہے۔ ان دونوں لڑائیوں کی تہ میں وہی اصول کارفرما تھا۔ جس کی رُو سے دنیا کو آزاد قومی مملکتوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے اور جس کا فطری نتیجہ یہ ہے کہ مختلف مملکتیں ایک دوسرے سے بڑھنے کی فکر کرتی ہیں اور اس طرح ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہیں۔ ان حالات میں کبھی صالح معاشرتی نظام قائم ہی نہیں ہو سکتا۔ اور رونا صرف یہی نہیں کہ یہ دو عالمگیر لڑائیاں کیوں ہو گئیں۔ رونا تو اس بات کا ہے کہ جب دنیا میں جنگ نہیں ہو رہی ہوتی اس وقت بھی امن قائم نہیں ہوتا۔" (صفحہ ۱۱ - ۱۲)

آگے چل کر رقمطراز ہے:۔

"نیشنلزم انسانی تاریخ میں سب سے بڑا مفسدہ ہے کہ اس سے پہلے کوئی فسادِ آدمیت نہ عالمگیر ہوا کرتا تھا۔ نہ انسانی زندگی پر محیط کُلی۔

برٹرینڈ رسل اپنی کتاب (THE HOPES FOR A CHANGING WORLD, 1953) میں لکھتا ہے:۔

"ہمارے زمانہ میں جو چیز، معاشرتی روابط کو قومی حدود سے آگے بڑھانے میں مانع ہے، وہ نیشنلزم ہے۔ اس لئے نیشنلزم، نوعِ انسان کی تباہی کے لئے سب سے بڑی قوت ہے (پھر تماشا یہ ہے کہ) ہر شخص تسلیم کرتا ہے کہ دوسرے ملکوں کی نیشنلزم بڑی خراب چیز ہے۔ لیکن اس کے اپنے وطن کی نیشنلزم بہت اچھی ہے۔"

الڈوس ہکسلے :-

"نیشنلزم (نسل پرستی) کے جذبے کو بالکل پاگلوں کا مسلک قرار دیتا ہے"۔

(THE PERENNIAL PHILOSOPHY) صفحہ ۲۸۸ تا ۳۰۲

**لارڈ ایکٹن** اپنی کتاب (SCIENCE, LIBERTY AND PEACE) میں الڈوس ہکسلے نے اسی کی وضاحت اس طرح کی ہے :-

"لارڈ ایکٹن نے ۱۸۶۲ء میں لکھا تھا کہ نیشنلزم کا مقصود آزادی یا خوشحالی نہیں۔ اس کے نزدیک مملکت ہی تمام مقاصد کا معیار ہوتی ہے اس لیے وہ مملکت کی خاطر سب کچھ قربان کر دیتی ہے۔ اس لیے اس کا انجام مادی، اخلاقی ہر قسم کی تباہی ہوگا۔ ایکٹن کی یہ پیش گوئی کس طرح پوری ہوتی چلی جا رہی ہے نیشنلزم نے جس قدر مادی نقصان پہنچایا ہے اس کی تلافی شاید پوری کی پوری نسل بھی نہ کر سکے۔ باقی رہی اخلاقی تباہی، سو یہ تباہی لاکھوں مردوں، عورتوں، بالخصوص بچوں کے لیے ناقابل تلافی ہے۔ نیشنلزم کی طرف سے جسے ہم نے وحدتِ انسانیت اور خدا کے عقیدہ کو چھوڑ کر ایک بت پرستانہ مذہب کی حیثیت سے اختیار کر رکھا ہے، ہمیں صرف یہی دو تحفے نہیں ملے۔ اس کی وجہ سے ساری دنیا قریب پچاس ٹکڑوں میں تقسیم ہو چکی ہے جنہیں اقوامِ عالم کہا جاتا ہے۔ ان میں سے ہر قوم کا "مملکتی مذہب" ہے۔ یعنی خدا کے بجائے قوم کی پرستش، جسے اعلیٰ اقدار کا مظہر سمجھا جاتا ہے۔ لہٰذا ان پچاس دیوتاؤں میں سے ایک دیوتا کا پجاری باقی انچاس پجاریوں کو ملیکش تصور کرتا ہے نیشنلزم اخلاق کی تباہی کا باعث اس طرح بنتی ہے کہ اس کی رو سے، عالمگیر انسانیت، خدائے واحد اور احترامِ آدمیت کے تمام عقائد باطل قرار پا جاتے ہیں۔ اور ان کے بجائے علیحدگی۔ تکبر، انانیت، خود اکتفائیت کے عقائد پیدا ہو جاتے ہیں۔ جن کا نتیجہ نفرت اور جنگ کا جواز ہی نہیں بلکہ وجوب ہوتا ہے"۔

(J. M. MURRAY) نے ایک دلچسپ کتاب (ADAM AND EVE) لکھی ہے اس میں وہ انسانیت کے لئے ایک جدید معاشرے کا تصور پیش کرتا ہے اس ضمن میں وہ لکھتا ہے :-

"چونکہ انسانوں کے دل سے خدا کا عقیدہ نکل گیا ہے اس لیے خالی مکان پر نیشنلزم کے شیطان نے قبضہ کر لیا ہے۔ اب انسانوں کو ایک ایسے مذہب کی ضرورت ہے جو نیشنلزم کے جذبہ پر غالب آسکے"۔ (صفحہ ۶۶-۶۷)

وطن کی حقیقت کے متعلق مشہور فرانسیسی مورخ رینان (ESSAY ON NATIONALITY) میں لکھتا ہے کہ:-

"انسان کی روح دریاؤں کے رُخ اور پہاڑوں کی سمتوں میں مقید نہیں ہو سکتی وطن کی سرزمین انسان کے لئے جائے قیام اور کش مکش کاروبار کے لئے ایک میدان مہیا کر دیتی ہے۔ لیکن انسان (اس کے لئے) روح مہیا کرتا ہے"۔

نیشنلزم کے متعلق ڈین انج لکھتا ہے کہ:-

"ہمارے سامنے ایک باطل مذہب ہے۔ یعنی نیشنلزم۔ یہ مذہب لا مذہبیت سے بھی زیادہ خطرناک ہے"۔ (THE FALL OF IDOLS, P.133)

مذہب قومیت پرستی میں حب الوطنی کے جذبہ کو بلند ترین خصوصیت انسانیت سمجھا جاتا ہے۔ اور محب وطن (PATRIOT) کو نہایت عقیدت اور احترام کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ لیکن (HEGEDUS) کہتا ہے:-

"محب وطن انسان، خواہ کتنا ہی سچا محب وطن کیوں نہ ہو، انسانی ترقی کا دشمن اور مقصدِ حیات کا سخت ترین غدار ہوتا ہے"۔

(THE STATE OF THE WORLD, P.53)

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ انسان چونکہ فطرتاً مدنی الطبع واقع ہوا ہے۔ اس لئے وطن اور اپنی قوم سے محبت اس کی فطرت کا تقاضا ہے۔ لیکن اب مغربی مفکرین رفتہ رفتہ اس نتیجہ پر پہنچ رہے ہیں کہ یہ خیال غلط ہے۔ ان کے نزدیک وطنیت اور قومیت کا جذبہ غیر فطری ہے اور انسانیت کی پست سطح کی یادگار۔ چنانچہ (HEGEDUS) لکھتا ہے کہ:-

"انسان مدنی الطبع حیوان ہے جو اپنے جبلی تقاضوں کی بنا پر جماعتی زندگی بسر کرتا ہے۔ یہ جبلت اس کی خصوصیات میں سے ہے۔ اس کے لئے جماعتی زندگی ہی میں زندہ رہنا ممکن ہے ۔۔۔۔۔۔ قومی گروہ میں رہنا بھی اسی

لحاظ سے فطری تقاضا قرار دیا جائے گا۔ لیکن یہ سب تقاضے ناتمام ہیں
انسان کی جماعت، تمام نوع ہے اور یہی اس کی فطرت کا تقاضا ہے:۔

(THE STATE OF THE WORLD. P. 96)

آپ اندازہ فرمائیے کہ انسانی فکر محض عقل کی راہنمائی میں بنی نوع انسان کی وحدت کے متعلق کس طرح سوچ رہی ہے۔ اب آپ پنڈت جواہر لعل نہرو کی کتاب (THE DISCOVERY OF INDIA) کے مقدمہ کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے کہ ذاتوں۔ گوتوں اور ورنوں میں انسانیت کو تقسیم کرنے والے لوگ بھی اب "نوع انسانی پر ایمان" کی تلقین کر رہے ہیں۔

پنڈت جواہر لعل نہرو لکھتے ہیں:۔

"ذات پات کی تمیز نے صرف یہی نہیں کیا کہ بعض جماعتوں کو دبائے رکھا، بلکہ یہ بھی کہ صنعت و حرفت سے علم کو الگ کر چھوڑا اور فلسفہ کو زندگی کے عملی مسائل کے پاس نہ آنے دیا۔ یہ درحقیقت امراء کے طبقہ کی اختراع تھی۔ جسے روایات کی سند سے مستحکم کر لیا گیا تھا۔ اب اس مطمح نگاہ کو یکسر بدل دینا چاہیئے۔ کیونکہ یہ زمانہ کے مقتضیات اور جمہوری اُصول کے بالکل منافی ہے۔۔۔۔۔۔ ہندوستان میں ہمارا نصب العین مساوات ہونا چاہیئے۔ اس کا مطلب یہ نہیں اور نہ ہی اس کا یہ مفہوم ہو سکتا ہے کہ فرد کو جسمانی ذہنی یا روحانی طور پر مساوی تسلیم کر لیا جائے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص کو مساوی مواقع بہم پہنچائے جائیں۔ اور کسی فرد یا جماعت کے راستہ میں کوئی سیاسی، معاشی یا معاشرتی رکاوٹ حائل نہ ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم نوع انسانی پر ایمان رکھیں اور اس حقیقت کو تسلیم کریں کہ کوئی نسل یا گروہ ایسا نہیں۔ کہ اسے مواقع بہم پہنچا دیئے جائیں اور وہ اس پر بھی ترقی نہ کرے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اس حقیقت کو محسوس کر لیں کہ کسی گروہ کا تنزل اس کی کسی داخلی کمی کی وجہ سے نہیں ہوتا۔ بلکہ محض اس لئے ہوتا ہے۔ کہ اسے

---

؎ دیکھئے برہمنی سیاست پنڈت جی کے ہاتھوں بے نقاب ہو رہی ہے۔

مدّتِ دراز تک ترقی کے مواقع بہم نہیں پہنچائے گئے - اور دوسری جماعتوں[۱]
نے اسے دبائے رکھا ہے۔"

## اقبالؒ کا تصورِ قومیت

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے - کہ اقبالؒ نے علیحدہ قومیت کا تصور ۱۹۳۰ء میں پیش کیا - لیکن تاریخ کے زندہ حقائق ہماری توجہ کو اُن کے اس لیکچر کی طرف لے جاتے ہیں - جو آپ نے اسٹریچی ہال ایم - اے - او - کالج علی گڑھ میں ۱۹۱۱ء کے آغاز سرما میں انگریزی زبان میں دیا تھا - اور اس کا مولانا ظفر علی خان نے اُردو میں ترجمہ کر کے ۱۹۱۱ء کو برکت علی ہال میں پڑھ کر سنایا - یہ جلسہ محض اس مقصد کے لئے منعقد کیا گیا تھا - علامہ اقبالؒ خود شریک جلسہ تھے - موضوع سے متعلق اقتباسات نذرِ قارئین کئے جاتے ہیں - جن سے یہ صاف ظاہر ہو جائے گا - کہ ۱۹۳۰ء سے بہت پہلے اقبالؒ کی فکرِ فلک پیما نے اس حقیقت کی بلندیوں کو چھو لیا تھا کہ اسلام کے نام پر اُبھرنے والی ملت کو جغرافیائی حدود میں قید نہیں کیا جا سکتا - اور نہ ہی طائرانِ اُمت نام و نسب کے غبار آلود پروں سے منزلِ مراد کی طرف پرواز کر سکتے ہیں - فرماتے ہیں :-

"میں اپنی قوم کی موجودہ عمرانی حرکت پر اسی پہلو سے نظر ڈالنا چاہتا ہوں اگر غور سے دیکھا جائے تو اقوام کے لئے سب سے زیادہ اہم با شان عقدہ فقط یہ عقدہ ہے خواہ اس کی نوعیت تمدنی قرار دی جائے - خواہ اقتصادی خواہ سیاسی - کہ قومی ہستی کا سلسلہ بلا انقطاع کس طرح قائم رکھا جائے - مٹنے یا معدوم ہو جانے کے خیال سے قومیں بھی ویسی ہی خائف ہیں جیسے افراد - کسی قوم کی مختلف عقلی یا غیر عقلی قابلیتوں اور استعدادوں کے محاسن کا اندازہ ہمیشہ اسی غایت الغایات سے کرنا چاہیئے - ہم لازم ہے ہم اپنے محاسن کو جانچیں اور پرکھیں اور اگر ضرورت آ پڑے تو نئے محاسن پیدا کریں - اس لئے بقول نطشے کے کسی قوم کی بقا کا دارومدار محاسن کی مسلسل و غیر مختتم تولید ہوتا ہے - کائنات

---

[۱] اس لیکچر کے اقتباسات تحریک پاکستان اور نیشنلسٹ علماء میں ذرا تفصیل سے دیئے گئے ہیں۔

یقیناً جناب باری کی حکمت بالغہ کے سانچے میں ڈھلی ہوئی معلوم ہوتی ہے مگر اس کا مفہوم سراسر انسانی ہے۔ لیکن اس پر تبصرہ کے آغاز سے پہلے ہی چند تمہیدی اُمور پر بحث کرنا چاہتا ہوں۔ اس لئے کہ یہ بحث میرے نزدیک مسلم قومیت کے متعلق کسی نتیجہ پر پہنچنے کے لئے ضروری ہے۔ یہ اُمور جن پر ترتیب وار نظر ڈالوں گا:۔

۱۔ جماعت المسلمین کی ہیئت ترکیبی۔

۲۔ اسلامی تمدن کی یک رنگی۔

۳۔ اس ہیئت کا نمونہ جو مسلمانوں کی ہستی کے تسلسل کے لئے لازمی ہے

اولاً ــــــ مسلمانوں اور دنیا کی دوسری قوموں میں اصلی فرق یہ ہے۔ کہ قومیت کا اصلِ اصول اشتراک زبان ہے نہ اشتراک وطن۔ نہ اشتراکِ اغراض اقتصادی بلکہ ہم لوگ اس برادری میں جو رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم فرمائی تھی اس لئے شریک ہیں کہ مظاہرِ کائنات کے متعلق ہم سب کے معتقدات کا سرچشمہ ایک ہے۔ اور جو تاریخی روایات ہم سب کو ترکہ میں پہنچی ہیں وہ بھی ہم سب کے لئے یکساں ہیں۔

اسلام تمام مادی قیود سے بیزاری ظاہر کرتا ہے اور اس کی قومیت کا دارومدار ایک خاص تہذیبی تصور پر ہے۔ جس کی تجسیمی شکل وہ جماعتِ اشخاص ہے۔ جس میں بڑھتے اور پھیلتے رہنے کی قابلیت طبعاً موجود ہے۔"

"اسلام کی زندگی کا انحصار کسی قوم کے خصائل مخصوصہ اور شمائل مختلفہ پر نہیں ہے۔ غرض اسلام زمان و مکان کی قیود سے مبرا ہے۔"

علامہؒ کا یہ فرمان آب زر سے لکھنے کے قابل ہے کہ:۔

"اس میں شک نہیں کہ قوم عرب نے جس کے بطن سے اسلام پیدا ہوا۔ اس کی پولیٹیکل نشوونما میں بہت بڑا حصہ لیا لیکن اسلامی علوم و فنون اور فلسفہ و حکمت کے انمول موتیوں کو رولنے کا کام اور یہ وہ کام ہے۔ جو نفسِ ناطقہ انسان کے اعلیٰ زندگی کے کارناموں سے متعلق ہے زیادہ تر غیر عرب اقوام ہی نے انجام دیا۔ معلوم ایسا ہوتا ہے۔ کہ اسلام کا ظہور

قومِ عرب کی زندگی کی تاریخ میں یزداں طلبی کی ایک آنی، عارضی جھلک ہونے کے لحاظ سے گویا برق کی چشمک تھی یا شرارہ کا تبسّم تھا لیکن اسلام کی دماغی توانائیوں کی جولان گاہ عرب نہ تھا بلکہ عجم تھا۔"

ملاحظہ فرمائیے:۔

"پس چونکہ اسلام کا جوہر ذاتی بلا کسی آمیزش کے خاص طور پر ذہنی یا تخیلی ہے لہٰذا کیونکر ممکن تھا کہ وہ قومیت کو بھی کسی خارجی یا حسّی اُصول مثلاً وطن پر مبنی قرار دینا جائز تصوّر کرے۔"

## قومیت کا ملکی تصوّر

"قومیت کا ملکی تصوّر جس پر زمانہ حال میں بہت کچھ حاشیے چڑھائے گئے ہیں۔ اپنی آستین میں اپنی تباہی کے جراثیم کو خود پرورش کر رہا ہے۔ اور اس میں شک نہیں۔ کہ قومیت کے جدید تصوّر نے چھوٹے چھوٹے پولٹیکل حلقے قائم کر کے اور ان میں قابت کے اس ایجع القوام عنصر کو پھیلا کر (جس تمدّنِ جدیدہ کی شاخ میں بوقلمونی کا پیوند لگایا ہے) دُنیا کو تھوڑا بہت فائدہ ضرور پہنچایا ہے۔ لیکن بڑی خرابی اس تصوّر میں یہ ہے۔ کہ اس میں غلو اور افراط کا شاخسانہ نکل آتا ہے۔ اس نے بین الاقوامی نیتوں کی نسبت غلط فہمی پھیلا رکھی ہے اس نے پولٹیکل سازشوں اور منصوبہ بازیوں کا بازار گرم کر رکھا ہے۔ اس نے فنونِ لطیفہ۔ علومِ ادبیہ کو خاص قوموں کی خصوصیات کی میراث دے کر تمام انسانی عنصر کو اس سے نکال دیا ہے۔

مَیں سمجھتا ہوں کہ وطن پرستی کا خیال جو قومیت کے تصوّر سے پیدا ہوتا ہے۔ ایک طرح سے مادی شئے کا تابع ہے۔ جو سراسر اُصول اسلام کے خلاف ہے۔ اس لئے کہ اسلام دُنیا میں ہر طرح کے شرک خفی و جلی کا قلع قمع کرنے کے لئے نمودار ہُوا تھا۔"

آپ دیکھ رہے ہیں کہ سرسیّدؒ نے (۱۸۶۷ء میں) برسوں پہلے جن خیالات کا اظہار بنارس کے کمشنر، مسٹر شکسپیئر کے ایک سوال کے جواب میں کیا تھا، علامہ

---

لہٰ "ملّتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر" اس لیکچر کا عنوان تھا۔

اقبالؒ نے مسلم قومیت کے اسی تصور کو ۱۹۱۰ء میں اپنے محولہ بالا لیکچر میں پیش کیا۔ چنانچہ پاکستان کی بُنیاد اسی نظریہ پر استوار ہوئی۔ اقبالؒ کانگریس کی اس اسکیم کے برعکس کہ ہندوستان کے تمام باشندے ایک ملک میں بسنے کی بنیاد پر ایک قوم ہیں" یہ سمجھتے تھے کہ اشتراکِ وطن کی رُو سے جب محمدؐ رسول اللہ اور ابو جہل جن کی نسل اور زبان بھی ایک تھی ایک قوم کے فرد نہیں تھے۔ لیکن آئیڈیالوجی کے اشتراک کی رُو سے رُوم کا صہیبؓ فارس کا سلمانؓ اور حبش کا بلالؓ ایک امّت کے افراد۔ اس لئے ابو جہل اور ابو بکرؓ کو وطن و نسل اور رنگ کا اشتراک ایک قوم کے افراد نہیں بنا سکتا۔ دراصل یہ وُہ معیارِ قومیت جسے قرآن پیش کرتا ہے۔ یہی وُہ اُصول تھا جسے حضرت ابراہیمؑ نے ان چار لفظوں میں سمٹا کر یوں بیان کر دیا کہ :-

فَمَنْ تَبِعَنِیْ فَاِنَّهٗ مِنِّیْ (۱۴/۳۶)

(ترجمہ) جو کہ میری پیروی کرتا ہے۔ وہ میرا ہے۔

تشکیلِ اُمّت کا یہی قرآنی نصب العین تھا جس کی دعوت علّامہ اقبالؒ برسوں سے دیتے چلے آرہے تھے۔ ہندو کانگریس کی گہری چال کو بھانپ کر آپ نے مسلمان کو بہت پہلے متنبّہ کیا تھا کہ خبردار عصرِ حاضر کا آذر وطن کا صنم تراشں کر اس دیوی کی پرستش کی ترغیب دے رہا ہے دیکھنا کہیں اس بُت کی پُوجا نہ شروع کر دینا۔ دیکھنا کہیں دامنِ توحید ہاتھ سے نہ چُھوٹ جائے۔ نہ پیرانِ حرم کے بدلے ہوئے اندازِ فکر سے آپ بے خبر تھے اور نہ ہی برہمنوں کی سیاست کے پیچ و خم سے ناواقف۔ چنانچہ ملکی قومیت کے مضرات سے آگاہ کرنے کے لئے یُوں گویا ہوتے ہیں :-

ؔ اس دَور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور
ساقی نے بنائی روشِ لطف و ستم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور
تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وُہ مذہب کا کفن ہے

نظارۂ دیرینہ زمانے کو دکھا دے
اے مصطفویؐ خاک میں اس بُت کو ملا دے

اس نظریہ کے غلط نتیجہ سے خبردار کرتے ہوئے فرماتے ہیں :۔

اقوام میں مخلوقِ خدا بٹتی ہے اس سے
قومیّتِ اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

## رنگ و نسل کا عقیدہ

قومیّت جس کی بنیاد قوم و وطن اور نسل و نسب پر ہو۔ اقبالؒ اسے نسلِ آدم کے لئے فتنہ قرار دیتے ہیں۔

نوعِ انسان کی نشو و نما اور فلاح و بہبود کے لئے اربابِ حسب و نسب کے خلاف جہاد ان کے نزدیک عین ضروری ہے۔ ان کے نظریہ کے مطابق اسلام وحدتِ انسانیہ کا علمبردار ہے۔ اسلام کا وہ نظام جسے یہ پاکستان کی مثالی مملکت میں تشکل کرنا چاہتے تھے (کیونکہ پاکستان کا مقصود یہی ہے) کسی خاص قوم یا نسل سے مخصوص نہیں، بلکہ یہ عالمگیر انسانیت کی اُخوّت و وحدت کا داعی اور ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ کا علمبردار ہوگا۔ ڈاکٹر نکلسن کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں کہ :۔

"اسلام بلکہ کائناتِ انسانیہ کا سب سے بڑا دشمن رنگ و نسل کا عقیدہ ہے۔ اور جو لوگ نوعِ انسانی سے محبّت رکھتے ہیں۔ ان کا فرض ہے۔ کہ ابلیس کی اس اختراع کے خلاف عَلمِ جہاد بلند کریں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ قومیت کا عقیدہ جس کی بنیاد نسل یا جغرافیائی حدود ملک پر ہے۔ دُنیائے اسلام میں استیلا کر رہا ہے۔ اور مسلمان عالمگیر اخوت کے نصب العین کو نظرانداز کرکے اس عقیدے کے فریب میں مبتلا ہو رہے۔ جو قومیّت کو ملک و وطن کی حدُود میں مقید رکھنے کی تعلیم دیتا ہے۔ اس لئے میں ایک مسلمان اور ہمدرد نوعِ انسانی کی حیثیت سے اُنہیں یاد دلانا مناسب سمجھتا ہوں۔ کہ ان کا حقیقی غرض سارے بنی آدم کی نشو و نما کی نشو و ارتقا ہے۔"

جاوید نامہ میں علامہ اقبالؒ پابندِ نسب انسانوں کے امام ابوجہل کا نوحہ جس میں وہ غلافِ کعبہ تھام کر یہ کہہ رہا ہے۔ کہ محمدؐ نے ایک نیا دین پیش کرکے اربابِ حسب و نسب کی عزّت کو خاک میں ملا دیا ہے۔ اس طرح سے شروع کرتے ہیں:۔

سینۂ ما از محمدؐ داغ داغ
از دمِ او کعبہ را گُل شد چراغ!

از ہلاکِ قیصر و کسریٰ سرود　　　نوجواناں را ز دستِ ما ربود
ساحر و اندر کلامش ساحری است　　　این دو حرفِ لَا اِلٰہَ خود کافری است

حسب و نسب اور ملک و قوم کے نام پر سادہ لوحوں کے جذبات کے سہارے اپنی سرداریاں قائم رکھنے والے مفاد پرستوں کا یہ نمایندہ حضورؐ کے دین کی وضاحت کرتے ہوئے کہتا ہے:-

مذہبِ او قاطعِ ملک و نسب
از قریش و منکر از فضلِ عرب
در نگاہِ او یکے بالا و پست
با غلامِ خویش بر یک خواں نشست
قدرِ احرارِ عرب نشناختہ
با کلفتانِ حبش در ساختہ
احمراں با اسوداں آمیختند
آبروئے دودمانے ریختند!
این مساوات این مواخات اعجمی است
خوب می دانم کہ سلمانؓ مزدکی است
ابن عبداللہ فریبش خوردہ است
رستخیزے بر عرب آوردہ است!
باز گو اے سنگِ اسود باز گوے
آنچہ دیدیم از محمدؐ باز گوے
اے ہبل اے بندہ را پوزش پذیر
خانۂ خود را ز بے کیشاں بگیر

حسب و نسب پر ناز کرنے والا عہدِ کہن کا ابو جہل ہو یا قوم و وطن کی بنا پر دیگر انسانوں سے برتر و اعلیٰ اور الگ سمجھنے والا آج کا قوم پرست۔ دین دونوں کے لئے پیغامِ موت ہے۔ اسلام ہیئتِ اجتماعیہ کی بنیاد ان حیات بخش اُصولوں کو قرار دیتا ہے جو نبوّتِ محمدیہؐ کو بارگاہِ الٰہی سے قرآنِ عزیز کی شکل میں

عطا ہوئے۔ اسلام کے نزدیک سیاہ و سرخ۔ عربی۔ عجمی۔ حبشی۔ افغانی۔ ایرانی و عراقی کے تمام امتیازات باطل ہیں۔ اسلام کردار کے علاوہ فخر و ناز کی کسی نسبت کو قبول نہیں کرتا۔ حتیٰ کہ اس کے ہاں پیغمبرِ آخری الزماں صلّی اللہ علیہ وسلّم کی بیٹی ہونے پر ناز کرنے کی اجازت نہیں محض اعمالِ حسنہ کی وجہ سے ملّت اسلامیہ کا کوئی فرد سربلند و سرفراز ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ محض حسب و نسب کی بنا پر۔ عزّت و عظمت حاصل کرنے والا ابوجہل انسانی اقدار کے؛ لاف اپنے جذبات و احساسات کا اس انداز میں اظہار کرتا ہے۔ اور اپنی اس جھوٹی عزّت کو برقرار و قائم رکھنے کے لئے حضورؐ کے پیغام انسانیت ساز سے پریشاں ہو کر لات و ہبل کے حضور الحاح و گریہ زاری کر رہا ہے۔ اور یہ جادۂ حق ناشناس رہبرِ انسانیتؐ کو فریب خوردۂ منزل کہہ رہا ہے

---

## دوسرا باب

# فکرِ اقبال

قرآن آیا اس چشمۂ رشد و ہدایت سے دلوں کی کھیتیاں سیراب اور شجرِ انسانیت اس مصفا و منزہ پانی سے سرسبز و شاداب ہوا۔ زندگی کی کونپلیں پھوٹیں اور برگ و ثمر پیدا ہوئے۔ اس آبِ حیات سے نخلِ انسانیت کی مرجھائی ہوئی شاخوں اور کملائے ہوئے پھولوں میں تر و تازگی آگئی۔

اسلام کی ندی پورے آب و تاب سے بہتی رہی اور قلوب و اذہان کو نمِ حیات بخشتی کشتِ انسانیت کو ہری بھری کرتی چلی گئی۔ اس جوئے حیات کی روانی نہایت تیز۔ گذرگاہ سیدھی اور راستہ واضح تھا۔ یہ جانب منزل بلا روک ٹوک رواں دواں تھی۔ اس کا حیات بخش پانی نخلِ آدمیت کے رگ و ریشے میں زندگی دوڑا رہا تھا۔

قرآن نے ان تمام زنجیروں کو جو ہامانیت و برہمنیت۔ ملائیت و خانقاہیت کی صورت میں انسانیت کو جکڑے ہوئے تھیں ایک ایک کر کے کاٹ دیا۔ یہ وہ مرگ آور زنجیریں تھیں جو انسان کو حیوان کی سطح سے بلند ہونے ہی نہیں دیتیں اور انسانیت کا گلا گھونٹ کر رکھ دیتی ہیں۔

قارونیت (سرمایہ داری) کی خون آشام زنجیر بھی جو جسدِ انسانیت کے خون کا آخری قطرہ چوس لیتی ہے۔ عہدِ انسانیت کا یہ زریں دور تھا جس میں انسان نے انسان کی غلامی سے نجات حاصل کی۔ آدم گری کا یہ عہد درخشاں تھا جس میں کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا غلام رہنا گوارا نہ کرتا تھا۔

یہ آبِ زلال نخلِ انسانیت کی سیرابی و برومندی کے کام آ رہا تھا کہ کچھ عرصہ بعد مفاد پرستیوں اور جاہ طلبیوں کی کثافت و غلاظت نے اس جوئے رواں کو گدلا کر دیا۔ عجمی سازش کے کوڑا کرکٹ سے یہ چشمۂ حیات اس قدر کثیف و غلیظ بنا دیا گیا کہ یہ

اندازہ کرنا مشکل ہوگیا کہ یہ وہی آبِ حیات ہے جو کبھی دلوں کے ویرانے آباد کرنے کے کام آیا تھا۔ زمانہ گزرتا گیا اس کثیف و حیات کُش پانی کو جس میں عجمی تصورات اور غیر اسلامی تخیلات کی پوری پوری آمیزش کر دی گئی تھی عقلِ چالاک نے آبِ زلال کہنا شروع کر دیا۔ اسلام کے صاف و شفاف حیات آفریں چشمہ کا تصور تک ذہنوں سے محو کر دیا گیا۔ مفاد پرستوں کی بن آئی۔ وہ اپنی کامیاب سازش پر خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے۔ قیصر و کسریٰ کے تخت گرانے اور تاج اُچھالنے والے ظلم و استبداد کے مرکزوں کو ختم کرکے انسانوں کو بلا امتیاز رنگ و خوں حسب نسب ایک صف میں کھڑے کرنے والے ملوکیت کے کل کے دشمن آج خود تختِ ملوکیت پر بیٹھ گئے۔ عقلِ سرکش اور علمِ بے باک نے اسے عین اسلام قرار دیا۔

**ملوکیت** یاد رکھیے ملوکیت تنہا کبھی کامیاب نہیں ہوتی یہ اپنی تائید میں پیشوائیت (PRIESTHOOD) اور غاصبانہ مفاد پرستی (CAPITALISM) کو اپنے ساتھ لاتی ہے۔ دنیا کا کوئی فرعون ہامان اور قارون کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ ظاہر ہے ان ابلیسی قوتوں کے راستہ میں سب سے بڑی رکاوٹ قرآن عزیز ہی تھا۔ اس لئے مفاد پرست قوتوں کو اپنی کامیابی کے لئے اس کو راہ سے ہٹانا ضروری تھا۔ چنانچہ ایک ہزار سال کی کوشش پیہم اور سعیٔ مسلسل سے منافقین اسلام نے قرآن کے مفہوم و معنی کو عجمی تصورات میں بدل دیا۔ یہ غیر اسلامی تخیلات عین اسلام اور قرآنی تعلیم یکسر غیر اسلامی بن گئی۔ مسلمان عالمگیر مایوسیوں کے سیلاب میں بہہ ہی چلا تھا۔ کہ قدرت نے ان میں اقبالؒ ایسے قرآن شناس کو پیدا کر دیا۔ جن کی نگہِ باطل سوز عجمی تصورات کے دبیز پردوں کو چیرتی ہوئی اس مقامِ بلند تک جا پہنچی جہاں سے قرآن اپنی اصلی شکل میں دنیا کے پاس آیا تھا۔ مایوسیوں کے ان گھٹا ٹوپ اندھیروں اور مفاد و جہالت کی ظلمت انگیز طغیانیوں میں روشنی کی اس کرن نے متلاشیانِ حق کے دلوں میں اُمیدوں کے چراغ روشن کر دئے۔ اقبالؒ نے عمل تقطیر (FILTRATION) سے اس کثیف و غلیظ پانی کو نتھار کر فضلا (RESIDUE) الگ اور صاف و شفاف مقطر (FILTRATE) الگ کرنے کے لیے اپنی خداداد صلاحیت و استعداد

سے کام لیا۔ حکیم الامت ؒ نے اسلام کے مستقبل سے مایوس مسلمان کو رجعت الی القرآن کی دعوت دی۔ اس نامساعد دور اور ناموافق حالات میں یوں تو بہت سی سعید روحوں نے قوم کی زبوں حالی اور عجم کی عیارانہ سازش پر خون کے آنسو بہائے لیکن مسلمان کے من کی دنیا بدلنے میں اقبالؒ کی آہِ نیم شبی اور نالۂ شب گیر نے جتنا کام کیا کسی اور سے نہ ہو سکا۔ اس لحاظ سے اس غمگسارِ ملت کا مرتبہ و مقام سب سے ممتاز و بلند نظر آتا ہے۔ ہمارا یہ دعویٰ نہیں کہ علامہؒ قرآن فہمی میں حرفِ آخر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن اس حقیقت سے کسے مجالِ انکار ہے۔ کہ حکیم الامت حضرتِ اقبالؒ وہ پہلے حکیم دانا ہیں جنہوں نے عملِ تقطیر سے اس آپ کثیف کو پھر سے مقطر کیا۔ عجمی سازش کی ملاوٹ نے جس کا رنگ بدل دیا تھا۔ اقبالؒ وہ پہلے پیامبر ہیں۔ جنہوں نے حضورِ اکرمؐ اور خلفائے راشدین کے درخشاں و تابناک دور کے بعد اسلام کو دین (نظامِ حیات) کی صورت میں پیش کیا اور ہندی مسلمان کو یہ احساس دلایا کہ دین کے نفاذ کے لئے اسٹیٹ کا ہونا ازبسکہ ضروری ہے۔ اقبالؒ ہی وہ دین شناس ہیں جنہوں نے قومیت و وطنیت کے غیر اسلامی تصور کا نہایت جرأت و وضاحت سے ابطال کیا۔ یہ آسمان کے ستاروں کی طرح روشن حقیقت ہے کہ اقبالؒ اسلام کے پہلے مفکر ہیں جنہوں نے ملوکیت، جمہوریت، اشتراکیت اور سرمایہ داری کے رخ سے اس مقدس نقاب کو سرکایا جسے اوڑھ کر یہ انسانوں کے ذریعے انسانیت کا شکار کیا کرتی ہیں۔

اقبالؒ آدم کی بے بصری کے متعلق فرماتے ہیں:—

آدم از بے بصری بندگیٔ آدم کرد
گوہرے داشت ولے نذرِ قباد و جم کرد
یعنی از خوئے غلامی زسگاں خوارتر است
من ندیدیم کہ سگے پیشِ سگے سر خم کرد

اس دور میں اکثر مذہب کے ہاں عصری تقاضوں کا حل نہ پانے والے مایوس ہو کر ایران کی شریعتِ جدیدہ اور پنجاب کی نبوتِ فرنگ آفریدہ کے

حلقۂ سحر میں اسیر ہو گئے۔ عین اسی طرح اس مایوسی سے غیر شعوری طور پر ایسا عنصر قومیت پرستی (نیشنلزم) کے آغوش میں چلا گیا۔ ابوالکلام آزاد اور مولوی حسین احمد مدنی اس حقیقت کی مثالیں ہیں۔

اقبالؒ نے ایمان وایقان کی بے پناہ قوتوں کے ساتھ اس حقیقت کو واشگاف کیا کہ مسلمان آجکل جسے دین سمجھ کر اس پر عمل پیرا ہے یہ اسلام نہیں ہے۔ یہ عجم کے وہ غیر اسلامی تصورات ہیں جنہوں نے دین کا مقدس نقاب اوڑھ رکھا ہے قرآن کا عطا کردہ دستورِ حیات مایوسی کا دشمن اور زندگی کا پیامبر ہے۔ قرآن زندگی کے حقائق سے چشم پوشی کی تلقین نہیں کرتا بلکہ ہر دور کے مسائلِ حیات کا حل اپنے اندر تلاش کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ جہاں مذہب چند موہوم تصورات پیش کر کے ذہنی اطمینان کا فریب دیتا ہے۔ وہاں دین مستقل اقدار سامنے لا کر زندگی کے نئے ٹھوس بنیادوں پر زندہ انسانوں کے لئے اسلامی معاشرہ تشکیل کرنے کا حکم دیتا ہے۔

قرآنِ عزیز وہ نورِ حیات اور حضور اقدس و اعظمؐ ہی وہ شمع جہاں تاب ہیں اقبالؒ جن سے اکتساب نور کر کے اپنا نورِ بصیرت عام کرنے کے لئے تمنا و آرزو کرتے رہے۔ اقبالؒ دنیائے انسانیت کو بے امتیاز رنگ و خون ایک ضابطۂ حیات (قرآن عزیز) کے پابند دیکھنے کے متمنی تھے۔ فرماتے ہیں:۔

حرفِ اِنّی جاعِلٌ تقدیرِ او — از زمین تا آسمان تفسیرِ او
از وجودش اعتبارِ ممکنات — اعتدالِ او عیارِ ممکنات
من چہ گویم از یمِ بے ساحلش — غرق اعصار و دہور اندر دلش
آنچہ در آدم بگنجد عالم است — آنچہ در عالم نگنجد آدم است
آشکارا مہر و مہ از جلوتش — نیست رہ جبریل را در خلوتش
برتر از گردوں مقامِ آدم است — اصلِ تہذیب احترامِ آدم است

اقبالؒ اسرارِ حیات فاش کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ مسلمان آج پژمردگی و افسردگی ۔ بیکسی اور بے بسی ۔ محکومی اور نا اُمیدی ۔ تقلید و جمود اور بے حسی و بے عملی کا شکار صرف اس لئے ہے کہ ـــــ عمل سے فارغ ہوا مسلمان بنا کے تقدیر

کا بہانہ ـــــ دین جو کہ مسلمان کی پُوری زندگی پر محیط ہے اسے محض پُوجا و پرستش کا مذہب بنا کر انفرادی نجات کا تصوّر قائم کر کے اسلام کے حیات بخش زرّیں اُصولوں سے انحراف کیا گیا۔ وحدتِ ملّت کا تصوّر ختم کر کے فرقے بنا لیئے گئے۔ پیرِ حرم ان کو رسم و راہ خانقہی سکھلاتا رہا۔ اور ذکر و فکر صبحگاہی کی محافل برپا کرنے ہی کو دین بتاتا رہا۔ ملّانے کافر گری کا پیشہ اختیار کیا۔ بحث و مناظرے کے بازار گرم ہوئے بقول مولانا حالی :۔

جو تفرقے اقوام کے آیا تھا مٹانے
اس دین میں بھائی سے اب بھائی جُدا ہے

جو دین جمعیّتِ اقوام کے بجائے جمعیّتِ آدم کا پیام لے کر آیا تھا۔ اس میں تفرقہ انگیزی عین اسلام قرار پائی۔ اقبالؒ چونکہ دین کو زماں و مکاں کی حدُود و قیود میں مقیّد تسلیم نہیں کرتے۔ ایک طرف جہاں وہ مشرق کو جمود و تقلید کی گمراہی میں مبتلا دیکھ کر اس کے نوجوانوں کی پریشاں نظری کا دارو تلاش کرنے کے لیئے پیرِ حرم کو رسم و راہ خانقہی چھوڑنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ وہاں دوسری طرف مغرب کی بے باک قوتوں اور بے ضبط طاقتوں کی ان آتش ناکیوں اور شعلہ افشانیوں کے خلاف بھی صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں۔ جن سے خرمنِ انسانیت جل کر راکھ ہوتا نظر آتا ہے۔ وہ مشرق و مغرب۔ چین و عرب۔ ایران و عراق۔ فلسطین و شام (وطنیت) کو جغرافیا کی لکیریں قرار دیتے ہیں۔ جنہیں انسانوں نے اپنے ہاتھوں سے کھینچ کر نسل و وطن کے غیر قرآنی امتیازات کی بنا پر بے رنگِ انسانیت کو تقسیم کر رکھا ہے۔ اقبالؒ اس سراسر غیر اسلامی تصوّرِ زندگی کو ختم کر کے الارض للہ کا قرآنی تصوّر اور الحکم للہ کا عدل پرور اور انسانیت ساز پہلو سامنے لاتے ہیں۔ حکیم الامتؒ کو نہ مشرق کے موجودہ انداز پسند ہیں نہ مغرب کے اسلوب۔ وہ مشرق و مغرب دونوں پر سخت تنقید کرتے ہیں۔ وہ دونوں کو گم کردہ راہِ حیات سمجھ کر برملا کہتے ہیں :۔

مغرب ز تو بیگانہ مشرق ہمہ افسانہ
وقت است کہ در عالم نقشِ دگر انگیزی

وُہ قصرِ انسانیت کے در و دیوار پر زندگی کے قرآنی نقوش و خطوط اُبھارنا اور اسی اُصولِ حیات کی گُلکاریوں سے اسے مزیّن دیکھنا۔ اور اسی کے بیل بوٹوں سے انسان کی روشِ زندگی کو سجانا چاہتے تھے۔ وُہ کاروانِ انسانیت کو ایک اشارہ۔ ایک حکم اور ایک امیر کارواں کی اطاعت۔ ایک قانون کی پابندی سے ایک مقصد۔ ایک نصب العین۔ ایک پروگرامِ حیات کے تحت منزلِ حیات کی طرف بڑھتا دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ شدّت سے محسوس کرتے تھے کہ ہوس نے نوعِ انساں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے۔ آدمی کی بطور آدمی۔ انساں کی انسان کی حیثیت میں کوئی تعظیم اور قدر و منزلت کہیں باقی نہیں رہی۔ اور عزّت و ذلّت شوکت و عظمت کا معیار اگر کہیں دولت و ثروت ہے تو کہیں رنگ و نسل۔ کہیں ملک و قوم کے ٹائیٹل سے پہچانا جاتا ہے۔ تو کہیں حسب و نسب وجۂ فخر و ناز ہیں۔ دُنیا میں انسان کی اضافی نسبتیں رہ گئی ہیں۔ اس کے ذاتی جوہر کی قدر اور ذاتی حیثیت کہیں نہیں رہی۔ حالانکہ آفاق و انفس کے خالق نے ولقد کرمنا بنی اٰدم کہہ کر ان تمام امتیازات کی نفی کر دی ہوئی ہے اور کھلے الفاظ میں کہہ دیا گیا ہے کہ آدم بہ حیثیت آدم باعثِ عزّ و شرف اور واجب التکریم ہے۔

متحدّہ ہندوستان میں تقلیدِ مغرب کی وجہ سے جب نظریۂ وطنیت فیشن بن چکا تھا۔ اور مہذّب انساں کہلانے کے لئے نیشنلسٹ ہونا عین ضروری سمجھا جاتا تھا اقبالؒ نے مسلمانوں کو جھنجھوڑ کر اس فتنۂ عصرِ حاضر سے خبردار کیا فرماتے ہیں:۔

۵ اپنی ملّت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسُولِؐ ہاشمی
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری
دامنِ دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں
اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملّت بھی گئی

اس لئے کہ:۔

"نرالا سارے جہاں سے اس کو عرب کے معمار نے بنایا"

علامہؒ کے نزدیک دین سے مراد وہ ضابطۂ حیات (قرآن عزیز) ہے۔ جو رب العالمین نے رحمۃ للعالمینؐ کے ذریعہ سے نوعِ انسان کو عطا کیا۔ یہی وہ نسخۂ کیمیا ہے۔ جس سے بیمار و ناتواں انسانیت شفا حاصل کر سکتی ہے۔ اسی سے رنگ و نسل اور وطن و خون۔ حسب و نسب ایسی آدم کُش بیماریوں کا علاج کیا جا سکتا ہے۔ حکیم الامت سازِ قرآن سے عمر بھر حیات افروز نغمے سنتے اور تقلید و ظن کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے مسلمان کو آزاد کرانے کے لیے انہی نغمات کو حجازی لَے میں سناتے رہے۔ اور اس پر اظہارِ افسوس بھی کرتے رہے کہ ہمارے ہاں جرأت اندیشہ نہیں ضربِ کلیم میں اجتہاد کے عنوان سے لکھتے ہیں:۔

حلقۂ شوق میں وہ جرأت اندیشہ کہاں
آہ! محکومی و تقلید و زوالِ تحقیق!
خود بدلتے نہیں قرآن کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق!

حکیم الامتؒ شیخانِ حرم سے نا امید تھے لیکن ملت سے مایوس نہیں تھے۔ انہیں یقین تھا کہ جب جوانانِ ملت قرآن میں غوطہ زن ہونگے گوہرِ حیات حاصل کرلیں گے۔ آیندہ اوراق میں اقبالؒ اور قرآنِ کریم کے عنوان سے یہ ثابت کیا جائے گا کہ اقبالؒ کے فکر کا ماخذ قرآن ہے۔

## اقبالؒ اور قرآنِ کریم

کسی مفکر کی فکر اور کسی پیغام وَر کے پیغام کو حقیقی طور پر سمجھنے کے لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ پہلے یہ معلوم کیا جائے کہ اس کے فکر کا سرچشمہ کیا ہے۔ جب تک اس کے فکر کی اصل کے متعلق پوری طرح واقفیت نہیں ہوگی اس وقت تک اُس کے پیغام کو سمجھنا آسان نہ ہوگا۔ آیئے ہم علامہ اقبالؒ کی فکر کے ماخذ کا پتہ لگائیں تاکہ ہم ان کے خیالات و نظریات احساسات و رجحانات کو جلدی سمجھ سکیں۔ جو لوگ اقبالؒ کی فکر کا ماخذ کانٹ۔ نٹشے اور برگساں کے فلسفہ کو قرار دیتے

ہیں۔ درحقیقت انہیں اقبالؒ سے آگہی حاصل نہیں ہے۔ علامہؒ کے فلسفہ کا سرچشمہ علمِ الٰہی اور ان کے فلسفہ کی بنیاد محض عقلِ انسانی ہے۔ وہ لوگ ظن و تقلید۔ قیاس و خیال کی وادیوں میں سرگرداں اور بھٹکتے نظر آتے ہیں۔ اقبال سفرِ حیات کے لیے وحی کی روشنی کو لازمی قرار دیتے ہیں۔ جیسا کہ

گر تو می خواہی مسلمان زیستن
نیست ممکن جز بقرآن زیستن

جو کوئی بھی یہ کہتا ہے کہ اقبالؒ کی فکر مغربی فلاسفرز کی رہینِ منت ہے۔ تو یہ محض اس کی اپنی قیاس آرائی ہے۔ اقبال کا فکر نہ نطشے کے فلسفہ کا آئینہ دار ہے۔ نہ ہی برگساں اور کانٹ کا دریوزہ گر۔ ان کے فکر کی اساس ایک محکم اور مستقل حقیقت پر ہے۔ ان کے تصوّرات و نظریات نہ مشرق کے مرہونِ احساں ہیں اور نہ مغرب کے قیاسات و مزعومات سے ملوث۔ اس قسم کی خیال آرائیاں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ :۔

فکر ہر کس بقدرِ ہمت اوست

اقبالؒ نے غیر مبہم۔ واضح اور کھلے الفاظ میں بیان کر دیا۔ کہ ان کے فکر کی اصل کتابِ زندہ قرآنِ حکیم ہے۔ اس کے بعد کسی ظن و تخمین اور قیاس و گماں کی گنجائش نہیں رہتی۔ اقبالؒ کے افکار و تصورات پر گہری نظر ڈالی جائے۔ تو صاف واضح ہو جاتا ہے کہ ان کے پیغام کا ماخذ کیا ہے اور وہ کن حقایق سے متاثر ہیں۔ اس میں کلام نہیں کہ اقبالؒ نے مشرق و مغرب کے علومِ قدیم و جدید کا بدقتِ نظر مطالعہ کیا ہے۔ اور یہ بھی درست ہے کہ آپ نے مغربی مفکرین کے تصورات و افکار کو پوری طرح سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن اس سے یہ مطلب اخذ نہیں کیا جا سکتا کہ ان کے افکار و تصورات کی بنیاد ان مفکرین کے نظریات و خیالات کو قرار دیا جائے۔ آپ نے علومِ تازہ کی سرمستیوں کو گناہ نہیں کہا۔ لیکن آپ طلسمِ عصرِ حاضر کے پھندے میں گرفتار بھی نہیں ہوئے۔ بلکہ آپ نے اس علم و حکمت کو جس کی اساس محض عقل و دانش پر رکھی گئی ہے۔ آتشِ نمرود قرار دیا ہے۔ جس کے دہکتے انگاروں سے انسانیت کا دل و دماغ جل رہا ہے۔

علومِ جدیدہ تو رہے ایک طرف علومِ قدیمہ کے متعلق بھی آپ کا مسلک یہی تھا۔ وہ حیات سوز نظریات اور غلط تصورات خواہ انہیں مشرقی فلسفہ کہہ کر سامنے لایا جائے یا مغربی نظریہ کہہ کر پیش کیا جائے۔ جن سے دنیائے انسانیت جہنم کدہ بن رہی ہے۔ علامہؒ دونوں سے نالاں و بیزار تھے۔ چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں:۔

نہ فلسفی سے نہ ملّا سے ہے غرض مجھ کو

یہ دل کی موت وہ اندیشہ و نظر کا فساد

اس میں کسی ظن و قیاس یا تعبیر و تاویل کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ اقبالؒ نے اپنے فکر کے محور و مرکز اور اساس و اصل کے متعلق جگہ جگہ فرمایا ہے۔ کہ ان کے فکر کا ماخذ قرآن حکیم ہے۔ آئینِ حیات کے متعلق بتاتے ہیں:۔

توہمی دانی کہ آئینِ تو چیست

زیرِ گردوں سرِ تمکینِ تو چیست

آں کتابِ زندہ قرآنِ حکیم

حکمتِ او لایزال است و قدیم

نظریۂ پاکستان کی تشریح ملاحظہ فرمایئے:۔

نوعِ انساں را پیامِ آخریں

حاملِ او رحمۃ للعالمینؐ

ایمان و ایقان کی سرمدی کیفیت کا اندازہ کیجئے:۔

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است

ایں کتابے نیست چیزے دیگر است

ختم المرسلینی کے مفہوم کی وضاحت اس سے بہتر کون کر سکتا ہے:۔

صد جہانِ تازہ در آیاتِ اوست

عصرہا پیچیدہ در آناتِ اوست

بندۂ مومن ز آیاتِ خدا است

ہر جہاں اندر برِ او چوں قبا است

چوں کہن گردد جہانے در برش

می دہد قرآں جہانے دیگرش

علامہؒ کی کسی کتاب کو اُٹھا کر دیکھ لیجئے۔ آپ قرآنی آیات کی تشریح و مفہوم اور وضاحت پائیں گے۔ اور جگہ جگہ، صفحہ بہ صفحہ قرآنی تلمیحات اور اشارات ملیں گے اس کھلی حقیقت کے بعد یہ اصرار کہ اقبالؒ کا فلسفہ مغربی فلاسفرز سے متأثر ہے۔ کچھ عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔ آپکے فکر کی بنیاد قرآنِ عظیم کے محکم اُصولوں پر ہے۔ جو لاریب مکمّل و اکمل اور شک و شبہ سے بالا تر ہیں۔ اقبالؒ کے نزدیک اگر یورپ آوارہ نظر اور پریشان نگاہ ہے تو ہمارے ہاں کے ارباب شریعت و طریقت کا مذہب اسلام کے عجمی تصوّرات کا ایڈیشن ہے جس پر صرف ڈسٹ کور (DUST COVER) قرآن کا ہے۔

اقبالؒ ببانگ دہل اس حقیقت کا اعلان فرماتے ہیں کہ شجرِ انسانیت سے جب تک ہامانیت (مذہبی پیشوائیت) قارونیت (سرمایہ داری) اور فرعونیت (استبدادی قوت) کی اکاس بیل کو الگ نہیں کیا جائے گا یہ درخت کبھی شگفتہ و شاداب نہیں ہوگا۔ جب تک ان کا وجود باقی ہے۔ ملوکیت کے رہزنوں کو یہ موقعہ ملتا رہے گا۔ کہ یہ زندگی کے ہر موڑ پر قافلہ انسانیت کو لوٹ کر اپنی مفاد پرستیوں اور ہوس رانیوں کو برقرار رکھیں۔ فرماتے ہیں:۔

خلقِ خدا کی گھات میں رند و فقیہ و میر و پیر
تیرے جہاں میں ہے وہی گردشِ صبح و شام ابھی
تیرے امیر مال مست تیرے فقیر حال مست
بندہ ہے کوچہ گرد ابھی خواجہ بلند بام ابھی

علامہؒ نے پورے وثوق سے کہا کہ مسلمان جب تک قرآن میں غور و تدبّر نہیں کرے گا۔ شجرِ ملّت کی ہر شاخ زندگی کی تر و تازگی سے محروم رہے گی۔ اس مفکرِ اسلام نے اگر کہیں کہیں مغربی مفکّرین کے خیالات کی ہمنوائی کی ہے۔ تو اخذ و اکتساب اور اثر پذیری کی وجہ سے نہیں۔ یہ ہوتا چلا آیا ہے۔ کہ مفکّرین کے خیالات و افکار میں کئی پہلوؤں سے ہم آہنگی و یک رنگی نظر آتی ہے۔ ارباب علم و دانش شروع سے دُوسرے کے خیالات و نظریات کو اپنے خاص نکتہ نظر سے استعمال کرتے چلے آئے ہیں۔ لہٰذا اگر اقبالؒ نے بھی ایسا کیا ہے تو اس سے یہ نتیجہ اخذ نہیں کیا جا

سکتا کہ ان کے فکر کا ماخذ ان مفکرین کے نظریات و میلانات تھے۔ اقبالؒ کے نزدیک سرچشمہ ہدایت وہی ضابطۂ حیات ہے جو محسنِ انسانیت سرورِ کائنات حضرت محمد رسول اللہ صلعم کی وساطت سے پیامِ آخریں کی حیثیت میں خالق ارض وسما جن وانس کی بارگاہ عالیہ سے انسانیت کو ملا۔ یہی وہ شمع فروزاں ہے جو ازل سے روشن ہے۔ اور ابد تک قافلۂ انسانیت کی رہبری و رہنمائی کے لئے پوری درخشانی و تابناکی سے جلوہ طرازیاں کرتی رہے گی۔ چونکہ اس کتاب کا مقصد نظریۂ پاکستان کی وضاحت ہے۔ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آیندہ باب میں ملوکیت۔ جمہوریت۔ اشتراکیت۔ پیشوائیت و ملائیت وغیرہ کے متعلق اقبالؒ کے نظریات کا اجمالی ساخاکہ پیش کر دیا جائے اور اگلے صفحات میں قرآنِ عزیز کی مستقل اقدار کو اس انداز میں پیش کیا جائے جو ان کا حقیقی مفہوم واضح کر دیں۔ اور یہ بھی ثابت کریں۔ کہ جبکہ مغربی خیالات و نظریات اور ان نظامہائے حیات کی چکاچوند نے کئی اسلام شناسی کے دعویداروں کی نظر کو خیرہ کر دیا۔ اقبالؒ انہیں انسانی مصائب کے درد کا درماں اور انسانی مسائل حیات کا حل کیوں قرار نہیں دیتے؟

---

## تیسرا باب

# فرعونیت ــــ قارونیت ــــ ہامانیت

انسان مدنی الطبع واقع ہوا ہے۔ اس میں مل جل کر رہنے کا جذبہ بدرجہ اتم پایا جاتا ہے۔ ابتدا میں اسی جذبے نے شعوب و قبائل کو شکل دی۔ انسانوں کے ان طبقوں۔گروہوں میں مفادات کا ٹکراؤ شروع ہو گیا۔ وہی قوت جو پہلے قبیلہ کے سردار کی حیثیت میں سامنے آئی تھی۔ اس نے بادشاہت کا لبادہ اوڑھ لیا۔ طاقتوروں نے رزق کے سرچشموں پر قبضہ کر لیا کمزور و ناتواں انسان اس طرح محتاجِ ملوک بن گئے عقلِ آذر پیشہ نے بادشاہ کے لیے عظمت و برتری کے بُت تراش دیئے۔ اس کی ملوکانہ صفات کو اس درجہ مقدس اور بادشاہ کو تنقید و احتساب سے اس قدر بالا بنا دیا گیا کہ اس کے خلاف لب کشائی کو جرم عظیم قرار دیا گیا۔ حتّٰی کہ اس تصور کو عام کیا گیا کہ شہنشاہ خدا کا نمایندہ ہے۔ اس کے اندازِ ملوکانہ کی مخالفت خدا کی مخالفت ہے۔ اس طرح نسلاً بعد نسلٍ آدم بندگیٔ آدم کرتا رہا۔ قرآن نے اس استبدادی قوت کے نمایندے کو فرعون کہہ کر پکارا ہے۔ اور واضح طور پر بتلایا ہے۔ کہ فرعونیت کبھی اکیلی نہیں ہوتی ملوکیت اور آمریت کا سہارا ہامانیت اور قارونیت بنتی ہے مفاد پرستی کی یہ قوتیں ایک دوسری کی مدد اور تحفظ کرتی ہیں۔ اقبالؒ کے فکرِ حکیمانہ نے جور و ظلم اور جبر و استبداد کی ان طاقتوں کو ابلیسی قوت کہہ کر نشاندہی کی ہے۔ علامہ اس خیالِ عظیم کی وضاحت مختلف موقعوں پر مختلف انداز سے کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہی فتنہ زا۔ فتنہ ربا قوت کہیں فسونِ قیصری تو کہیں طلسم کسرٰی ہے۔ امامانِ سیاست نے اسی مشکِ افیون آمیز کو عصرِ حاضر میں جمہوریت اور ڈکٹیٹرشپ کی شکل میں پیش کیا ہے۔ علامہ انسانوں پر انسانوں کی حکمرانی کے اس جذبہ کو جو رسلطانی اور ستم خواجگی کہتے ہیں۔ آپ دیانتداری سے یہ سمجھتے ہیں کہ شاہی کو جمہوری لباس پہنا کر انسانیت

کو فریب دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ جمہوریت کے علمبردار رہبُودِ دیگراں کا نعرہ لگا کر اپنے مفادات محفوظ کرتے ہیں۔ اقبالؒ کے نزدیک یہ ارباب سیاست جمہور کے وہ ابلیس ہیں جو سلطانی و قیصری۔ زاری و سکندری کے بُتانِ عہدِ عتیق کو آدمیت کے حریمِ قلب میں سجانا چاہتے ہیں تاکہ مفاد پرستوں کا یہ گروہ سادہ لوح عوام کو اپنے مذموم مقاصد کے لئے استعمال کر سکے۔ اقبالؒ ان اسرار ملوکیت کو فاش کرتے ہوئے فرماتے ہیں :-

پُرانی سیاست گری خوار ہے
زمیں میر و سلطان سے بیزار ہے

اقبالؒ کی فکرِ فلک پیما نے شیاطینِ ملوکیت کی اس فریب آمیز اور انسانیت سوز چال کو بھانپ کر کہ ابلیسِ سیاست اب پھر فرزندِ آدم کو آستانِ قیصرو کسریٰ پر جھکانے کی تراکیب سوچ رہا ہے اور اس کی عقلِ چالاک انہی کُہنہ لاتُ مناتُ کو قلبِ انسانی میں نصب کرنا چاہتی ہے کہا :-

"تازہ پھر دانشِ حاضر نے کیا سحرِ قدیم
گذر اس عہد میں ممکن نہیں بے چوبِ کلیم

وہ اربابِ سیاست اور مذہبی پیشوائیت کی اس فتنہ گری کے باوجود محسوس کر رہے تھے کہ کُرّہ ارض کی تقدیر بدلنے والی ہے۔ فرماتے ہیں :-

اُلٹ جائیں گی تدبیریں بدل جائیں گی تقدیریں
حقیقت ہے نہیں میرے تخیّل کی یہ خلّاقی!

علّامہ یورپ اور اس کی چشمِ تہذیب کی نابصیری اور معصومانِ یورپ کے مزاج کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ وہ اس کے جمہوری نظام کے دلکش اور دلفریب نعروں سے بھی ناواقف نہ تھے۔ ان کا جذبِ کلیمانہ یورپ کے اس سودائے خام کو قرآن کی کسوٹی پر کستا ہے۔ یہ نواطراز حکیمانِ فرنگ کے طلسمِ فریب آمیز کو یوں بے نقاب کرتے ہیں :-

| | |
|---|---|
| اُمتّے بر اُمتّے دیگر چرد | دانہ ایں می کارد آں حاصل برد |
| از ضعیفاں ناں ربودن حکمت است | از تنِ شاں جاں ربودن حکمت است |

شیوۂ تہذیبِ نو آدم دری است　　　پردۂ آدم دری سوداگری است

اقبالؒ کی آہِ شرر ریز ظلم و استبداد کی تمام قوتوں کو جل کر راکھ ہوتے دیکھنا چاہتی ہے۔ ان کا دل فطرت شناس آدم کو رسومِ کہن کے سلاسل سے آزاد دیکھنے کا متمنّی ہے۔ ساحرِ افرنگ کے قصرِ جور و ستم کی بنیادیں تھرتھراتی اور لڑھکاتی دیکھ کر حکیم نکتہ پرداز یوں گویا ہوتے ہیں :۔

نشانِ جادہ ہُوں منزل نہیں ہیں

اَور

مری تقدیر ہے خاشاک سوزی
فقط بجلی ہُوں میں ، حاصل نہیں مَیں

ملوکیت و جمہوریت۔ آمریت و شہنشاہیت کو انسانی غلامی کا نشان قرار دیتے ہوئے اس طلسمِ ابلیسیت پر یُوں برقِ تپاں بن کر گرتے ہیں۔ اور اس سودائے سَری سے اظہارِ بیزاری کرتے ہیں :۔

فطرت کو گوارا نہیں سلطانیٔ جاوید
ہر چند کہ یہ شعبدہ بازی ہے دِل آویز

جیسا کہ ابتداً عرض کیا گیا ہے فرعونیت۔ ہامانیت اور قارونیت کے سہاروں کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ اصل میں ملوکیت۔ آمریت۔ جمہوریت وغیرہ ایک ہی سکّہ کے مختلف رُخ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن فرعون کے ساتھ قارون و ہامان کا بھی ذکر کرتا ہے۔ ان میں سے قارون سرمایہ داری کا نمایندہ ہے۔ اَور ہامان مذہبی پیشوائیت کا۔

اقبالؒ ہامانیت کے متعلق کہتے ہیں :۔

ہو اگر قوتِ فرعون کی دَرپردہ مُرید!
قوم کے حق میں ہے لعنت وہ کلیم اللّٰہی

قارونیت کے بارے میں :۔

رازدانِ جزو و کل از خویش نامحرم شد است
آدم از سرمایہ داری قاتلِ آدم شد است

جلالِ پادشاہی ہو یا جمہوری تماشا علامہؒ اسے پردۂ تہذیب میں غارتگری اور آدم کشی قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک ظلمِ سلطانی اور ستمِ خواجگی کے بہت سے نام ہیں۔ وہ اس رازِ ملوکانہ سے واقف تھے کہ مجبور ولاچار بے کس و بے بس انسانوں کو غلام بنانے کے لیے عقلِ سفّاک کی یہ حیلہ طرازیاں ہیں کہ چالاک و ہوشیار مکّار و دغاباز انسانی قوت انسانوں کو محکوم و غلام بنا کر اپنے ذاتی مقاصد کی تکمیل کرتی ہے:۔

خواجہ از خونِ رگِ مزدور سازد لعلِ ناب
از جفائے دہ خدایاں کشتِ دہقاناں خراب

——— اور ———

میر و سلطاں نرد باز و کعبتینِ شان دغل
جانِ محکوماں ز تن بردند و محکوماں بخواب!
انقلاب! اے انقلاب! اے انقلاب!

دُوسرے مقام پر آہ سرد کھینچ کر:۔

خواجہ نانِ بندۂ مزدور خورد
آبروئے دخترِ مزدور برد

علامہؒ کا ولولۂ حق فرعونیت۔ قارونیت اور ہامانیت کی صیدِ زبوں انسانیت کو غلامی کی زنجیروں سے آزاد دیکھنے کے لئے انسان کی رُوحِ خودی کو بیدار کر کے مظلوموں کو قصرِ استبدادیت کی بنیادیں ہلا دینے پر اُکساتا ہے۔

تلقین کا انداز ملاحظہ فرمائیے:۔

انتظارے غمگسارے تا کجا
جستجوئے رازدارے تا کجا

کاہن و پاپا و سلطان و امیر
بہرِ یک نخچیر صد نخچیر گیر

گرمیٔ ہنگامۂ جمہور دید ۔۔۔۔۔ پردہ بر رُوئے ملوکیت کشید

پیشِ فرعوناں بگو حرفِ کلیم
تا کند ضربِ تو دریا را دو نیم

داغم از رسوائی ایں کاروان
در امیرِ او ندیدم نورِ جان
تن پرست و جاہ مست و کم نگہ
اندرونش بے نصیب از لاالٰہ
الحذر از گرمی گفتارِ او
الحذر از حرف پہلو دارِ او

حکیم الامتؒ اسلام کو مکمل ضابطۂ حیات سمجھ کر اس حقیقت پر پورا پورا یقین رکھتے تھے کہ انسانی ذہن کے تراشیدہ نظامہائے حیات کاروانِ انسانیت کو کبھی منزل مراد تک نہیں پہنچا سکتے۔ دین شناسی کا یہی احساس تھا جس نے انہیں مجبور کیا کہ آپ نے دین کے نفاذ کے لئے ایک خطۂ ارض کا مطالبہ کیا۔ اس پُر آشوب دور میں مفسرِ قرآن اور شیخ الحدیث ہونے کے دعویدار مسجد و مندر کے اتحاد میں مسلمان کی نجات مضمر سمجھتے تھے۔ علامہؒ ان کی اس دین ناشناسی پر خون کے آنسو روتے ہوئے اس کفر نواز اسلام کے متعلق یوں اظہار کرتے ہیں:۔

متاعِ شیخ اساطیرِ کہن بود
حدیثِ او ہمہ تخمین و ظن بود
ہنوز اسلامِ او زنار دار است
حرم چوں دیر بود او برہمن بود

اقبالؒ ان کی لادین سیاست اور متحدہ قومیت اور وطنیت پرستی کے ان رجحاناتِ رذیلہ کو دیکھ کر کہ یہ مولوی حضرات کفر و اسلام کی آویزش سے ایک قوم بنانا چاہتے ہیں۔ عالمِ حیرانگی میں کہتے ہیں:۔

چنیں دورِ آسماں کم دیدہ باشد
کہ جبرئیل امیں را دل خراشد
چہ خوش دیرے بنا کردند آنجا
پرستد مومن و کافر تراشد

دین و وطن کے اس معرکۂ عظیم میں "امام الہند" نے قرآن کی گنگا جمنی تفسیر لکھی۔

"اور شیخ الحدیث" نے متحدہ قومیت کے جواز کے لئے تفسیر دین کی۔ ان کی قرآنی تفسیریات اور احادیث کی اس قسم کی تشریحات کو دیکھ کر

زمن بر صوفی و ملّا سلامے
کہ پیغام خدا گفتند مارا
ولے تاویل شاں در حیرت انداخت
خدا و جبرئیل و مصطفےٰ را

میری کتاب[1] تحریک پاکستان اور نیشنلسٹ علمار" میں آپ کو یہ تفصیل مل جائے گی کہ ابوالکلام مرحوم ۱۹۱۲-۱۴ء کے بعد اسلام سے مایوس و بیزار ہو گئے تھے۔ دَورِ الہلال کا ابوالکلام جنہیں ترک کے تلوے میں کانٹے کی چبھن بے چین کر دیتی تھی۔ اور اگر ہندی مسلمان اسے محسوس نہ کرے تو اس کا ایمان باقی نہ رہتا تھا۔ واردھا کے سامری کے طلسم کا شکار ہونے کے بعد انہیں مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے مسلمانوں میں کوئی رشتۂ اُخوّت اور وجۂ اتحاد نظر نہیں آتی تھی۔ یہ معرکۂ دین و وطن کی تاریخ کی زندہ شہادت ہے۔ جس پر انڈیا ونس فریڈم کے صفحہ ۲۲۷ پر خود آزاد نے مہرِ تصدیق ثبت کی ہے۔ ۱۹۲۰-۲۱ء کے لگ بھگ جب ہندوستان کے لیڈر جیل سے رہا ہوئے اور امرت سر میں مندر و مسجد کا اتحاد ہوا۔ علامہؒ نے بانگ درا میں اپنے ظریفانہ کلام میں صفحہ ۳۳۳ پر "امام الہند" پر یوں طنز فرمائی :-

یہ آیۂ نو جیل میں نازل ہوئی مجھ پر
گیتا میں ہے قرآن تو قرآن میں گیتا
مندر سے تو بیزار تھا پہلے ہی سے "بدری"
مسجد سے نکلتا نہیں ضدی ہے "سیتا"

یہ آیۂ نو[2] (نئی آیت) مجھ پر جیل میں نازل ہوئی ہے کہ تمام مذاہب یکساں ہیں۔

---

[1] پوری تفصیل کے لئے "تحریک پاکستان اور نیشنلسٹ علماء" دیکھئے۔

[2] ڈاکٹر باقر صاحب پرنسپل اورینٹل کالج لاہور نے بانگ درا کی تشریح کی ہے جو ملک نذیر احمد پروپرائٹر "تاج بک ڈپو" اردو بازار لاہور نے شائع کی ہے اس میں صفحہ ۱۵۸ پر آپ نے آیۂ نو (نئی آیت) کے بجائے نو جیل لکھ کر ترجمہ تو رایت کیا ہے جو سراسر غلط ہے۔ بانگ درا کی یہ تشریح پہلی بار ۱۹۵۱ء

(بقیہ نوٹ بر صفحہ ۴۲)

اُن میں کوئی تمیز و فرق نہیں - قرآن اور گیتا ایک ہی ہیں - عالمگیر سچائیاں تمام مذاہب میں یکساں ہیں - دین الحق اور کفر - مسجد اور مندر کا اتحاد قرآنی تعلیمات کے سراسر منافی ہے کیونکہ

باطل دوئی پسند ہے حق لا شریک ہے
شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول

علامہؒ نے اس معرکۂ حق و باطل میں دین کی اس ابدی حقیقت کو نہایت واضح طور پر بیان کیا - اس مقام پر مذہبی پیشوائیت کی بے کم نگہی اور کم سوادی کس طرح سامنے آجاتی ہے کہ نیشنلسٹ علماء نے نظامِ دینی کے ارکان کو تو اسی شکل میں رہنے دیا لیکن دین کی غرض و غایت اور مقصود و منتہا کو یکسر بدل دیا - اسے خدا اور بندے کے درمیان پرائیویٹ تعلق قائم کرنے کا ذریعہ بنا دیا گیا - گیان - دھیان - پوجا پاٹ - بھگتی اور پرستش کو اسلام بنا کر مسلمانوں کو کانگریس میں شرکت کی دعوت دی - یہ حقیقت کہ اسلام امتیازِ حق و باطل کو بنیادی حیثیت دیتا ہے اور کفر و اسلام کی آویزش ممکن نہیں گاندھی کو کسی کروٹ چین نہیں لینے دیتی تھی - گاندھی کی خواہش تھی کہ اسلام ایسے زندہ و پائندہ دین کو ہندو مت کے برابر لا کھڑا کیا جائے تاکہ مسلمان متحدہ قومیت کے دامِ فریب میں پھنس سکیں - آپ کوثر سے پھسل کر لبِ گنگا پہنچنے والے ابوالکلام نے واردھا کے سامری کی اس خواہش کی تکمیل کی - آزاد مرحوم نے اپنی گنگا جمنی تفسیر میں یہ ثابت کیا کہ عالمگیر سچائیاں تمام مذاہب میں یکساں ہیں - اسلام جو ایک مکمل دین ہے اور جو نوع انسان کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے آخری ضابطۂ حیات تھا اور مسلمان جس کی قومیت کی اصل و اساس کلمۂ توحید ہے اسے وطن کے اشتراک پر ہندوؤں کے ساتھ ملا کر ایک قوم بنانے کی سازش کی گئی - حبِ وطن کو جزوِ ایمان بنایا گیا - اس طرح عیار ہندو و شاطر نے ہندو اکثریت کے مفاد کے لئے جمہوری

---

(بقیہ نوٹ صفحہ ۶۱) میں تاج بک ڈپو اردو بازار لاہور نے شائع کی - حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ جیل کی رہائی کے بعد جب کانگریسی لیڈروں کا امرتسر میں اجلاس ہوا جس میں مسجد و مندر کا اتحاد ہوا اور ابوالکلام مرحوم نے کھل کر کہنا شروع کیا کہ عالمگیر سچائیاں تمام مذاہب میں یکساں ہیں - اُسی وقت علامہؒ نے طنزاً یہ فرمایا تھا کہ یہ نئی آیت ابوالکلام آزاد پر جیل میں نازل ہوئی ہے کہ تمام مذاہب یکساں ہیں ؂

تحریک چلائی۔ اقبالؒ نے برہمنیت کے سامراجی عزائم کو بھانپ کر مسلمان کو اس خطرۂ عظیم سے آگاہ و خبردار کیا۔

دیوِ استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے کہ آزادی کی ہے نیلم پری

اقبالؒ کے نزدیک جمہوری قبا میں برہمنی سامراجیت کا دیوِ استبداد ناچ رہا تھا۔ آپ نے نظریۂ پاکستان پیش کرتے ہوئے کہا کہ اسلامک آئیڈیالوجی کے مطابق مسلم قومیت کا معیار توحید ہے اشتراکِ وطن نہیں ہے۔ اسلام اپنا الگ نظامِ حیات رکھتا ہے۔ جو مکمل و اکمل قانونِ زندگی ہے۔ مسلمان ایک علیحدہ ملت ہیں۔ ہندوستان میں ہمیں ایک الگ خطۂ ارض چاہیئے۔ جس میں مسلمان اپنا معاشرہ قانونِ خداوندی کے مطابق تشکیل کر سکیں۔ علامہؒ نے یورپ کی نقالی میں جمہوریت کی تحریک چلانے والوں کو یوں بے نقاب کیا اور پوری ذمہ داری سے کہا کہ اسلام کے تصورِ حیات کی رو سے یہ جمہوری تماشا مسلمانانِ ہند کی فلاح و فوز کا ضامن نہیں ہو سکتا۔ آپ جمہوریت اور ملوکیت دونوں کو ابلیسی نظام سمجھتے تھے۔ فرماتے ہیں:۔

از ملوکیت، جہانِ تو خراب — تیرہ شب در آستین آفتاب!
چاره مرگ اندر پئے ایں دیر میر — سود خوار و والی و ملا و پیر

دوسرے مقام پر ابلیس کے پہلے مشیر کی زبان سے کہلواتے ہیں:۔

یہ ہماری سعیِ پیہم کی کرامت ہے کہ آج
صوفی و ملا ملوکیت کے بندے ہیں تمام

**جمہوریت**

جمہوری طرزِ حکومت کے متعلق حکیم الامتؒ کے حقیقت کشا اور بصیرت افروز ارشادات سے یہ صداقت نکھر کر سامنے آجاتی ہے کہ جمہوریت۔ آمریت دونوں میں ایک ہی روح کارفرما ہے۔ ڈکٹیٹر شپ کی صورت میں اگر ایک جابر انسان باقی انسانوں کو غلام بنائے رکھتا ہے تو جمہوریت میں برسرِاقتدار گروہ باقی تمام انسانوں پر حکمرانی کرتا ہے۔ آپ کے نزدیک جمہوریت بھی درحقیقت ملوکیت کا اک پردہ ہے۔ یہ تمام ابلیسانِ عصرِ حاضر کے تراشیدہ نظامِ حکومت ہیں۔ جن میں عقلِ عیار ذی اقتدار اور صاحبِ قوت

لوگوں کے مفادات کا تحفظ کرتی ہے۔ ان کا معیار مستقل اقدار اور غیر متبادل قوانین نہیں۔ جمہوریت میں اگر حق و باطل کا معیار کثرت آرا ہے۔ تو آمریت میں ذاتی منشا و مرضی۔ رفاہِ عامہ۔ مفادِ عامہ اور بہبودِ عامہ، بہبودِ دیگراں۔ فلاحِ عامہ اور بہبودِ ہمہ کے علاوہ مفادِ دیگراں یہ تمام وہ خوشنما الفاظ ہیں۔ جن سے عوام کی آنکھوں میں دھول جھونکی جاتی ہے۔ اقبالؒ جاوید نامہ میں "حکومتِ الہٰی" کے عنوان میں فرماتے ہیں کہ جمہوریت، ملوکیت وغیرہ میں ایک ہی رُوح کارفرما ہے۔

قاہری را شرع و دستورے دہد
بے بصیرت سُرمہ با کورے دہد!
حاصلِ آئین و دستورِ ملوک؟
دہ خدایاں فربہ و دہقاں چو دوک!
وائے بر دستورِ جمہورِ فرنگ
مردہ تر شد مردہ از صورِ فرنگ!

اقبالؒ شاطرانِ جمہوریت کی مفاد بینی، مفاد پرستی کو یوں طشت ازبام کرتے ہیں:۔

شاطراں ایں گنج وَر آں رنج ور
ہر زماں اندر کمین یک دگر
فاش باید گفت سِرِّ دلبراں
ما متاع و ایں ہمہ سوداگراں!

علامہؒ ارمغانِ حجاز میں ابلیس کی مجلسِ مشاورت کے عنوان سے مفاد پرست قوتوں کو بے نقاب کرتے ہیں۔ وہ محسوس کرتے ہیں کہ آدم بے بصری کی وجہ سے بندگیٔ آدم کر رہا ہے۔ اسلام اسے شرفِ انسانیت کے منافی قرار دیتا ہے۔ کہ انسان اپنے ہی ہم جنس کے سامنے سجدہ ریز ہو۔ آپ کے نزدیک جمہوریت و ملوکیت اصل میں وُہی ابلیسی حربے ہیں۔ جن کے ذریعے آدم گری کے لباس میں آدم دری کی جاتی ہے۔ ابلیس کی مجلسِ مشاورت میں دُوسرے مشیر کی زبان سے:۔

خیر ہے سلطانیٔ جمہور کا غوغا کہ شر؟
تو جہاں کے تازہ فتنوں سے نہیں ہے باخبر!

اس کے جواب میں :-

## پہلا مشیر

ہوں، مگر میری جہاں بینی بتاتی ہے مجھے
جو ملوکیت کا اک پردہ ہو کیا اس سے خطر
ہم نے خود شاہی کو پہنایا ہے جمہوری لباس
جب ذرا آدم ہُوا ہے خود شناس و خودنگر
کاروبارِ شہریاری کی حقیقت اور ہے
یہ وجودِ میر و سلطاں، پر نہیں ہے منحصر
تُو نے کیا دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام
چہرہ روشن، اندروں چنگیز سے تاریک تر!

دُوسرے مقام پر علامہ یُوں اظہار کرتے ہیں :-

متاعِ معنیٔ بیگانہ از دوں فطرتاں جوئی؟
ز موراں شوخیٔ طبعِ سلیمانے نمی آید
گریز از طرزِ جمہوری غلامِ پختہ کارے شو
کہ از مغزِ دو صد خر فکرِ انسانے نمی آید

جمہوری طرزِ حکومت :-

اس راز کو اک مردِ فرنگی نے کیا فاش
ہر چند کہ دانا اسے کھولا نہیں کرتے
جمہوریت اک طرزِ حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

اقبالؒ نے کس دردو سوزمندی سے اپنے فکرِ حکیمانہ کی جن بلندیوں سے کاروانِ آدمیت کو نشانِ منزل دکھانے کے لئے زندگی کی حقیقی اقدار کو نکھار کر پیش کیا ہے یہ انہی کا حصہ ہے۔ ان کے حساس قلب نے اس خدشہ کو محسوس کیا کہ اگر قافلۂ انسانیت

کی صحیح رہنمائی نہ کی گئی تو مسافرانِ حیات ظلمتِ شب میں ادھر اُدھر بھٹکتے پھریں گے۔ علم و بصر کی میزان میں ان کے فکرِ رسا کا وزن کیا جائے۔ تو عصرِ حاضر کا کوئی مفکّران کا ہم پلّہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔

جمہوریت کی تعریف یہ ہے۔ کہ "عوام کی حکومت، عوام کے مفاد کی خاطر، عوام ہی کی وساطت سے"۔ اس طرزِ حکومت میں یہی اُصول کارفرما سمجھا جاتا ہے۔ مفکّرینِ مغرب کا خیال ہے کہ انسان مدۃ العمر کے تجارب کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ اس سے بہتر کوئی نظامِ حکومت نہیں۔ وہاں تصوّرِ جمہوریت کو آیۂ رحمت۔ اس کی تائید کرنے والوں کو حق و صداقت کے شاہد اور نوعِ انسانی کی فلاح و بہبود کا معاون خیال کیا جاتا ہے۔ اسے ذہنِ انسانی کے سامنے کچھ اس مقدّس انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔ کہ مدّت کے تجربے نے اس نظامِ حکومت کو فی الحقیقت بہترین نظام ثابت کیا ہے۔

لیکن اقبالؒ ڈیماکریسی کی بنیاد کو اپنے سامنے پوری طرح بے نقاب دیکھتے ہوئے اسے بھی ستمِ خواجگی اور جورِ آمریت قرار دیتے ہیں۔ کیونکہ اس میں بھی کمزور و ناتواں انسان ظلم و ستم کا نشانہ بنتے ہیں۔ اصل میں جمہوریت بھی استبدادیت و قہرمانیت ہے۔ درحقیقت منشاءِ عمومی بھی ایک مقدّس فریب ہے۔ جیسے دولت و ثروت اور اثر و رسوخ کے ذریعہ خریدا جاتا ہے۔ جمہور کے ابلیس (اربابِ سیاست) عمومی منشا (GENERAL WILL) کے دلفریب نعرے سے عوام کو زیرِ دام لا کر اپنے ذاتی مقاصد کی تکمیل کرتے ہیں۔ اس میں بھی اقتدارِ اعلیٰ دراصل عوام کو حاصل نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ گروہ مسندِ اقتدار پر تسلّط جماتا ہے۔ جو زور و زر کے ذریعے عامۃ النّاس کو فریب دینے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ یہ گروہ فی الحقیقت حکمرانوں کا گروہ اور عوام النّاس ان کے محکوم ہوتے ہیں۔ ڈکٹیٹر شپ میں فردِ واحد اور جمہوریت میں افراد تاجِ سلطانی پہنتے ہیں۔ اس میں حاکم و محکوم کا امتیاز و فرق برابر رہتا ہے۔

پروفیسر کوبن (ALFRED COBB LN)

(THE CRISIS OF CIVILISATION)

میں صفحہ ۶۸ پر اس نظریہ کے متعلق لکھتا ہے :۔

"اس نظریہ کو اگر بنظرِ امعان دیکھا جائے۔ تو "عوام کے اقتدارِ اعلیٰ" کا فریب

نکھر کر سامنے آجاتا ہے۔ اگر سیاست کو نظری حیثیت سے نہیں، بلکہ عملی حیثیت سے دیکھا جائے تو یہ ماننا پڑے گا کہ حاکم اور محکوم کو ایک ہی تصوّر کرنا عملی ناممکنات میں سے ہے، عملاً حکومت، افراد کے ایک طبقہ پر مشتمل ہوتی ہے اور رعایا، افراد کے دوسرے طبقہ کا نام ہوتا ہے۔ جب معاشرہ اپنی ابتدائی قبائلی زندگی سے ذرا آگے بڑھ جائے تو پھر حاکم اور محکوم کبھی ایک نہیں ہو سکتے۔ یہ سمجھ لینا کہ دونوں ایک ہی ہیں مملکت میں بدترین قسم کی آزادی اختیارات پیدا کر دیتا ہے۔"

جمہوریت میں اقتدار کا سرچشمہ عوام کو قرار دے کر بھی صاحب اقتدار لوگ اپنے مفادات کا تحفظ اور ہوس حکمرانی کی تشنگی بجھاتے ہیں۔ علاّمہ سرداری صرف ذاتِ خداوندی کے لئے مختص کرتے ہیں۔ دینی مملکت میں نہ مذہبی پیشوائیت ہوتی ہے نہ جمہوریت نہ آمریت، نہ سرمایہ داری اس میں کوئی انسان کسی انسان کا غلام و مطیع ہوتا ہے نہ کسی انسان پر کسی دوسرے انسان کا اختیار و اقتدار ہوتا ہے۔ اس اسلامی مملکت میں اطاعت و فرمانروائی صرف قانونِ خدا (قرآن عزیز) کی ہوتی ہے اس دورِ حکومت میں:۔

يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْئًا - وَالْاَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ - (۸۲/۱۹)

اس حریت نواز نظام میں کسی شخص کا کسی دوسرے پر اختیار و اقتدار نہیں ہوگا۔ کیونکہ

سروری زیبا فقط اُس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وُہی باقی بتانِ آذری

آفاق و انفس میں ایک ہی اللہ کا قانون جاری و ساری ہے۔

نظریہ جمہوریت کے متعلق پروفیسر کوبن صفحہ ۷۶ پر لکھتا ہے:۔

"عوام کے اقتدارِ اعلیٰ کے نظریہ کی تائید میں روایتی دلیل یہ دی جاتی ہے کہ حکومت یا تو قوت سے قائم کی جائے گی یا باہمی رضامندی سے۔ اور چونکہ یہ غلط ہے کہ جس چیز کو قوت صحیح کہہ دے وہ صحیح ہو۔ اس لئے یہی درست ہے۔ کہ حکومت کو باہمی رضامندی پر مبنی ہونا چاہیئے۔ لیکن یہ دلیل منطقی

طور پر صحیح ہے، نہ ہی صداقت پر مبنی۔ اگر کسی غلط بات کو لاکھ آدمی بھی صحیح کہہ دیں تو وہ صحیح نہیں ہو سکتی۔ ... ... فیصلہ وہی صحیح ہو سکتا ہے۔ جو درحقیقت صحیح ہو نہ کہ وہ جسے زیادہ لوگ صحیح کہنا شروع کر دیں۔ روسو کہتا ہے کہ "منشائے عمومی" ہمیشہ صحیح ہو گا ورنہ وہ منشائے عمومی نہیں کہلا سکے گا۔ اگر یہ صحیح ہے تو پھر اکثریت اور اقلیت کا سوال ہی باقی نہ رہا۔ سوال یہ رہ گیا کہ جو چیز اخلاقی بنیادوں پر درست ہے۔ وہی صداقت ہے (خواہ اس کی تائید میں ایک ہاتھ بھی نہ اُٹھے)"

انسانی تاریخ جمہوریت کے علمبرداروں کے کارناموں سے بھری پڑی ہے۔ جس گروہ نے بھی مسندِ اقتدار پر قبضہ جما لیا۔ اس نے دوسرے لوگوں کو مفادِ خویش کے لئے استعمال کیا۔ جمہوریت نوازوں نے اگر کچھ کیا۔ تو اپنے لئے اور اپنے نعرہ بازوں کے لئے۔ افکارِ اقبال سے جو نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے وہ یہ کہ جمہوریت بھی انسانیت کے درد کا درماں نہیں بن سکتی۔

## اشتراکیت

انسانی آزادی کے لئے عقل کے ذریعہ مارکس نے یہ حل نکالا کہ فسادِ آدمیت کی وجہ معاشی ناہمواری ہے۔ اس کا نظریہ مارکسزم کے نام سے متعارف ہے۔ یہ جس قسم کا معاشی اور سیاسی نظام قائم کرنا چاہتا تھا اسے اشتراکیت (کمیونزم) کہتے ہیں۔ کمیونزم کے اجزائے ترکیبی کے متعلق تو اُس جگہ بحث کی جائے گی۔ جہاں ہم اسلام کے نظامِ حیات سے اس کا موازنہ کریں گے۔ یہاں تو صرف اتنا کہنا ہے۔ کہ اس پیغمبرِ بے جبریل نے مزدوروں۔ فاقہ کشوں اور محنت کشوں کو سرمایہ دار قوتوں کے خلاف نفرت کی بنیاد پر اُبھار کر سرمایہ داری کا قلع قمع کرنے کے لئے ایک نظامِ زندگی دیا۔ اس نے دیانت داری سے محسوس کیا کہ زاریت وقیصریت وسائلِ حیات پر قبضہ جما کر عامۃ النّاس کو پیٹ سے بھوکے رکھ کر ان کو فرمان پذیری کے لئے مجبور کرتی ہے۔ لہٰذا اس نے انفرادی ملکیت کے تصوّر پر ضرب کاری لگائی۔ یہ اس کی عقلِ رسا کی اپروچ تھی۔ اس کے قلبِ مومن نے انسانی زندگی کی جس تلخی کو محسوس کیا محض عقل کی بنیاد پر اس کا حل پیش کر دیا۔ اس نے اپنی کتاب

کیپٹیل (سرمایہ) میں انسان کو محض پیٹ بنا دیا۔ اس نے نیک نیتی سے انسانی مصائب کا حل سوچا چونکہ اس کے دماغ میں وحی کا تصور نہ تھا۔ اگر اس کی نگاہ قرآنِ عزیز کے پیش کردہ حقائق تک پہنچتی تو یقیناً یہ اس سے بہتر حل پیش کرتا کیونکہ

قلب او مومن دماغش کافر است

اس لئے مارکس نے مساواتِ شکم پر نظامِ حیات کی بنیاد رکھی۔

دینِ آں پیغمبرِ حق ناشناس
بر مساواتِ شکم دارد اساس

علامہؒ کے اس شعر سے دین کی وضاحت بھی ہو جاتی ہے کہ اس سے مراد ضابطۂ حیات ہے۔ جیسا کہ ابتدا میں عرض کیا گیا ہے۔ کہ مارکسی فلسفۂ حیات کی وضاحت اس مقام پر کی جائے گی۔ جہاں اسلام اور کمیونزم کا مقابلہ کیا جائے گا۔ اس جگہ یہ وضاحت کر دینا ضروری ہے۔ کہ مارکس اور اسلام کے معاشی فلسفہ میں مماثلت ہے لیکن ان دونوں کے مکمل فلسفہ ہائے حیات میں بنیادی طور پر بڑا واضح فرق ہے۔ نظریۂ پاکستان کے خالق حضرت اقبالؒ فرماتے ہیں:۔

جانتا ہے جس پہ روشن باطنِ ایام ہے
مزدکیت فتنۂ فردا نہیں اسلام ہے

اشتراکیین نے نظامِ سرمایہ داری کے خلاف عوام کو منظم کر کے اس کا شیشۂ غرور پاش پاش کر دیا ہے۔ اور اس کے شرارِ آتش سے ردائے پیر کلیسا اور قبائے سلطان جل کر راکھ ہوتی نظر آ رہی ہے۔ کہتے ہیں:۔

شرارِ آتش جمہور کہنہ ساماں سوخت
ردائے پیر کلیسا، قبائے سلطاں سوخت

اور

غلام گرسنہ دیدی کہ بر درید آخر
قمیص خواجہ کہ رنگین ز خونِ ما بود است

اشتراکیت عصرِ حاضر کا بھڑکتا ہوا موضوع ہے لہٰذا علامہ بھی اس کے بڑھتے

ہوئے اثر و نفوذ کو بنظرِ غائر دیکھ رہے تھے۔ دیانتداری سے محسوس کر کے فرماتے ہیں :-

گیا دورِ سرمایہ داری گیا
تماشا دکھا کر مداری گیا
زمانے کے انداز بدلے گئے
نیا راگ ہے ساز بدلے گئے

ایک اور مقام پر :-

خواجہ ز سروری گذشت　　بندۂ زچاکری گذشت
زاری و قیصری گذشت　　دورِ سکندری گذشت

مزدور کے پھٹے ہوئے لباس کو دیکھ کر

بریشم قبا خواجہ از محنتِ او　　نصیبِ تنش جامۂ تار تارے

انسان کی خود ناشناسی اور نامحرمی اور سرمایہ دارانہ قوتوں کے جور و ستم سے متاثر ہو کر :-

راز دانِ جزو و کل از خویش نامحرم شد است
آدم از سرمایہ داری قاتلِ آدم شد است

سرمایہ دارانہ ذہنیت کی بڑھتی ہوئی بے باکی و بے تابی اور نشۂ اقتدار میں سرمست قوتوں کی آدم دری کی وجہ سے حق و باطل کا ٹکراؤ ہر دور میں ہوتا ہے :-

اس کی بڑھتی ہوئی بے باکی و بے تابی سے
تازہ ہر عہد میں ہے قصۂ فرعون و کلیم

تاریخ کا دیدۂ عبرت آج تک اس جور پر خوں افشاں ہے کہ ظالم سلطان یا مستبد حکمرانوں نے ان وسائل و ذرائع کو جو خدا نے تمام انسانوں کو بلا مزد و قیمت عطا کئے ہیں سمیٹ کر دوسرے انسانوں کو اپنے پنجۂ غلامی میں کس لیا۔ اسی ہوسِ اقتدار اور طمع و لالچ کی وجہ سے آج تک خدا کی پاک زمین انسانی خون سے رنگین ہوتی رہی ہے۔ یہی انسان کا اپنا پیدا کردہ وہ جہنم ہے۔ جس میں جسدِ انسانیت آج تک جھلس رہا ہے۔ ہر گرگ کسی برۂ معصوم کی تلاش میں ہے۔ چند انسان جو

دولت کے خزانوں پر سانپ بن کر بیٹھ جاتے ہیں۔ انسانوں کی عظیم اکثریت کا خون ان کی موٹروں کا پیٹرول بنتا ہے۔ محنت کش مزدور صبح سے شام تک کارخانوں میں ان کے عیش و طرب کے لئے دولت کماتے ہیں۔ اور یہ دولت کی فراوانی کی وجہ سے سوسائٹی کے تمام اعزازات حاصل کر لیتے ہیں۔ اس کیفیت کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ لذاتِ دُنیاوی سے متمتع ہونے کے لیے یہی چند خانماں پیدا ہوئے ہیں۔ کیونکہ یہی لوگ خدا کے جہان پر قبضہ و تصرف جمائے نظر آتے ہیں۔ اقبالؔ کہتے ہیں:۔

جہانِ تست در دستِ خسے چند
کسانِ او بہ بند ناکسے چند
ہنر ور در میانِ کارگاہاں
کشند خود را بہ عیشِ کرگسے چند

دہقاں کی محنت پر عیش و نشاط کی محفلیں سجانے اور رونگ رلیاں منانے والے والیٔ شہر کے متعلق بالِ جبریل میں گدائی کے عنوان سے لکھتے ہیں:۔

میکدے میں ایک دن اک رندِ زیرک نے کہا
ہے ہمارے شہر کا والی گدائے بے حیا!
تاج پہنایا ہے کس کی بے کلاہی نے اسے؟
کس کی عُریانی نے بخشی ہے اسے زریں قبا؟
اُس کے آبِ لالہ گوں کی خونِ دہقاں سے کشید
تیرے میرے کھیت کی مٹی ہے اس کی کیمیا!
اُس کے نعمت خانے کی ہر چیز ہے مانگی ہوئی
دینے والا کون ہے؟ مردِ غریب و بے نوا
مانگنے والا گدا ہے، صدقہ مانگے یا خراج
کوئی مانے یا نہ مانے میر و سلطاں سب گدا!

(ماخوذ از انوری)

مارکس نے دولت کی اس چھینا جھپٹی۔ زرساندوزی و زرپرستی کے خلاف

ایک تحریک تو پیدا کی لیکن جادۂ ہموار دیکھنے میں اشتراکیین نے سخت ٹھوکر کھائی ہے اقبالؒ لا کے بعد اِلاّ ضروری سمجھتے ہیں۔ اشتراکیت کے پاس فسادِ عصرِ حاضر کا علاج اس لئے نہیں کہ یہ اقتدارِ اعلیٰ انسانی عقل کو سونپتی ہے۔ جبکہ علاّمہؒ کاروانِ انسانیت کو اس نورِ مبین (قرآن عزیز) کی روشنی میں آگے بڑھانا چاہتے ہیں۔ ان کا چراغ آرزو عقلِ انسانی کو وحی کی روشنی کے تابع چلنے کی راہ دکھاتا ہے۔ کمیونزم کے متعلق:۔

کردہ ام اندر مقاماتش نگہ
لاَ سلاطین، لاَ کلیسا لاَ اِلٰہ
در مقامِ لاَ نیا ساید حیات
سوئے الاّ می خرامد کائنات
لاَ و اِلاَّ سازو برگ اُمتاں
نفی بے اثبات مرگِ اُمتاں

## اسلامی سوشلزم اور اسلامی جمہوریت

**اسلامی سوشلزم** آجکل اسلامی سوشلزم ایک بھڑکتا ہوا موضوع ہے پاکستان میں اس کے مخالف و موافق بہت کچھ لکھا اور کہا جا رہا ہے۔

ہمارے نزدیک اسلام (دین) اپنی ذات میں مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ جس طرح قرآن کا اللہ الصمد (خارجی سہاروں سے بے نیاز) ہے۔ عین اُسی طرح اس کا پیش کردہ دین بھی خارجی سہاروں کا محتاج نہیں۔ مارکس نے جس معاشی فلسفۂ کا تصور پیش کیا اس فلسفۂ حیات میں سوشلزم اس نظام کی عبوری شکل کا نام ہے جس کی انتہائی شکل کمیونزم ہے۔ مارکسزم کے فلسفۂ حیات پر ایمان رکھنے والا جب کوئی کمیونسٹ سوشلزم کہتا ہے تو اس سے مراد مارکس کے پیش کردہ معاشی فلسفہ کا ابتدائی مرحلہ ہوتا ہے۔ مارکسزم (مارکسی فلسفۂ حیات) اور قرآنی ضابطۂ حیات کی اصل و اساس میں واضح فرق ہے۔ قرآن اپنے نظامِ حیات

کی بنیاد غیر متبدل اُصولوں (جنہیں مستقل اقدار کہا جاتا ہے) پر قائم کرتا ہے۔

**فلسفۂ جدلیت**

مارکس کے معاشی نظام اور فلسفۂ حیات کی عمارت مادی جدلیت (MATERIALISTIC DIALECTIC) پر استوار ہوتی ہے۔ فلسفۂ جدلیت کی رُو سے کوئی تصور۔ کوئی نظریہ۔ کوئی مسلک بنیادی طور پر نہ حق ہے نہ باطل۔ ہر شئے اور ہر نظریہ کے اندر دو متضاد عناصر باہمدگر بر سرِ پیکار رہتے ہیں۔ ان میں سے کبھی ایک کبھی دُوسرا غالب آجاتا ہے پھر اس کی ضد نمودار ہوتی ہے۔ غرضیکہ کش مکش اسی طرح جاری رہتی ہے۔ مارکس کی زبان میں اس کا نام تاریخی وجوب (HISTORICUL NECESSITY) اور مازوسے تنگ کی اصطلاح میں قانون اضداد (LAW OF CONTRADICTION) جدلیاتی فلسفہ کی رُو سے اشیائے کائنات ہوں یا انسانی فکر و تصورات، ان میں سے کوئی بھی غیر متبدل نہیں۔

**قرآنی تصورِ حیات**

یہ کشمکش حق (تعمیری قوتوں) اور باطل (تخریبی قوتوں) کے درمیان ہوتی ہے۔ آخرالامر حق غالب آجاتا ہے یہ فلسفۂ حیات۔ اس طرح باطل کو محو حق کو محکم اور استوار کیئے جاتا ہے سلسلۂ کائنات ایک ارتقائی منزل اور آگے بڑھ جاتا ہے۔ اس نئی منزل میں باطل پھر پیکر بدل کر سامنے آتا ہے اور حق و باطل کا یہ تصادم پھر جاری رہتا ہے جس میں پھر حق غالب آجاتا ہے۔ اس طریق سے کائنات نکھرتی سنورتی چلی جاتی ہے اس طرح حق کی ضربیں باطل کا سرِ غرور کچل کر رکھ دیتی ہیں۔ باطل محو اور حق محکم ہوتا چلا جاتا ہے۔ دین (حق) یقین آور نتائج کے ساتھ منزلِ حیات کی طرف بڑھتا ہے اس کی آتشِ ایماں افروز کا ایک ایک شعلہ انسانیت سوز جہنم کو نگلنے کے لئے مضطرب و بے قرار ہوتا ہے۔ جو آگ مفاد پرست قوتوں نے بھڑکائی ہوتی ہے حق کے اس غلبہ سے ان کی منفعت کوشیاں جھلس کر رہ جاتی ہیں۔

مارکسزم میں خالص مادہ پرستی ہے۔ اس میں خدا۔ وحی۔ مستقل اقدار کا سرے سے انکار ہے۔ سوشلزم کا معاشی نظام قریب قریب وہی ہے جو قرآن پیش کرتا ہے۔ لیکن مکمل مارکسی فلسفۂ حیات، دین کے تصورِ حیات کی یکسر نقیض ہے،

حکیم الامت ؒ نے ۱۹۳۱ء کے ایک خط میں جو سر فرانسیس ینگ ہسبنڈ کے نام تھا۔ اپنا فارمولا بتایا تھا۔ آجکل اس کو غلط معانی و مطالب پہنائے جاتے ہیں۔ وہ مشہور فارمولا یہ تھا:۔

بالشیوزم + خدا = اسلام

اس سے اقبال ؒ کا مقصد واضح ہوجاتا ہے۔ کہ اگر اسلام کے فلسفۂ حیات کی بنیادوں پر اشتراکیت کے نظامِ معاشی کو استوار کیا جائے۔ تو یہ اسلام کے معاشی نظام کے مماثل ہوجاتا ہے۔ اس طرح مزدکیت فتنۂ فردا نہیں رہتی اسلام بن جاتی ہے۔ قرآنی فلسفہ ہر طاغوتی فلسفہ اور ہر ابلیسی نظام کے لئے پیغامِ موت ہے۔ علامہ ؒ نے مارکسی فلسفۂ معاشں کی اگر تائید کی ہے تو محض اس لئے کہ اسلام کے معاشی نظام سے مماثل ہے۔ رہا۔ مارکسزم کا پورا فلسفۂ زندگی تو یہ اسلام کے فلسفۂ زندگی سے ہم آہنگ نہیں۔ اسلامی نظام اُصولی ہیئت سے غیر متبدل غیر متغیر ہے۔ اس کے معاشی نظام کا منتہائے نگاہ عالمینی ربوبیت ہے۔ قرآنِ کریم نے اپنے نظام کے لئے اصطلاحات بھی قریب قریب خود تجویز کردی ہیں ان کے مرادفات کسی زبان میں نہیں مل سکتے۔ ہمیں اپنے ہاں وہی اصطلاحات استعمال کرنی چاہئیں۔ جو قرآنی اصطلاحات ہیں۔ جب قرآن کا خدا ہر قسم کے خارجی سہاروں اور ہر قسم کی محتاجگی سے بے نیاز ہے تو اس کا عطا کردہ نظامِ حیات بھی دوسرے فلسفہ ہائے حیات کی اصطلاحوں کا محتاج نہیں ہوسکتا۔ اقبال ؒ نے جو کہا ہے کہ اگر کمیونزم میں خدا کا تصوّر شامل کرلیا جائے تو یہ عین اسلام ہوجاتا ہے تو اس سے ان کی مراد صرف یہ ہے کہ اگر اس معاشی فلسفہ کو قرآنی فلسفۂ حیات کے تابع کردیا جائے تو یہ معاشی نظریہ مسلمان ہوجاتا ہے۔ چونکہ سوشلزم اور اسلام (دین) دونوں سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف ہیں۔ لہٰذا اس حقیقت سے یہ نتیجہ اخذ کرلیا گیا ہے کہ مارکسزم اور اسلام کے فلسفۂ زندگی میں مطابقت ہے جو سراسر غلط اور اسلامی روح کے منافی ہے۔ قرآن کی رُو سے کسی فلسفۂ حیات سے اس کا معاشی نظام الگ نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی حق لاشریک، انسانی ذہن کے کسی تراشیدہ نظامِ زندگی سے کوئی مفاہمت کرتا ہے۔ اس لئے

کسی مسلمان کے لئے روا نہیں کہ وہ اسلام کو مکمل ضابطۂ حیات بھی تسلیم کرے اور سوشلزم کا سہارا دے کر اسے کمزور و ناتواں ثابت کرنے کی کوشش کرے۔ ان دونوں نظاموں کے بنیادی اختلاف و فرق کی تفصیل آئندہ اوراق میں آئے گی۔ جہاں قرآنی تصورِ حیات اور مارکسزم کو ذرا وضاحت سے پیش کیا جائے گا۔" رہا سرمایہ داری اور سوشلزم کا تقابل۔ تو ہمارے نزدیک اس کی مثال خنزیر کے گوشت اور جھٹکا کئے ہوئے بکرے کے گوشت کی سی ہے۔ اسلامی نقطۂ نگاہ سے یہ دونوں حرام ہیں۔ لیکن بکرے کو اگر خدا کا نام لے کر ذبح کر لیا جائے۔ تو وہ حلال ہو جائے گا۔ لیکن خنزیر پر ہزار بسم اللہ پڑھئے وہ حرام کا حرام ہی رہے گا۔ سوشلزم کے معاشی نظام کو اسلامی فلسفۂ حیات کے تابع لے آئیے، وہ حلال و طیب ہو جائے گا۔"

(طلوعِ اسلام صفحہ ۱۹ ستمبر ۱۹۶۷ء)

## اسلامی جمہوریت

جس طرح اسلامی سوشلزم کی اصطلاح قرآن کے مزاج کے منافی ہے اور سوشلزم کے ساتھ "اسلامی" کا اضافہ کر کے اسے مسلمان نہیں بنایا جا سکتا ہے۔ اسی طرح نقطۂ جمہوریت کے ساتھ اسلامی لیبل لگا کر اسے قرآنی سند نہیں دی جا سکتی۔ پاکستان کی ایک جماعت جس نے قیامِ پاکستان کے وقت اسلام کے مقدس نام پر سوادِ اعظم کی مخالفت کی تھی اور جمہوریت کو منافیٔ اسلام قرار دیا تھا آجکل میکیاولی سیاست کی علمبردار اس مذہبی جماعت اور اس کی دوسری ہمقدم جماعت کے حلقوں میں اسلامی جمہوریت کا شہرہ و غلغلہ بلند ہے لیکن لطف یہ ہے کہ یہ دونوں جماعتیں اسلامی سوشلزم کی اصطلاح کو اسلام کے مکمل نظام کی توہین قرار دے کر اس نعرہ کی مخالفت کر رہی ہیں لیکن اسلامی جمہوریت۔ جمہوریت کو اسلام کے نفاذ کے لئے عین ضروری کہہ کر اس مغربی طرزِ حکومت پر اسلامی چھاپ لگائی جا رہی ہے۔ مغرب کے اس طرزِ حکومت میں غلط یا صحیح کا معیار کثرتِ آراء ہے۔ اقلیت کو ہر حالت میں اکثریت کے فیصلے ماننے پڑتے ہیں۔ اس میں حاکمی و مولائی اور سروری و آقائی کا حق انسانوں کی اکثریت کو دے دیا جاتا ہے یعنی انسان کی حکمرانی - انسان کی غلامی۔ اس میں کہا تو یہ جاتا ہے کہ قانون کا سرچشمہ عوام ہیں۔

نظر بظاہر ڈیماکریسی میں عوام حکومت میں دخیل ہوتے ہیں۔ لیکن حاکم و محکوم کا تصور اس میں باقی رہتا ہے۔ اس میں اقلیت کو اکثریت کا محکوم بننا پڑتا ہے اس طرز کی حکومت میں دراصل برسرِ اقتدار گروہ لوگوں کو اپنی آرزو کے مطابق چلاتا ہے۔ یورپ میں جمہوریت کو مقدس اس لئے سمجھا گیا کہ اس کے مقابلہ میں ڈکٹیٹرشپ یا بادشاہت کا تصور تھا۔ اسلام اقتدارِ اعلیٰ (قانون) کو سونپتا ہے اور حق و باطل کا معیار قانونِ خداوندی کو قرار دیتا ہے۔ اسلامی نظام میں کثرت آرا سے حق و باطل کے معیار کو تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ یہ تصور کہ اکثریت کبھی غلطی نہیں کر سکتی اسلام کے نزدیک مضحکہ خیز ہے۔ اسلام ایک مشاورتی نظام ہے قرآن کسی انسان کو یہ حق نہیں دیتا کہ حاکمی و مولائی اور سروری و آقائی کے اختیارات کسی شخص کو دے دئے جائیں۔ اس نظام میں حاکمیت کا تصور یہ ہے کہ وہ لوگ جو قانونِ اسلام کی تنفیذ کریں گے۔ ان کو یہ حق حاصل نہ ہوگا کہ وہ خود کو ان قوانین کی گرفت سے آزاد سمجھیں اور اس قوت و اثر کے ذریعے انسانوں کو اپنی غلامی کے لئے مجبور کریں۔ حتیٰ کہ حاملِ وحی سالارِ انسانیت حضورِ اکرمؐ کو بھی یہ کہہ دیا گیا کہ:۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ
ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (۳/۷۹)

کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ خدا اسے ضابطہ قوانین اور فیصلہ کرنے کی قوت اور نبوّت (تک) بھی عطا کر دے اور وہ لوگوں سے کہے کہ تم خدا کو چھوڑ کر میرے محکوم اور فرماں پذیر بن جاؤ۔

قرآن کہتا ہے کہ حقِ حکومت صرف خدا کو حاصل ہے (ان الحکم الا للّٰہ ۱۲/۴۰) حکومت کا حق کسی انسان کو نہیں۔ لا یشرک فی حکمہٖ احدًا (۱۸/۲۶) وہ اپنی حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔

اقبالؒ فرماتے ہیں:۔

اے بہ تقلیدش اسیر آزاد شو
دامنِ قرآن بگیر آزاد شو!

اس مقام پر جمہوریت کا اجمالی سا خاکہ پیش کرنا اور یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ اسلامی جمہوریت کی اصطلاح بھی سراسر غیر قرآنی ہے۔ درحقیقت جمہوریت بھی ملوکیت کا ایک پردہ ہے۔ یورپ ازمنہ متوسطہ (DARK AGES) میں چرچ (کلیسا) کے نظام میں جکڑا ہوا تھا۔ اس میں ملک کا سیاسی اقتدار مذہبی پیشوائیت کی گرفت میں تھا بلکہ عوام کی معاشرتی زندگی بھی ان کی منشا و مرضی کی رسیوں سے بندھی ہوئی تھی۔ ملوکیت اور کلیسا میں سازباز تھی۔ وہاں کے ارباب فکر ان حالات سے سخت نالاں تھے۔ بعض حساس قلوب جن میں سے ایک لوتھر تھا۔ عوام کو مذہبی پیشوائیت کی گرفت سے آزاد دیکھنے کا خواہاں تھا۔ اس نے بڑی جرأت سے یہ اعلان کیا کہ بائیبل ہر انسان کے لئے راہ نمائی ہے۔ اس پر کسی گروہ کی اجارہ داری نہیں ہونی چاہیئے۔ چرچ کو یہ حق حاصل نہیں کہ اس پر قبضہ جما کر لوگوں کو اپنا مطیع و غلام بنائے۔ یہ پہلا جرأت مندانہ اعلان تھا۔ اس کے بعد انقلاب فرانس نے بساطِ سیاست کا تختہ اُلٹنا چاہا۔ اس وقت یہ محسوس کیا گیا کہ جب تک مذہبی پیشوائیت کو ایوانِ سیاست سے خارج نہیں کیا جائے گا۔ لوگوں کو حقیقی آزادی نصیب نہیں ہوگی۔ جب تک ملوکیت کا یہ مقدس سہارا باقی رہے گا عوام غلامی کی چکی میں پستے رہیں گے۔ معاملہ صرف ملوکیت کے شکنجوں کو ڈھیلا کرنے تک ختم نہ ہوا مذہبی پیشوائیت کو بھی اُمورِ سیاست سے بے دخل کرنا بھی ضروری سمجھا گیا۔ لہٰذا اس طریق سے حلقومِ انسانیت کو ان دو استبدادی قوتوں کی ظالمانہ گرفت سے نجات دلائی گئی۔ پاکستان کی مذہبی پیشوائیت نے جس نے قیام پاکستان کی ڈٹ کر مخالفت کی تھی۔ یہ عیارانہ چال چلی ہے کہ جمہوریت کے ساتھ اسلامی کا مقدس لفظ چسپاں کر کے جمہور کو اسلامی جمہوریت کے نام پر فریب دیا جائے اور اقتدار کی گدی پر قبضہ جما کر اپنی من مانی شریعت نافذ کی جائے ہمارے نزدیک ہوسِ اقتدار کی تڑپ نے اس مذہبی رہنما کو یہ خوشنما نعرہ تخلیق کرنے کے لئے مجبور کیا۔ حالانکہ صاف سیدھی سی بات ہے۔ کہ اگر اسلامی کا لفظ لگا کر سوشلزم کو مسلمان نہیں کیا جا سکتا۔ تو یہی لفظ جمہوریت کے ساتھ جوڑ کر اس جمہوریت کو کیسے مسلمان کیا جا سکتا ہے۔ جس کے متعلق برسوں یہ کہا گیا ہو کہ یہ عین اسلام کے

منافی اور یورپ کی نقالی ہے۔ اسلام تو اپنی غیر متبدل اقدار کو اقتدارِ اعلیٰ کہتا ہے۔ اس کے نزدیک کثرت و قلت کو معیارِ حق قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس کی پوزیشن یہ ہے کہ:-

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ۭ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ○ (۶/۱۱۵)

انسان کے لیے جس قدر اُصول و ضوابط کی ضرورت تھی وہ سب اس میں دیئے جا چکے ہیں اور مکمل شکل میں دیئے جا چکے ہیں ان میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا۔ قرآن عزیز کے اُصول واضح، مکمل اور غیر متبدل ہیں۔

وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِي الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ○ (۶/۱۱۶)

اگر تم اس مؤقف کو چھوڑ کر، اکثریت کا اتباع کرو گے۔ وہ تمہیں خدا کے راستے سے گمراہ کر دیں گے، اکثریت، محض ظن و تخمین کے پیچھے چلتی ہے۔ حتمی علم و یقین ان کے پاس نہیں ہوتا۔

قرآن کا یہ فیصلہ، دُنیا کی مروجہ جمہوریت کے متعلق قولِ فیصل ہے۔ بالخصوص ان کے لئے جو یہ مانتے ہیں کہ مسلمانوں کی حیثیت حاکمیہ صرف قرآن عزیز کے غیر متبدل اُصولوں کی پابندی ہوتی ہے۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ○ (۵/۴۴)

جو خدا کی نازل کردہ کتاب کے مطابق فیصلے نہیں کرتے وہی لوگ کافر ہیں۔

اس کے برعکس نظامِ جمہوریت، اکثریت جو جی چاہے قانون بنائے۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے۔ اسلامی جمہوریت اس میکیاولی مذہبی پیشوائیت کا کرشمہ ہے۔ جس نے تحریک قیامِ پاکستان کی مخالفت سے لے کر آج تک ہزاروں رنگ بدلے اور ہوسِ اقتدار میں اپنی مرضی و منشا کے مطابق اسلام کی سینکڑوں متضاد و متخالف تفاسیر و تاویلات کیں۔

## چوتھا باب

# اسلام

ہر مسجد اور منبر و محراب سے یہ آواز آپ کو سُنائی دے گی۔ کہ اسلام ایک مکمل نظامِ حیات ہے۔ جس کی مثال و نظیر تمام مذاہب عالم پیش نہیں کر سکتے۔ یہ وُہ قانونِ حیات ہے۔ جس کی بنیادیں چند محکم۔ اٹل اور غیر متبدّل تصوّرات پر قائم ہیں۔ یہ دعویٰ بھی کیا جاتا ہے۔ اگر تمام دُنیا کے مفکّرین، مقنّنین اور مُصلحین اکٹھے ہو جائیں تو ایسا ضابطۂ حیات نہیں بنا سکتے۔ اسلام انسان کے تمام معاشی و معاشرتی اور سیاسی و اجتماعی مسائل و مشکلات کا حل اپنے اندر رکھتا ہے لیکن ان اجارہ دارانِ مذہب سے اگر یہ پُوچھا جائے کہ وہ بے مثل و بے نظیر اُصولِ حیات کیا ہیں۔ تو آپ حیران ہوں گے کہ ان کی طرف سے کوئی اطمینان بخش جواب نہیں ملے گا۔ پیرانِ حرم زیادہ سے زیادہ یہ کہیں گے کہ اسلام رُوحانی ترقی اور آخروی نجات کا ضامن ہے۔ دلِ فطرت شناس اس جواب سے مطمئن نہیں ہوگا۔ بندۂ صاحب نظر سوچنے پر مجبور ہوگا۔ کہ یہ دین مجھ پر زمین کے ہنگامے سہل نہیں کرتا اس کے ماننے کی آخر ضرورت کیا ہے؟ یہ تو وُہی کچھ ہے جس پر دیگر مذاہب والے عمل پیرا ہیں کہ جھوٹ نہ بولو۔ چوری نہ کرو۔ کسی کو نہ ستاؤ۔ کسی پر ظلم نہ کرو۔ ہمارے اربابِ مذہب اسلام بھی اسلام ہیں نماز۔ روزہ۔ حج۔ زکوٰۃ وغیرہ کے احکام و مصالح سامنے لا کر پُوجا و پرستش کے طور طریق سمجھا کر حسنِ سلوک اور حسنِ معاملہ کا وعظ فرما کر اپنے طریقِ عبادت کو دوسروں سے بہتر ثابت کرنے کے لئے منطقیانہ موشگافیاں کریں گے اور انفرادی نجات کا تصوّر دے کر مسلمان کو اس غلط فہمی میں مگن رکھتے ہیں کہ ایسا کر کے آپ احکامِ خداوندی کی تعمیل کر رہے ہیں۔ اس لئے آپ جنّت

کے صحیح وارث و حقدار ہیں ۔ اس طرح یہ اربابِ شریعت و طریقت اپنے خود ساختہ
نظریوں سے دین و دنیا میں جدائی پیدا کر کے دنیاوی حکومت اربابِ اقتدار و
اختیار اور مذہبی حکومت روحانی پیشواؤں کے سپرد کر کے معاشرہ میں ثنویت پیدا
کرتے ہیں ۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے عجمی اسلام اور اس دلفریب جنّت کی حقیقت
فریبِ نظر کے سوا اور کچھ نہ ہوگی ۔ اور نہ اس کی بارگاہ سے زندگی کے ٹھوس مسائل
کا تسلّی بخش حل مل سکے گا ۔ اقبالؒ نے اس حقیقت کو شدّت سے محسوس کیا کہ
جب تک دین کے بنیادی تصورات کو قرآنی سندات کے ساتھ واضح ، غیر مبہم
اور متعین طور پر سامنے نہیں لایا جائے گا ۔ انسان ظن و گماں کی ظلمتوں میں بھٹکتا
پھرے گا ۔ ۔ اس دیدہ ور نے فکرِ خداداد سے اس عجمی سازش کا پردہ چاک کیا جس
کی وجہ سے اسلام ایک جیتے جاگتے ، متحرک نظامِ زندگی کے بجائے چند بے جان
عقائد اور بے روح رسومات کا مجموعہ بن کر رہ گیا تھا ۔ اس طرح مذہب کی پرستار
قوم زندگی کی تمام خوشگواریوں سے محروم ہو چکی تھی ۔ کیفیت یہ تھی کہ یہ ایک اضطراب
انگیز اور سکوں سوز جہنّم میں جل رہی تھی اور اس ذلت آمیز عذاب سے چھٹکارا
حاصل کرنے کے لئے اسے کوئی راستہ نظر نہ آتا تھا ۔ دین شناس اقبالؒ نے ملّت
کے فہمیدہ و باشعور اور حسّاس طبقہ کو کہا کہ دین کی محرّف صورت میں مذہب بنائے
جانے والے اسلام کو پھر سے دین میں تبدیل کرنے کے لئے اس سے غیر قرآنی عناصر
کو الگ کیا جائے ۔ اسلام کے اجارہ داروں نے دین کو بلند سطح سے نیچے اُتار کر
جو مذہب بنا دیا ہے ۔ اسے دوبارہ دین (ضابطہ حیات) کی حیثیت میں پیش کرنا
چنداں مشکل نہیں کیونکہ اسلام اور مذاہبِ عالم میں ایک بنیادی فرق یہ ہے
کہ قرآنِ کریم اپنی اصلی اور غیر محرّف شکل میں انسانوں کے پاس موجود ہے ۔ یہی
ہے وہ فرق جس سے کاروانِ انسانیت کو صحیح راستہ مل جانے کی اُمید کی جا سکتی
ہے ۔ چنانچہ علامہؒ نے ہر قسم کی رطب و یابس ۔ روایات اور بعید از علم و عقل
خرافات پر ضربِ کاری لگائی اور یہ حیات آموز اعلان کیا کہ اُمت حقیقت
کو خرافات میں گم کر کے روایات میں کھو گئی ہے ۔ آپ نے امام و شیوخ کی فریب
کاریوں کا پردہ چاک کیا اور ان سرتا سر لغو اور باطل قصّے کہانیوں کو خلافِ اسلام

قرار دیا۔ جن کو سُنا سُنا کر مسلمان کو خفتہ بخت بنا دیا گیا تھا۔

اقبالؒ کے نزدیک وہ فلسفہ جو علمبرداران مذہب کی طرف سے اسلام کہہ کر سامنے لایا جاتا رہا ہے قرآنی تصورِ حیات سے یکسر متضاد و متخالف ہے۔ آپ کے نزدیک انفس و آفاق میں ایک ہی قوت کے قانون کی کارفرمائی ہے وہ اللہ ایک خبیر و بصیر اور علیم و حکیم ہستی ہے۔ کائنات کے ذرّے ذرّے میں اُسی کا قانون جلوہ ریز ہے۔ سُورج کو یہ اختیار نہیں کہ وہ طلوع ہونے میں ایک ثانیہ کی تاخیر کر سکے۔ آسمان پر کروڑوں عظیم الجثہ کرّے اسی کے حکم و اشارہ پر گردش کرتے ہیں۔ یہ ممکن نہیں کہ زمین کچھ دیر کے لئے حرکت کو روک دے۔ ارض و سما میں اسی کا قانون جاری و ساری ہے۔ اس کی تخلیق ایک عظیم مقصد کے لئے کی گئی ہے۔ تمام کائنات خدائی پیمانوں کے مطابق سرگرم عمل اور اس کے قانون کے شکنجوں میں جکڑی ہوئی ہے۔ اس کی مجال نہیں کہ اس سے سرِ مو انحراف کرے یا سرکشی برت سکے۔

اسی طرح انسان کو منزلِ حیات تک پہنچنے کے لئے جو راہ نمائی عطا کی گئی ہے۔ اس ما فوق العقل سرچشمۂ علم کو وحی کہا جاتا ہے۔ جو قرآن کی دفتین میں محفوظ ہے۔ انسان کو اختیار و ارادہ دیا گیا ہے کہ وہ جیسا چاہے عمل کرے لیکن نتائج خدا قانونِ مکافاتِ عمل اپنے پیمانوں کے مطابق مرتب کرے گا۔ خدا کے عطا کردہ ضابطۂ حیات (قرآن عزیز) پر عمل پیرائی سے انسان کو زندگی کی خوشگواریاں (جنّت ارضی) نصیب ہوتی ہے۔ اس نظام کی رُو سے تمام افرادِ انسانیہ کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما ہوتی ہے۔ یہ تربیت یافتہ انسان ایسا معاشرہ تشکیل کرتے ہیں۔ جس میں کوئی انسان بنیادی ضروریاتِ زندگی سے محروم نہیں رہتا۔ حکیم الامتؒ اسی زندگی کو حیات با شرف سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس معاشرہ کا ہر فرد اپنی خدا داد صلاحیتوں کو بہبودِ دیگراں کے لئے صرف کرتا ہے۔ یہ زندگی افروز نظام اپنی صداقت نمائی کے لئے ناداروں کو تقدیر کی افیون نہیں دیتا بلکہ اُن میں تقدیرِ یزداں بن کر اپنی تقدیر بدلنے کے ارماں اور ولولے پیدا کرتا ہے۔ قرآن مستقل اقدار کی روشنی میں چلنے والے افرادِ کاروانِ حیات کے قلوب نورِ حیات سے منور کر دیتا ہے۔ اُن کی زندگی کے راستے جگمگا اُٹھتے ہیں۔ اُن پر زمین کے ہنگامے سہل ہو جاتے ہیں۔ یہ حیات بخش

نظریہ جس کی رُو سے انسان اپنی حُوسے حیات قانون کے ساحلوں کے اندر محصور کر کے معاشرتی توازن برقرار رکھ سکتا ہے۔ حکیم مشرق نے اپنے کلام میں اس کی کافی وضاحت کی ہے۔ آپ نے اشتراکیت کے پیام ور مارکس کو پیغمبرِ بے جبرئیل اسی لئے کہا ہے کہ وُہ انسانی مصائب کا حل تنہا عقل کے ذریعے پیش کرتا ہے۔ علّامہ کے نزدیک جس طرح پیشانی کی آنکھ سورج کی روشنی کی محتاج ہے اُسی طرح عقل قافلۂ آدمیت کو وحی کی روشنی کے بغیر صراطِ مستقیم پر نہیں چلا سکتی۔ اسلام رنگ و بو نسل و خون۔ زبان و وطن کے امتیازات مٹا کر ایک ایسی بے رنگ و بو ملت دین کی بنیاد پر استوار کرتا ہے جس میں حبش کا بلالؓ روم کا صہیبؓ اور فارس کا سلیمانؓ وطن و نسل کے فرق کے باوجود ایک قوم بن جاتے ہیں۔ جبکہ ابولہب۔ ابوجہل اور محمدؐ ایک قوم۔ ایک زبان اور ایک وطن رکھنے کے باوجود ایک قوم نہیں بن سکے۔ آپ کے نزدیک ایک عالمگیر دین کی یہی شان ہے کہ وُہ وطن و نسل کے فرق و اختلاف کی بنا پر اتحادِ انسانیت کو ریزہ ریزہ نہ کرے۔ اسلام لا الٰہ الا اللّٰہ کا باطل سوز نعرہ لگا کر انسان کو قومیت وطنیت اور نسلیت کے تنگ دائروں سے نکال کر عالمینیت کی فضاوں میں لے جاتا ہے۔ نظریۂ پاکستان میں یہی اسلامی حقیقت جلوہ ریز ہے۔ جسے بعض کوتاہ بین آج تک نہ سمجھے۔ وہ رازِ حیات جو پوشیدہ لا الٰہ میں ہے۔ اقبالؒ کے عطا فرمودہ نظریہ میں مضمر ہے۔ اقبالؒ کی آواز تھی کہ عالمِ انسانیت اپنے مسائل حیات خدا کے قانون (قرآن عزیز) کے مطابق حل کرے۔ کیونکہ اس کی راہنمائی میں ہر انسان کو ترقی و کامرانی کے یکساں مواقع میسّر آتے ہیں ان کی تمنا تھی کہ قافلۂ آدمیت قندیلِ خدا وندی کی روشنی میں منازلِ حیات قطع کرے۔ وہ انسانیت ساز نظریہ جو علّامہ نے پیش کیا اسے قرآن سے الگ کر کے نہ سمجھا جا سکتا ہے نہ سمجھایا جا سکتا ہے۔ آپ عالمِ انسانیت کے لئے عالمگیر عمرانی نظام قائم کرنے کے لئے پاکستان کو مثالی مملکت دیکھنا چاہتے تھے۔ آپ خوب سمجھتے تھے کہ انسان نے اپنی مفاد پرستیوں کے لئے دین کو ہمیشہ مذہب میں تبدیل کیا ہے اور انبیائے سابقہ کی طرف سے پیش کردہ دین کی طرح اسلام کے ساتھ بھی یہی کچھ کیا گیا۔ مذہب بن کر اسلام دین الحق نہ رہا۔ جب دین کی مشعل

سامنے نہ تھی تو کاروانِ انسانیت صحیح راستے پر چل ہی کیسے سکتا تھا۔ پیرانِ حرم نے اپنے احترام و عظمت کی ہوس میں خالق و مخلوق کے درمیان واسطہ کے پردے حائل کر رکھے تھے۔ علامہ نے کہا یہ خدا کے حاجب و درباں نہیں۔ چنانچہ آپ نے پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اُٹھا دینے کا مشورہ دیا۔ انتشار و افتراق کی آتشِ سکوں سوز جس کی آتش ناکیوں سے دُنیائے انسانیت جھلس رہی تھی۔ اس دانائے راز نے محسوس کیا کہ اس حیات سوز آگ میں جلتی ہوئی انسانیت کو بچانے کے لئے یہ ضروری ہے۔ کہ بتانِ شعوب و قبائل کو توڑ کر اُمتِ واحدہ پیدا کی جائے ایسے عالمگیر معاشرہ کے قیام کے لئے جمعیتِ اقوام کے بجائے جمعیتِ آدم کا نظریہ عام کیا جائے۔ ایک ایسا معاشرہ جس میں کوئی انساں کسی دُوسرے انساں کا غلام و محتاج نہ ہو۔ جس میں گورے کو کالے پر۔ عربی کو عجمی پر کوئی فضیلت نہ ہو اور انسان کا احترام محض انسان ہونے کی جہت سے ہو ظاہر ہے اس میں اتھارٹی اعلیٰ خالق اکبر کے قانون کو حاصل ہوگا۔ جب تک تمیز بندہ و آقا رہے گی۔ فسادِ آدمیت نہ رُکا ہے نہ رُکے گا۔ جب تک عقلِ چالاک اور علمِ بے باک کے ابلیس کو مسلمان کرکے عقلِ خود بین کو عقلِ جہاں بین نہیں بنایا جائے گا۔ خونِ انساں ارزاں رہے گا۔ انساں صفحۂ ارض پر اس وقت خوشحالیوں اور خوشگواریوں کے جھُولے جھولے گا جب گمان و ظن اوہام و تخمین کی تاریکیوں سے نکل کر اس شمع فروزاں سے اکتسابِ نُور کرے گا۔ جو ازل سے روشن ہے اور ابد تک روشن رہے گی۔

یہ چشمِ تہذیب نو کی نابصیری ہے کہ وُہ اپنی نامحکمی اور دل کی دیرینہ بیماری کا علاج اس آبِ نشاط انگیز سے نہیں کرتی۔ جس کے متعلق کہا گیا:۔

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝ (۶۱/۹)

یہ نظامِ حیات یقیناً تمام نظامہائے حیات (ادیانِ عالم) پر غالب آکر رہے گا۔ کیونکہ

آسماں ہوگا سحر کے نُور سے آئینہ پوش — اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی

اس قدر ہوگی ترنم آفریں بادِ بہار — نکہتِ خوابیدہ غنچے کی نوا ہو جائے گی

بزمِ گل کی ہم نفس بادِ صبا ہو جائے گی ‏ ‏ آسملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک
آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں ‏ ‏ محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ جہاں معمور ہو گا نغمۂ توحید سے

علامہ موصوف کے انگریزی خطبات کا ترجمہ آپ کی ہدایت کے مطابق جناب سید نذیر نیازی صاحب نے کیا ہے۔ "تشکیل جدید الہیات اسلامیہ" میں سے چھٹے خطبہ "الاجتہاد فی الاسلام" کے وہ اقتباسات جو موضوعِ کتاب کے لئے مفید ہیں پیش کئے جاتے ہیں۔

آغاز خطبہ میں ارشاد فرماتے ہیں کہ:-

"تہذیب و ثقافت کی نظر سے دیکھا جائے تو بحیثیت ایک تحریک اسلام نے دنیائے قدیم کا یہ نظریہ (۲) تسلیم نہیں کیا کہ کائنات ایک ساکن و جامد وجود ہے (۳)، بعینہٖ جہانتک بطور ایک نظام اجتماع (۵) جذبات سے کام لینے کا تعلق ہے، اس نے رنگ اور خون کے رشتے (۶) ٹھکرا دیئے اور اپنی توجہ صرف فرد کی ذاتی قدر و قیمت (۷) پر رکھی۔ رنگ و خون کا رشتہ زمین پیوستگی (۸) کا رشتہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اتحادِ انسانی (۹) کے لئے خالص نفسیاتی اساس کی جستجو جب ہی کامیاب ہو سکتی ہے جب اس حقیقت کا ادراک ہو جائے کہ نوعِ انسانی ایک ہے۔"

---

(۱) اصل عنوان :- اسلام کی ترکیب میں بہ حرکت کا اصول ملاحظہ ہو مقدمہ۔ (مترجم)
(۲) جیسے ارسطاطالیسی (مشائی) فلسفہ میں۔ (مترجم)
(۳) لہٰذا اسے جو کچھ بننا تھا بن چکا۔ ‏ ‏ (۴) جس کی تکوین کا عمل جاری ہے۔
(۵) تشکیل ریاست یا یوں کہیئے کہ معاشرے کی تاسیس کے لئے۔ (مترجم)
(۶) یعنی نسل اور وطن کے۔ (مترجم) ‏ ‏ (۷) شرف ذات پر۔ (مترجم)
(۸) بالفاظ دیگر قید مقامی۔ (مترجم)
(۹) بحیثیت ایک "امت" بفحوائے "کان الناس امۃ واحدۃ" (۲: ۲۱۳) (مترجم)
(صفحہ ۲۲۳ تشکیل جدید الہیات اسلامیہ)

ملاحظہ فرمائیے:۔
"اسلام کا ظہور ہوا تو اس وقت متمدن دُنیا کی جو حالت تھی تہذیب و تمدن کے ایک مورخ (۲۰) نے اس کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے:۔
"معلوم ہوتا تھا وہ عظیم الشان تمدن جس کی تعمیر میں چار ہزار برس صرف ہوئے، انتشار اور تباہی کے کنارے آ لگا ہے۔ لہٰذا ڈر تھا۔ کہ انسان پھر کہیں وحشت اور بربریت کی اس زندگی کا شکار نہ ہو جائے جس میں ہر قبیلہ اور ہر فرقہ دوسرے قبیلے اور دوسرے فرقے سے دست و گریبان رہتا اور جس میں کہیں قانون کا تصور تھا نہ نظم و نسق کا۔ قبائلی زندگی کی بنیاد جن تکالیف (۲۱) پر تھی ان میں اب کوئی اثر باقی نہیں رہا تھا اور اس لئے وہ پرانے طور و طریق بھی جن سے اس وقت سلطنتیں کام لے رہی تھیں (۲۲) بے کار اور فرسودہ ہو چکے تھے رہیں وہ تکالیف جو ان کی جگہ عیسائیت نے قائم کیں، سو وہ نظم اور اتحاد کی بجائے اور زیادہ افتراق، ہلاکت اور تباہی پھیلا رہی تھیں۔ یہ زمانہ بڑا پُر آشوب اور خطرناک تھا۔ تہذیب و تمدن کا شجرِ عظیم جس کے برگ و بار اطراف و اکناف عالم میں پھیل گئے تھے اور جس کی شاخوں میں کبھی علم و فن اور ادب کے ثمر ہائے زرّیں لگے تھے۔ بوسیدہ ہو رہا تھا۔ اس کی رگوں میں عقیدت اور احترام کا رس ہی باقی نہیں رہا تھا کہ اس کی زندگی قائم اور برقرار رہتی۔ برعکس اس کے جنگ و جدال کی آندھیوں نے جو آئے دن اُٹھتی تھیں۔ اس کی جڑیں کھوکھلی کر رکھی تھیں اس کا وجود قائم تھا تو صرف عہد قدیم کے رسم و رواج اور قوانین کی بدولت لیکن جو معلوم نہیں کب ختم ہو جائے۔"

(۲۰) حضرت علامہ نے مصنف اور تصنیف دونوں کا حوالہ نہیں دیا۔ کتاب کا نام شاید EMOTION AS BASIS OF CIVILIZATION ہے۔ مترجم

(۲۱) ملاحظہ ہو فرہنگ مصطلحات۔ (مترجم)

صفحہ ۲۲۴ تا ۲۲۵۔ تشکیل جدید الٰہیاتِ اسلامیہ

آگے بڑھیے:۔

"اتنا کچھ کہنے کے بعد مصنف کہتا ہے دنیا کو اس وقت ایک نئی تہذیب کی ضرورت تھی تاکہ وہ اس تہذیب کی جگہ لے سکتی جس کی بنا بادشاہت پر تھی، علیٰ ہٰذا ان نظامات اجتماع کی جن کا نشو ونما رنگ اور خون کے رشتوں پر ہوا۔ حالانکہ اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔

حیاتِ عالم (۲۷) وجدانی طور پر اپنی ضروریات کا مشاہدہ کر لیتی ہے اور اس میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ ہر نازک موقع پر اپنا راستہ آپ متعین کرے۔ چنانچہ یہ وہی چیز ہے جس کو مذہب نے اپنی زبان میں وحیٔ نبوت سے تعبیر کیا۔ پھر یہ بھی ایک طبعی امر تھا کہ اسلام کا ظہور ایک ایسی سادہ مزاج قوم میں ہوتا جو قدیم تہذیبوں کے اثرات سے یکسر پاک اور ایک ایسی سرزمین میں آباد تھی جہاں تین براعظم آپس میں مل جاتے ہیں۔

اس نئی تہذیب نے اتحادِ عالم کی بنا اصولِ توحید پر رکھی۔ لہٰذا بطور اساسِ ریاست اسلام ہی وہ عملی ذریعہ ہے جس سے ہم اس مقصد میں کہ توحید کا یہ اصول ہماری حیاتِ عقلی اور جذباتی میں ایک زندہ عنصر کی حیثیت اختیار کرے، کامیاب ہو سکتے ہیں۔"

(صفحہ ۲۲۴ تا ۲۲۷۔ تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ)

**توحید اساس ہے**

"لہٰذا انسان عبارت ہے جس وحدت سے جب اس کے اعمال و افعال کا مشاہدہ عالمِ خارجی کے حوالے سے کیا جائے تو ہم اسے بدن، لیکن جب ان کی حقیقی غرض و غایت اور نصب العین پر نظر رکھی گئی تو روح کہیں گے۔ گویا بہ حیثیت ایک اصولِ عمل توحید اساس ہے حریت، مساوات اور حفظِ نوعِ انسانی کی۔ اب اگر اس لحاظ سے دیکھا جائے تو از روئے اسلام ریاست کا مطلب ہوگا ہماری یہ کوشش

(۲۷) جو گویا کائنات میں ہر جگہ کام کر رہی ہے۔ نوعِ انسانی کی صورت میں "زندگی"۔
(مترجم)

کہ یہ عظیم اور مثالی اصولِ زمان و مکان کی دنیا (۷۰) میں ایک قوت بن کر ظاہر ہوں (۷۱)، وہ گویا ایک آرزو ہے ان اصولوں کو ایک مخصوص جمعیت بشری (۷۲)، مشہود دیکھنے کی۔ لہٰذا اسلامی ریاست کو حکومت الٰہیہ سے تعبیر کیا جاتا ہے تو انہی معنوں میں۔ ان معنوں میں نہیں کہ ہم اس کی زمامِ اقتدار کسی ایسے خلیفۃ اللہ فی الارض کے ہاتھ میں دے دیں جو اپنی مفروضہ معصومیت کے عذر میں اپنے جور و استبداد پر ہمیشہ ایک پردہ سا ڈال رکھے۔ مگر پھر یہی وہ نکتہ ہے جسے اسلام کے ناقدین اکثر نظر انداز کر دیتے ہیں۔

قرآنِ پاک کے نزدیک حقیقت مطلقہ محض روح ہے اور اس کی زندگی عبادت ہے۔ اس فعالیت سے جس کو ہم زمانًا جلوہ گر دیکھتے ہیں۔ لہٰذا یہ طبعی، اور مادی، اور دنیوی ہی تو ہے جس میں روح کو اپنے اظہار کا موقع ملتا ہے اور جس کے پیش نظر ہر وہ شئے جسے اصطلاحًا (دنیوی) (۷۳)، کہا جاتا ہے، اپنی اصل میں روحانی تسلیم کی جائے گی۔

چنانچہ سب سے بڑی خدمت جو فکرِ حاضر نے اسلام، بلکہ یہ کہنا چاہیئے۔ مذہب کی سرانجام دی ہے، یہ اس کی وہ تنقید ہے جس کے ماتحت اس نے مادی اور طبعی پر نظر ڈالی اور جس کا ماحصل یہ ہے کہ مادی کے بحیثیت مادی کوئی معنی ہی نہیں، الّا یہ کہ ہم اس کی جڑیں روحانی میں تلاش کریں۔ بالفاظ دیگر یہاں کسی ناپاک دنیا کا وجود نہیں۔ برعکس اس کے مادے کی ساری کثرت شے ہی کے ادراکِ ذات کا ایک میدان ہے، اور اس کے لئے جو کچھ بھی ہے مقدس ہے۔ کیا خوب ارشاد فرمایا ہے حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ ہمارے لئے یہ ساری زمین مسجد ہے (۷۴)۔ (صفحہ ۲۲۸ تا ۲۲۹ تشکیل جدید الٰہیات)

---

(۷۳) SECULAR بمقابلہ SPIRITUAL یعنی روحانی۔ (مترجم)

(۷۴) صحیح مسلم۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ہمیں تین باتوں میں سب انسانوں پر فضیلت دی گئی۔ ہماری صفوں کی مثال ملائکہ کی صفوں کی ہے، ہمارے لئے ساری زمین مسجد ٹھہرائی گئی اور جب پانی نہ ملے تو ہمارے لئے اس کی مٹی پاک ٹھہری۔ (مترجم)

**استحکام انسانیت** "برعکس اس کے حزب اصلاح مذہبی نے، جس کی زمام قیادت سعید حلیم پاشا کے ہاتھ میں تھی اس بنیادی حقیقت پر زور دیا کہ اسلام میں عینیت (۸۰) اور اثباتیت (۸۱) دونوں کا امتزاج نہایت خوبی سے ہو چکا ہے یوں بھی اس نے حریت، مساوات اور استحکام انسانیت کی ابدی صداقتوں کو چونکہ ایک وحدت میں سمو دیا، لہٰذا اس کا کوئی وطن نہیں (۸۲) پھر جیسے نہ تو کوئی انگریز ریاضیات ہے، نہ فرانسیسی کیمیا (۸۳) وزیر اعظم ترکی (۸۴) کے نزدیک نہ تو کسی ترکی اسلام کا وجود ہے، نہ عربی، ایرانی اور ہندی (۸۵) اسلام کا۔ مگر پھر جس طرح علمی حقائق کی عالمگیر نوعیت سے ہر قوم کے اندر علم و حکمت کی پرورش اپنی مخصوص شکل میں ہوتی رہتی اور وہ جب مل کر ہمارے علمی سرمائے کی نمائندگی کرتی ہیں۔ ایسے ہی اسلامی صداقتوں کی عالمگیر نوعیت سے بھی ہمارے قومی، اخلاقی اور اجتماعی مقاصد کی دنیا میں گوناگونی پیدا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اس بڑے ہی بابصر اہل قلم کا خیال ہے کہ تہذیب جدید کو، جس کی بنا وطنی انانیت پر ہے، انسان کے دورِ وحشت اور بربریت ہی کی ایک شکل تصور کرنا چاہیئے۔ ذرا آگے:۔

"سعید حلیم پاشا کو افسوس ہے کہ اسلام کے اخلاقی اور اجتماعی مقاصد بھی بعض ایسے توہمات کے زیر اثر جو امم اسلامیہ کے اندر زمانہ قبل اسلام سے کام کر رہے تھے، غیر اسلامی شکل اختیار کرتے چلے گئے ان کے مقاصد (۸۶) بھی تو اسلامی بہت کم ہیں عجمی یا ترکی زیادہ (۸۷) نہ

---

(۸۰) حقیقت۔ مترجم۔ (۸۱) مجاز۔ ملاحظہ ہو خطبہ اوّل، بحث حقیقت و مجاز۔ مترجم۔ (۸۲) گویا وہ ایک عالمگیر انسانی معاشرہ ہے۔ قومی اور نسلی تفریقات قاطع حریت و مساوات اور باعث فساد ہیں۔ مترجم۔ (۸۳) کیونکہ علم ایک عالمگیر حقیقت ہے اس لئے حدود زمان و مکان سے آزاد۔ مترجم۔ (۸۴) سعید حلیم پاشا کے۔ ملاحظہ ہو ان کی تصنیف "اسلام یا شمق۔ مترجم۔ (۸۵) کہ اس کی انفرادی اور اجتماعی ہیئت کا تعین الگ الگ اصولوں پر ہو۔ مترجم۔ (۸۶) اخلاقی۔ اجتماعی۔ مترجم۔ (۸۷) لہٰذا اسلام سے متصادم۔ مترجم ٭ تشکیل جدید الہٰیات اسلامیہ۔ صفحہ ۲۴۲ تا ۲۴۳۔

توحید کا صاف ستھرا اور پاکیزہ چہرہ کفر و شرک کے غبار سے محفوظ رہ سکا۔ نہ قید مقامی کی روز افزوں پابندیوں نے اسلام کے اخلاقی مقاصد کو غیر شخصی (۸۸) اور عالمگیر نوعیت کو قائم اور برقرار رہنے دیا۔ لہٰذا اب کوئی چارہ کار ہے تو یہ کہ ہم اس قشر کو جو سختی کے ساتھ اسلام پر جم گیا ہے۔ اور جس نے زندگی کے ایک ایسے مطمح نظر کو جو سرتاسر حرکت تھا، جامد اور بے تبدیل بنا رکھا ہے، توڑ ڈالیں اور یوں حریت، مساوات اور حفظ و استحکام انسانیت کی ابدی صداقتوں کو پھر سے دریافت کرتے ہوئے اپنے سیاسی، اخلاقی اور اجتماعی مقاصد کی تعمیر ان کے حقیقی، صاف و سادہ اور عالمگیر رنگ میں کریں۔"

**اتحادِ انسانی** "اسلام کی حیثیت لاَ جغرافی ہے۔ اور اس کا مقصد ہے۔ ایک ایسا نمونہ پیش کرنا جو اتحادِ انسانی کی اس شکل کے لیے جو بالآخر ظہور میں آئے گی مختلف، بلکہ یہ کہنا چاہیے باہمدگر حریف نسلوں کو اوّل دولتِ ایمان سے مالا مال کرے اور پھر اس متفرق اور منتشر مجموعے کو ایک ایسی اُمت کی شکل دے۔ جس کا اپنا ایک شعورِ ذات (۱۴۱) ہو۔ یہ کوئی معمولی کام نہیں تھا۔ بایں ہمہ اسلام نے ان اداروں کے ذریعے جن کی تاسیس میں بڑی حکمت سے کام لیا گیا ہے۔ اتنی کامیابی تو ضرور حاصل کر لی ہے کہ اس کے مختلف الجنس پیروں میں کچھ نہ کچھ اجتماعی ارادہ اور اجتماعی ضمیر پیدا ہو گیا ہے۔ اس قسم کے معاشرے کے ارتقاء میں تو بعض ایسے قواعد و ضوابط مثلاً آدابِ اکل و شرب، یا احکام طہارت کا غیر متبدل ہونا بھی جو اجتماعی اعتبار سے بے ضرر ہیں۔ زندگی کے نکتۂ نظر سے بڑا قابلِ قدر ہے، کیونکہ ان سے معاشرے

---

(۸۸) یعنی انسانی۔ مترجم۔

(۱۴۱) بحیثیت ایک قوم۔ کنتم خیر امۃ اخرجت للناس۔ مترجم۔

(تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ۔ صفحہ ۲۵۸ تا ۲۵۹)

میں ایک خاص قسم کا خلوص پرورش پاتا ہے۔ اور اس کے ظاہر و باطن میں ایک ایسی یکسانی اور یک رنگی پیدا ہو جاتی ہے۔ جو تفریق و انتشار اور عدم مجانست کی ان قوتوں کو سدّ باب کر دیتی ہے۔ جو ایک مُرتّب اور محفوظ معاشرے میں خوابیدہ رہتی ہیں۔"

پھر جب ہم ان اُصولوں کا جائزہ لیتے ہیں جن پر قرآنِ مجید نے قانون کی بنا اُٹھائی ہے۔ تو صاف ظاہر ہو جاتا ہے۔ کہ ان سے نہ تو فکرِ انسانی پر کوئی روک قائم ہوتی ہے، نہ وضع آئین و قوانین پر۔ برعکس اس کے ان میں جو وسعت، رواداری اور گنجائش موجود ہے اس سے ہمارے غور و فکر کو اور بھی تحریک ہوتی ہے۔ چنانچہ یہی اصول تھے۔ جو فقہائے متقدمین کے پیشِ نظر تھے اور جن سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انہوں نے متعدد نظامات قانون قائم کیے۔ بعینہٖ جن حضرات نے تاریخِ اسلام کا مطالعہ کیا ہے یہ خوب جانتے ہیں کہ بہ لحاظ ایک نظامِ مدنیت اور سیاست اسلام نے جو کامیابی حاصل کی ہے، اس کا نصف حصّہ ہمارے فقہا کی قانونی ذہانت اور فطانت کا مرہونِ منّت ہے۔"

(تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ صفحہ ۲۵۸ تا ۲۵۹)

## بُنیادی تصورات کی اساس وحی پر ہے

"وہ بنیادی اُصول (۱۹۰) جن کی نوعیت عالمگیر ہو اور جن سے انسانی معاشرے کا ارتقأ رُوحانی اساس پر ہوتا رہے۔ اس میں کوئی شک نہیں جدید یورپ نے اسی نہج پر متعدد عینی نظامات قائم کیے، لیکن تجربہ کہتا ہے۔ کہ جس حق و صداقت کا انکشاف عقلِ محض کی وساطت سے ہو اس سے ایمان و یقین میں وہ حرارت پیدا نہیں ہوتی جو وحی و تنزیل کی بدولت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عقلِ محض نے انسان کو بہت کم متأثر کیا۔ برعکس اس کے مذہب کو دیکھئے تو اس نے افراد میں اضافہ مراتب کے ساتھ ساتھ معاشروں تک کو بدل ڈالا۔ لہٰذا

---

(۱۹۰) باصطلاح قرآن مجید و محکمات۔ مترجم۔

یورپ کے علمی فلسفہ کو کبھی یہ درجہ حاصل نہیں ہوا کہ زندگی کا کوئی مؤثر جزو بن سکے اور اس لئے اب حالت یہ ہے کہ یورپ کی فساد زدہ خودی باہمدگر حریف جمہورتوں کی شکل میں جن کا مقصد وحید ہی یہ ہے ۔ کہ دولتمندوں کی خاطر ناداروں کا حق چھینے اپنے تقاضے پورا کر رہی ہے یقین کیجئے یورپ سے بڑھ کر آج انسان کے اخلاقی ارتقاء میں بڑی رکاوٹ اور کوئی نہیں ۔ برعکس اس کے مسلمانوں کے نزدیک ان بنیادی تصورات کی اساس چونکہ وحی و تنزیل پر ہے جس کا صدور ہی زندگی کی انتہائی گہرائیوں سے ہوتا ہے ۔ لہٰذا وہ اپنی ظاہری خارجیت (۱۹۱) کو ایک اندرونی حقیقت میں بدل دیتی ہے ۔

(تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ صفحہ ۲۷۵ تا ۲۷۶)

اب ہم "تشکیل جدید الٰہیات" میں سے خطبہ اول کے وہ اقتباسات جو ہمارے موضوع سے متعلق ہیں ۔ نذرِ قارئین کر رہے ہیں ۔

ملاحظہ فرمایئے :۔

**فطرت کی تسخیر** | پچھلے پانچسو برس سے الٰہیات اسلامیہ پر جمود کی ایک کیفیت طاری ہے ۔ وہ دن گئے جب یورپ کے افکار دنیائے اسلام سے متاثر ہوا کرتے تھے ۔ تاریخ حاضرہ کا سب سے زیادہ توجہ طلب منظر یہ ہے کہ ذہنی اعتبار سے عالم اسلام نہایت تیزی سے مغرب کی طرف بڑھ رہا ہے ۔ اس تحریک میں بجائے خود کوئی خرابی نہیں کیونکہ جہاں تک علم و حکمت کا تعلق ہے ، مغربی تہذیب دراصل اسلامی تہذیب ہی کے بعض پہلوؤں کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے (۳۸) لیکن اندیشہ یہ ہے کہ اس تہذیب کی ظاہری آب و تاب کہیں اس تحریک میں حارج نہ ہو جائے اور ہم اس کے حقیقی جوہر ، ضمیر اور باطن تک پہنچنے سے قاصر رہیں ۔

---

(۱۹۱) بمقابلہ ہماری ذات کے ۔ ملاحظہ ہو تصریح (ح) ۔ مترجم ۔

(۱۹۲) کیونکہ اس سے درحقیقت ہماری فطرت ہی کی ترجمانی ہوتی ہے ۔ ذالکم خیر لکم ان کنتم تعلمون (۷ : ۵) ۔ مترجم ۔

(۳۸) ملاحظہ ہو تصریح (ح) آخری بحث میں ۔ مترجم ۔

بات یہ ہے کہ پچھلی متعدد صدیوں میں جب عالم اسلام پر ذہنی غفلت اور بیہوشی کی نیند طاری تھی، یورپ نے ان مسائل میں نہایت گہرے غور و فکر سے کام لیا جن سے کبھی مسلمان فلسفیوں اور سائنس دانوں کو دلی شغف رہا ہے (۳۹) قرون وسطیٰ سے لے کر اب تک جب اسلامی مذہب الہیات کی تکمیل ہوئی انسانی فکر اور تجربے کی دنیا میں غیر معمولی وسعت پیدا ہو چکی ہے۔ فطرت کی تسخیر اور اس پر غلبے نے انسان کے اندر ایک تازہ یقین اور ان قوتوں پر جن سے اس کے ماحول نے ترکیب پائی فضیلت کا ایک نیا احساس پیدا کر دیا ہے۔ نئے نئے نقطہ ہائے نظر ہمارے سامنے آ رہے ہیں۔ قدیم مسائل کو جدید تجربات کی روشنی میں حل کیا جا رہا ہے، نیز کئی ایک اور نئے مسائل پیدا ہو گئے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے عقل انسانی زمان و مکان اور علیت۔ ایسے بنیادی مقولات کی دنیا سے بھی آگے نکل جائے گی۔ پھر جُوں جُوں افکار سائنس ترقی کر رہے ہیں۔ انسانی علم و ادراک کے متعلق بھی ہمارے تصورات بدل رہے ہیں"

**حقیقی مقصد** | قرآن مجید کا حقیقی مقصد تو یہ ہے کہ انسان اپنے اندر ان گوناگوں روابط کا ایک اعلیٰ اور برتر شعور پیدا کرے جو اس کے اور کائنات کے درمیان قائم ہیں۔ قرآنی تعلیمات کا یہی وہ بنیادی پہلو ہے جس کے پیش نظر گوئٹے (۴۴) نے بہ اعتبار ایک تعلیمی قوت اسلام پر من حیث الکل تبصرہ کرتے ہوئے ایکرمن (۴۵) سے کہا تھا "تم نے دیکھا اس تعلیم میں کوئی خامی نہیں۔ ہمارا کوئی نظام اور ہمیں پر کیا موقوف ہے کوئی انسان بھی اس سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔"

دراصل اسلام کا مسئلہ ان دو قوتوں کا پیدا کردہ ہے جو باہم گر متصادم بھی ہیں اور متجاذب بھی اور جن کی نمایندگی گویا مذہب اور تمدن سے ہوتی ہے (۴۶)
(تشکیل جدید الہیات اسلامیہ۔ صفحہ ۱۱ تا ۱۳)

---

(۳۹) لہٰذا مغربی فلسفہ کے مسائل سرے سے مغربی ذہنیت کی پیداوار نہیں جیسا کہ تاریخ فلسفہ کے غلط مطالعہ اور غلط تعبیر سے خیال ہوتا ہے۔ مترجم

**سمع و بصر** اب جہاں تک اسلام کا تعلق ہے ہم کہہ سکتے ہیں۔ کہ اس کی عقلی اساسات کی جستجو کا آغاز آں حضرت صلعم کی ذات مبارک ہی سے ہو گیا تھا۔ آپ ہمیشہ دُعا فرماتے :-

"اے اللہ مجھ کو اشیاء کی حقیقت سے آگاہ کر!" (۱۳)

آگے چل کر صوفیہ اور متکلمین اسلام نے اس سلسلے میں جو خدمات سرانجام دیں وُہ ہماری تاریخ ثقافت کا ایک نہایت درجہ سبق آموز باب ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ انہیں افکار کے ایک مرتب نظام کی کیسی سچی طلب تھی۔ اور وُہ حق سے کس قدر مخلصانہ عقیدت رکھتے تھے۔ مزید یہ کہ وہ کیا حدُود اور کیا علائق تھے۔ جن کی وجہ سے الٰہیات اسلامیہ کی مختلف تحریکیں اتنی بار آور نہیں ہوئیں جتنی کسی دوسرے عہد میں ہوئیں پھر جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں۔ فلسفۂ یونان کی حیثیت تاریخ اسلام میں ایک زبردست ثقافتی قوت کی رہی ہے لیکن جب ہم علمِ کلام کے ان مختلف مذاہب پر نظر ڈالتے ہیں جن کا ظہور فلسفۂ یونان کے زیر اثر ہُوا اور ان کا مقابلہ قُرآن پاک سے کرتے ہیں۔ تو یہ اہم حقیقت ہمارے سامنے آجاتی ہے کہ یُونانی فلسفہ نے مفکّرین اسلام کے مطمح نظر میں اگرچہ بہت کچھ وسعت پیدا کر دی تھی۔ مگر بحیثیت مجموعی قُرآن مجید میں اُن کی بصیرت محدُود ہو کر رہ گئی۔

سقراط کی توجہ صرف عالمِ انسانی پر تھی۔ اس کے نزدیک انسان کے مطالعے کا بہترین موضوع انسان ہی ہو سکتا ہے۔ نہ کہ نباتات اور حشرات، یا ستاروں کی دنیا۔ مگر اس سے کس قدر مختلف ہیں۔ قُرآن پاک کی تعلیمات، جس کا ارشاد ہے کہ شہد کی مکھی ایسی حقیر شے بھی وحی الٰہی سے بہرہ ور ہوئی اور جس نے بار بار اس امر کی دعوت دی کہ ہواؤں کے مسلسل تغیّر و تبدّل کا مشاہدہ کیا جائے۔ نیز دن رات کے اختلاف، تاروں بھرے آسمان اور بادلوں کا جو فضائے لا محدود میں تیرتے پھرتے

(۱۳) اللّٰھم ارنی حقائق الاشیاء کما ھی - اللّٰھم ارنی الاشیاء کما ھی

ہیں سقراط کے شاگرد افلاطون کو بھی ادراک بالحواس سے نفرت ہی ہی اس کا خیال تھا ادراک بالحواس سے کوئی حقیقی علم تو حاصل نہیں ہوتا۔ ہم اس کی بنا پر صرف ایک رائے قائم کر سکتے ہیں۔ برعکس اس کے قرآنِ مجید نے سمع و بصر (۱۵) کا شمار اللہ تعالیٰ کے گراں قدر انعامات میں کیا اور عنداللہ اپنے اعمال وافعال کا جواب دہ ٹھہرایا۔ یہ حقیقت تھی جسے شروع شروع کے مسلمانوں نے قرآن مجید کے مطالعہ میں یونانی ظن وتخمین سے مسحور ہو کر نظر انداز کر دیا۔ بہ الفاظ دیگر انہوں نے اس کا مطالعہ بھی فکر یونان ہی کی روشنی میں کیا اور پھر کہیں دو سو برس میں جا کر مجھے اور وہ بھی پورے طور سے نہیں کہ قرآنِ پاک کی روح اساسًا یونانیت (۱۶) کے منافی ہے۔

اس انکشاف نے ان کے اندر جو ذہنی بغاوت پیدا کر دی تھی۔ اس کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ آج تک نہیں کیا گیا۔ بہرحال یہ کچھ اس بغاوت اور کچھ غزالی کے ذاتی حالات کا تقاضا تھا کہ امام موصوف نے مذہب کی بنا فلسفیانہ تشکیک پر رکھی۔ حالانکہ یہ مذہب کی کوئی محکم اساس ہے نہ تعلیماتِ قرآنی کے مطابق۔"

(تشکیلِ جدید الٰہیات صفحہ ۴ تا ۵)

**جامد کائنات نہیں** "لہٰذا سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآنِ پاک کے نزدیک اس کائنات کی جس میں ہم زندگی بسر کر رہے ہیں نوعیت کیا ہے۔

اوّل یہ کہ اس کی آفرینش اس لئے نہیں ہوئی کہ تخلیق کا عمل ایک کھیل ہے (۵۸)

---

(۱۴) ملاحظہ ہو تصریح (ج) آخر بحث میں۔ مترجم

(۱۵) بطور ذریعۂ علم اعضائے حواس کی حیثیت سے۔ مترجم۔

(۱۶) ملاحظہ ہو تصریح (د) آخر بحث میں۔ مترجم۔

(۵۸) جیسے رام لیلا۔ مترجم

وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ۝ مَا
خَلَقْنٰهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ (۵۹) وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ
(۳۸ : ۴۴)

وہ ایک حقیقت ہے جس کا اعتراف کرنا پڑے گا۔
اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ
وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ۝ الَّذِیْنَ یَذْكُرُوْنَ
اللّٰهَ قِیٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِهِمْ وَیَتَفَكَّرُوْنَ فِیْ
خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۝ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا
بَاطِلًا ج (۱۸۸ ۲۳)

اور اس کی ترکیب بھی اس طرح ہوئی کہ اس میں مزید وسعت کی گنجائش ہے یہ کوئی جامد کائنات نہیں نہ ایک ایسا مصنوع جس کی تکمیل ختم ہو چکی اور جو بے حرکت اور تغیر و تبدل ہے۔ برعکس اس کے معلوم ہوتا ہے اس کے باطن میں ایک نئی آفرینش کا خواب پوشیدہ ہے۔
قُلْ سِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَیْفَ بَدَاَ الْخَلْقَ ثُمَّ
اللّٰهُ یُنْشِئُ النَّشْاَةَ الْاٰخِرَةَ ط (۲۹:۱۹)

دراصل کائنات کا یہ پُر اسرار اہتزاز اور تحریک و علی ہذا زمانے کی یہ خاموش روانی جس کا احساس ہم انسانوں کو دن اور رات کی گردش میں ہوتا ہے۔

قرآن پاک کے نزدیک ایک بہت بڑی آیت ہے اللہ کی!
یُقَلِّبُ اللّٰهُ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ ط اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِی
الْاَبْصَارِ ۝ (۲۴ : ۴۴)
(تشکیل جدید الٰہیاتِ اسلامیہ صفحہ ۱۵ تا ۱۶)

## پہل انسان کی طرف سے ہو

انسان ہی کے حصے میں یہ سعادت آئی ہے کہ اس عالم کی گہری سے گہری آرزوؤں میں شریک ہو جو اس کے گرد و پیش موجود ہے اور اپنی، جلی، ہذا کائنات کی تقدیر خود متشکل کرے۔ کبھی اس کی قوتوں سے توافق پیدا کرتے

ہوئے اور کبھی پوری طاقت سے کام لیتے ہوئے اپنی غرض و غایت کے مطابق ڈھال کر۔ اس لحاظ بہ لحاظ پیش رس، اور تغیر زا عمل میں قدرت بھی اس کا ساتھ دیتا ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ پہل انسان کی طرف سے ہو۔ إِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِأَنْفُسِهِمْ

(۱۳:۱۲)

لیکن اگر وہ پہل نہیں کرتا، اپنی ذات کی وسعتوں اور گوناگوں صلاحیتوں کو ترقی نہیں دیتا۔ زندگی کی بڑھتی ہوئی رَو کا کوئی تقاضا اپنے اندرون ذات میں محسوس نہیں کرتا تو اس کی رُوح پتھر کی طرح سخت ہوجاتی ہے اور وہ گر کر بے جان مادے کی سطح پر جا پہنچتا ہے۔ اس کی زندگی علیٰ ہذا پے بہ پے ترقی پذیر رُوح کے سفر کا دارومدار اس بات پر ہے کہ اس حقیقت سے رابطہ پیدا کرے جس نے اس کا ہر چہار طرف سے احاطہ کر رکھا ہے یہ رابطے علم کی بدولت قائم ہوتے ہیں اور علم عبارت ہے ادراک بالحس سے جس میں ہم اپنی عقل و فہم (۶۱) کی مدد سے اور زیادہ وسعت پیدا کر لیتے ہیں۔" (تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ۔ صفحہ ۱۸ تا ۱۹)

## فطرت کے مشاہدے میں غور و فکر

"اس میں شک نہیں کہ قرآنِ پاک نے فطرت کے مشاہدے میں غور و فکر کی ترغیب دلائی تو اس لئے کہ ہم اس حقیقت کا شعور پیدا کریں جس کی عالمِ فطرت کو اس نے ایک آیت ٹھہرایا ہے۔ لیکن یہاں توجہ طلب امر قرآن کی وہ اختیاری (۶۳) روش ہے جس سے مسلمانوں کے اندر عالمِ واقعیت کا احترام پیدا ہوا اور جس کی بدولت آگے چل کر انہوں نے علومِ جدیدہ کی بنیاد ڈالی۔ پھر یہ امر کہ اختیار اور مشاہدے کی اس رُوح کو اس زمانے میں بیدار کیا جو ذاتِ الٰہیہ کی جستجو میں مرئی کو بے حقیقت سمجھتے ہوئے سرے سے نظر انداز کر چکا تھا، کوئی معمولی واقعہ نہیں

(۶۱) یعنی فکر و استدلال اور تفصیلات و جزئیات میں نظم و ترتیب۔

(۶۳) یعنی اپنے حواس سے کام لیتے ہوئے مظاہر و موجودات عالم کے مطالعہ اور مشاہدے کی مترجم

جیساکہ ہم اس سے پہلے عرض کر آئے ہیں۔

قرآنِ مجید کے نزدیک کائنات کے اندر کوئی بہت بڑا مقصد کام کر رہا ہے۔ یہ فطرت ہی کے پیہم انقلابات ہیں جن کے پیش نظر ہم مجبور ہو جاتے ہیں کہ اپنے آپ کو نئے نئے سانچوں میں ڈال دیں۔ پھر جُوں جُوں ہم اپنی ذہنی کاوشوں سے علائقِ فطرت پر غلبہ حاصل کرنے کی سعی کرتے ہیں ہماری زندگی میں وسعت اور تنوع پیدا ہوتا اور ہماری بصیرت تیز تر ہو جاتی ہے۔ یونہی ہم اس قابل ہوتے ہیں کہ محسوسات ومدرکات کے زیادہ نازک پہلو اپنی گرفت میں لے آئیں اور یونہی اشیاء کے مرورِ زمانی (۶۴) پر غور و فکر کرتے کرتے ہم اپنے اندر یہ استعداد پیدا کر لیتے ہیں کہ لازمانی کا تعقل کر سکیں (۶۵)

حقیقت اپنے تمام مظاہر میں موجود ہے اور انسان جو ایک متزاحم ماحول میں زندگی بسر کر رہا ہے، مرئی کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ لہٰذا قرآنِ پاک میں ہمیں تغیر نے ایسی زبردست حقیقت کی طرف متوجہ کیا کیونکہ اگر ہم اس سے غفلت برتتے یا اسے قابو میں لانے کی کوشش نہیں کرتے تو ناممکن ہے کوئی زندہ اور پائیدار تمدن قائم کر سکیں۔

ایشیا اور واقعہ یہ ہے کہ دُنیائے قدیم کے سارے تمدن محض اس لئے ناکام رہے کہ انہوں نے حقیقت کی طرف داخل کی راہ سے قدم بڑھایا اور پھر داخل سے خارج کا۔ یوں انہوں نے نظریات تو قائم کر لئے۔ مگر طاقت سے محروم ہو گئے اور ظاہر ہے کہ صرف نظریوں کی بنا پر کوئی پائیدار تمدن قائم نہیں ہو سکتا۔

یہی وجہ ہے کہ حقیقتِ مطلقہ کے تمام و کمال لقا کی خاطر ادراک بالحواس کے ساتھ ساتھ اس چیز کے مدرکات کا اضافہ بھی ضروری ہے جسے قرآن پاک نے فوادٗ یا قلب سے تعبیر کیا۔ (تشکیلِ جدیدِ الٰہیات صفحہ ۲۱ تا ۲۳)

---

(۶۴) یا اگر زبان اجازت دے تو ان کی زمانیتٗ کا۔ مترجم۔

(۶۵) یعنی زمانی کی طرح، لازمانی، بھی بطور ایک حقیقت ہماری سمجھ میں آجائے۔

## زمین انسان کا مستقر اور متاع ہے

عہد نامہ عتیق نے آدم کے جرم نافرمانی کی بنا پر زمین کو ملعون ٹھہرایا۔ برعکس اس کے قرآنِ مجید کے نزدیک وہ انسان کا مستقر اور متاع ہے (۸۲) جس کے لئے اسے اللہ تعالے کا شکرگزار ہونا چاہیئے۔

وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ؀

پھر اس امر کا بھی ثبوت نہیں کہ لفظ جنّت (باغ) کا اشارہ یہاں اس فوق الحواس بہشت کی طرف ہے جس سے کہا جاتا ہے انسان زمین پر گرا تھا۔ قرآنِ پاک نے کہیں یہ نہیں کہا کہ انسان کی حیثیت اس میں اجنبی کی ہے۔ واللہ انبتکم من الارض نباتا (۸۳) لہٰذا یہ جنّت جس کا اس قصّے میں ذکر آیا ہے، نیکوکاروں کا وہ مسکن نہیں جہاں وہ ہمیشہ رہنے چلے جائیں گے (۸۴) کیونکہ ان معنوں میں جہاں کہیں جنّت کا ذکر آیا ہے، اس کی تعریف قرآنِ مجید نے ان الفاظ میں کی ہے۔ تینا ذعون فیھا کاسا لا لغو فیھا ولا تاثیما (۸۵) نیز ان الفاظ میں لا یمسھم فیھا نصب وما ھم منھا بمخرجین۔ لیکن وہ جنّت جس کا ذکر اس قصّے میں آیا ہے، اس میں تو انسان نے سب سے پہلے گناہ ہی کا ارتکاب کیا جس کی پاداش میں اُسے وہاں سے نکال دیا گیا۔ دراصل قرآن مجید جہاں کہیں کوئی لفظ استعمال کرتا ہے، وہیں اس کے معنی بھی بیان کردیتا ہے۔ چنانچہ آگے چل کر اس قصّے کی دُوسری حکایت میں اسی باغ (۸۷) کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے دان لك الا تجوع فیھا ولا تعری ہ و انك لا تظمؤا فیھا ولا تضحیٰ (۸۸) اور اس لئے مَیں سمجھتا ہوں قرآنِ پاک کی اس روایت سے لفظ جنّت کا اشارہ حیاتِ

---

(۸۳) (۷۱ : ۱۷) (۸۴) قلب ۔ خلود ۔ مترجم

(۸۵) (۵۲ : ۲۳) (۸۶) (۱۵ : ۴۸)

(۸۷) یعنی جنّت (۸۸) (۲۰ : ۱۱۸)

انسانی کے اس ابتدائی دور کی طرف ہے جس میں انسان کا اپنے ماحول سے ابھی عملاً کوئی رشتہ قائم نہیں ہوا تھا۔ اور جس میں وہ اس تکلیف دہ احساس سے بے خبر تھا جو اپنی ضروریات میں محتاجی کو دیکھتے ہوئے ہمارے دل میں پیدا ہوتا ہے لیکن جو گویا تمہید ہے تہذیب و تمدّن کی (۸۹)

(تشکیلِ جدید الٰہیات صفحہ ۱۲۶ و ۱۲۷)

**قانون سازی** اُس امر کا بھی یقین ہے کہ جونہی فقہ اسلام کا مطالعہ نمائر نگاہوں سے کیا گیا۔ اس کے موجودہ ناقدین کی یہ رائے بدل جائے گی کہ اسلامی قانون جامد یا مزید نشو و نما کے ناقابل ہے۔ بدقسمتی سے اس ملک (۱۲۶) کے قدامت پسند مسلم عوام کو ابھی یہ گوارا نہیں کہ فقہ اسلامی کی بحث میں کوئی تنقیدی نقطۂ نظر اختیار کیا جائے۔ وہ بات بات پر خفا ہو جاتے اور ذرا سی تحریک پر بھی فرقہ دارانہ نزاعات کا دروازہ کھول دیتے ہیں (۱۲۷) بایں ہمہ ہم اس بحث میں چند معروضات پیش کریں گے

۱۔ اوّل یہ کہ صدرِ اسلام سے لے کر قریب قریب اس زمانے تک جب عباسی برسرِ اقتدار آئے قرآن مجید کے سوا مسلمانوں کا کوئی تحریری قانون نہیں تھا (۱۲۸)

۲۔ دوسرے یہ کہ قرنِ اوّل کے تقریباً وسط سے لے کر قرنِ چہارم کے آغاز (۱۲۹) تک عالمِ اسلام میں فقہ اور قانون کے کم از کم انیس مذاہب کا ظہور ہو چکا تھا جس سے پتہ چلتا ہے کہ فقہائے متقدمین نے ایک بڑھتے ہوئے تمدّن کی ضروریات کے پیشِ نظر کس سعی اور جدّ و جہد سے کام لیا۔ بات یہ ہے کہ فتوحات میں توسیع اور اضافے کے ساتھ ساتھ جب عالمِ اسلام کے مطمحِ نظر میں بھی وسعت پیدا ہوئی تو اس سے فقہائے

(۸۹) اور جو ایک معنوں میں عبارت ہے۔ تسخیرِ فطرت اور زندگی کے نظم و انضباط سے۔ مترجم۔
(۱۲۶) غیر منقسم ہندوستان کے۔ مترجم۔ (۱۲۷) لیکن اس کی وجہ وہی ہے جو حضرت علاّمہ نے "رموزِ بے خودی" میں بیان کی تھی۔ مترجم۔ (۱۲۸) بشکل ضابطۂ قانون و دستور۔ مترجم۔
(۱۲۹) یعنی دسویں اور گیارہویں صدی مسیحی تک۔ وسطی عباسی دور میں۔ مترجم۔

متقدمین کو بھی ہر معاملے میں وسعتِ نظر سے کام لینا پڑا۔ وہ مجبور ہو گئے کہ جو قومیں اسلام قبول کر رہی ہیں۔ اُن کے عادات وخصائل اور مقامی حالات کا مطالعہ کریں۔ یہی وجہ ہے کہ جب اس وقت کی سیاسی اور علمی تاریخ کی روشنی میں ہم ان مذاہب فقہ پر نظر ڈالتے ہیں تو اس حقیقت کا انکشاف ہو جاتا ہے کہ وہ اس سلسلۂ تعبیر و تاویل میں استخراج کی بجائے رفتہ رفتہ استقرائی منہاج اختیار کرتے چلے گئے۔

۳۔ تیسرے یہ کہ اسلامی قانون کے متفق فیہ مآخذ علیٰ ہٰذا اس سلسلے میں جو نزاعات قائم ہوئے ان کا لحاظ رکھتے ہوئے دیکھا جائے تو مذاہب فقہ کے مفروضہ جمود کی کوئی حقیقت باقی نہیں رہتی، بلکہ صاف ظاہر ہے کہ اسلامی قانون میں مزید ارتقا اور نشوونما کا پورا پورا امکان ہے۔"
(تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ صفحہ ۲۵۴، ۲۵۵)

## شاہ ولی اللہ رح

"شاہ ولی اللہ رح کہتے ہیں انبیاء کا عام طریق تعلیم تو یہی ہے کہ وہ جس قوم میں مبعوث ہوتے ہیں۔ ان پر اس قوم کے رسم ورواج اور عادات وخصائص کے مطابق شریعت نازل کی جاتی ہے لیکن جس نبی کے سامنے ہمہ گیر اُصول ہیں اس پر نہ تو مختلف قوموں کے لئے مختلف اُصول نازل کئے جائیں گے، نہ یہ ممکن ہے کہ وہ ہر قوم کو اپنی ضروریات کے لئے الگ الگ اُصول عمل متعین کرنے کی اجازت دے۔ وہ کسی قوم کی تربیت کرتا اور پھر ایک عالمگیر شریعت کی تشکیل میں اس سے تمہید کا کام لیتا ہے (۱۵۸) لیکن ایسا کرنے میں وہ اگرچہ انہیں اُصولوں کو حرکت

(۱۵۸) یہاں شاہ صاحبؒ کی عبارت سے ایک غلط فہمی کا اندیشہ ہے لہٰذا اس امر کی صراحت ناگزیر ہو جاتی ہے کہ قرآنِ پاک میں تو یہی "عالمگیر شریعت" نازل ہوئی جس کی طرف شاہ صاحبؒ ارشاد فرما رہے ہیں۔ رہا اس کے اطلاق میں قوموں کے احوال اور خصائص کا مسئلہ سو یہ قانون کا مسئلہ ہے شریعت کا نہیں۔ قرآنِ پاک کا صاف وصریح ارشاد ہے۔ شرع لکم من الدین ما وصی به نوحا والذی اوحینا الیك وما وصینا به ابراهیم وموسٰی وعیسٰی ان اقیموا الدین ولا تتفرقوا فیه (۴۲ : ۱۳)۔ مترجم۔

دیتا ہے۔ جو ساری نوعِ انسانی کی حیاتِ اجتماعیہ میں کارفرما ہیں، پھر بھی ہر معاملے اور ہر موقع پر عملاً اُن کا اطلاق اپنی قوم کی مخصوص عادات کے مطابق ہی کرتا ہے۔ لہٰذا اس طرح جو احکام وضع ہوتے ہیں (مثلاً تعزیرات) ایک لحاظ سے اسی قوم کے لئے مخصوص ہونگے۔ پھر چونکہ احکام مقصود بالذات نہیں، اس لئے یہ بھی ضروری نہیں کہ ان کو آیندہ نسلوں کے لئے بھی واجب ٹھہرایا جائے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ امام ابوحنیفہؒ نے جو اسلام کی عالمگیر نوعیت کو خوب سمجھ گئے تھے۔ احادیث سے اعتناً نہیں کیا۔" (۱۵۹)

## عہدِ حاضر کے مسلمان

"لہٰذا بحیثیت مجموعی دیکھا جائے تو میری رائے میں امام موصوف نے فقہی احادیث کے بارے میں جو روش اختیار کی سرتاسر جائز اور درست تھی۔ اندریں صورت اگر آزادیٔ اجتہاد کی وہ تحریک جو اس وقت دنیائے اسلام میں پھیل رہی ہے۔ احادیث کو بلا جرح و تنقید قانون کا ماخذ تسلیم کرنے کے لئے طیار نہیں تو اس سے اہل سنت والجماعت کے ایک امام الائمہ ہی کی پیروی مقصود ہے۔" (۱۶۱) تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ صفحہ ۲۶۶ تا ۲۶۷

## نصوص قرآنی کی حدود کے اندر

"بہرحال اگر مذہب حنفی کے اس بنیادی اُصول قانون یعنی قیاس کو ٹھیک ٹھیک سمجھ کر کام میں لایا جائے تو جیسا کہ امام شافعیؒ کا ارشاد ہے وہ اجتہاد ہی کا دوسرا نام ہے (۱۸۱) اور اس لئے نصوصِ قرآنی کی حدود کے اندر ہمیں اس کے استعمال کی پوری پوری آزادی ہونی چاہیئے۔ پھر بحیثیت ایک اُصولِ قانون اس کی اہمیت کا اندازہ صرف اس بات سے ہو جاتا ہے۔ کہ یہ قول قاضی شوکانی زیادہ تر فقہا اس امر

---

(۱۵۹) یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ احتیاط سے کام لیا۔ مترجم۔

تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ صفحہ ۲۶۵ و ۲۶۶

(۱۸۱) حضرت امام کہتے ہیں۔ قیاس کیا ہے؟ اجتہاد یا قیاس سے الگ کوئی دوسری چیز؟ میں کہتا ہوں وہ ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ مترجم۔

کے قائل تھے کہ حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں بھی قیاس سے کام لینے کی اجازت تھی (۱۸۲) لہٰذا یہ کہنا کہ اجتہاد کا دروازہ بند ہو چکا ہے محض ایک افسانہ ہے جس کا خیال کچھ اس لئے پیدا ہوا کہ اسلامی افکار فقہ ایک معیّن صورت اختیار کرتے چلے گئے اور کچھ اسی ذہنی تسلسل کے باعث کہ روحانی زوال کی حالت میں لوگ اپنے اکابر مفکّرین کو بتوں کی طرح پوجنا شروع کر دیتے ہیں۔ لہٰذا اگر فقہائے متاخّرین میں سے بھی بعض نے اس افسانے کی حمایت کی ہے تو کیا مضائقہ ہے عہدِ حاضر کے مسلمان کبھی یہ گوارا نہیں کریں گے کہ اپنی آزادیٔ ذہن کو خود اپنے ہاتھوں قربان کر دیں"

(تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ صفحہ ۲۷۳ تا ۲۷۴)

مندرجہ بالا اقتباسات سے قارئین کرام دین کے متعلق حضرت علّامہؒ کے خیالات و نظریات کا اندازہ فرما سکیں گے اور یہ بھی معلوم کر سکیں گے کہ آپ کا اجتہادی نکتۂ نظر کیا ہے۔ اب اس سے اگلا باب شروع ہوتا ہے ؛

---

(۱۸۲) ارشاد الفحول، ص ۱۵۸ ۔ مترجم۔

## پانچواں باب

# توحید

انسان میں جب سے تمدنی شعور بیدار ہوا۔ خدا کی طرف سے بذریعہ وحی ہدایت ملتی رہی کہ خدا کا صحیح تصور کیا ہے۔ اس وحی کا سرچشمہ ایک اور شروع سے آخر تک خدا کا تصور بھی ایک ہی رہا۔ انسان نے ذہنی اور قیاسی معبود بھی تراشے۔ اتحادِ انسانی کے لئے یہ ضروری تھا کہ ان قیاسی معبودوں اور ذہنی خداؤں کے بجائے حقیقی اِلٰہ کا صاف و شفاف اور پاکیزہ و منزّہ تصور ہو جس میں ذہنی رنگ آمیزی کا شائبہ تک نہ ہو۔ وحی کا یہ سلسلہ اسی نہج و انداز سے جاری رہا۔ انبیائے کرامؑ کی وساطت سے یہ روشنی منزلِ حیات کی طرف انسان کی رہبری و رہنمائی کرتی رہی تا آنکہ ذہنِ انسانی سنِّ بلوغت کو پہنچ گیا تو خدا کا بلند و بالا۔ اعلیٰ و ارفع تصور قرآن عزیز میں دے دیا گیا۔ یہ حقیقت ہے کہ جو تصور قرآن نے پیش کیا ہے اس سے مکمل ترین اور بلند ترین تصور اور کہیں نہیں ملتا۔ توحید کا صاف ستھرا اور پاکیزہ چہرہ جو قرآن نے دکھایا ہے اس کی جھلک کہیں اور نظر نہیں آتی۔ استحکامِ انسانیت کے لئے جو ٹھوس پن اور مضبوطی اس تصورِ اِلٰہ میں پائی جاتی ہے۔ اور اتحادِ عالم کے لئے جس انداز و خوبی سے قرآنی تصورِ اِلٰہ قافلہ انسانیت کو نشانِ منزل دیتا ہے اس کی مثال و نظیر باقی تصورات میں نہیں ملتی۔ یہ اصولِ توحید صفاتِ خداوندی کے جس معیار (اسٹینڈرڈ) کو سامنے لاتا ہے اس سے انسانی ذات کی تعمیر و تکمیل میں پوری پوری مدد ملتی ہے۔ قرآن نے نہایت حسن و خوبی اور وضاحت و صراحت سے اس عظیم حقیقت کو پیش کیا ہے۔ اس نے خدا کے خصائص و صفات کو اسماء الحسنیٰ سے تعبیر کیا ہے۔ قرآن نے ظلمت کدۂ انسانیت میں ضیائے شعور پھیلا کر انسان کو توہم پرستی کی تاریکیوں سے نکالا اور بتلایا کہ انسان اپنی ذات کی تکمیل و تعمیر کے لئے ان صفاتی جوہروں کو اپنے اندر پیدا کرے تو یہ حقیقی زندگی

کی شہریتوں سے متمتع ہو سکتا ہے۔

قرآن نے لا الٰہ میں پوشیدہ رازِ حقیقت کو سمجھایا کہ جس طرح قرآن کا پیش کردہ خدا لاشریک ہے جو اُمت قوانینِ خداوندی پر محکم و اٹل یقین رکھتے ہوئے اُن کی روشنی میں اپنی نشوونما اور تربیت کرتی ہے۔ وہ ملت بھی لاشریک بن جاتی ہے۔ جس طرح قرآن کا خدا الصمد ہے وہ ملت بھی خارجی سہاروں سے بے نیاز اور غیر کی محتاجی سے آزاد ہوتی ہے۔ یہ ملت نسل و وطن۔ رنگ و خون کے امتیازات و اختلافات کو مٹا کر وحدتِ انسانیت کا موجب بنتی ہے۔ یہ ایک عالمگیر برادری کے قیام و استحکام کی ضامن قرار پاتی ہے۔ یہ توحید کو عملی شعار بنا کر انسانوں میں محکم اور پائیدار رشتہ استوار کرتی ہے۔ توحید ان میں وحدتِ فکر و نظر پیدا کرتی ہے۔ اس اُمت کے افراد رنگ و خون۔ وطن و نسل اور زبان کے تفاوت کے باوجود ایک دُوسرے سے ہم آہنگ اور یک رنگ ہو جاتے ہیں۔ اس ملت میں وجہِ جامعیت وہ توحیدی نکتہ ہوتا ہے۔ جسے کلمۂ طیبہ کہا جاتا ہے۔ جس کا منتہٰی و مقصود یہ ہے۔ کہ رفتہ رفتہ انسان خونی و نسلی۔ لسانی والوانی تفریقات کے بند و سلاسل کو توڑ کر وحدت میں گم ہو جائیں۔ اس طرح ایک عالمی خوشگوار و خوشحال معاشرہ قائم ہو اور دُنیا کی انسانیت سکون و راحت سے زندگی بسر کرے۔

نوعِ انسان کی عالمگیر برادری قائم کرنے کے لئے اسلام نے حسب و نسب کے امتیازات اور بُتانِ رنگ و بُو کو پاش پاش کیا۔ انسانیت کی تقسیم کا معیار کفر و ایمان کو قرار دیا۔ یعنی جو لوگ اپنے خالقِ حقیقی پر ایمان لائیں ایک ملت اور جو خدا کے عطا کردہ ضابطۂ حیات سے سرکشی برتیں یہ منکرین خدا دوسری قوم۔ نظریۂ پاکستان میں یہی حقیقت مضمر بھی ہے۔ اور نمایاں بھی جس کی توحید میں گرمجوش زُنّار پوش مسلمان نے بڑی شدّ و مد سے مخالفت کی۔ اقبالؒ کا یہ نظریۂ بُتانِ شعوب و قبائل اور صنم کدۂ قوم و وطن کے خلاف اعلانِ جہاد تھا۔ نظریۂ وطنیت کے علمبرداروں اور وطن پرست علما نے اس کی مخالفت کے لئے قرآن و احادیث کی وُہ وُہ تفسیرات و تاویلات کیں۔ کہ جبرئیل امینؑ بھی ان گہرائیوں اور نکتہ آفرینیوں پر حیران و ششدر رہ گئے ہوں گے۔ نیشنلسٹ علما کی یہ کم نظری و کم سوادی تھی جس نے انہیں اور ان کے مریدانِ باصفا کو

واردھا کے سامری کے طلسم کا اسیر بنا دیا۔ اقبالؒ نے زنار پوش مسلمان کی قلبی کیفیت اور ذہنی پراگندگی سے متاثر ہو کر کہا کہ

کسے کو پنجہ زد نام و نسب را
نداند نکتۂ دینِ عرب را
اگر قوم از وطن بودے محمدؐ
ندادے دعوتِ دین بولہب را

آپ کی نوائے دلپذیر نے جہاں فرزندانِ اسلام میں گرمیٔ عمل اور جوشِ جذبہ بیدار کیا وہاں کانگریسی علماء نے نور و ظلمت میں فرق و امتیاز نہ کرتے ہوئے نہایت بھونڈے انداز میں حکیم الامتؒ کے خلاف محاذِ غوغا آرائی اور ژاژ خائی قائم کیا۔ آپ نے ان گم کردہ راہ راہنماؤں کو نہایت صبر و تحمّل اور پیار و محبت سے دین و وطن کا فرق بتاتے ہوئے کہا کہ ذہنِ مغرب کے تراشیدہ تازہ خداؤں میں سب سے بڑا خدا وطن ہے:۔

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

آپ خونِ جگر کی آمیزش اور بیاذیِ اشکوں کے ساتھ ان دین ناشناس توحید کے دعویداروں کو وضاحت و صراحت سے توحید کا عملی مفہوم سمجھاتے رہے کہ اس سے مُراد ملّتِ اسلامیہ کی ہم آہنگی اور یک رنگی ہے۔ ایک خدا۔ ایک رسول۔ ایک کتاب۔ ایک صراطِ مستقیم پر گامزن ہونے والی ایک اُمّت جس میں وحدت فی الخیال والعمل ہونی چاہیئے:۔

چیست ملّت ایکہ گوئی لا الٰہ
با ہزاراں چشم بودن یک نگاہ

اقبالؒ نے نہایت سوز و دردمندی اور تڑپ و خلش کے ساتھ نظریۂ پاکستان کے نام سے انسانیت ساز پروگرام پیش کیا۔ آپ نے مسلمانانِ ہند کو یہ احساس دلایا کہ اگر آپ اپنی لٹی ہوئی عظمتیں۔ چھنی ہوئی شوکتیں اور کھوئی ہوئی دولتیں پھر سے حاصل کرنا چاہتے ہیں تو نیشنلزم کی وجہ سے دُنیا میں جو فسادِ آدمیت بپا ہے اس کے

خلاف اعلانِ جنگ کرو۔ ہندوستان میں متحدہ قومیت کا تصور جو ہندو کانگریس پیش کر رہی ہے یہ قرآن کے ملّت ساز پروگرام کے منافی ہے۔ آج انسانی دُنیا قومیت پرستی کی لعنت کی وجہ سے درندوں کا بھٹ بنی ہوئی ہے۔ وطن پرستی کے پیدا کردہ گھٹا ٹوپ اندھیروں میں اگر نورِ توحید سے اُجالا کرنا مقصود ہے۔ تو نظریۂ پاکستان کی گہرائیوں میں اُتر کر دیکھو۔ اقبالؒ کی خلوص و محبّت بھری صدا کو ان کے بہرے کانوں نے نہ سُنا اور یہ دین کم شناس وطن کی دیوی کے سامنے سجدہ ریز ہو گئے۔ حکیم الامّتؒ نے اُن کے ضعفِ ایمان کی یہ حالت دیکھ کر نہایت درد و کرب سے آہ بھر کر کہا:۔

مسلماں ہے توحید میں گرمجوش
مگر دل ابھی تک ہے زنّار پوش

اقبالؒ نے نظریۂ پاکستان میں اسی حقیقت کو پیش کیا تھا کہ مسلمان کی ملّت کی اساس آئیڈیالوجی (کلمۂ توحید) ہے لیکن جن لوگوں نے خُدا کے صحیح تصوّر کو چھوڑ کر وطن کو اپنا معبود بنا لیا تھا انہوں نے ایک گنگا جمنی قسم کا اسلام ایجاد کیا اور اپنے متأثرین کو برابر وطن پرستی کی تعلیم دیتے رہے۔ علّامہؒ نے ہندو کانگریس کی ابلیسی سازش کو بے نقاب کرتے ہوئے بہتیرا کہا کہ برہمن کو مسلمان کی حیاتِ تازہ گوارا نہیں۔ یہ مسلمانوں میں تفرقہ اندازی اور گروہ بندی پیدا کرنے اور مسلمانانِ ہند کو ان کے مؤقف سے ہٹانے کے لئے علمائے کرام کی ناز برداری کر رہی ہے یہ توحید سے عملی انکار ہے۔ یہ شیوۂ مشرکانہ ہے کہ مسلمان وطن پرست ہو۔ آپ نے فرمایا کہ جس قوم پر خُدا کی رحمت ہوتی ہے وہ اختلاف و انتشار سے بچ کر ملّت واحدہ بن جاتی ہے۔ آپ نے فرمایا کلمۂ توحید زندہ خُدا کی اطاعت کا اقرار ہے یہ مردِ حق آگاہ جو نہ شرقی تھا نہ غربی نکتۂ توحید سے بے خبروں کو یوں توحید کی اہمیّت کی وضاحت کرتا ہے :۔

زندہ قوت تھی جہاں میں یہی توحید کبھی
آج کیا ہے؟ فقط اک مسئلہ علم کلام
روشن اس ضو سے اگر ظلمت کردار نہ ہو
خود مسلماں سے ہے پوشیدہ مسلماں کا مقام!

مَیں نے اے میرِ سپہ تری سپہ دیکھی ہے
قُل ھُوَ اللہ کی شمشیر سے خالی ہے نیام

شیخِ دین کی کم سوادی کو دیکھ کر:-

آہ اس راز سے واقف ہے نہ مُلّا نہ فقیہہ
وحدتِ افکار کی بے وحدتِ کردار ہے خام!

نظریۂ پاکستان عالمگیر برادری کی تشکیل کے لئے اُخوّت ساز پیغام ہے۔ جُوں جُوں زمانہ اسے سمجھتا چلا جائے گا۔ یہ اثر انگیز اور نتیجہ خیز ہوتا چلا جائے گا۔ اس نکتۂ توحید کو سمجھ لینے کے بعد انسان رحمتِ خُداوندی کے سکون بخش شامیانے میں آکر اُن تمام فتنہ سامانیوں سے محفوظ ہو جائے گا جو امتیازِ رنگ و خُون۔ حسب و نسب اور قوم و وطن کے تعصبات نے پیدا کر رکھی ہے۔

یُوں تو توحید ایک وسیع و عریض موضوع ہے اور اس کی تشریح و تفصیل کے لیے ایک مستقل تصنیف کی ضرورت ہے۔ چونکہ ہمارا منشا و مقصد نظریۂ پاکستان کی وضاحت ہے۔ اس لئے اس مقام پر نظریہ کی تائید میں چند قرآنی آیات پر اکتفا کیا جائے گا۔ اقبالؒ کے زندہ و پائندہ تصور و خیال کا مرکز و محور یہی توحید ہے۔ اسی سے عالمِ انسانیت عالمگیریت سے ہمکنار ہو سکتا ہے۔ اسی لئے علّامہؒ نے فرمایا کہ بندۂ حق نہ ایرانی ہے نہ ترکی۔ نہ سوڈانی ہے نہ عراقی نہ ہندی ہے نہ عربی۔ نہ بنگالی ہے نہ پنجابی۔ اور نہ افغانی ہے نہ مصری۔ اس کا دیس اسلام ہے اور یہ صرف مصطفویؐ ہے۔

اقبالؒ کا یہی کفر سوز اور باطل شکن اعلان تھا جس سے ہندو کے ایوانِ سیاست میں زلزلہ آ گیا تھا اور ہندو شاطرِ سیاست اپنی تمام مہرہ بازیوں اور شعبدہ گری کے باوجود اپنے مذموم مقاصد میں کامیاب نہ ہو سکا۔ وار دھا کے سامری کی سحر طرازیوں اور ہندو ذہنیت کی تمام فریب کاریوں کے باوجود پاکستان کی نظریاتی مملکت جس کی اساس و بنیاد توحید ہے معرضِ وجُود میں آ کر رہی۔ آپ کے افکار و تصورات کا نقطہ ماسکہ یہ ہے کہ خُدائے واحد پر ایمان لانے والی ملّت بھی قوم و وطن کی تمیزات سے بالا و اعلیٰ۔ یگانہ اور منفرد ہونی چاہیئے۔ علّامہؒ کا اس ٹھوس حقیقت پر ایمان تھا کہ انفس و آفاق میں ایک ہی قوت (اللہ) کی کارفرمائی و

کبریائی ہے ۔ فرماتے ہیں :-

خرد دیکھے اگر دل کی نگہ سے
جہاں روشن ہے نورِ لاالٰہ سے

تعمیرِ انسانیت اور تکمیلِ آدمیت کے لئے آپ نے اسی حقیقتِ عظمہ کو معیار قرار دیا ۔ آپ نے واشگاف الفاظ میں کہا کہ دنیائے انسانیت میں جو تصادم و تزاحم ۔ اور حسد و انتقام کی آتش ریزیاں ہیں ان کا بنیادی سبب انسانیت کی غیر فطری تقسیم ہے ۔ توحید انسانی برادری کو حدود فراموش اور وسعت ناآشنا بناتی ہے ۔ اسی سے رنگ و خون ۔ قوم و زبان کے امتیازات کے باوجود عربی و حبشی ایک دوسرے کے بھائی بھائی بن جاتے ہیں ۔ معرکۂ دین و وطن میں اقبالؒ نے اسی اصولِ توحید کو نمایاں کیا تھا ۔ دراصل یہ قرآنی توحید کا اعلان تھا ۔ قرآن نے وضاحت کے ساتھ اس دعوٰی کو پیش کیا کہ الٰہ حقیقی تمام نوعِ انسانی کا الٰہ ہے ۔

اِلٰـهِ النَّاسِ ○ (۱۱۴/۳)

تمام نوعِ انسانی کا مشترکہ الٰہ !

کتنی درخشاں و تابناک حقیقت کی وضاحت کردی کہ تمام افرادِ انسانی کا الٰہ ایک ہے ۔ یہ چیز قرآن کریم نے بتائی ہے کہ نوعِ انسانی کی تخلیق نفس واحدہ سے ہوئی (۳۹/۶) یہ اصولِ توحید عقلِ صحیح اور قلبِ سلیم کو کس طرح اپیل کرتا ہے لیکن جن کی ایمانی قوت کو وار دھا کے سامری کے سحر نے ماؤف کردیا تھا وہ مرتے دم تک ان زندہ و ٹھوس حقائق سے چشم پوشی کرتے رہے اور ان کی ذہنی اولاد آج تک کررہی ہے ۔ ایک سلیم القلب انسان ادنٰی سے غور سے علامہؒ کے تصور و خیال کی تائید کے لئے مجبور ہو جاتا ہے ۔ اخوتِ بشرٰی کا یہ تصور کتنا پاکیزہ و منزہ ہے ۔ جس میں نسلی ۔ وطنی تفریقات و اختلاف کا کوئی دخل نہیں ۔ اس تصور کی مثال و نظیر کسی اور جگہ سے ملنا محال ہے ۔

آگے بڑھیے :-

لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ج فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ
رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ○ (۲۱/۲۲)

اور زمین و آسمان میں اللہ کے سوا کوئی اور الٰہ بھی ہوتا تو یہ ارض و سما (سلسلۂ کائنات) درہم برہم ہو جاتا۔ سو اللہ (کائنات جہاں بانی کے) تخت کا مالک ان باتوں سے بلند ہے جو یہ لوگ بیان کرتے ہیں۔

دوسری جگہ اس کی تفصیل یُوں بیان کی:۔

مَا اتَّخَذَ اللّٰهُ مِنْ وَّلَدٍ وَّمَا كَانَ مَعَهٗ مِنْ اِلٰهٍ اِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ اِلٰهٍۢ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۙ (۲۳/۹۱)

اور اللہ نے کسی کو اپنی اولاد نہیں بنایا، اور نہ اُس کے ساتھ کوئی اور الٰہ ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو ہر الٰہ اپنی مخلوق لے کر الگ ہو جاتا اور ایک دُوسرے پر چڑھ دوڑتا۔ سو اللہ بلند ہے اُن باتوں سے جو لوگ اُس کی نسبت بیان کرتے ہیں!

نظامِ کائنات کے نظم و نسق اور ربط و ضبط پر غور کرنے سے یہ حقیقت اُبھر کر سامنے آجاتی ہے۔ کہ یہ سلسلۂ کائنات ایک لگے بندھے نظام کے ماتحت چل رہا ہے۔ یہ ہوشربا کارخانۂ قُدرت اس حسن و خُوبی سے چل ہی نہیں سکتا اگر اس کو کنٹرول میں رکھنے والی طاقت بھی ایک نہ ہو۔ نظم و نسق کائنات ایک ثانیہ کے لئے برقرار نہ رہے۔ اگر اس کے چلانے میں ایک سے زیادہ ارادوں اور مختلف قوتوں کا دخل ہو۔ خدا کی ذاتِ واحد جو غیر منقسم اور لامحدود قوتوں کی مالک اور لاانتہا اختیارات و اقتدارات کی حامل ہے اسے کسی معین و مددگار کی ضرورت نہیں۔ اُسے یہ محتاجگی نہیں کہ مختلف کارندے اس کے دست و بازو بن کر کارخانۂ قدرت کو چلائیں۔ وُہ خارجی سہاروں سے بے نیاز زندہ قوتوں والا خُدائے زندہ ہے وُہ حیّ اور قیوم ہے۔ وُہ کبھی مر نہیں سکتا۔ مرنا تو ایک طرف اسے تو اُونگھ تک نہیں آتی لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ۔ نظامِ کائنات میں اس کی حکمت و مشیت ہر وقت جاری و ساری ہے۔ حاکمی و کبریائی۔ آقائی و مولائی اسی ذاتِ کبریا کے لئے ہے۔ وہی خدائے واحد ہے جس کے قانون کے مطابق گردشِ لیل و نہار ہے۔ وُہی حاکم و آقا ہے شمس و قمر کی نُور پاشیاں اور نُور افشانیاں صحراؤں کی دہشت انگیزیاں اور حیرت افروزیاں۔

سمندروں کی شورانگیزیاں اور دریاؤں کی تلاطم خیزیاں اُسی کے قانون کی کرشمہ زائیاں ہیں۔مہ و دشت و یم و صحرا ہیں اُسی کے حکم کی کارفرمائیاں ہیں۔غرضیکہ جملۂ کائنات کے مختلف اور متنوع مظاہر اسی کے ہیں۔صحرائی ریت کے تابناک ذروں کی چمک اور انسانی اعمال کی کھیتیاں اُسی کے قانون مکافات عمل کے مطابق سرسبز ہوتی اور جھلستی ہیں۔آفاق و انفس ہیں اسی کا قانون زندگی فشاں ہے یہ حقیقت ذہنِ انسانی کو ایک نئی بات معلوم ہوتی تھی۔کہ تمام قوتوں کا مالک ایک الٰہ تسلیم کیا جائے۔چنانچہ قرآن نے جب یہ عقیدہ پیش کیا۔کہ نظمِ عالم کی ہم آہنگی کے لئے اس کو چلانے والی قوت بھی ایک ہی ہے۔تو مختلف قوتوں کے لئے مختلف خداؤں پر اعتقاد و ایمان رکھنے والے نہایت حیرت و استعجاب سے کہتے ہیں۔

اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ عُجَابٌ ۝

(۳۸/۵)

ہیں! کیا یہ اُن تمام خداؤں کو ایک بتا رہا ہے؟ یقیناً یہ تو بڑی تعجب انگیز بات ہے۔یہ لوگ اس عقیدہ کو ایک مہمل شئے سمجھ کر حقارت کی ہنسی ہنستے۔

عصرِ حاضر میں تمام فتنہ و فساد اور عدمِ اطمینان و فقدانِ سکون کی انساں سوز آگ اس لئے بھڑک رہی ہے کہ عقلِ انسانی نے اپنے اپنے مفادات کے لئے الگ الگ معبود تراش رکھے ہیں۔ایک قوم کا معبود دوسری قوم سے۔ایک ملک کا خدا دوسرے ملک کے خدا سے برسرِ پیکار ہے۔اقبالؒ نظریہ پاکستان میں الگ الگ معبودوں کی جگہ خالقِ برحق (حقیقی الٰہ) کا تصور پیش کرتے ہیں اور ملک و نسب کی غیر فطری حدود و ثغور کو ختم کر کے عالمگیر مواخات کا ڈھنگ بتاتے ہیں۔انسانی زندگی کو امن و عافیت اسی وقت نصیب ہو سکتا ہے۔جب یہ خود کشیدہ جغرافیائی لکیروں کو مٹا کر تمام انسانوں کا ایک گھر بنا کر وسائل پیداوار کو آپس میں عدل و احسان کی رُو سے تقسیم کرے گا۔آپ نے اس تفریقِ ملل کی آتشِ سوزناک سے قصرِ آدمیّت کو محفوظ و مصئون کرنے کے لئے بھٹکتے ہوئے انسانوں کو یہ بتلایا کہ انسانی معاشرہ حقیقی الٰہ کے قانون کے مطابق متشکل کرو۔نیز اس حقیقت کو بھی واشگاف کیا کہ دنیا کے

انسانیت میں توازن وتناسب اسی وقت برقرار رہ سکتا ہے۔ جب قانون خداوندی کے مطابق نظامِ مملکت قائم کیا جائے گا۔ اسی طریق سے نظم ونسق مملکت مضبوط و مستحکم ہوگا۔ جب انسان ایک قانون۔ ایک مشیت۔ ایک حاکم۔ ایک کی اطاعت تسلیم کرکے تمام انسانوں کو ایک برادری تصور کرے گا۔

اَلَّذِیْنَ یَجْعَلُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۚ فَسَوْفَ یَعْلَمُوْنَ ۝ (۱۵/۹۶)

جو لوگ اللہ کے ساتھ دوسرا معبود تجویز کرتے ہیں انہیں بہت جلد معلوم ہو جائے گا۔ (کہ حقیقت کیا ہے)

دوسری جگہ:-

وَمَنْ یَّدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۙ لَا بُرْهَانَ لَهٗ بِهٖ ۙ (۲۳/۱۱۷)

اور جو شخص اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا الٰہ پکارتا ہے تو اس کے پاس اس عقیدہ کے اثبات میں، کوئی دلیل نہیں ہو سکتی۔

غور فرمایا آپ نے یہاں ایک سے زیادہ معبودوں کو ماننے والوں سے بُرہان طلب کی گئی۔ نیز یہ بھی بتا دیا کہ اس عقیدہ کے ماننے والوں کے پاس کوئی دلیل نہیں۔ ان لوگوں نے حقیر چیزوں کو خدا بنا کر اپنے آپ کو کس قدر ذلیل بنا رکھا تھا۔

لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَقْعُدَ مَذْمُوْمًا مَّخْذُوْلًا ۝

(۱۷/۲۲)

خدا کے مطیع وفرماں پذیر بندے (عباد الرحمٰن) کبھی کسی دوسرے کے سامنے سجدہ ریز و سرنگوں نہیں ہوتے اس لئے کہ وہ حیات باشرف اپنی ذات کی عظمت سے آگاہ ہوتے ہیں۔

وَالَّذِیْنَ لَا یَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ۔ (۲۵/۱۸)

وہ لوگ جو اللہ کے ساتھ دوسرا الٰہ تجویز نہیں کرتے۔

اربابِ مذہب اور مفاد پرست قوتیں اپنے ذہنی تراشیدہ خداؤں (خدائے خواہشات) کے خلاف کوئی نعرۂ بغاوت گوارا نہیں کرتے۔ یہ اپنی عقل کے

تراشیدہ نظامہائے حیات پر چلنے کی لوگوں کو تلقین کرتے ہیں۔ کیونکہ اگر الٰہ حقیقی کا صحیح تصور لوگوں کے دل و دماغ میں رچ بس جائے تو انہیں خدشہ لاحق ہو جاتا ہے کہ لوگ ہم (زمینی خداؤں) کے خلاف اعلانِ بغاوت کر دیں گے۔ مذہبی احبار و رہبان (جنہیں عصر رواں کی زبان میں علماء و مشائخ کہا جاتا ہے) سادہ لوح متاثرین نے انہیں خدائی میں شریک سمجھ رکھا ہے۔ اس عقیدہ نے عظمت و تقدس کا نقاب اوڑھ کر عقیدت و ارادت کے راستے سادہ لوح لوگوں کے دل کی گہرائیوں میں اپنا گھر بنا رکھا ہے۔ لوگ انہیں مقرب خدا جان کر ان کی غلامی و چاکری کرتے ہیں۔ ان مریدین کو یہ سمجھنے ہی نہیں دیا جاتا کہ خدائے حقیقی تمام انسانوں کے لئے یکساں فاصلے پر ہے۔ قرآن کریم نے اس عقیدہ باطلہ کا یوں ابطال کیا:۔

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ ۚ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ‎(۹/۳۱)

انہوں نے اللہ کو چھوڑ کر علماء و مشائخ کو خدا بنا لیا۔ اور مسیح ابن مریم کو بھی۔ حالانکہ ان کو حکم یہی دیا گیا تھا۔ کہ وہ اسی ایک اللہ کی عبودیت اختیار کریں۔ جس کے سوا کوئی دوسرا الٰہ نہیں۔ وہ ان کے شرک سے بلند ہے۔

یہاں اہل کتاب سے صاف کہہ دیا گیا۔ کہ احبار و رہبان اور انبیاء و رسل کو خدا بنا لینے کی تعلیم خدا کی طرف سے نہیں۔ یہ تمہاری تحریفات کا نتیجہ ہے۔

قرآن نے استبدادی قوت کا نمائندہ فرعون کو پیش کیا ہے۔ یہ ظلم و جور کا نشان ہے۔ فرعون نے حضرت موسیٰؑ سے کہا:۔

قَالَ لَئِنِ اتَّخَذْتَ اِلٰهًا غَيْرِيْ لَاَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُوْنِيْنَ ‎(۲۶/۲۹)

سن لے کہا کہ اگر تم نے میرے سوا کوئی الٰہ بنایا تو (یاد رکھو) یقیناً تمہیں جیل میں بھجوا دوں گا۔

فرعون نشۂ قوت اور پندارِ حکومت و امارت سے سرشار ہو کر طنزاً بولا۔

وَقَالَ فِرْعَوْنُ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَاُ مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ

غَيْرِیْ ج ......... وَاِنِّیْ لَاَظُنُّهٗ مِنَ الْكٰذِبِیْنَ ه
(۲۸/۳۸)

فرعون نے کہا کہ اے سرداران! میں تو اپنے سوا تمہارا کوئی الٰہ نہیں سمجھتا۔
پس اے ہامان تم میرے لئے مٹی کی اینٹیں بنا کر اُن پر آگ، جلاؤ (پکاؤ ان
کو شرارہ میں) پھر میرے لئے ایک بلند مینار بناؤ تاکہ میں اس پر چڑھ
کر موسٰی کے خدا کو جھانکوں اور میں تو اسے جھوٹا ہی سمجھتا ہوں۔

اس مقام پر فرعون نے یہ کہا ہے کہ میرے سوا کوئی الٰہ نہیں۔ اس سے الٰہ کے معنی واضح ہو جاتے ہیں۔ جناب موسٰی بنی اسرائیل کو فرعون کی غلامی و محکومی سے نکال کر آزادی کی بحرِ بیکراں فضاؤں میں بسانا چاہتے تھے۔ یہ فرعون کو کب گوارا تھا۔ وہ تو اپنی مملکت میں اپنی فرماں روائی چاہتا تھا۔ وہ اس قسم کی بغاوت و سرکشی کو کیسے برداشت کر سکتا تھا۔ اس نے جذباتِ حریّت کو ہر چند کچلنے کی کوشش کی اس سے صاف ظاہر ہے کہ شرک صرف پتھر کی مورتیوں کے سامنے سجدہ ریز ہو جانا نہیں بلکہ قوانینِ خداوندی کی جگہ انسانوں کے خود ساختہ نظام کی اطاعت بھی ہے۔
علّامہ فرماتے ہیں:۔

مردِ حُر از لا الٰہ روشن ضمیر
می نہ گردد بندۂ سلطان و میر

جب تک انسان کو وحی کی روشنی میسّر نہ ہو عقلِ محض کے ذریعے اسرار لا الٰہ سے واقف ہونا حیطہ ادراک میں نہیں۔ کیونکہ جہان کی رُوحِ رواں لَآ اِلٰهَ اِلَّا ھُوَ ہے۔
جب تک انسان اپنے خالق کو نہ پہچانے یہ محتاجِ ملوک رہے گا۔
اسرارِ لا الٰہ کے لئے عقل کو وحی کی راہنمائی ضروری ہے۔
حکیم مغرب نطشے کے متعلق ارشاد ہے:۔

حریفِ نکتۂ توحید ہو سکا نہ حکیم
نگاہ چاہیئے اسرارِ لا الٰہ کے لئے

دوسری جگہ:۔
خرد نے کہہ بھی دیا لا الٰہ تو کیا حاصل — دل و نگاہ مسلمان نہیں تو کچھ بھی نہیں

کیونکہ

خرد بتا نہیں سکتی کہ مدعائے زندگی کیا ہے۔ انساں سلطانِ جملہ موجودات اسی وقت بنتا ہے۔ جب عقلِ انسانی وحی کی روشنی میں منازلِ حیات طے کرے:۔

در جہاں کیف و کم گردید عقل
پے بہ منزل بُرد از توحید عقل
ورنہ ایں بیچارہ را منزل کجاست
کشتیٔ ادراک را ساحل کجا است

عصرِ حاضر کی مہذب دُنیا مقامِ حیات سے نا آشنا ہے۔ اس کی عقلِ سرکش اور علمِ بے باک نے خدائے خواہشات کے سامنے سر جھکا رکھا ہے۔ اس کا اندازہ لینن اور میکیاولی کے اس نظریہ سے لگایا جا سکتا ہے۔ کہ جس سے مقصد حاصل ہو جائے۔ وہ جائز اور جو حصولِ مقاصد میں مخل ہو وہ ناجائز۔

جائز اور ناجائز کا معیار تکمیلِ آرزو و مفاد قرار پائی۔ دُنیا میں چاروں طرف جو فساد و خوں ریزی ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے۔ کہ مفاد پرست قومیں اپنی خواہشات و مفادات کے حصول کے لئے کمزور و ناتواں اور مجبور و بے بس انسانوں کا خون بہا رہی ہیں۔ آج ان کی تمام عقل و علم اس بات پر صرف ہو رہا ہے۔ کہ دُوسروں کو کس طرح اپنا غلام بنایا جائے۔ آج کی مہذب دُنیا جذبات کے دھارے پر کچھ اس طرح بہہ نکلی ہے۔ کہ اس کی کوئی منزل اور کنارا نظر نہیں آتا۔ ذہنِ انسانی ان ایجادات میں منہمک و مصروف ہے۔ جن سے زیادہ سے زیادہ انسانوں کو ہلاک و برباد کر کے اپنی قوم اپنے ملک کے لئے زیادہ سے زیادہ مفادات حاصل کئے جا سکیں۔ حق و باطل کا معیار کامیابی و ناکامیابی ٹھہرا ہے انسانی بربادیوں کا یہی وُہ ہولناک جہنم ہے جس کی آتش ریزیاں جسدِ انسانیت کو جلائے جا رہی ہیں۔ قوم و وطن کے یہی لات و منات ہیں۔ جن کے پجاریوں کے ہاتھوں انسانیت ہلاکت کے دہانوں تک جا پہنچی ہے۔ نیشنلزم ہلاکتوں کا وُہ سمندر ہے جس کی لہروں سے قصرِ آدمیت محفوظ نہیں۔ آج دنیا میں ظلم و فساد کی جتنی

چنگاریاں ہیں اسی کی بھڑکائی ہوئی ہیں۔ انسانی ذہن ہر لمحہ ہر آن اور ہر ساعت منفادات و خواہشات کے نئے نئے خدا تراش رہا ہے۔

می تراشد فکرِ ما ہر دم خدا وندے دگر
رست از یک بند تا افتاد در بندے دگر

اسی آتشِ انتقام و بغض کے شرارے ہیں جن سے انسانیت جل کر راکھ کا ڈھیر بن رہی ہے نیشنلزم ہی وہ خطرناک گھاٹی ہے۔ جہاں سے کاروانِ آدمیت پھسل کر منزلِ حیات کھو چکا ہے نیشنلزم (قومیت پرستی) سود ہمہ و بہبود دیگراں کی سخت دشمن ہے۔ یہ قوت صرف قرآن کے تصور لاالٰہ میں ہے۔ کہ عالمگیر اُخوتِ بشری پیدا کر سکے۔ کیونکہ

ایں دو حرفے لا الٰہ گفتار نیست
لا الٰہ جز تیغِ بے زنہار نیست
لا مقام ضرب ہائے پے بہ پے
ایں غو رعد است۔ نے آوازِ نے
ہر قبائے کہنہ چاک از دستِ او
قیصر و کسریٰ ہلاک از دست او
ہر کہ اندر دست او شمشیر لا است
جُملہ موجودات را فرماں رَوا است

صرف لا ہی نہیں اس کے بعد الا بھی۔ یعنی نفی کے بعد اثبات۔ تخریب کے بعد تعمیر انکار کے بعد اقرار لا الٰہ کے بعد الا اللہ۔

در مقامے لا نیا ید حیات
سوئے الا می خرامد کائنات

قومی و وطنی تفریقات کے انسانیت سوز نظریہ کا ابطال کرتے ہوئے قافلۂ آدمیت کو ختم المرتبتؐ کی ردائے رحمۃ للعالمینی کے سائے میں پناہ جوئی کی تلقین کرتے ہیں۔

لا الٰہ سرمایۂ اسرار ما
رشتہ اش شیرازۂ افکار ما

عقدۂ قومیت مسلم کشود
از وطن آقائے ما ہجرت نمود
حکمتش یک ملّت گیتی نورد
بر اساس کلمہ تعمیر کرد
تاز بخششائے آں سلطانِ دین
مسجد ما شد ہمہ روئے زمین

اندازہ فرمائیے کس قدر حیات آور اور زندگی فشاں اصول ہے۔ اس سے یہ رمزِ حیات کس قدر آشکارا ہے کہ سالارِ قافلۂ انسانیت پوری نوعِ انسانی کے لئے پیغامِ رحمت بن کر آئے تھے۔ آپ نے ہجرت فرما کر یہ ثابت کر دیا کہ مومن خاک سے پیوند نہیں رکھتا بلکہ پوری روئے زمین الارض اللہ اور الحکم للہ کے قرآنی فلسفہ کے مطابق اس انسان کا گھر ہے جس کے دین کی بنیاد کلمۂ توحید ہے۔

غور فرمائیے کہ نورِ لاالٰہ سے دیکھنے والا دانائے رازِ اقبال حقائق و بصائر کی کتنی دنیائیں آپ کے سامنے کھولتا چلا جاتا ہے۔ حکیم الامتؒ نے کس قدر وضاحت سے بتایا کہ انسانی شیرازہ بندی کے لئے رشتۂ توحید سے محکم اور پائیدار اور کوئی اساس نہیں۔ نظریۂ پاکستان میں علامہؒ نے بتایا ہے کہ جب تک انسانی زندگی کی عمارت توحید کی بنیاد پر استوار نہیں ہوگی۔ انسان فرق و اختلاف کے پیچ و خم میں الجھا رہے گا۔ یہی حرفِ راز تھا جسے اقبالؒ نے نفسِ جبرئیل مانگ کر کہا۔ لیکن افسوس کہ زنار پوش مسلمان نے اس عظیم حقیقت کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا اور اس کے سینۂ بے سوز میں نظریۂ پاکستان نے کوئی جگہ نہ پائی۔

مردِ حق شناس۔ روشن نفس اقبالؒ نے اس رازِ حیات کو واشگاف الفاظ میں واضح کیا کہ انسان اس لئے ذلیل و خوار ہے۔ کہ اس میں خود شناسی و خدا شناسی کا جوہر مفقود ہو گیا ہے۔ زوالِ آدم خاکی اس وجہ سے ہے کہ انسان نے اپنے الٰہ حقیقی (خالق مطلق) کے بجائے خدائے خواہشات کو اپنا معبود بنا لیا ہے اس محرمِ اعماق نے گرفتارِ خرافات انسان کو صاف طور پر کہا کہ تجھے تہذیبِ افرنگ کی فسوں سازی اور سحر طرازی نے خالقِ حقیقی سے بیگانہ کر دیا ہے۔ طلسمِ رنگ و بو

میں کھو جانا معرفتِ خویش سے بیگانگی ہے۔ آپ اپنے کلام میں بار بار اس نکتہ کو سامنے لاتے ہیں کہ جب تک انسان اپنی زندگی قوانینِ خداوندی کے سانچوں میں نہیں ڈھالے گا دنیا میں فسادِ آدمیت باقی رہے گا۔ آپ ذکرِ حکیم میں اس خیال کو ہر جگہ پائیں گے کہ انسان کی عقلِ غلط سیر نے اسے زندگی کی غلط راہوں پر ڈال دیا ہے۔ اس کی تمام ہلاکت خیزیوں اور فساد انگیزیوں کا سبب اس کا علمِ سرکش اور عقلِ بے باک ہے۔ آپ کے نزدیک محکم اور پائیدار ضابطۂ حیات قرآن عزیز ہے:۔

یہی دین محکم یہی فتح باب
کہ دنیا میں توحید ہو بے حجاب

آپ نے عالمِ انسانیت کو رُخِ امروز میں عکسِ فردا دکھا کر حقیقی زندگی (حیاتِ باشرف) کے لئے اُصولی طور پر توحید کو شرطِ اول بتایا۔ آپ نے مسلمانانِ ہند کو بھی یہی حرفِ راز سمجھایا تھا کہ وہ توحید مست بن جائیں یہی کہ بُتانِ شعوب و قبائل ۔صنم کدہ وطن کے بُتوں کو پاش پاش کر کے ملّت میں گم ہو جائیں اور امتیازِ قبائل و نسل کو ختم کر کے اساسِ ملّت کلمۂ توحید کو بنائیں۔ یہ خالص قرآنی توحید تھی۔ لیکن برہمنوں کی سیاست کے پیچ میں آئے ہوئے مولاناؤں نے اس حرفِ دل فروز کی اشد مخالفت کی اور کارزارِ کفر و ایمان میں برہمنی سیاست کی طرفداری کی۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے۔ کہ اسلام کا الٰہ الٰہ النّاس ہے اسی طرح قرآن کا پیش کردہ ربّ ربّ العالمین ہے۔ قرآن کی ابتدا اس آیت سے ہوتی ہے:۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

"ہر طرح کی ستائش اس اللہ کے لئے ہے۔ جو تمام کائنات کا نشو و نما دینے والا ہے"

رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ | یہ اللہ کی صفتِ ربوبیت ہے۔ ساری دُنیا کی ربوبیت۔ خدا کا ہمہ گیر نظامِ ربوبیت تمام کائنات پر محیط ہے۔

قرآن میں قریب پندرہ مختلف مقامات پر مختلف انداز میں ربوبیتِ کائنات

کی عظیم حقیقت کی طرف اشارات ملتے ہیں۔

**رَبِّ النَّاسِ** | قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۝ (۱۱۴/۱)

کہیئے کہ میں ربّ الناس کی پناہ مانگتا ہوں۔

کہیں ان تفصیلات کو سمیٹا کر ایک جگہ ایک ہی ٹکڑے میں سمو دیا کہ وُہ تمام اشیائے کائنات کا ربّ ہے۔

قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْغِيْ رَبًّا وَّهُوَ رَبُّ كُلِّ شَيْءٍ ...... (۶/۱۶۴)

کہو کہ کیا اللہ کے سوا کسی اور ربّ کی تلاش کروں حالانکہ وہ ہر شے کا ربّ ہے۔

**رَبُّ كُلِّ شَيْءٍ** | ہر شئے کا خالق۔ ہر شئے کا ربّ کس قدر لامحدود قوتوں کی مالک اللہ کی ذات ہے۔ اس محیر العقول کائنات میں ایک ذرہ ناچیز سے لے کر عظیم الشان کُرّوں تک ہر شئے کی ابتداء سے اُس کی انتہا تک ہر مرحلۂ زندگی میں تمام سامانِ نشو و نما مہیا کرنا ربّ العالمین کے شایانِ شان ہے۔

**رَبُّ الْعَرْشِ** | رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ ۝ (۲۳/۱۱۶)

عرشِ کریم کا مالک

تمام قوتوں کے مرکز کا مالک۔ جن سے یہ نظامِ کائنات اس قدر بندھے قانون کے مطابق اس حسن و خوبی سے چل رہا ہے۔ جملہ موجودات کی تخلیق۔ ربوبیت اور نظم و نسق صرف اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ نظامِ فطرت کے مختلف شعبوں اور متنوّع گوشوں کے متعلق بھی مختلف آیات میں فرمایا کہ ان تمام کا مالک و مختار خُدا ہے۔ ان آیات میں فطرت کے باریک اشارے نمایاں ہیں۔

**نظامِ فطرت کا ربّ** | وَاَنَّهٗ هُوَ رَبُّ الشِّعْرٰى ۝ (۵۳/۴۹)

اور ستارہ شعریٰ (Sirius) کا ربّ وہی ہے۔

**سُوْرَةُ الْفَلَقِ میں** | قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ۝ (۱۱۳/۱)

کہہ دیجئے کہ میں دُنیا کی ہر شئے سے خُدائے ربّ الفلق کے قانون کی پناہ طلب کرتا ہوں

**سُوْرَةُ الرَّحْمٰن** | رَبُّ الْمَشْرِقَيْنِ وَرَبُّ الْمَغْرِبَيْنِ ۝ (۵۵/۱۷)

مشرقین اور مغربین کا ربّ

دُوسری جگہ :-

رَبُّ الْمَشَارِقِ ٥ (۳۷/۵)

تمام مشرقوں کا رب!

فَلَآ اُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشٰرِقِ وَالْمَغٰرِبِ - (۷۰/۴۰)

مشرقوں اور مغربوں کے رب کو شہادت میں پیش کرتا ہوں -

**ربّ العزّت** | سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا یَصِفُوْنَ ٥ (۳۷/۱۸۰)

تیرا خدا یعنی ربّ العزّت - ان تمام باتوں سے بلند و منزّہ ہے - جنہیں لوگ اس کی نسبت (بزعم خویش) بیان کرتے ہیں -

یعنی

غلبہ و اقتدار کا مالک

**مَلِكِ النَّاسِ** | مَلِكِ النَّاسِ

سروری و آقائی کا سزاوار - تمام مخلوق کا خالق و حاکم -

حکیم الامّتؒ فرماتے ہیں :-

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وُہی باقی بُتانِ آذری

**رزّاقیت** | رزّق کے تمام سرچشموں کا مالک ربّ العالمین ہے - یہ نظام خالقِ ارض و سما کی تدبیرِ اُمور کے ذریعے قائم ہے - اس حقیقت سے کسی کو مجالِ انکار نہیں - مادہ پرست بھی لفظوں کے ہیر پھیر سے اس امر کا اقرار کرتے ہیں - کہ نظامِ کائنات انسان کا قائم کردہ نہیں - وہ خالقِ کائنات کا اعتراف "قوانین فطرت" (LAWS OF NATURE) کہہ کر کرتے ہیں - کوئی سلیم العقل اس سے انکار نہیں کر سکتا - کہ قوانین بلا کسی بالا رادہ قوت کے نافذ العمل نہیں ہو سکتے - اسی ذات کا نام اللہ ہے -

اقبالؒ نے اس عظیم حقیقت کو یُوں واضح کیا ہے :-

پالتا ہے بیج کو مٹّی کی تاریکی میں کون
کون دریاؤں کی موجوں سے اُٹھتا ہے سحاب

کون لایا کھینچ کر پچھم سے بادِ سازگار
یہ زمین کس کی ہے۔ کس کا ہے یہ نورِ آفتاب
کس نے بھر دی موتیوں سے خوشۂ گندم کی جیب
موسموں کو کس نے سکھلائی ہے خوئے انقلاب
دہ خدایا یہ زمین تری نہیں تری نہیں
ترے آبا کی نہیں تیری نہیں میری نہیں

رزّق کے معنی ہیں ہر وہ شئے جو کسی کی طرف سے عطیۃً ملے لیکن اس کی معنوی بنیاد میں یہ خصوصیت ہے۔ کہ وہ شئے عین وقت پر ملے۔ رزّق سے مراد وہ سامانِ نشوونما ہے۔ جو رزّاق کی طرف سے بلا مزد و معاوضہ ملتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ پکی پکائی روٹی انسان کے منہ میں ڈال دی جاتی ہے۔ مراد یہ ہے کہ انسانی ضروریات کا تمام سامان ارض میں موجود ہے۔ ہر ضرورت منداسے حاصل کر سکتا ہے۔ خدائے رزّاق کی نعمائے گوناگوں کا دسترخوان (مائدہ) ہے۔ جو اس نے ہر ذی روح کے لئے یکساں طور پر بچھا رکھا ہے۔ یہ وسیع و عریض زمین رزّاق نے تمام انسانوں کی بنیادی ضرورتوں کو مہیا کرنے کے لئے پیدا کی ہے۔ نظامِ کائنات کو اس نے ایک خاص انداز سے ترتیب دیا ہے۔ وہ اپنے فرائض کی انجام دہی میں مصروف و مشغول ہے اس طرح ایک خاص طریق سے رزّق کے تمام سامان و اسباب انسان کے سامنے آتے چلے جاتے ہیں:-

الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّکُمْ ... ... ... ... ... (۲/۲۲)

اللہ وہ ہے جس نے زمین کا حدود فراموش تخت تمہارے لئے فرش کی طرح بچھا دیا اور آسمان کو چھت کی طرح بلند کر دیا۔ وہی ہے جو آسمان سے پانی برساتا ہے۔ جس سے (طرح طرح) کے پھل تمہاری غذا کے لئے پیدا ہو جاتے ہیں۔ آسمان کی بلندیوں پر پانی کے ذخائر جمع کر کے ان کے ذریعے زمینِ مردہ سے زندگی بخش رزّق پیدا کرنا۔ یہ سب اسی کی صفتِ رزّاقی کے کرشمے ہیں۔

وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ط (۲۱/۳۰)

اور پانی سے ہم نے ہر شئے کو زندگی عطا کی۔

دوسرے مقام پر:۔

وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ رِّزْقٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ...... (۴۵/۵)

اور جو (پانی) اللہ نے آسمان سے (بطور) رزق نازل فرمایا اور جس سے زمینِ مُردہ کو پھر سے زندگی مرحمت فرمائی۔

زندگی کا اوّلین سرچشمہ بھی پانی ہے اور اس کی بقا کا موجب بھی۔ جوئے حیات کی مسلسل روانی اسی کی برکات سے ہے۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ ثُمَّ رَزَقَكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّفْعَلُ مِنْ ذٰلِكُمْ مِّنْ شَيْءٍ ط (۳۰/۴۰)

اللہ وہ ہے جس نے تمہیں پیدا کیا۔ وہی تمہیں رزق عطا فرماتا ہے۔ پھر تمہیں موت دے گا۔ اس کے بعد پھر زندہ کرے گا۔ کیا تمہارے ٹھہرائے ہوئے خداؤں میں سے کوئی ہے جو اس میں سے کچھ بھی کر سکے؟

وَنَزَّلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً مُّبٰرَكًا فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ جَنّٰتٍ وَّحَبَّ الْحَصِيْدِ ۙ وَالنَّخْلَ بٰسِقٰتٍ لَّهَا طَلْعٌ نَّضِيْدٌ ۙ رِّزْقًا لِّلْعِبَادِ ۙ وَاَحْيَيْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا ؕ كَذٰلِكَ الْخُرُوْجُ ۔ (۵۰/۹)

اور ہم نے آسمان سے بابرکت پانی برسایا۔ جس سے باغات اور کھیتیاں (اناج) اُگائے اور سر بفلک کھجور کے درخت جن کے خوشہ تہ بہ تہ ہیں (اپنے) بندوں کے لئے (سامان) معیشت کے طور پر پیدا کئے۔ اور اس سے مُردہ بستیوں (زمینوں) کو از سرِ نو زندگی بخشی۔ اس طرح (پھر) زندگی کی نمود ہوگی۔

نظامِ رزق اللہ کے ہاتھ میں ہے | لَا رَزَّاقَ اِلَّا اللّٰهُ ۔

رزق کے تمام سرچشمے اللہ کے اقتدار میں ہیں۔

قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ......

وَمَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ ط فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ ج ....... (۱۰/۳۱)
(اے رسول) ان سے پوچھو کہ وہ کون ہے جو تمہیں زمین و آسمان (کی بخشائشوں کے ذریعے) رزق دیتا ہے؟ ............ اور وہ کون ہے جو کارگہ ہستی کا انتظام کر رہا ہے؟ کہیں گے کہ اللہ

قرآن کریم کائنات کے محیر العقول نظام کو سامنے لاکر ذہن انسانی کو توحید الٰہی کی طرف منتقل کر دیتا ہے۔ یہ اپنے مخصوص انداز و استدلال سے سلسلۂ کائنات میں قدرت کے نظم و نسق کی ہوشربا کارفرمائیاں پیش کر کے انسان کو اس نتیجہ تک پہنچانا چاہتا ہے۔ کہ نظام کائنات میں ایک صاحب اختیار و ارادہ مشیت کارفرما ہے۔ اسی لئے یہ کارخانۂ قدرت اس طرح یک جہتی و ہم آہنگی سے چل رہا ہے۔ نظام فطرت کی یہ کارفرمائی اس حقیقت کی طرف دلالت کرتی ہے۔ کہ نظام کائنات کو چلانے والی وہ صاحب مشیت ذات یگانہ و یکتا اور لاشریک ہے۔ اسی لئے کائنات میں ایک ہی قانون نافذ العمل ہے۔

اَمَّن يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَمَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ط ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ط قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ٥

وہ کون ہے جس نے مخلوق کی ابتدا کی اور پھر اسے گردشیں دے رہا ہے اور وہ کون ہے جو تمہیں زمین و آسمان سے رزق دیتا ہے۔ کیا اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا الٰہ بھی ہے؟ (اے رسول ان سے) کہو کہ (اگر تم اپنے دعویٰ شرک میں سچے ہو تو اس کی کوئی دلیل پیش کرو۔

## نہ کوئی دوسرا خالق نہ دوسرا رازق

..... هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللّٰهِ يَرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ط لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ صلے ......... (۳۵/۳)

کیا اللہ کے سوا کوئی اور بھی خالق ہے جو تمہیں زمین و آسمان سے رزق بہم پہنچاتا ہے۔ اس (اللہ) کے سوا کوئی اور الٰہ نہیں!

قرآنِ کریم نے یہ بھی وضاحت کردی۔ کہ مبدا رزق پانی ہے۔ جسے اللہ نے آسمان کی بلندیوں پر پھیلا رکھا ہے۔ وَفِي السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ (۵۱/۲۲) اور وہیں سے اس کا نزول ہوتا ہے۔ وَ يُنَزِّلُ لَكُمْ مِنَ السَّمَآءِ رِزْقًا (۴۰/۱۳)

## رزّق کا اختیار کسی اَور کو حاصل نہیں

عقیدۂ توحید کا یہ ایجابی پہلو تھا کہ رزّق صرف خدا ہی دیتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی سلبی پہلو بھی نمایاں کردیا کہ اس کے سوا رزّق کا داتا کوئی نہیں ان دونوں ٹکڑوں کے ملنے سے ایمان کی تکمیل ہوتی ہے۔ وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَهُمْ رِزْقًا مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ شَيْئًا وَّلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ۚ (۱۶/۷۳)

یہ لوگ اللہ کو چھوڑ کر ایسی ہستیوں کے سامنے (زمینی خداؤں) جھکنے لگ جاتے ہیں (ان کی عبودیت، غلامی، محکومی اختیار کرلیتے ہیں) جو زمین و آسمان سے رزّق دینے کا کچھ بھی اختیار نہیں رکھتے۔

قرآنِ کریم نے ان "باطل خداؤں" کی نفی کردی۔ جن کو صاحب اختیار و ارادہ سمجھ کر انسان ان کی غلامی و محکومی اس لئے اختیار کرلیتا ہے کہ رزّق عطا کرنا ان کے قبضۂ قدرت میں ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ خواہ دورِ توہم پرستی کے دیوی دیوتاؤں یا عہدِ تہذیب و تمدّن کے "تازہ خدا" رزّق کسی کے ہاتھ میں نہیں صرف رزّاق (اللہ) کے ہاتھ میں ہے۔ اور جب رزّق کے تمام سرچشموں کا مالک ربّ العالمین ہے۔ تو پھر اس کے سوا کسی اور کی محکومی اور غلامی کیسی؟

اِنَّ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَمْلِكُوْنَ لَكُمْ رِزْقًا فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰهِ الرِّزْقَ وَاعْبُدُوْهُ وَاشْكُرُوْا لَهٗ ؕ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝ (۲۹/۱۷)

جن کی تم اللہ کے سوا غلامی و عبودیت اختیار کرتے ہو وہ تمہارے رزّق پر کوئی اختیار نہیں رکھتے۔ سو رزّق اللہ ہی کے ہاں سے طلب کرو اور غلامی بھی اُسی کی اختیار کرو۔ اسی کے شکر گزار رہو کہ زندگی کی ہر گردش اسی قانون کے گرد ہوتی ہے۔

اگر وُہ رزق کے سرچشموں کو بند کردے۔ تو انہیں کوئی قوت کھول نہیں سکتی۔

اَمَّنْ هٰذَا الَّذِيْ يَرْزُقُكُمْ اِنْ اَمْسَكَ رِزْقَهٗ (۶۷/۲۱)

اگر اللہ ذرائع رزق بند کردے تو وُہ کون ہے جو تمہیں رزق دے سکے؟

تمام ذرائع کا بند ہونا تو ایک طرف اگر نظامِ کائنات میں تھوڑا سا خلل واقع ہو جائے۔ صرف اتنا سا فرق کہ سمندر سے صاف وشفاف پانی اُٹھ کر بادل بن جاتا ہے۔ اور اس کی تمام کثافتیں (جو اس کے کھاری پن کی ذمہ دار ہیں) سمندر میں رہ جاتی ہیں، اگر سمندر کا پانی جیسا ہے ویسا ہی بادل بن کر زمین پر برسنے لگ جائے تو سوچئے کہ اتنے سے فرق سے دُنیا کی حالت کیا سے کیا ہو جائے گی۔ وُہ اس حُسنِ انتظام سے انسانوں کو رزق دیتا ہے۔ اور اس کے بدلے میں ان سے کچھ نہیں چاہتا۔

لَا نَسْئَلُكَ رِزْقًا ؕ نَحْنُ نَرْزُقُكَ ؕ ...... (۲۰/۱۳۲)

ہم تجھ سے رزق نہیں مانگتے۔ بلکہ تجھے تو رزق ہی دیتے ہیں۔

خدایانِ باطل اور رزّاقِ حقیقی میں یہی فرق ہے۔

اقبالؒ کے فرمان کے مطابق:۔

آں خُدا نانے دہد ——— جانے دہد

ایں خُدا نانے دہد ——— جانے بُرد

حصول رزق کے وسائل و ذرائع اور طریق کی نسبت سے رزق کی خاصیت اور اس کے اثرات کی کیفیت بدل جاتی ہے۔ صحیح طریق سے حاصل کیا جائے، تو رزق، رزق حسنہ۔ رزق طیب و حلال۔ رزق کریم (عزت کی روٹی) ہے۔ رزق حسنہ ان لوگوں کا حصہ ہے جو خدا کے قانون کے مطابق اعمال صالحہ کرتے ہیں۔ اور اسی کے متعین کردہ قوانین کے ماتحت حصولِ رزق کے لئے طلب و جستجو کرتے ہیں۔

**رزق کریم** | فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ○ (۲۲/۵۰)

اور وُہ لوگ جو ایمان لاتے ہیں۔ اور اعمال صالحہ کرتے ہیں۔ ان کے لئے خطرات سے حفاظت اور باعزت رزق ہے۔ نیز ۲۴/۲۶

سچے مومنوں کے لئے مدارج عالیہ ہیں اور عزت کی روٹی ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ رزقِ کریم (عزت کی روٹی) کسے کہتے ہیں اور وہ کیونکر ملتی ہے۔

ایک ایسا نظامِ معاشرہ جس میں رزق کے سرچشمے جابر و ظالم۔ بالادست انسانوں کے قبضہ و اختیار میں ہوتے ہیں۔ اور باقی افرادِ معاشرہ کی احتیاج (بھوک)، انہیں ان کا دستِ نگر اور محتاج بنا دیتی ہے۔ بالادست انسانوں کا یہ گروہ زیردستوں سے اپنی مرضی کے مطابق کام لیتا ہے۔ یہ مترفین (مفت خوروں کا خوشحال طبقہ) اپنی مفاد کوشیوں اور ہوس رانیوں کے لئے زیردست انسانوں کو استعمال کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے نظامِ زندگی میں یہ لوگ حیاتِ با شرف سے کیسے مشرف ہو سکتے ہیں۔

دوسرا معاشرہ جس میں وسائل پیداوار کسی فردِ واحد یا انسانوں کے کسی گروہ یا کسی نیشن (قوم) کی ملکیت نہیں ہوتے بلکہ انہیں رب العالمین کے نظامِ ربوبیت عالمینی کے تحت ضرورت مندوں کی ضرورت پورا کرنے کے لئے اس طریق سے صرف کیا جاتا ہے کہ اس معاشرہ میں کسی انسان کی ضرورت رکی نہیں رہتی۔ کوئی فرد بھوکا نہیں رہتا۔ اس معاشرہ میں تمام افرادِ معاشرہ حتّٰی کہ (امیر مملکت) بھی قوانینِ خداوندی کی محکومیت میں ہوتا ہے۔ اس میں تمام انسان یکساں عزت و تکریم کے مستحق ہوتے ہیں۔ کوئی فرد کسی دوسرے فرد کا محتاج نہیں ہوتا۔ اس مثالی معاشرہ میں کوئی نہ کسی کا حاکم ہوتا ہے اور نہ کوئی محکوم۔ نہ کوئی سائل نہ محروم۔ اس میں انسان ہونے کی جہت سے تمام انسان یکساں طور پر واجب التکریم و تعظیم ہوتے ہیں۔ اس معاشرہ میں پیکرانِ توحید کا شعلۂ ایمان اس انسانیت سوز جہنم کو نگل لیتا ہے۔ جو انسانی قوانین کے مطابق قائم کردہ معاشرہ میں خرمنِ امن کو جلا کر انسان کو ریزہ ریزہ کر دیتا ہے۔ اس معاشرہ کا ہر فرد قانون کے سامنے جواب دِہ ہوتا ہے۔

حکیم الامتؒ فرماتے ہیں کہ اس مثالی معاشرہ میں:۔

کس دریں جا سائل و محروم نیست
عبد و مولا حاکم و محکوم نیست

کس نباشد در جہاں محتاج کس
نکتۂ شرعِ مبین ایں است و بس

ایسے قرآنی معاشرہ میں شرفِ انسانیت اور عزّتِ آدمیّت باقی رہتی ہے۔ اسی میں انسانی ذات کی صحیح معنوں میں نشوونما ہوتی ہے۔ یہ معاشرہ الٰہ النّاس کی صفتِ ربّ العالمین کا مظہر اور ربوبیتِ عامہ کا ذمّہ دار و نگراں ہوتا ہے۔

**جور و استبداد** بھوک کا کوڑا اس قدر سخت ہے۔ کہ اس سے سرکش سے سرکش اور وحشی سے وحشی جانور بھی مطیع و اطاعت گذار بن جاتا ہے۔ سرکس کے شیر کو دیکھیے کس طرح اپنے رنگ ماسٹر کا حکم مانتا ہے اس کی وجہ یہی ہوتی ہے۔ کہ اُسے بھوکا رکھا جاتا ہے۔ انسان کی سب سے دُکھتی رگ رزّق ہے۔ عالمِ انسانیت میں جور و استبداد اور ظُلم و ستم صرف اس بنا پر جاری رہتا ہے۔ کہ جابر و طاقت وَر انسان رزّق کے سرچشموں پر قابض ہوکر وسائل پیداوار کو اپنی مفاد پرستیوں کے تابع تقسیم کرتے ہیں۔ زیر دست انسان بھوک کے عذاب سے بچنے کے لئے ان نشۂ اقتدار سے بدمست حکمرانوں کی اطاعت کے لیے مجبور ہوجاتے ہیں۔ جس معاشرہ میں معاشی ناہمواریاں اور معاشرتی ناسُتواریاں ہوں گی۔ یہ معاشرہ عدمِ توازن کے دہکتے انگاروں کا جہنّم ہوگا۔ جس کی امن سوز شرر افشانیاں اور ہلاکت انگیز آتش ریزیاں جسدِ انسانیت کو راکھ کا ڈھیر بنا کر رکھ دیتی ہیں۔

قرآن کے قانون کے مطابق رزّق کا بست و کشاد اور تنگی و فراوانی، سب خُدا کے اختیار میں ہے۔ کسی انسان کو کسی دُوسرے انسان کے رزّق میں کمی و بیشی کا اختیار نہیں دیا گیا۔

**رزّق کی تنگی و فراوانی خُدا کے ہاتھ میں ہے** وَاللّٰهُ یَقْبِضُ وَیَبْسُطُ ص (۲/۲۴۵) اور اَللّٰهُ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیَقْدِرُ ط (۱۳/۲۶) اللہ اپنی مشیت کے مطابق جس کی روزی چاہتا ہے۔ فراخ کر دیتا ہے۔ اور جسے چاہتا ہے تنگی دیتا ہے۔ نیز ۱۷/۳۰ و ۲۸/۸۲ و ۲۹/۶۲ اور یہ وُہ اُصول ہے۔ جس کے اندر اہلِ ایمان کے لئے بڑی عظیم الشّان نشانیاں پوشیدہ ہیں کہ

أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّ اللَّهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَشَاءُ
وَيَقْدِرُ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ۝ (۳۰/۳۷)

کیا یہ اس بات پر غور نہیں کرتے کہ اللہ (اپنے قانونِ مشیت کے مطابق) جو چاہتا ہے اس کی روزی فراخ کر دیتا ہے اور جو چاہتا ہے اسے ایک معین اندازے کے مطابق دیتا ہے۔ اس قانونِ مشیت کے اندر ایمان والوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں!

زمین و آسمان (ارض و سمٰوات) میں رزق کی کنجیاں اُسی کے ہاتھ میں ہیں۔ وُہی رزق کے تمام خزانوں کا مالک ہے۔

لَهُ مَقَالِيدُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۖ يَبْسُطُ الرِّزْقَ
لِمَنْ يَشَاءُ وَيَقْدِرُ ۚ إِنَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ۝ (۴۲/۱۲)

زمین و آسمان کے خزانوں کی کنجیاں اس کے پاس ہیں۔ جو چاہتا ہے اسے روزی زیادہ دیتا ہے اور جو چاہتا ہے اسے نپی تُلی دیتا ہے اور وہ ہر چیز کا پُورا پُورا علم رکھتا ہے۔

فَكُلُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللَّهُ حَلَالًا طَيِّبًا ۖ وَاشْكُرُوا
نِعْمَتَ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ ۝ (۱۶/۱۱۴)

محولہ بالا آیات سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ جو معاشرہ مستقل اقدار کے مطابق نظامِ مملکت چلائے گا۔ اس میں رزق کی فراوانی ہوگی اور ہر فرد سکون و طمانیت کی دولت سے بہرہ یاب ہوگا۔ لیکن جس معاشرہ کا نظام انسانوں کے خود ساختہ قوانین کے مطابق چلے گا۔ اس میں معاشی و معاشرتی عدم توازن پیدا ہو جائے گا اور چھینا جھپٹی کی زہرناکیاں فضائے معاشرہ کو مسموم کر دیں گی۔

### فضل ایزدی کی جستجو

فضل کے عام معنی ایزاد (زیادہ ہونے) کے ہیں۔ اگر حصولِ رزق کے لئے وُہ طریق اختیار کیا جائے جو قرآن نے بتایا ہے۔ تو حصولِ رزق کی اس کوشش کا نام "اللہ کے فضل کی جستجو" ہے۔ قرآن نے اکثر مقامات پر اسے معاشی سہولتوں کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔ چونکہ یہ سہولتیں خُدا کی طرف سے بلا مزد و معاوضہ عطا ہوتی ہیں اس لئے اسے (فضل اللہ)

کہہ کر پکارا گیا ہے۔

یہ یاد رکھئے کہ یہ سہولتیں خود بخود انسان تک نہیں آ جاتیں۔ انسان کے لئے ان کی طلب اور جستجو ضروری ہے۔ اسے "ابتغائے فضل اللہ" سے تعبیر کیا گیا ہے۔

قرآن کا ربوبیتِ عالمینی کا نظام تمام انسانوں کے لیے عزت کی روٹی کا ذمہ دار ہے۔ یہ غیر خداوندی نظامہائے معیشت جنہوں نے انسانی دنیا کو ہوس و آز اور بغض و حسد کی آتش ناکیوں کے سپرد کر رکھا ہے۔ ان کی اساس و بنیاد محض عقل پر ہے۔ انسانی معاشرہ کو اس وقت تک معاشرتی خوشگواریوں اور معاشی خوشحالیوں کی جھلک دیکھنا نصیب نہیں ہو گی۔ جب تک انسان اپنے ارادوں۔ خواہشوں اور جذبوں اپنی طاقت و قوت اور خرد و توانائی کو ان مستقل اقدارِ حیات کے تابع نہیں کرے گا جو خالقِ حقیقی کی طرف سے متعین فرمودہ ہیں۔ یہ مستقل اقدار وحی نے عطا کی ہیں۔

# خالقیت

اشیائے کائنات کا خالق الٰہ حقیقی ہے جس کا کوئی شریک و سہیم نہیں۔ خلق کے معنی کسی شئے کا تناسب و توازن درست کرنا۔ کسی چیز کا اندازہ کرنا۔ کسی شئے کا ماپنا۔ مختلف عناصر میں توازن و تناسب پیدا کر کے ایک خاص پیمانے۔ ایک خاص اندازے کے مطابق خاص طریق سے کسی شئے کو بنانا۔ کسی شئے کو عدم سے وجود میں لانے والے کے لئے قرآن کریم نے بدیع اور فاطر کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ مختلف اندازوں اور مختلف تراکیب سے نئی نئی چیزیں بناتے چلے جانا۔ تخلیق شدہ اشیاء میں نئے نئے اضافے کرتے چلے جانا۔ ایک خاص اندازہ و ترکیب۔ ایک خاص اندازہ و پیمانہ سے مختلف چیزوں میں تناسب و توازن اور حسن و خوبی پیدا کرنا خالقِ کائنات ہی کے لئے زیبا و سزاوار ہے یہ طاقت اور قدرت جس میں دوسری کوئی قوت شریک نہیں۔ صرف اللہ کے لئے ہے۔

قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ

يُعِيْدُهٗ ط قُلِ اللّٰهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ٥ (۱۰/۳۴)

(اَے رسول - ان سے پوچھو) جن کو تم شریکِ خدا وندی قرار دیتے ہو۔ ان میں سے کوئی ایسا بھی ہے جس نے خلقت کی ابتدا کی ہو اور پھر اس کا اعادہ کر رہا ہو؟ کہیئے کہ اللہ ہی نے خلقت کی ابتدا کی ہے اور وہی اس کا اعادہ کرتا ہے۔ سو تم پھر کہاں (حق سے) پھرے جاتے ہو۔

پہلے پہل کسی کام کی ابتدا کرنے والا۔ نئی نئی چیزیں ایجاد کرنے والا بدیعؒ اور فاطرؒ وہی الہ الناس ہے۔ جو کائنات کی ہر شئے کو عدم سے وجود میں لایا۔ سورۂ بقر میں ہے :-

بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط وَاِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ٥ (۲/۱۱۷)

وہ ارض و سموات (آسمانوں اور زمین) کی ابتدا کرنے والا ہے (بدیعؒ ہے) جب وہ کسی امر کے متعلق فیصلہ کر لیتا ہے۔ تو وہ صرف اتنا کہتا ہے کہ کُن ہو جا، اور وہ ہو جاتا ہے۔ (فیکون)

بدیع (موجد) ہونا وہی ہے جسے كُنْ فَيَكُوْنُ کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ نظامِ کائنات کی ہر شئے کی تخلیق ایک خاص قاعدے اور قانونِ الٰہی کے مطابق ہوتی ہے۔ یہ مختلف مدارج و مراحل سے گذر کر اپنی آخری اور مکمل صورت اختیار کر لیتی ہے كُنْ فَيَكُوْنُ سے مراد یہ ہے کہ اللہ کو کسی سامان اور اسباب کی ضرورت نہیں۔ ہر شئے کی ابتدا اس کے حکم و ارادہ کے ماتحت ہوتی ہے۔ پھر اسی کے متعین کردہ قوانین کے تحت وہ مختلف مراحل طے کر کے اپنی مکمل شکل اختیار کرتی ہے۔ اللہ نے مختلف شعبائے کائنات کو اپنے مختلف مددگاروں کے سپرد نہیں کیا ہوا بلکہ وہی بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط ہے۔ جو اپنے مرکزِ حکومت پر قائم و استوار نظامِ کائنات کو اپنے قانون کے پیمانوں ۔ اپنے حکم و ارادہ کے اندازوں کے مطابق چلا رہا ہے۔

اَللّٰهُ الَّذِىْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِىْ

سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ ط ... ... ... ...
وَجَعَلَ لَکُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَۃَ ط قَلِیْلًا مَّا
تَشْکُرُوْنَ ٥ (۳۲/۴-۹)

اللہ وہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین (کے اس محیر العقول سلسلہ) کو چھ (بڑے طول طویل) اوقات میں پیدا کیا۔ اور اب تختِ حکومت پر قائم و استوار (اس نظامِ کائنات کو چلا رہا ہے) اس کے سوا تمہارا نہ کوئی کارساز ہے، نہ ساتھی۔ کیا تم (اس نظامِ کائنات کی حیرت انگیزی سے) کچھ عبرت حاصل نہیں کرتے۔ وہ خدا جو ایک عظیم الشان امر (اسکیم) کی تجویز آسمان سے زمین تک کر دیتا ہے، پھر وہ سکیم (تجویز) ایک مدّتِ مدیدہ میں جس کی مقدار انسانی شمار کے مطابق ایک ہزار برس ہو، معراج تک پہنچ جاتی ہے۔ (تکمیل حاصل کر لیتی ہے) یہ ہے خدائے عزیز و رحیم جو موجود اور غائب سب کا علم رکھتا ہے (جسے اس اسکیم کی ابتدا کے وقت اس کی انتہا کی خبر تھی) وہ خدا جس نے ہر چیز کو بہتر سے بہتر بنایا (جس طرح) انسان (کی سی اشرف مخلوق) کی ابتدا مٹی سے کی۔ پھر اس میں اپنی روح پھونک دی۔ اور اُسے نوعِ انسانی اس طرح تمہیں سمع و بصر اور قلب عطا کیا۔ افسوس کہ تم بہت کم شکر گزار ہو۔

خالقِ کائنات نے اس عظیم الشان سلسلہ کائنات کو یونہی بے مقصد و بیکار پیدا نہیں کیا۔ یہ بے معنی و بے غرض و غایت بھی نہیں۔ اسے مقصد و مصلحت کے تحت پیدا کیا گیا ہے۔ کائنات کی پیدائش میں خالقِ حقیقی کی حکمت بالغہ کام کر رہی ہے۔ تخلیقِ ارض و سما بالمقصد (بالحق) ہے۔

خالقِ ارض و سما تخلیقِ کائنات کے بعد بیکار نہیں بیٹھ گیا۔ وہ حیات بعد الممات پر پوری قدرت رکھتا ہے۔

اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّ اللّٰہَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ
وَلَمْ یَعْیَ بِخَلْقِھِنَّ بِقٰدِرٍ عَلٰۤی اَنْ یُّحْیِۦَ الْمَوْتٰی ط
بَلٰۤی اِنَّهٗ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ٥ (۴۶/۳۳)

کیا یہ نہیں دیکھتے کہ اللہ وُہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے اور وہ ان کے پیدا کرنے (کے بعد) تھک نہیں گیا۔ کیا وُہ اس پر قادر نہیں کہ مُردوں کو زندہ کر دے؟ یقیناً وہ ہر شئے پر قادر ہے!

خالقِ کل۔ خالقِ کائنات وُہی ہے۔ سب کچھ اُس نے پیدا کیا ظن و تخمین کی وادیوں میں سرگرداں ٹامک ٹوئیے مارنے والے جو یہ کہتے ہیں کہ اشیائے کائنات (موجوداتِ عالم) میں اندھی فطرت کام کر رہی ہے۔ یہ تمام کائنات بلا مقصد و مصلحت وجُود میں آگئی ہے۔ اسی طرح یہ کبھی فنا بھی ہو جائے گی۔ قُرآنِ حکیم نے اس کی تردید خاص انداز میں کی ہے:۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًاؕ ذٰلِكَ ظَنُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْاۚ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنَ النَّارِؕ (۳۸/۲۷)

اور ہم نے زمین و آسمان اور جو کچھ اُن کے درمیان ہے اسے یونہی باطل نہیں پیدا کر دیا۔ ایسا تو ان لوگوں کا ظن ہے جو خُدائے حکیم کے وجود سے انکار کرتے ہیں۔ ان کفار کے لئے نار (جہنّم) کی تباہی اور بد بختی ہے۔

علم الاشیاء کے متعلق تحقیق و تفتیش جماعت مومنین کا فریضۂ اوّلین ہے ملائکہ کے جواب میں اللہ تعالےٰ نے یہی کہا تھا کہ میں نے آدم کو (حقائق الاشیاء) کائنات کے بھیدوں اور اشیائے کائنات کے رازوں سے باخبر کر دیا ہے۔ آدم اُن کی خاصیّت و کیفیّت کو جانتا ہے۔ جو تم نہیں جانتے۔

آج کا (بزعم خویش) ماہر تعلیم[ل] جو یہ کہتا ہے کہ ان کی زندگی کی آخری آرزو یہ ہے۔ کہ دین اور سائنس کو ہم آہنگ کیا جائے۔ وُہ یہ کہتے ہوئے اس حقیقت کو فراموش کر جاتے ہیں کہ سائنس اصل میں دین ہی کا ایک شعبہ ہے۔ کیونکہ قرآنی نقطۂ نظر سے تسخیرِ کائنات ہی سے لقائے ربّ ممکن ہے۔ کائنات کا ایک ذرّہ تک ایسا نہیں جسے بے معنی و بے کار اور عبث و فضول پیدا کیا گیا ہو۔

---

ل ڈاکٹر سیّد عبداللہ صاحب نے گورنمنٹ ڈگری کالج لائل پور میں مجلسِ علومِ اسلامی کے ایک اجلاس خصوصی کے خطبہ صدارت، ۲ مارچ ۱۹۶۶ء میں فرمایا تھا۔ یہ اجلاس عزیزم محمد فاروق صاحب کی صدارت میں منعقد ہُوا تھا۔

ایک گوشہ سے یہ آواز بھی کانوں کو سنائی دیتی ہے۔ کہ سائنس کبھی کچھ اور کبھی کچھ کہتی ہے۔ ایسے حضرات کی خدمت میں صرف یہی عرض کیا جا سکتا ہے کہ

سائنس قوانینِ فطرت کا انکشاف کرتی ہے، بناتی نہیں۔ مومن کا
فریضۂ حیات تسخیرِ کائنات ہے کیونکہ
زندگی جہد است استحقاق است

مومنین کی زندگی مشاہدہ کائنات اور مطالعۂ فطرت میں مضمر ہے۔ مظاہرِ قدرت میں غور و خوض کرنے والوں کو قرآن اولوالالباب قرار دیتا ہے۔ فرزندانِ اسلام کا فرض ہے۔ کہ وہ اپنے تجربات و مشاہدات سے ہر ذرہ کائنات کی تخلیق ماہیت و کیفیت کا اندازہ کریں اور خلاقِ جہاں کی پیدا کردہ اشیاء کو مسخر کر کے انسانی فلاح و فوز اور انسانیت کے قیام و بقا کے لئے صرف میں لائیں۔ اور خدا کے مقرر کردہ پیمانوں اور اندازوں کے مطابق ان کو استعمال کریں نہ کہ یورپ کی بے لگام طاقتوں کی طرح ان قوتوں کو انسان کشی اور مردم آزاری کے کام میں لائیں۔ ایمان والوں کا فرض ہے۔ کہ وہ سورج کی شعاعوں کو اس لئے گرفتار کریں کہ ان سے ظلمت کدۂ انسانیت کی شبِ تاریک سحر ہو۔ یہی صاحبانِ علم و بصیرت اور دانش و بینش ہیں۔ جن کے متعلق قرآن نے کہا ہے :-

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ
وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ۚ الَّذِیْنَ یَذْكُرُوْنَ
اللّٰهَ قِیٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِهِمْ وَیَتَفَكَّرُوْنَ فِیْ
خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ج رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ج
سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ (۳/۱۸۹-۱۹۱)

یقیناً ارض و سمٰوات کی پیدائش اور دن اور رات کی گردش (اختلاف) میں صاحبانِ بصیرت کے لئے بڑی ہی نشانیاں ہیں۔ وہ صاحبانِ بصیرت جو کھڑے بیٹھے، لیٹے قوانینِ خداوندی کو اپنے سامنے رکھتے ہیں۔ یعنی ارض و سمٰوات کی خلقت پر غور و تفکر کر کے اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار تو نے کچھ بھی بیکار و عبث پیدا نہیں کیا۔ یقیناً تیری ذات اس سے بلند ہے۔

(کہ یہ سب کچھ یونہی عبث بنا دیا ہو) سو (اے اللہ) ہمیں آگ کے عذاب سے محفوظ رکھنا۔

یہاں اللہ کے ذکر کا مفہوم واضح ہوگیا کہ فطرت کے مشاہدہ اور مطالعہ سے اس حقیقت کو پالیا کہ سلسلہ کائنات بے کار و بے مقصد نہیں۔ یہ قوانین خداوندی کے مطابق سرگرم عمل ہے۔ اجزائے کائنات کے مختلف جواہر و خواص تلاش کرکے (مفردات) یعنی کل کو بے معنی و عبث قرار دینے والے۔ پیدا شدہ اشیاء (مخلوق) سے کرید کرید کر منافع و فوائد ڈھونڈنے والے لیکن فائدہ مند اور نفع رساں اشیاء کے خالق کو "اندھی فطرت" کہنے والے منکرین خدا آج نہیں تو کل یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ تخلیق کائنات اندھی فطرت کا کام نہیں۔ یہ عظیم الشان کارخانہ قدرت کو چلانے والی ہستی علیم و حکیم اور خبیر و بصیر ہے۔ یہ ریت کے ایک ذرہ میں ہزاروں آفتاب دیکھنے والے۔ یہ اندھیری رات میں ستاروں کی چشمکیں دیکھ کر بے ساختہ پکار اٹھیں گے سبحان اللہ۔ موجوداتِ عالم کی ایک ایک شئے کی کنہ و حقیقت معلوم کرنے کے لئے اپنی تمام عمریں صرف کرنے والے یہ کائناتی مفکر جوں جوں علم الاشیاء کے سربستہ رازوں اور حقیقی بھیدوں سے واقف ہوتے جائیں گے۔ اور انکشافات و اکتشافات کے سمندروں کی انتھاہ گہرائیوں میں ڈوبیں گے بے تابانہ کہہ اٹھیں گے۔ کہ اس محیر العقول سلسلۂ کائنات کا خالق عظیم قوتوں والی بلند و بالا لاشریک ہستی ہے۔ یہ قرآنِ پاک کی زندہ و پائندہ آیات کو بطور ثواب پڑھنے والا مسلمان جب تک حقیقی معنوں میں قرآن میں غوطہ زن نہیں ہوگا۔ اور پاکستان کے اربابِ اختیار و اقتدار جب تک قرآن کو مذہبی مدرسوں سے اٹھا کر کالج و یونیورسٹی میں نہیں لائیں گے۔ نیز نصاب تعلیم میں بنیادی تبدیلیاں نہیں کی جائیں گی اور دانش گاہوں میں فکرِ اقبالؒ کو عام نہیں کیا جائے گا۔ یہ مومنین اس نکتۂ ایمان کو نہیں سمجھ سکیں گے:۔

ولایت پادشاہی علم اشیاء کی جہانگیری
یہ سب کیا ہیں فقط اک نکتۂ ایمان کی تفسیریں

علم اشیاء کی جہانگیری کے لئے خدائے جہان کا وہ تصور جو قرآن عزیز نے

پیش کیا ہے۔ اس سے باخبری ضروری ہے۔

جہانِ کائنات کی ہر شے اللہ نے بالمقصد پیدا کی ہے۔ یہ محیر العقول مشنیری جہاں بھی ہے موزوں ہے۔ جس مقصد کے لیئے اسے پیدا کیا گیا ہے۔ اس کی سرانجام دہی میں مصروف و منہمک ہے۔ کارخانہ قدرت کی ہر شے کو خالقِ کائنات نے بالحق پیدا کیا ہے۔ اربابِ علم و بصیرت کے لئے اس کائنات میں وہ نشانیاں موجود ہیں۔ جن سے یہ ایقان و طمانیت حاصل کر سکتے ہیں۔

خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّلْمُؤْمِنِیْنَ ۠

اللہ نے آسمانوں اور زمین کو "بالحق" پیدا کیا ہے۔ یقیناً اس میں اہل ایمان کے لیے نشانیاں ہیں! یونہی کھیل تماشا کے لیے اسے پیدا کرنا خدا کی حکمت و مصلحت کے خلاف ہے۔ مظاہرِ فطرت میں صاحبانِ ایمان کے لیے نشانیاں ہیں۔

اس عظیم سلسلہ کائنات اور عالمِ موجودات میں کوئی نقص۔ کوئی خرابی۔ کوئی نامناسبت کوئی غیر موزونیت۔ کوئی بھول کوئی چوک۔ کوئی غلطی اور کوئی بے قاعدگی نہیں۔ اور کہیں بھی انگشت نمائی کی گنجائش موجود نہیں ہے! اس کارخانۂ قدرت میں کہیں خلل نہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ سطح بین نگاہوں کو کائناتی نظام میں کوئی توازن و تناسب اور ربط و ضبط نظر نہیں آتا۔ لیکن یہ اٹل اور انمٹ حقیقت ہے کہ تخلیقِ خداوندی میں کوئی سقم اور کوئی شکن نہیں۔ خالقِ جہان کا پیدا کردہ یہ جہاں اس انداز کا نہیں کہ اسے پیدا کرنے کے بعد وہ (نعوذ باللہ) ایک عضوِ معطل بن کر نہیں بیٹھ گیا۔ وہ سو نہیں گیا کیونکہ نہ اسے نیند آتی ہے نہ اونگھ۔ وہ زندہ قوتوں والا بلند و بالا خدا حیّ کے ساتھ قیوم بھی ہے۔ اب بیکار نہیں بیٹھ گیا۔ نظریۂ تعطل حقائق سے چشم پوشی کی دلیل ہے۔

رگِ کائنات میں اس کا نظام اس کی مشیت کے مطابق جاری و ساری ہے۔ وہ ہر شے کو اپنی حکمت سے پیدا کرتا ہے۔ پھر جسے باقی نہیں رہنا ہوتا وہ اپنے قانونِ محو و ثبات کے تحت اسے محو کر دیتا ہے۔ اور جس میں باقی رہنے کی صلاحیت

ہوتی ہے۔ اس کا قانون اسے ثابت رکھتا ہے:۔

يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَ يُثْبِتُ ۚ وَعِنْدَهٗۤ اُمُّ الْكِتٰبِ ۝ (۱۳/۳۹)

کائنات میں محو و ثبات خدا کے قانون کے مطابق عمل میں آتا رہتا ہے۔

اس قانون کی اصل علم خداوندی میں ہے۔

یہ کہ اللہ نے ایسا قانون کیوں بنایا اس کی توجیہہ علم خداوندی میں ہے اور یہ انسان کی حدِّ ادراک سے ماورا ہے۔ اللہ نے اپنے قانونِ مشیّت کے مطابق ہر شیئے کے اندازے اور پیمانے مقرر کر رکھے ہیں۔ اب بھی تخلیقِ کائنات کے بعد تخلیق سے غافل نہیں ہو گیا:۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعَ طَرَآئِقَ ۖ وَمَا كُنَّا عَنِ الْخَلْقِ غٰفِلِيْنَ ۝ (۲۳/۱۷)

اور یقیناً ہم نے تمہارے اوپر متعدد راستے بنائے ہیں اور ہم تخلیق سے غافل نہیں ہو گئے۔

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

صرف آرائش و تزئین ہی نہیں بلکہ نت نئی مخلوق پیدا کرتا ہے۔

يَزِيْدُ فِى الْخَلْقِ مَا يَشَآءُ ۭ (۳۵/۱)

اپنے قانونِ مشیّت کے مطابق مخلوق میں اضافہ کرتا رہتا ہے

قرآن کا خدا خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ (ہر شیئے کا پیدا کرنے والا) ہے وہ خالق ہے۔ باپ نہیں۔ اس کے ہاں عملِ تخلیق ہے۔ تولید نہیں۔ اس لئے وہ کسی کا باپ کیسے ہو سکتا ہے؟

## معبودانِ باطل

قرآن کا دعویٰ ہے کہ اس کے پیش کردہ الٰہ حقیقی کے علاوہ اور کوئی الٰہ نہیں۔ مظاہرِ فطرت ہوں یا انسان یہ خود خدا کے پیدا کردہ ہیں۔

اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ اَمْ هُمُ الْخٰلِقُوْنَ ۝ اَمْ

خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ج بَلْ لَّا یُوْقِنُوْنَ ۃ

(۵۲ / ۳۶-۳۵)

کیا یہ بغیر کسی خالق کے پیدا ہو گئے ہیں یا خود آپ اپنے ہی خالق ہیں۔ کیا انہوں نے ارض و سمٰوٰت کو پیدا کیا ہے! نہیں ان لوگوں کو ایمان و ایقان نصیب نہیں۔

ایک مقام پر:۔

وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمٌ ۙ (۳۶ / ۷۹)

اور وہ تمام مخلوق سے خوب واقف ہے۔

مندرجہ بالا آیات سے یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ کسی غیر خدا میں کسی شئے کو عدم سے وجود میں لانے کی قدرت و طاقت نہیں،۔ ورنہ تخلیق کے جو دوسرے معنی ہیں مختلف عناصر میں ترتیب نو سے ایک نئی چیز بنا دینا۔ تو اس عملِ تخلیق کی انسان میں صلاحیت ہے۔ قرآن نے جہاں خدا کو احسن الخالقین (۲۳ / ۱۴ و ۳۷ / ۱۲۵) تو یہ اس طرف اشارہ ہے کہ خالق خدا کے علاوہ اور بھی ہو سکتے ہیں لیکن جو حُسن و زیبائی صحیح توازن و تناسب احسن الخالقین کی تخلیق میں ہے وہ دوسروں کی تخلیق میں نہیں ہو سکتا۔ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ:۔

تو شب آفریدی چراغ آفریدم
سفال آفریدی ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و راغ آفریدی
خیابان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم
من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

ایسی جماعت جس میں صفاتِ خداوندی کی نمود ہو رہی ہو۔ اس کی پہلی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ تخلیقی پروگرام میں خدا کی رفیق بن جاتی ہے۔

ہر کہ او را قوتِ تخلیق نیست
نزدِ ما جز کافر و زندیق نیست

مومن کی بُنیاد صفت تخلیق ہے۔ جماعتِ مومنین اپنے مقاصد کے حصول میں کسی غیر کی دستِ نگر نہ ہو۔ یہ خارجی سہاروں سے بے نیاز ہو۔ ایسی جماعت ہی دُنیا میں نئے نئے مدّعا۔ زندہ وتابندہ آرزوؤں کی تخلیق کا موجب اور زمانہ کے حال و مستقبل کی درخشندگی کی ضامن ہوتی ہے۔

جس طرح مومنین کا خدا اپنے ارادوں کی تکمیل میں کسی غیر کی مدد کا محتاج نہیں ہوتا۔ اسی طرح اس جماعتِ مومنین کی بھی یہ حالت ہونی چاہیئے۔ وُہ بھی غیر کی امداد و محتاجگی سے بے نیاز ہو۔ ظاہر ہے، کہ قرآن کی حامل جماعت ہی ایسی تابناک و درخشاں آرزوؤں اور ٹھوس ارادوں کی حامل ہو سکتی ہے :-

مقصدے از آسماں بالاترے
دل ربائے۔ دل ستانے دل برے
باطلِ دیرینہ را غارت گرے
فتنہ در جیبے۔ سراپا محشرے (اقبالؒ)

قرآن کا خُدا خلاّق و فعّال۔ حیّ و قیّوم۔ حکیم و بصیر۔ علیم و خبیر ہے تو کسی ایسی ملّت کو جو اس اللہ پر ایمان رکھنے والی ہو کس طرح زیبا ہے کہ وہ جمود و تعطّل اور غفلت کی زندگی بسر کرے۔ ایسی ملّت کو اپنی دُنیا آپ پیدا کرنا ہوتی ہے۔ یہ اپنے جہاں کی آپ خالق ہوتی ہے۔ اور اس جہانِ نَو کی تخلیق میں اس کا کوئی شریک اور مددگار نہیں ہوتا۔ ایسی ملّت جس طرح اس کا خُدا خلاّق و فعّال ہے (بشریت کی وسعتوں کے اندر) یہ بھی خلاّق و فعّال ہوتی ہے۔ یہی قرآن کا پیغام ہے۔

خیز و خلاّقِ جہانِ تازہ شو
شعلہ در بر کن۔ خلیل آوازہ شو
(اقبالؒ)

---

# ربوبیت

کسی شئے کا اپنے نقطۂ آغاز سے بتدریج (آہستہ آہستہ) نشوونما پاکر مقام تکمیل تک پہنچ جانا عربی زبان میں اس طریق عمل (PROCESS) کو ربوبیت کہتے ہیں۔ تربیت بھی اسی سے ہے۔ ایسا کرنے والے کو رب۔ جس کے عام معنی نشوونما دینے والا ہونگے۔ یہ انتظام کہ بچے کے پیدا ہوتے ہی اس کی پرورش کے لئے دُودھ کے چشمے اُبل پڑیں کسی انسان کے بس کی بات نہیں۔ یہ رب العالمین کی شانِ ربوبیت کا کرشمہ ہے۔ اگر ہم اسے چند لفظوں میں سمٹانا چاہئیں تو یُوں کہا جا سکتا ہے کہ ساری کائنات کی تگ و تاز اور سعی و کاوش کا مقصود ربوبیت ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اس نظام کی ہر حرکت ٹھوس تعمیری نتائج پیدا کرے۔ اس بات کا ثبوت کہ بیج کی ربوبیت شروع ہو گئی ہے۔ صرف یہ ہے کہ بیج سے کونپل پھوٹ نکلے۔ کونپل ایک تعمیری نتیجہ ہے۔ جس سے اس امر کی شہادت بہم پہنچتی ہے کہ نظامِ ربوبیت نے اپنا عمل شروع کر دیا ہے۔ اگر بیج سے کونپل نہ پھوٹے تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ تخم ریزی کا نتیجہ تعمیری کے بجائے تخریبی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح سے بیج کا درخت بننا تو کجا خود بیج بھی ضائع ہو گیا۔ قرآن اسے خبیث کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے۔ جس کی ضد طیب ہے۔

قرآن کی زبان میں ٹھوس تعمیری نتائج کو حق اور تخریبی نتائج کو باطل کہا جاتا ہے۔ نظامِ ربوبیت کا قیام و بقا اس محکم اصول پر ہے کہ اس میں ہر حرکت کا رُخ تعمیری نتائج حق کی طرف ہے۔ اسی لئے قرآن نے کہا ہے کہ کائنات کو بالحق پیدا کیا ہے۔

حق وُہ ہے جو ثابت ہو۔ اٹل ہو۔ انمٹ ہو۔ اپنی جگہ پر قائم ہو۔ حقیقت کے ہر معیار پر پُورا اُترے۔ علم و بصیرت کی کسوٹی پر کھرا ثابت ہو۔ اس کے نتائج ہمیشہ تعمیری ہوں۔

پروفیسر وہائٹ ہیڈ کہتا ہے کہ:۔

"باطل کے غیر محکم ہونے کی وجہ یہ ہے کہ کائنات میں ایسا نظم پایا جاتا ہے جو

حق پر مبنی ہے"

QUOTED BY HUXLAY "ENDS AND MEANS"

کائنات کے نظامِ ربوبیت میں مختلف اجزائے متعلقہ میں باہمی تعاون و ائتلاف لاینفک ہے۔ اس تناسب و توازن کو قرآن نے کہیں حسنات اور کہیں اعمالِ صالحہ کہہ کر پکارا ہے۔ حسن (اعضا کے صحیح تناسب کا نام حسن ہے) اعمال صالحہ جن سے ہمواریاں پیدا ہوں اور صلاحیتیں اُبھریں۔ اس کے مقابلے میں فساد کا لفظ آیا ہے۔ جس کے معنی ناہمواریاں ہیں۔ کہیں اسے قوام سے تعبیر کیا گیا ہے جس کے معنی صحیح صحیح توازن کا صحیح صحیح ہونا اور قائم رہنا ہے۔ اسی سے دین قیم ہے۔ یعنی وہ نظام جو خود بھی توازن و تناسب کی صحت پر قائم و استوار ہو اور افراد معاشرہ کی صلاحیتوں میں بھی صحیح صحیح توازن قائم کر سکے۔ اسی سے صراط مستقیم ہے۔ جس کے معنی توازن بدوش راہ ہیں۔

اللہ کا قانونِ ربوبیت توازن بدوش راہ پر جا رہا ہے جو معاشرہ اس کی اتباع کرے گا۔ اس میں بھی توازن قائم ہو جائے گا۔

قرآنِ کریم بار بار اس حقیقت کو دُہراتا ہے کہ کائنات بلا مقصد و منزل نہیں پیدا کی گئی۔ یہ تمام عالم آرائی بالمقصد ہے۔ ساری کائنات کی تگ و تاز اور سعی و عمل کا مقصود یہ ہے کہ اشیائے کائنات کی مضمر صلاحیتوں کی نشو و نما ہوتی جائے کائنات کی ہر شے اس سعی و کاوش میں سرگرمِ عمل دکھائی دیتا ہے۔

تخلیق (پیدا کرنا) اور ہدایت (رہنمائی کرنا) دونوں خدا کی طرف سے ہیں۔

اَلَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی ہ وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَھَدٰی ہ ۸۷/۲-۳

وُہ خُدا جس نے پیدا کیا اور ہر طرح کی موزونیت عطا کر دی۔ پھر (اس مضمر صلاحیتوں کے) پیمانے مقرر کر دیئے (کہ وُہ کس حد تک بردمند ہو سکتی ہیں) اور پھر (ان کی ربوبیت کی) راہ نمائی کر دی۔

دُوسرے مقام پر:۔

رَبُّنَا الَّذِیْٓ اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی ہ ۲۰/۵۰

خُدا کا قانونِ ربوبیت ہے جو ہر شئے کو اس کی خلقت عطا کرتا ہے اور اس کے

بعد اس کی رہنمائی کرتا ہے۔

اشیائے کائنات اپنی اپنی جگہ خدا کے قانونِ ربوبیت کی فرمانبرداری میں منہمک ہیں۔ کسی کو امرِ خداوندی سے یارائے سرکشی اور مجالِ انکار نہیں۔ سورج اپنی رفتار میں ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے کی کمی و بیشی کا مجاز نہیں۔ ہوا ایک لمحہ کے لئے بھی اپنا رُخ آپ متعین نہیں کر سکتی۔ ستارے ایک ثانیہ کے لئے اپنی گردشوں کی راہیں خود تبدیل نہیں کر سکتے۔ فضا میں تیرنے والے عظیم الشان محیر العقول کرّے اپنا راستہ خود تجویز نہیں کر سکتے۔

اس کارگہ عالم کے محیر العقول اور عظیم الشان نظام میں حسن و خوبی یہی ہے کہ کائنات کی ہر شئے قوانین فطرت کے سامنے سربسجود ہے۔

وَلِلّٰہِ یَسْجُدُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۱۳/۱۵)

کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے سب قوانین خداوندی کے سامنے سجدہ ریز ہے۔

ہر چیز اسی کے قانون کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی اس کی اطاعت شعاری میں مشغول ہے۔

سَبَّحَ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۵۷/۱)

کائنات کی ہر شئے قوانینِ خداوندی کے مطابق اپنے فرائض مفوضہ کی تکمیل میں سرگرم عمل ہے۔

کُلٌّ لَّہٗ قَانِتُوْنَ۔ ہر شئے اس قانونِ ربوبیت کے لئے قانت (سقائے قنیت) اس مشکیزے کو کہتے ہیں۔ جس سے پانی یونہی نہ ٹپکتا رہے بلکہ اس کا منہ اس جگہ کھلے جہاں پانی ڈالنا مقصود ہو۔

قانونِ خداوندی کی اطاعت کا نام اسلام ہے۔ آل عمران میں ہے:۔

وَلَہٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّ کَرْھًا وَّاِلَیْہِ یُرْجَعُوْنَ ○ (۳/۸۲)

کائنات کی ہر شئے اس کے قانون کے سامنے سرتسلیم خم کئے ہے۔ طوعاً وکرہاً۔

ان اشیاء کی تمام حرکتیں اسی محور کے گرد گردش کرتی ہیں۔

اس سے اسلام کے معنی سامنے آگئے۔ جو آفاقی کائنات میں نافذالعمل ہے یعنی اس قانون اور نظام کی اطاعت جس سے ہر شئے کی مضمر صلاحیتیں نشو و نما پا کر نقطۂ تکمیل تک پہنچ جائیں۔ بالفاظ دیگر اسلام کے معنی ہیں نظامِ ربوبیت کی تکمیل۔ سلام کے معنی نقائص اور نا مکملیت سے بری ہونا۔ مسلم مکمل کو کہتے ہیں جس میں کوئی کمی نہ رہ گئی ہو۔ اَسْلَمَ الزَّرعُ کے معنی ہیں کھیتی کا اس حد تک نشو و نما پا جانا کہ اس میں بال آجائیں۔ اس سے نشو و نما کی تکمیل کا مقصد سامنے آجاتا ہے۔

اسلام کے معنی ہیں اس نظام کا قیام اور تکمیل جس میں ہر شئے کی مضمر صلاحیتوں کی کامل نشو و نما ہو جائے۔ یعنی نظامِ ربوبیت کی تکمیل۔

رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ ۖ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ۖ فَأَنَّىٰ تُصْرَفُونَ ۝

(۳۹/۶)

تمہارا رب نشو و نما دینے والا۔ سارا اقتدار اُسی کے لئے ہے۔ اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں سو تم کدھر بھٹکتے پھر رہے ہو۔

## ذَٰلِكُمُ اللَّهُ

یہ ہے اللہ

اس کتاب میں نظامِ ربوبیت کا ذکر اکثر مقامات پر ملے گا۔ اس لئے یہاں اسی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ مندرجہ بالا تحریر سے یہ حقیقت اُبھر کر سامنے آجاتی ہے۔ کہ نظامِ عالم میں خُدا کے نظامِ ربوبیت کی کارفرمائی ہے۔ علمِ انفس و آفاق اسی محور کے گرد گردش کرتا ہے۔ آفاق و انفس میں جو قانون جاری و ساری ہے۔ رب العالمین کا قانون ہے جس نے العالمین کی ربوبیت کا ذمہ لے رکھا ہے۔ جو معاشرہ قوانینِ خُداوندی کے مطابق معرضِ وجود میں آئے گا۔ وہ تمام افرادِ انسانیہ کی ربوبیت کا یکساں طور پر ضامن ہوگا۔ رزق کے معاملے میں کافر و مومن کے درمیان بھی کوئی فرق و تمیز روا نہیں رکھی جائے گی۔ قرآنی معاشرہ کی بنیاد زندگی کی مستقل اقدار پر رکھی جاتی ہے یہ مستقل اقدار کیا ہیں اور کہاں سے ملتی ہیں۔ آئندہ باب میں پیش کیا جارہا ہے ÷

## چھٹا باب

# مستقل اقدار

دین کی عمارت مستقل اقدار کے گرد گھومتی ہے۔ دین خدا کے پیغمبروں کی وساطت سے بذریعہ وحی انسانوں کو ملا۔ انسان محض عقل کی روشنی میں زندگی کے جو راستے تراشتا رہا۔ سالہا سال کے ناکام تجارب کے بعد یہ اعتراف کرتا رہا۔ کہ وہ جس راستے پر گامزن ہے۔ وہ غلط ہے۔ وقت اور توانائی کے ضیاع کے بعد پھر دوسرا راستہ اختیار کرنے کے بعد بھی وہ منزلِ حیات کو نہ پا سکتا۔ اس طریق سے وہ ہزاروں دیدہ و نادیدہ مشکلات کا سامنا کرتا رہا۔ اس کے برعکس جن انسانوں نے وحی کو مشعلِ زندگی بنایا۔ اور صراطِ مستقیم کو مسافتِ زندگی کے لئے پسند کیا وہ یقین و اعتماد سے زندگی کی سرفرازیوں اور کامرانیوں سے سرفراز ہوئے۔ پہلے طریقِ عمل سے انسان جاں گسل ناکامیوں اور حیات سوز تباہیوں کا شکار ہوتا رہا لیکن دوسرا طریقِ زندگی اسے لبریز یقین کرتے ہوئے منزلِ مقصود تک لے جاتا ہے۔ اور یہ زندگی کی تابناکیوں اور درخشندگیوں سے اپنی راہِ حیات کو جگمگاتا چلا جاتا ہے۔ اسرارِ حیات اُس پر روشن، عیاں اور رموزِ کائنات بے نقاب ہوتے جاتے ہیں۔

اقبالؒ کے الفاظ میں:۔

"وحی کی راہنمائی انسانی محنت میں بڑی کفالت کر دیتی ہے۔ فرشتوں نے جس آدم کے خمیر میں آگ کی چنگاریاں اور خون کے چھینٹے دیکھے تھے وہ آدم وہی تھا جو وحی کی رہنمائی کے بغیر سفرِ زندگی طے کرنا چاہتا تھا۔ اس کے برعکس دوسرا آدم وہ ہے جو سفرِ حیات میں وحی کی راہنمائی سے راستہ متعین کرتا ہے۔ اس کے متعلق کہہ دیا کہ (لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ) وہ راستہ کے خوف و خطر سے محفوظ و مصئون رہے گا۔ نیز یہ بھی حقیقت ہے کہ انسان جب کائناتی قانون کے مطابق زندگی کے صحیح اُصولوں کو قبول کرتا ہے۔ تو

اس کی نگاہوں کے سامنے راستہ واضح انداز میں نہیں آتا۔ دُھندلا سا نقشہ سامنے آتا ہے اور اسے صحیح راستہ تک پہنچنے کے لئے مزید کد و کاوش کرنی پڑتی ہے جس میں خرابیاں پیدا ہوتی ہیں اور تباہیاں آتی ہیں۔ وحی کی راہنمائی میں انسان صراطِ مستقیم پر گامزن ہو سکتا ہے اس آدم کے متعلق جو وحی کی روشنی میں مسافتِ حیات طے کرتا ہے اور اسی کے نور سے جادہ منزل قطع کرتا ہے فرماتے ہیں یہ وہ شناسائے حدودِ کائنات اور یہ وہ سینۂ کائنات کا راز نہیں یہ وہ وجہ کائنات، اشرف المخلوقات انسان ہے کہ جہانِ کائنات کی تمام بزم آرائیاں اور نقش افروزیاں اسی کے لئے ہیں ؎

نہ تو زمین کے لئے ہے نہ آسمان کے لئے
جہاں ہے تیرے لئے تو نہیں جہاں کے لئے

۔یہی مسجودِ ملائک اور مخدومِ خلائق ۔ خود بیں اور خُدا بیں آدم ہے ۔جس کے متعلق ارشاد ہے :۔

عُروجِ آدمِ خاکی کے منتظر ہیں تمام
یہ کہکشاں یہ ستارے، یہ نیلگوں افلاک!

۔یہی بندۂ حق بین و حق اندیش آدم تقدیر کی گہرائیوں میں جس کی کارفرمائیاں ہیں۔ یہ قبائے علم و ہنر سے آراستہ و پیراستہ آدم جو اس عالمِ رنگ و بُو میں محو خود نمائی ہے :۔

طلسم بود و عدم جس کا نام ہے آدم
خُدا کا راز ہے قادر نہیں ہے جس پہ سخن!

۔یہی وہ پیکرِ حریت ہے جو نہ مرعوبِ سُلطان نہ محتاجِ سلطاں ۔ یہی وہ آدم ہے جو خُدا کے نور سے اپنی زندگی کی راہیں تلاش کرتا ہے ۔ اس کا فکر تاباں مثلِ خورشیدِ سحر ۔ کوہ و صحرا اور دشت و افلاک سے اس کی رزم آرائیاں ۔ بر و بحر سے اس کی حریفانہ کشاکش ۔ یہ جب دیکھتا ہے ۔ کہ کائنات کے ذرہ ذرہ میں عالم آرائی کی تڑپ موجود ہے ۔ تو یہ سکون و ثبات کو موت قرار دیتا ہے ۔ اور تسخیرِ کائنات کو اپنی زندگی کا مقصد

اوّلیں قرار دیتا ہے :۔

مہ و انجم گرفتارِ کمندش
بدستِ اوست تقدیرِ زمانہ

یہی وہ صاحبِ تخلیق ہے۔ جس کے ہنر میں تازہ جہاں آباد اور اس کے نورِ زندگی میں خورشیدِ جہانتاب کی ضو، اور اس کے سینہ سے زندگی کے شرارے ابھرتے ہیں یہی وہ آدم ہے۔ جس کے متعلق مالک ارض و سما۔ خالق کائنات نے ملائکہ سے کھلے طور پر کہہ دیا کہ اسے میں نے حقایق الاشیاء سے (علم اسما) باخبر کر دیا ہے :۔

ہیں اس کے تصرّف میں[1] یہ بادل یہ گھٹائیں
یہ گنبدِ افلاک یہ خاموش فضائیں
یہ کوہ، یہ صحرا یہ سمندر یہ ہوائیں
تھیں پیشِ نظر کل تو فرشتوں کی ادائیں
آئینہ ایام میں اب اس کی ادا دیکھ

یہی وہ آدم ہے جس نے رموزِ کائنات سے واقفیت حاصل کی۔ یہی وہ آدم ہے۔ جس کی زندگی کا مقصد اشیائے کائنات کی تسخیر اور بہبودِ ہمہ کے لئے ان کا مقرر ہے۔ اس پیکرِ آب و گل نے اپنی کوششِ پیہم سے خدا کے جہانِ خراب کو سنوارا :۔

مری جفا طلبی کو دعائیں دیتا ہے
وہ دشتِ سادہ وہ تیرا جہانِ بے بنیاد

اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ کہ گرمیٔ آدم ہی سے ہنگامۂ عالم گرم ہے

ہے گرمیٔ آدم سے ہنگامۂ عالم گرم
سورج بھی تماشائی تارے بھی تماشائی

یہی آدم ہے جو علم النفس و آفاق کا حصول اپنی زندگی کا مقصدِ وحید سمجھتا ہے۔ جو اس رازِ حیات سے واقف ہے کہ :۔

زندگی جہد است استحقاق نیست
جز بعلم انفس و آفاق نیست

---

[1] تصرّف والے مصرعہ میں تصرّف کیا ہے۔ (مؤلف)

کیونکہ :۔

کوہ و صحرا دشت و دریا بحر و بَر
تختۂ تعلیم اربابِ نظر
اور
علم اسما اعتبارِ آدم است
حکمتِ اشیا حصارِ آدم است

وحی کی روشنی میں جادۂ حیات طے کرنے والا یہی آدم ہے جس کے متعلق علامہ فرماتے ہیں :۔

برخیز کہ آدم را ہنگام نمود آمد
ایں مشتِ غبارے را انجم بسجود آمد
آں راز کہ پوشیدہ در سینۂ ہستی بود
از شوخیٔ آب و گِل در گفت و شنود آمد

یہی آدم ہے خونِ رگِ کائنات کی گردشیں جس کی چشمِ بیدار سے مستور نہیں۔ اسی آدم کا دل بیدار ہے۔ جو دُنیائے انسانیت کو رنج و غم میں مبتلا دیکھ کر تڑپ اُٹھتا اور اس کی چشم خوں فشاں ہوتی ہے۔ یہی ہے جس کی شرابِ زندگی میں لا الٰہ کا سرُور ہوتا ہے۔ یہ بطونِ روزگار کے تمام بھیدوں سے واقف اور رازِ کائنات کا شناسا آدم مہ و انجم کے اس حیرت کدہ کی تسخیر جزو ایماں سمجھتا ہے۔ یہ بندۂ حق۔ روشن نفس درماندہ انسانیت کو وہ حرفِ راز جس کے بغیر انسانیت کا قیام ناممکن ہے۔ سمجھاتا ہے۔ اسی آدم کے متعلق حکیم الامتؒ فرماتے ہیں :۔

سوختی لات و منات کہنہ را
تازہ کردی کائنات کہنہ را

اس کا پیمانۂ ثواب و عذاب میزان خداوندی (قرآن عزیز) ہے۔ یہ رنگ و نسل۔ خون و وطن اور امتیازِ قبائل سے پاک۔ جہانِ تنگ و تاز میں لاانتہا وسعتوں کا مالک انسان

فطرتِ او بے جہات اندر جہات
او حریم و در طوافش کائنات

وارداتِ کائنات پر اس کی نگاہ بہت گہری ہوتی ہے۔ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں غور و خوض اس کا وظیفۂ حیات۔ یہ خالق ارض و سمٰوات کی عالم نگاہی اور خالقِ کون و مکاں کی خلقت کاری کو دیکھ کر بے ساختہ پکار اُٹھتا ہے کہ خدائے ارض و سمانے کائنات کو بالمقصد پیدا کیا ہے:۔

چشمِ او بر وارداتِ کائنات
تا بہ بیند محکماتِ کائنات

جمالِ کائنات اور جلالِ کائنات دونوں اس کی نظر میں۔ یہ منکرانِ غائب و حاضر اور سرکشانِ زور مست کی طرح یہ عقیدہ نہیں رکھتا کہ یہ سلسلۂ کائنات یونہی معرضِ وجود میں آ گیا۔ اس کا ایمان یہ ہے کہ یہ خالقِ حقیقی (احسن الخالقین) کی کرشمہ سازی ہے۔ یہ ربط و نظمِ کائنات کو دیکھ کر بے قرارانہ سبحان اللہ پکار اُٹھتا ہے۔ یہ نبضِ موجودات میں حرارت دیکھ کر بے ساختہ کہہ اُٹھتا ہے۔ کہ ایک عظیم قوت ہے۔ جو بایں نظم و نسق کاروبارِ کائنات کو اپنے نپے تُلے پیمانوں کے مطابق چلا رہی ہے۔ اور انسانوں کی جو جماعت دُنیائے انسانیت میں امن کی ضامن ہوگی وہ بھی اسی قوت کے آئین کی پابند ہوگی:۔

ہر کہ تسخیر مہ و پرویں کند
خویش را زنجیری آئین کند

اس کے اعمال و افعال میں قوانینِ خُداوندی کے احترام و تسلیم کی جھلکیاں ہوں گی۔ جس طرح کائنات کا ذرہ ذرہ اس قوت (خُدا) کے لگے بندھے قانون کے مطابق سرگرم عمل ہے۔ ایسے ہی انسان بھی اسی کے عطا کردہ قانون کی روشنی میں منزلِ مُراد کی طرف بڑھیں گے:۔

درِ عمل پوشیدہ مضمونِ حیات
لذت تخلیق قانونِ حیات

لذتِ تخلیق کا سرور ان کے جذبوں اور ولولوں کو سرد نہیں ہونے دے گا یہ اُمت اس حقیقت سے آشنا ہوگی کہ:۔

کیا چاند تارے کیا مہر و ماہی نُوری حضوری ترے سپاہی

یہ اس عالمِ آب و خاک میں طرح طرح کی ندرت کاریاں کریں گے۔
عقلِ سرکش اور علمِ بے باک کی انساں سوزیوں سے بیزار عصرِ جدید کے مفکرین بھی اسی قسم کے انسانوں کی تلاش و جستجو میں ہیں۔ وہ محسوس کرتے ہیں کہ جس انسانی معاشرہ کی بنیاد محض عقلِ حیلہ جُو پر ہوگی۔ وہ معاشرہ کبھی مستحکم و پائیدار نہیں ہوگا۔ خُدا کے قانون (قرآن) کو جو نوعِ انساں کے لئے پیامِ آخریں ہے۔ ایسے ہی انسان درکار ہیں:۔

قدم در جستجوئے آدمے زن
خُدا ہم در تلاشِ آدمے ہست

اقبالؒ کے الفاظ ہیں:۔
خُدا کی تمام مخلوق میں انسان ہی اس قابل ہے کہ وُہ شعوری طور پر اپنے خالق کی حیاتِ تخلیقی میں شرکت کر سکے۔ اس میں یہ جوہر ودیعت کیا گیا ہے۔ کہ یہ ایک بہتر دُنیا کا تصوّر کر سکے۔ اور یہ جو کچھ موجود ہے اسے وہ کچھ بنا دے جو اسے ہونا چاہیئے۔"
(تشکیل جدید الٰہیات صفحہ ۴۱)

آیندہ سطور میں مفکّرینِ مغرب کے خیالات و آراء کو پیش کیا جائے گا کہ وُہ کس شدّت سے محسوس کرتے ہیں۔ کہ قافلۂ انسانیت وحی کی روشنی کے بغیر حقیقی زندگی کی منزل کو نہیں پا سکتا۔ ان کے نزدیک انسان کے شعور و آگہی کی راہنمائی کے لئے عقل سے بلند و بالا قوت کی ضرورت ہے۔ یعنی ایسی قوت عقل جس کی اقتدا میں زندگی کی صحیح سمتوں کی طرف بڑھے۔ زندگی کا جادۂ پیچیدہ جو یورپ نے محض عقل کے زور پر طے کرنا چاہا وہ اس میں بُری طرح ناکام رہا۔ تہذیبِ نو اور تمدّنِ یورپ آئے دن کی آتش ریزیوں اور انسانی ہلاکتوں سے گھبرا اُٹھی ہے۔ مفکّرینِ مغرب یہ تسلیم کر رہے ہیں کہ عقل کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وُہ ادراکِ حقیقت کر سکے۔ یا فکرِ انسانی کو حقیقت کے متعلق صحیح علم ہو سکے۔ چنانچہ حکیم نکتہ پرداز برگساں (CREATIVE EVOLUTION) کے مقاصد میں لکھتا ہے:۔
"ہماری فکر اس قابل نہیں کہ وُہ زندگی کی حقیقت کو ہمارے سامنے لا سکے

یا زندگی کی ارتقائی حرکت کا صحیح اور پُورا پُورا مفہوم پیش کر سکے۔"
آگے چل کر برگساں کہتا ہے کہ :-
"انسانی فکر کی خصوصیت ہی یہ ہے - کہ یہ زندگی کا احاطہ کرنے کے لئے فطری طور پر نا قابل ہے- (P.174)
پروفیسر وہائٹ ہیڈ لکھتا ہے کہ :-
"ہم خُدا کی فطرت کے متعلق کوئی دلیل پیش نہیں کر سکتے۔"
THE SCIENCE AND THE MODERN WORLD)
خُدا کی فطرت تو بہت آگے کی چیز ہے- BRIGHMAN کہتا ہے :-
"عقل انسانی کسی معاملہ کے متعلق بھی آخری دلیل، مکمل شہادت اور منطقی یقین ہم نہیں پہنچا سکتی - انسانی علم قطعی یقین تک پہنچانے کے نا قابل ہے۔"
(P.113)
جس طرح انسانی آنکھ خارجی روشنی کی محتاج ہے - اس کے بغیر کچھ نہیں دیکھ سکتی - اسی طرح انسانی عقل وحی کی روشنی کے بغیر، یقین کے درجہ تک نہیں پہنچ سکتی-
شین (SHEEN) کے الفاظ میں :-
"جس طرح ہمارے حواس اس وقت بہتر کام کرتے ہیں - جب ان کی تکمیل عقل کے ذریعہ سے ہو جائے - اسی طرح ہماری عقل اس وقت بہتر کام کر سکتی ہے جب اُس کی تکمیل ایمان (وحی) کے ذریعہ سے ہو جائے -
جو آدمی عارضی طور پر عقل سے عاری ہو جائے (مثلاً شرابی) اس کے حواس وہی ہوتے ہیں - جو پہلے تھے، لیکن اس وقت وہ کبھی اپنے فرائض کو اس طرح سرانجام نہیں دے سکتا جس طرح عقل و ہوش کی حالت میں سرانجام دیتا ہے - جو حالت عقل کے بغیر حواس کی ہوتی ہے - وُہی کیفیت وحی کے بغیر عقل کی ہوتی ہے۔" (P-341)
لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ جو علم وحی کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے وُہ خلافِ عقل ہوتا ہے - خلافِ عقل اور ما ورائے عقل میں بڑا فرق ہے - جو وحی صحیح علم و بصیرت

کے خلاف ہو وہ وحی نہیں ہو سکتی۔

LOCKE (لاک کے الفاظ میں)

"جو شخص وحی کے لئے جگہ بنانے کی خاطر عقل و بصیرت کو باہر نکال دیتا ہے وہ وحی اور عقل دونوں کے چراغ گُل کر دیتا ہے۔"

EASSAY BOOK III QUOTED BY BRIGHTMAN-P-104

باردیو (BAR DYAEV) کہتا ہے:۔

نبوّت، خُدائی الہام پر مبنی ہوتی ہے۔ صاحبِ وحی، دنیا اور انسان کے مقدرات اور مستقبل کے متعلق خُدا کی آواز سنتا ہے۔ حاملِ وحی اپنے آپ کو دُنیا میں تنہا پاتا ہے۔ وہ جن لوگوں کو تباہی سے بچانے کی کوشش کرتا ہے وہ اسے پتھر مارتے ہیں۔ لیکن بایں ہمہ وہ انہیں چھوڑ کر الگ نہیں ہو جاتا۔ یہ وحی اکتسابی نہیں ہوتی، جسے ارتقائی مدارج سے حاصل کیا جا سکے۔ یہ تو ایک داخلی شئے ہے۔ ایک پیغمبر کی وحی، ہندوستان اور یونان کے صوفیوں کے کشف سے، بالکل منفرد شئے ہوتی ہے۔

THE DIVINE AND THE HUMAN- P.136

اس مفکّر کے اس تصوّر کو اقبالؒ نے جس حسن و خوبی اور وضاحت سے بیان کیا ہے۔ اس سے لطف اندوز ہونے سے آپ کو محروم کیوں رکھا جائے۔ حکیم الامتؒ پانچواں خُطبہ یُوں شروع کرتے ہیں:۔

"محمدؐ عربی فلک الافلاک کی بلندیوں پر پہنچ کر واپس تشریف لے آئے۔ خدا شاہد ہے کہ میں اگر اس مقام تک پہنچ جاتا تو کبھی واپس نہ لوٹتا۔"

یہ الفاظ ایک بہت بڑے مسلمان صُوفی بُزرگ (حضرت عبدالقدوس گنگوہیؒ) کے ہیں۔ تصوّف کے لٹریچر میں ان جیسے الفاظ کا ملنا غالباً مشکل ہے۔ جو ایک فقرہ کے اندر، شعورِ نبوّت اور تصوّف کے اس قدر لطیف نفسیاتی فرق کو اس طرح واضح کر دیں۔ ایک صُوفی اپنے انفرادی تجربہ کی تجردگاہ سے واپس آتا ہے (اس لئے کہ اسے واپس آنا پڑتا ہے) تو اس کی یہ مراجعت نوعِ انساں کے لئے کچھ معنی نہیں رکھتی۔ اس کے برعکس ایک نبی کی مراجعت تخلیقی ہوتی ہے وہ آتا ہے کہ زمانے کے

طوفان پر تسلط پاکر، تاریخ کی قوتوں کو اپنے قابو میں لے آئے اور اس طرح مقاصدِ مطامح کی ایک نئی دنیا تعمیر کر دے۔

ایک صوفی کے لئے اس کے انفرادی تجربہ کی تجرد گاہ، آخری مقام ہوتی ہے لیکن ایک رسول کے دل میں اس سے زلزلہ انگیز نفسی قوتیں بیدار ہوتی ہیں۔ جن کا مقصد جو کچھ اس کی آنکھ نے دیکھا ہے۔ وہ ایک جیتی جاگتی دنیا کے پیکر میں متشکل ہو جائے، نبی کے دل میں پیش پیش ہوتی ہے۔ اس لئے ایک صاحبِ وحی کے تجربہ کی قدر و قیمت جانچنے کا طریقہ یہ بھی ہے کہ دیکھا جائے کہ اس نے انسانیت کو جس قالب میں ڈھالا ہے وہ کیسا ہے؟ اور اس کے پیغام کی روح سے جس قسم کی دنیائے ثقافت ابھر کر سامنے آگئی ہے وہ کس انداز کی ہے؟ (خطبات صفحہ ۱۱۸)

**پروفیسر آئن سٹائن** دنیائے سائنس میں پروفیسر آئن سٹائن کا جو مقام ہے۔ وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ اس نے اپنی عمر کے آخری حصہ میں ایک کتاب (OUT OF MY LATER DAYS) لکھی ہے۔ وہ سائنس کے میدان میں عمر بھر کی شاہسواری کے بعد لکھتا ہے:۔

> سائنس صرف یہ بتا سکتی ہے کہ "کیا ہے"۔ وہ یہ نہیں بتا سکتی کہ کیا ہونا چاہیئے"۔ اس لئے اقدار کی قیمت متعین کرنا اس کے دائرہ سے باہر ہے اس کے برعکس مذہب کا کام یہ ہے کہ وہ انسانی فکر و عمل کی قیمت متعین کرے۔۔۔۔۔ سائنس کے علمبرداروں نے اکثر اوقات اس امر کی کوشش کی ہے کہ وہ سائنس کی رو سے اقدار کے متعلق قطعی فیصلہ نافذ کر دیں۔ (یہ ان کی غلطی ہے جس کی وجہ سے) وہ مذہب کے خلاف محاذ قائم کر کے بیٹھ جاتے ہیں۔۔۔۔۔ سائنس کے نزدیک بس ایک "شے" ہوتی ہے اس کی دنیا میں آرزوؤں، اقدار، خیر، شر، نصب العین حیات کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔۔۔۔۔ سائنس نہ تو اقدار متعین کر سکتی ہے اور نہ ہی انہیں انسانی سینے کے اندر داخل کر سکتی ہے۔ سائنس زیادہ سے زیادہ ایسے ذرائع فراہم کر سکتی ہے جن سے انسان اپنا مقصد حاصل کرے۔ مقصد کا تصور و تعین صرف بلند ہستیاں ہی کر سکتی ہیں۔ اور اگر ان کے مقاصد بے جان ہو کر نہیں رہ گئے۔ تو انہیں وہ لوگ آگے بڑھا سکتے ہیں۔ جو نیم شعوری طور

پر نوعِ انسان کے ارتقاء کا تعین کرتے ہیں۔

اس کے بعد پروفیسر موصوف لکھتا ہے:۔

"ہم نے تلخ تجارب کے بعد یہ سیکھا ہے کہ معاشرتی زندگی کی گتھیاں تنہا عقل کی رو سے نہیں سلجھ سکتیں۔ سائنس کی تحقیقات اکثر اوقات نوعِ انسانی کے لئے بڑی مہلک ثابت ہوتی ہیں۔ اُن سے انسان کو طبیعی زندگی میں آرام اور عشرت تو ضرور مل گئی لیکن اس کی داخلی دُنیا میں عجیب قسم کا کرب و اضطراب پیدا ہو گیا جس سے وہ اپنے ٹیکنیکل ماحول کا غلام بن کر رہ گیا۔ اور اس سے بھی زیادہ یہ کہ، اُسے خُود اپنی تباہی کے لئے بڑے بڑے ہلاکت آفریں سامان مل گئے۔۔ ۔۔ ۔۔ اس لئے ہمیں تنہا عقل کو اپنا خُدا نہیں بنا لینا چاہیئے۔

اس خدا کے عضلات (MUSCLES) تو بہت مضبوط ہیں لیکن اس کی ذات (PERSONALITY) نہیں ہے۔ یہ صرف خدمت اچھی طرح کر سکتا ہے، راہ نمائی نہیں کر سکتا عقل، ذرائع اور اسباب پر تو خوب نگہ رکھتی ہے لیکن مقاصد و اقدار کی طرف سے بالکل اندھی ہوتی ہے۔

ان اقدار کا سرچشمہ کیا ہے؟ اس کے متعلق آئن سٹائن لکھتا ہے کہ:۔

"یہ اقدار تجربات کے بعد وضع نہیں کی جاتیں۔ یہ مقتدر ہستیوں کی وساطت سے بذریعہ وحی ملتی ہیں۔۔ ان کی بنیادیں عقل پر نہیں ہوتیں لیکن وہ تجربہ کی کسوٹی پر بالکل پُوری اُترتی ہیں۔ اس لئے کہ صداقت کہتے ہی اُسے ہیں جو تجربے سے دُرست ثابت ہو۔"

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے ان اقدار کا سرچشمہ قرآنِ عزیز ہے۔ جو خدا کی طرف سے نوعِ انسان کے لئے آخری پیغامِ حیات کی صورت میں حضور اقدس و اعظم صلی اللہ علیہ وسلم پر بذریعہ وحی نازل ہُوا۔ اس نے انسانی زندگی کے لئے جو اقدارِ حیات پیش کی ہیں وہ یقینی اور حتمی ہیں۔ قرآن کا دعویٰ ہے۔ کہ یہی اقدارِ زندگی ہیں۔ جو حیاتِ انسانی کی صحیح راہ نمائی کرتی ہیں۔ قرآنِ عزیز ہی وُہ درخشندہ آفتاب ہے جس کی روشنی سے انسانی زندگی کی کھیتیاں پروان چڑھ سکتی ہیں۔ رسول اکرم ہی شمع توحید لے کر بزم کونین

سجانے اور اسی نور سے انسانی دلوں کی تاریکیوں کو دُور کرنے کے لئے تشریف لائے۔ ظلم وفساد اور جور و استبداد کے اُبھرتے طوفانوں میں کشتیٔ انسانیت کو سلامتی کے کناروں تک لے جانا نزولِ قرآن کا مقصدِ عظیم ہے۔ قرآن کی دفتّین میں محفوظ و مصئون مستقل اقدار ہی انسانی زندگی کے وہ پیمانے ہیں جو ناداروں اور ناچاروں کو حقیقی زندگی بخش سکتے ہیں۔ اب ان مستقل اقدار کا اجمالی سا تعارف کرایا جاتا ہے۔ کیونکہ پوری وضاحت کے لئے تفصیلی طور پر سارا قرآن سامنے لانا پڑے گا۔

اجمالی تعارف ملاحظہ فرمائیے :-

## ۱۔ انسانی ذات

مستقل اقدار میں بلند ترین قدر خود انسانی ذات ہے۔ اللہ خود ذات ہے۔ کائنات میں ذات صرف انسان کو عطا کی گئی ہے۔ خالق نے مخلوق میں اگر شرفِ ذات سے کسی کو نوازا ہے۔ تو وہ صرف انسان ہے۔ لہٰذا آغاز اسی کے تعارف سے کیا جاتا ہے۔

قرآن انسانی ذات کو "نفس" کہہ کر پکارتا ہے اور اسے الوہیاتی توانائی قرار دیتا ہے۔ جب قرآن تخلیقِ انسانی کے مختلف مراحل کا ذکر کرنے کے بعد (جس کا تعلق اس کی جسمانی اور طبعی ساخت سے ہے اور جو دیگر حیوانات میں بھی مشترک ہیں) کہتا ہے کہ وَ نَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ (۳۲/۹)

"خدا نے اس میں اپنی توانائی پھونک دی"۔

تو اس سے مُراد یہی انسانی ذات ہے۔ یہی چیز انسان کو دیگر حیوانی مخلوقات سے الگ اور متمیز کرتی ہے۔ انسانی زندگی سے مقصود نفسِ انسانی کا نشوو ارتقا ہے۔ قرآن اسی طرف راہنمائی کرتا ہے۔ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۝ وَ قَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا (۹۱/۹-۱۰)

"جس نے اس کی نشوونما کی وہ پھولا پھلا" جس نے اسے دبایا وہ تباہ و برباد ہو گیا"۔ انسان کے ہر عمل (کام) کا اثر انسانی ذات پر ہوتا ہے۔

اعمالِ حسنہ (خیر) وہ ہیں۔ جن سے ذاتِ انسانی میں استحکام پیدا ہوتا ہے اور اعمالِ سیئہ (شر) جن سے اس میں ضعف واقع ہو جاتا ہے۔ "الوہیاتی توانائی" کی وضاحت ملاحظہ فرمائیے۔ کائنات میں توانائی کا ظہور ہر شے میں اور ہر جگہ ہوتا ہے۔

لیکن یہ توانائی طبیعی قوانین کی رو سے نمو پذیر ہوتی ہے۔ جانداروں کے جسم میں بھی اس مادی توانائی کی نمود ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ انسان کے جسم میں بھی۔ ایک توانائی اور بھی ہے۔ جو انسان کے اختیار و ارادہ کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ یہ توانائی مادی توانائی سے کہیں زیادہ قوی ہے۔ اسے خدا نے "من روحنا" کہہ کر پکارا ہے۔ اسی کو انسانی ذات کہتے ہیں۔ یہ واضح رہے کہ انسانی ذات ذاتِ خداوندی کا جزو نہیں۔ یہ توانائی اس کی عطا کردہ ہے۔ یہاں مادی توانائی سے متمیز کرنے کے لئے اسے الوہیاتی توانائی کہا گیا ہے۔ ویسے تو مادی توانائی بھی خدا ہی کی عطا کردہ ہے۔ یہ بھی خالقِ ارض و سمٰوات کے قانون کے مطابق ظہور میں آتی ہے۔

انسانی ذات مستقل بنیادی قدر ہے۔ باقی اقدار اس کے نشو و نما کا ذریعہ بنتی ہیں۔ جب ذاتِ انسانی میں پختگی پیدا ہو جاتی ہے۔ تو یہی اقدار سورج کی شعاعوں اور چاند کی کرنوں کی طرح اس میں سے خود بخود پھوٹتی۔ اُبھرتی اور ظاہر ہوتی چلی جاتی ہیں۔ انسان کی طبیعی زندگی (جسم) بھی اپنی اقدار رکھتی ہے۔ جن کا تحفظ ضروری ہے۔ لیکن یہ مستقل اقدار نہیں کیونکہ جب طبیعی زندگی اور انسانی ذات کے مفادات میں تصادم ہو جائے تو انسان اپنی ذات کے تحفظ کے لئے جسم اور اس کے مفاد کو قربان کر دیتا ہے

پہلی بنیادی قدر انسانی ذات ہے۔

## ۲۔ احترام آدمیت

ہر انسانی بچہ پیدائشی لحاظ سے یکساں طور پر واجب الاحترام ہے۔ اس لئے کہ انسانی ذات ہر انسانی بچہ کو یکساں طور پر ملتی ہے۔

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِىٓ اٰدَمَ (۱۷/۷۰)

"ہم نے تمام فرزندانِ آدم کو واجب التکریم بنایا ہے۔"

قرآن تمام نوع انسان کو مخاطب کر کے کہتا ہے:۔

خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ (۴/۱)

"ہم نے تم سب کو ایک نفسِ واحد (ایک LIFE CELL) سے پیدا کیا ہے۔

قرآن کی رو سے مرد کو عورت پر اور عورت کو مرد پر کوئی تفوق نہیں بعض خصوصیات مردوں میں ایسی ہیں۔ جو عورتوں میں نہیں اور بعض عورتوں میں ایسی ہیں جو مردوں میں

نہیں، پیدائش کے اعتبار سے مرد اور عورت دونوں یکساں ہیں۔ حکیم الامت علامہ اقبالؒ کا یہ خیالِ عظیم کس قدر قرآن سے ہم آہنگ ہے ؎

برتر از گردوں مقامِ آدم است
اصلِ تہذیب احترامِ آدم است

قرآن اس مقام پر خون و رنگ۔ حسب و نسب اور نسل و رنگ کے تمام امتیازات ختم کر کے رکھ دیتا ہے۔ ہر انسانی بچہ انسان کا بچہ ہونے کی وجہ سے یکساں طور پر واجب التعظیم ہے۔

دوسری جگہ اقبالؒ فرماتے ہیں:۔

آدمیت احترامِ آدمی
باخبر شو از مقامِ آدمی

انسان باقی تمام کائنات سے اعلیٰ ارفع اور بلند و بالا مقام رکھتا ہے:۔

آدم از آب و گِل بالاترے

دوسری مستقل اقدار احترامِ آدمیت ہے۔

## ۳۔ مقام و درجہ عمل سے

بہ اعتبارِ پیدائش تمام انسان یکساں ہیں۔ قرآن احترام کے مدارج اعمال کے مطابق متعین کرتا ہے۔ وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا (۴۶/۱۹) ہر ایک کے درجات اعمال کے مطابق مرتب ہوں گے۔ جو سب سے زیادہ قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرے گا۔ وہی سب سے زیادہ مستحقِ عزّ و شرف ہوگا۔ اسی کی زیادہ عزت و تکریم ہوگی۔

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ (۴۹/۱۳)

اے نوعِ انسانی ہم نے تمہیں نر اور مادہ (کے خلیہ) سے پیدا کیا اور تمہیں قبیلوں اور خاندانوں میں تقسیم کر دیا (تم نے اپنے لئے قبائل اور خاندان بنالئے) مقصد اس سے صرف یہ ہے کہ تم پہچانے جا سکو (ورنہ جہاں تک عزت و تکریم کا تعلق ہے اس اصول کو یاد رکھو کہ) تم میں سے اللہ کے نزدیک سب سے

زیادہ واجب التکریم وہ ہے جو سب سے زیادہ اس کے قوانین کی نگہداشت اور اپنے فرائض کی پابندی کرتا ہے۔

یہ عالمے بے امتیازِ خون و رنگ۔ عزت و احترام کے بلند و بالا مقامات اور اعلیٰ درجات انہیں عطا کرتا ہے جو زیادہ سے زیادہ قوانینِ خداوندی کا اتباع کریں۔ قرآنی معاشرہ میں ابنِ فلاں، ابنِ فلاں چیزے نیست۔ اس معاشرہ میں عزت و عظمت کا معیار جوہر ذاتی ہے اضافی نسبتیں نہیں۔ اہلیت ہے سفارش نہیں۔ قابلیت اور ایثار و قربانی ہے خونی رشتے نہیں۔ اس معاشرے کی معراج مفادِ ملت ہے گروہی اور خاندانی مفادات کا تحفظ نہیں۔

تیسری مستقل قدر جو خدا کی عطا کردہ نشو و نما یافتہ اعلیٰ صلاحیتیں اور جوہر ذاتی سے اُبھرتی ہے۔ حسب و نسب اور خاندانی اضافی نسبتیں اور شعوب و قبائل کے امتیازات سے نہیں۔ احترامِ آدمیت ہے۔

## ۴۔ عدل

بلا امتیاز رنگ و خوں۔ حسب و نسب۔ قوم و وطن تمام انسانوں کو پیدائش کے اعتبار سے یکساں سمجھ کر ان کی خداداد صلاحیتوں کی نشو و نما کے لئے سب کو یکساں مواقع مہیا کرنا اور جہد و عمل کے لحاظ سے ان کے مدارج و مقامات متعین کرنا۔ محنت کے مطابق معاوضہ دینا۔ اور

تمام اُمور کے فیصلے اس قانون کے مطابق کرنا جو سب پر یکساں نافذ ہو عدل کہلاتا ہے۔ اس میں خونِ شہ رنگین تراز معمار نیست۔ وہ قانون کہ

در نگاہِ او یکے بالا و پست

جس کے متعلق کہا گیا ہے:۔

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ ..... (۱۶/۹۰)

یقیناً اللہ عدل کا حکم دیتا ہے۔

کارزار کفر و ایمان اور رزم گاہِ حق و باطل میں بھی قرآن عدل کا حکم دیتا ہے۔ دشمنوں سے بھی عدل کرنا ضروری ہے۔ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ز (۵/۸)

"کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس پر آمادہ نہ کر دے کہ تم ان سے عدل نہ کرو۔ عدل تقویٰ

کی روش ہے۔ عام طور پر یہی کہا جائے گا۔ جو قوم دشمنی پر اُتر آئے اس سے عدل کیسا؟ لیکن چونکہ عدل ایک مستقل قدر ہے۔ اس لئے کسی کی دوستی یا دشمنی اس پر اثر انداز نہیں ہو سکتی۔

چوتھی مستقل قدر عدل ہے۔

## ۵۔ جُرم کی پاداش

جس معاشرہ میں جرائم عام ہو جائیں۔ وہ زمانے میں کبھی پنپ نہیں سکتا۔ جُرم کا لفظ سنتے ہی انسانی ذہن کسی ملک کے رائج الوقت قانون کی خلاف ورزی کرنے والے کو مجرم قرار دینے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ قرآنِ کریم کی رُو سے ایسا نہیں۔ اس کے نزدیک خدا کے کسی قانون کی خلاف ورزی کرنا جُرم ہے اور ایسے مجرم کو دُنیاوی عدالت خواہ مجرم قرار دے یا نہ دے خُدا کا قانونِ مکافاتِ عمل ہر عمل کا نتیجہ خدا کے قانون کے مطابق مرتّب کرتا ہے۔ اس کے نزدیک اعمالِ انسانی کے تباہ کن نتائج کا نام سزا ہے۔ قوموں کی تباہی مروّجہ عدالتی فیصلوں کی رُو سے نہیں خُدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کی رُو سے ہوتی ہے۔ قوانینِ خداوندی کی دو شقیں ہیں۔ ایک کا نام قوانینِ فطرت ہے۔ جن کا تعلق انسان کی طبیعی زندگی سے ہے۔ ان قوانین کی خلاف ورزی سے طبیعی نقصان ہوتا ہے۔ دُوسری شق، ان قوانین پر مشتمل ہے۔ جن کا تعلق انسان کی انسانی سطح زندگی سے ہے۔ جیسے کسی کی حق تلفی۔!

جو قوم دریاؤں کے بند مضبوط طور پر نہیں باندھتی۔ اس کی بستیاں سیلاب سے برباد ہو جاتی ہیں۔ جس قوم میں ظلم و جُرم عام ہو وہ بھی تباہ ہو جاتی ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ سیلاب کی تباہی کا منظر اور اس کے اسباب محسوس ہوتے ہیں جنہیں ہر آنکھ دیکھ سکتی ہے۔ آخر الذکر تباہی کے اسباب غیر محسوس ہوتے ہیں۔ اس لئے انہیں ہر آنکھ نہیں دیکھ سکتی اس کے لئے "دیدہ بینا" بلکہ "بیدار آنکھ" کی ضرورت ہوتی ہے۔

قرآنِ کریم نے جب کہا ہے کہ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْمُجْرِمُوْنَ۔ تو اس سے دونوں قسم کی خلاف ورزی کرنے والے مراد ہیں۔ وَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ ۝ (۱۴/۱۵) اس لئے تو واضح طور پر یہ کہہ دیا گیا کہ ہر وہ نظریہ، ہر وہ نظام جس میں قوانینِ خداوندی

سے سرکشی برتی جائے اور کمزوری کو قوت کے شکنجوں میں کس کر باقی رکھا جائے، تباہ و برباد ہوکر رہتا ہے۔

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ انفرادی استقام دعیوب قومی تباہی کا موجب کیسے ہوسکتے ہیں۔ ایسا سوچنے والے اس وقت یہ بھول جاتے ہیں کہ معاشرہ افراد ہی کے مجموعہ کا نام ہے۔ اس لئے انفرادی جرائم قوم کے لئے تباہی و بربادی کا سرسام اور ذلت و رسوائی کا جذام بن کر معاشرتی زندگی پر اثرانداز ہوتے ہیں۔

قانون کی دانستہ خلاف ورزی جرم قرار دی جاتی ہے۔ اس سے نظام عدل ٹوٹ جاتا ہے۔ اس ذہنیت کی اصلاح تو ضبط خویش اور محاسبہ خویش ہی سے ہوسکتی ہے لیکن اس قسم کے اقدامات کی روک تھام نہایت ضروری ہے۔ اس کو سزا یا قصاص کہتے ہیں۔ قصاص کے معنی ہیں مجرم کا پیچھا کرکے اُسے اُس کے کئے کا بدلہ دینا۔ قصاص میں حیاتِ انسانی کا راز مضمر ہے۔ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ٥ (۲/۱۷۹) اے صاحبانِ عقل و بصیرت! تمہارے لئے قصاص میں زندگی کا راز پوشیدہ ہے۔ تاکہ تم قانون کی اچھی طرح نگہداشت کرسکو۔

قصاص انفرادی چیز نہیں۔ حکومت کا فریضہ ہے۔ قرآن سزا باندازہ جرم دیتا ہے۔ انتقاماً نہیں وَالَّذِيْنَ كَسَبُوا السَّيِّاٰتِ جَزَاۗءُ سَيِّئَةٍۢ بِمِثْلِهَا (۱۰/۲۷) "جو لوگ ناہمواریاں اور ناخوشگواریاں پیدا کریں"

عدل کا یہ تقاضا ہے کہ جو جرم کرے سزا اسی کو ملے یہ نہیں کہ کرے داڑھی والا اور پکڑا مونچھوں والا جائے۔ وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَيْهَا (۶/۱۶۵) اور جو جرم کرے گا۔ اُس کا وبال اُسی پر پڑے گا۔ کسی اور پر نہیں۔

لہذا قانونِ مکافاتِ عمل، تقاضائے عدل، اور ایک مستقل قدر ہے۔

عدل کا یہ بھی تقاضا ہے کہ ہر شخص۔ ہر فردِ معاشرہ اپنی ذمہ داری خود اُٹھائے کوئی دوسرا دوسرے کا بوجھ (ذمہ داری) کیوں اُٹھائے۔ یہ اصول نہایت جامع اور کس قدر صحیح ہے۔ اس کا زندگی کے ہر شعبے پر اطلاق ہوسکتا ہے۔

۶۔ ظلم | کوئی قوم انتظامی اُمور میں کتنا ہی نظم و ضبط اور حسن سلیقہ سے کام کیوں نہ

نہ لے لیکن اگر اس میں ظلم کی فراوانی ہو۔ تو یہ قوم ان تخریبی خرابیوں کا ازالہ نہیں کر سکتی اور ایسی قوم زندگی کی رزمگاہ میں کبھی کامیاب و کامران نہیں ہو سکتی۔ ظلم ان بنیادی خرابیوں میں سب سے شدید خرابی ہے۔ فلاح و بہبود اس ملت کے حصہ میں آ ہی نہیں سکتی۔ جس میں ظلم کا دور دورہ ہو۔

ظلم کے مروجہ معنی تو سب کو معلوم ہیں۔ اس کے عام معنی ناانصافی کے لئے جاتے ہیں۔ اس کے بنیادی معنی یہ ہیں کہ (جس شخص یا چیز کا جو مقام ہونا چاہیئے۔ وہ اس مقام پر نہ ہو۔ اگر کوئی شخص اپنے مقام سے اونچے مقام پر ہے۔ تو بھی ظلم اور اگر اس سے نیچے ہے تو بھی ظلم ہے۔ اس کمی و زیادتی کو قرآن ظلم کہتا ہے)

اِنَّہٗ لَا یُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ (۶/۲۱)

یہ حقیقت ہے کہ ظالم کی کھیتی کبھی پنپ نہیں سکتی۔

کسی کو اس کے حق سے زیادہ دے دیجئے (اسے اس کے مقام صحیح سے اونچا لے جائیے) تو یہ سوسائٹی (معاشرہ) پر ظلم ہوگا۔ اسے اس کے مقام سے نیچا رکھیئے۔ اسے اس کے حق سے کم دیجئے۔ تو یہ اس شخص پر ظلم ہوگا۔

جب عدل اس قدر عظیم قدر ہے تو اس کی نقیض قدر ظلم کس قدر ناروا ہوگا۔ قرآن نے صرف یہ نہیں کہا کہ کسی پر ظلم نہیں کرنا چاہیئے۔ بلکہ یہ بھی کہ کسی میں اتنی جرأت بھی نہیں ہونی چاہیئے۔ کہ وہ آپ پر یا کسی پر ظلم کر سکے۔ قرآن نے تو ظلم کو روکنے کے لئے اگر جنگ کے سوا کوئی اور چارہ کار نہ ہو۔ تو یہ اجازت دی ہے کہ

اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّھُمْ ظُلِمُوْا ط (۲۲/۳۹)

ظالم جن مظلوموں کے خلاف آمادہ پیکار ہو رہے ہیں انہیں اجازت دی جاتی ہے۔ کہ وہ بھی ان کے خلاف میدانِ جنگ میں نکل آئیں۔ اس لئے کہ ان پر ظلم ہو رہا ہے۔

خود ظلم نہ کرنا اور ظالم کے ہاتھ کو ظلم سے روکنا ایک مستقل قدر ہے۔

## ۷۔ احسان

وَ اَوْفُوا الْکَیْلَ وَ الْمِیْزَانَ بِالْقِسْطِ

تم ماپ اور تول کے پیمانوں کو عدل و انصاف کے ساتھ رکھو۔ ان میں کمی بیشی نہ کرو۔

یہ عدل ہے۔ لیکن اگر آپ دیکھتے ہیں کہ ایک شخص دن بھر محنت کرنے کے باوجود اتنا نہیں کما سکتا کہ اپنے بچوں کو پیٹ بھر کر کھانا دے سکے۔ تو آپ کے لئے ضروری ہے کہ اس کی کمی کو پورا کر دیں اسے احسان کہا جاتا ہے۔

احسان کے معنی ہیں حسن پیدا کرنا۔ حسن توازن ہی کا دوسرا نام ہے۔ لہذا جس کا توازن بگڑ جائے اس توازن کو درست کر دینا احسان ہے۔ یہ بھی ایک مستقل قدر ہے۔

إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ (۱۶/۹۰)

یہ حقیقت ہے کہ اللہ تمہیں عدل اور احسان دونوں کا حکم دیتا ہے۔

احسان میں معاوضے اور بدلے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ احسان میں بدلے اور معاوضے کی آرزو سراسر غیر قرآنی ہے۔ قرآن نے کہا ہے کہ جَزَآءُ الْإِحْسَانِ إِلَّا الْإِحْسَانُ ہ (۵۵/۶۰) تو اس کے یہ معنی ہیں کہ تم نے کسی کے بگڑے ہوئے توازن کو درست کیا اور وہ توازن درست ہو گیا (تم نے حسن پیدا کرنے کی کوشش کی حسن پیدا ہو گیا) اب اس کا اور بدلہ کیا؟ اگر تم نے کسی پر اس لئے احسان کیا کہ اس کا بدلہ لوں گا تو یہ احسان نہیں۔ ایسا احسان کرنے کی ضرورت نہیں وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ ہ (۷۴/۶) زیادہ لینے کی نیت سے کسی پر احسان مت کرو۔ آپ کا نقطۂ نگاہ یہ ہونا چاہیئے کہ لَا نُرِيدُ مِنكُمْ جَزَآءً وَلَا شُكُورًا ہ (۷۶/۹) ہم تم سے نہ کوئی بدلہ چاہتے ہیں نہ شکریہ (واضح رہے کہ پاکستان میں قرآنی نظام قائم ہو جانے کے بعد یہ احسان (کمی کو پورا کرنا) خود نظام کی طرف سے ہوگا۔ جو تمام افرادِ معاشرہ کی ربوبیت کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ جب تمام دنیائے انسانیت نظریۂ پاکستان کو اپنائے گی تو حیاتِ عالم کے تمام اجزائے حیات قرآن کے نظامِ ربوبیت کے مطابق نشوونما ارتقار حاصل کریں گے۔ کیونکہ اس معاشرہ میں نارِ حرص و ہوا سرد ہو جائے گی انسان رموزِ زندگی سے آشنا ہو جائے گا۔ جب تک اسلامی نظام قائم نہ ہو یہ فریضہ افراد کو ادا کرنا ہوگا۔ نظام کے اندر بھی افراد ہی کی طرف سے تمام فرائض پایۂ تکمیل کو پہنچتے ہیں لیکن ان کی حیثیت اجتماعی اور مکمل نظم و ضبط اور حسن و شائستگی کی ہو جاتی ہے۔

دُوسروں کی کمی پُورا کرنا (جو باوجود پُوری محنت کے اپنے بچّوں کا گزارہ نہ کر سکے) بھی ایک مستقل قدر ہے۔ انسانی پیکارِ حیات میں ذوقِ حیات ایسی ہی ذمّہ داری سے عہدہ برآ ہونے سے تیز تر ہوتا ہے۔

## ۸ ۔ قانون کی اطاعت

کوئی معاشرہ یا کوئی نظام اس وقت تک قائم نہیں ہو سکتا جب تک افرادِ معاشرہ از خود اپنے اُوپر کچھ حدُود و قیود اور پابندیاں نہ عائد کریں۔ قرآن انسان کے لئے اُصولی حدُود مقرر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ انسان پر یہ پابندیاں قانون کی رُو سے قائم ہونگی قرآن آقائی و حکمرانی کا حق صرف قوانینِ خُداوندی کو دیتا ہے۔ وہ کسی انسان کو کسی انسان پر اپنی آرزو و ارادہ کے مطابق حکومت کرنے کا حق نہیں دیتا۔ قرآن کے قانون کی رُو سے کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا محکوم نہیں ہوگا۔ سب کو یکساں آزادی حاصل ہوگی۔ واضح فیصلہ یہ ہے کہ :-

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَ الْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ
ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (۳/۷۸)

"کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ خدا اسے ضابطۂ قوانین، حکومت اور نبوّت عطا کرے اور وہ دُوسرے لوگوں سے کہے کہ تم، خُدا سے ورے میرے غلام اور محکوم بن جاؤ"۔ معاشرہ میں نہ کسی عدلیہ اور نہ ہی اجرائیہ کو یہ حق حاصل ہے۔ کہ کسی فرد معاشرہ کو اپنی مرضی کے تابع چلائے۔ نہ کسی نبی تک کو اختیار ہے کہ وہ لوگوں کو اپنا مطیع و فرماں بردار بنائے۔ کیا حریّت و آزادی کی یہ نعمت کسی اور نظام میں میسّر آسکتی ہے؟ ہر فرد کی آزادی اور اس کا احترام ایک مستقل قدر ہے جسے کسی حالت میں کوئی انسان پائمال نہیں کر سکتا۔

نظریۂ پاکستان کے مطابق جو قانون عالمِ انسانیت میں رائج ہوگا۔ اس قانون کے اُصول و مبانی انسانوں کے وضع کردہ نہیں ہونگے۔ جزوی قوانین وضع کرنے یا قانون نافذ کرنے کے اختیارات ہونے کے باوجود بھی کسی انسان کو دوسرے انسان سے اپنی مرضی منوانے کا اختیار نہیں۔ وُہ صرف خُدا کی طرف سے متعین شُدہ قوانین کی تنفیذ کرے گا۔ اطاعت درحقیقت قوانینِ خُداوندی کی ہوگی جو دی

قوانین بنیادی قوانین کی روشنی میں بنائے جائیں گے۔

قرآن کے قانون کا اطلاق ہر فردِ معاشرہ پر یکساں طور پر ہوگا۔ کوئی بڑی سے بڑی ہستی بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہوگی۔ حتیٰ کہ رسول، جس کی وساطت سے قوانینِ خداوندی دوسرے انسانوں کو ملتے ہیں۔ اسی لئے دانائے رموزِ زندگی سالارِ انسانیت حضور اکرم و اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی چاہیتی بیٹی تک کو کہہ دیا تھا۔ کہ اس وجہ سے تمہارے لئے قانون میں کوئی رعایت نہیں ہوگی کہ تم رسول کی بیٹی ہو۔

متنازعہ فیہ امور کے فیصلے کتابِ خداوندی کی رُو سے ہوں گے۔ قرآنِ عزیز میں حاکم مطلق حق تعالیٰ فرماتے ہیں:۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ○ (۵/۴۴)

"جو کتاب اللہ کے مطابق فیصلے نہیں کرتا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جو حکومت خدا کی کتاب کے مطابق قائم نہیں ہوتی۔ تو یہی لوگ کافر ہیں"

قانونِ خداوندی کی اطاعت کرنا اور کرانا مستقل قدر ہے۔

اسی حقیقت کو جوڈ اپنے الفاظ میں بیان کرتا ہے:۔

"اچھی زندگی سے مفہوم یہ ہے کہ انسان مستقل اقدار کو حاصل کر سکے بنا بریں مَیں کہہ سکتا ہوں کہ مملکت کا فریضہ یہ ہے کہ وہ ایسے حالات پیدا کرے جس میں ایک انسان کے لئے مستقل اقدار کا حصول ممکن ہو جائے۔ سوسائٹی کی ترقی کا یہی ایک پیمانہ ہے۔

GUIDE TO THE PHILOSOPHY OF MORALS AND POLITICS – P. 806

**۹۔ ہر عمل کا نتیجہ**

قانون کی اطاعت کے معنی یہ ہیں کہ ہر کام کا نتیجہ مرتب ہو کر سامنے آئے۔ اچھے کام کا اچھا نتیجہ اور بُرے عمل کا بُرا نتیجہ۔ اچھے کام سے مراد قوانینِ خداوندی کے مطابق عمل کرنا۔ بُرے کام کے معنی ہیں، قانونِ خداوندی سے سرکشی اختیار کرنا۔ وہ معاشرہ جس میں انسانوں کے خودساختہ

قانون کی کارفرمائی ہو اس میں پولیس اور عدالت جزا و سزا کا انتظام کرتی ہے۔ لیکن جو معاشرہ مستقل اقدار کے تابع نظامِ معاشرت چلاتا ہے۔ اس میں خواہ کوئی جرم عدالت اور پولیس کی نگاہوں سے اوجھل رہے اور یہ اس پر گرفت نہ کرسکیں۔ لیکن اگر کسی انسان کا کوئی فعل و عمل قانونِ خداوندی کی نگاہ میں جرم ہے تو خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل جس کی گرفت سے (انسان کے محسوس اعمال تو ایک طرف) نگاہوں کی خیانتیں اور دل کی لغزشیں بھی نہیں بچ سکتیں۔ يَعْلَمُ خَائِنَةَ الْأَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُورُ (۴۰/۱۹) وہ نگاہ کی خیانت اور دل کے رازوں تک کو جانتا ہے۔ اس لئے فَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ ۝ وَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ ۝ (۹۹/۷-۸) جو شخص ذرہ برابر بھی قانون کے مطابق کام کرتا ہے۔ اس کا خوشگوار نتیجہ اس کے سامنے آجاتا ہے۔ اور جو ذرہ برابر قانون کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ وہ اس کے نتائج و عواقب سے دوچار ہوتا ہے۔ اس باب میں اور تو اور، خود رسول کی بھی استثنار نہیں ہوتی۔ سورۂ یونس میں رسول اللہ صلعم سے کہا گیا کہ تم اعلان کردو کہ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوحٰى اِلَيَّ۔ میں تو صرف اس کا اتباع کرتا ہوں جو میری طرف وحی کیا جاتا ہے

اِنِّيْ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ (۱۰/۱۵)

"اگر میں اس (وحی) کی خلاف ورزی کروں تو مجھے خدا کا عذاب پکڑے گا"

دیکھئے خدا کا رسول بھی امتحانِ خویش میں قانونِ خداوندی کو پیمائۂ ثواب و عذاب قرار دیتا ہے۔ اس سے صاف واضح ہے کہ قانونِ مکافاتِ عمل کی گرفت سے جب حضور اکرم ختم المرتبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی قانون کی خلاف ورزی کی صورت میں ماخذ ہو سکتے ہیں۔ تو کارِ حیات میں دوسرے انسان۔ مہماتِ زندگی میں دوسرے لوگ قانونِ خدا سے بغاوت و سرکشی اختیار کر کے گرفت سے کیسے بچ سکتے ہیں۔

قرآن کا واضح اعلان ہے کہ انسان اس کے لئے آزاد ہے کہ وہ زندگی کے لئے جو طور طریقے اور انداز و اسلوب اختیار کرے لیکن اس کے اعمال و افعال کے نتائج خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل مرتب کرے گا۔ اس قانون کی رو سے کسی مرد یا عورت کی محنت رائیگاں نہیں جاتی۔ اللہ کسی کام کرنے والے کے کام کو ضائع نہیں کرتا۔ اس قانون کے مطابق کسی کے اجر میں ذرا کمی نہیں کی جاتی اور نہ ہی ایسا ہوتا ہے کہ بلا سعی و

عمل یونہی کسی کو کچھ بخش دیا جائے۔

لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی ۙ (۵۳/۳۹) کسی انسان کو بجز اس کی سعی و عمل کے کچھ نہیں ملتا۔

ہر عمل کا ٹھیک ٹھیک نتیجہ مرتب کرنا مستقل قدر ہے۔

**مشاورتی نظامِ حکومت** | قرآنی معاشرہ میں صحیح نظامِ حکومت چلانے کے لئے مستقل اقدار نافذ اور رائج کی جائیں گی۔ مستقل اقدار بالعموم بنیادی اصول کی شکل میں ہوتی ہیں۔ ان کی عملی جزئیات ہر زمانہ کے تقاضوں کے لحاظ سے معاشرہ خود متعین کرتا ہے۔ یہ کام فردِ واحد کے سپرد نہیں کیا جاتا۔ بلکہ نمایندگانِ ملت جزئیات باہمی مشوروں سے طے کریں گے۔ قرآنِ عزیز نے رسول اکرمؐ کو بھی مشاورت سے مستثنیٰ قرار نہیں دیا۔ آپؐ سے بھی کہا گیا کہ

شَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ج (۳/۱۵۸)

"معاملات میں ان سے مشورہ کیا کرو۔"

مغرب کے جمہوری نظام میں ووٹوں کی کثرت و قلت سے فیصلے طے ہوتے ہیں۔ لیکن چونکہ "آئین ملتِ محمدیہ قرآن است" اس لئے اسلامی معاشرہ میں جزئی معاملات مستقل اقدار کی حدود کے اندر رہتے ہوئے طے کئے جائیں گے۔ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ص (۴۲/۳۸)

لہٰذا نظامِ مملکت میں باہمی مشاورت بھی ایک مستقل قدر ہے۔

آج پاکستان میں اجتہادِ عالمانِ کم نظریہ ہے کہ سوشلزم کو اسلامی (اسلامی سوشلزم) کے اضافے سے مسلمان نہیں کیا جا سکتا کیونکہ یہ اصطلاح غیر اسلامی ہے۔ لیکن انسان کی عقل و بصیرت اور شعور و آگہی ان ساحرانِ سیاست کے اس سحرِ مبین پر حیران و ششدر ہے کہ اسلام کو مصلحت کی بھینٹ چڑھانے والے یہ فتنہ پرداز اسی اسلامی کے اضافہ سے جمہوریت کو اسلامی جمہوریت بنا رہے ہیں۔ شاید حکیم الامتؒ نے انہی کے متعلق لکھا ہے:۔

داغم از رسوائی ایں کارواں
در امیر او ندیدم نورِ جاں

تن پرست و جاہ مست و کم نگہ
اندرونش بے نصیب از لاالٰہ

قرآنی نظام انسانی معاملات کے فیصلے حق و باطل کے معیار پر کرے گا۔ کثرت آراء اس نظام مملکت میں معیارِ حق قرار نہیں دیا جائے گا۔

## ۱۱۔ اُمورِ مملکت نا اہلوں کے سُپرد نہ کیے جائیں

اسلامی معاشرہ میں اربابِ نظم و نسق اور صاحبِ اقتدار و اختیار (اربابِ حل و عقد) درحقیقت متاعِ ملت کے امین ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ امانت صرف انہی کے سُپرد کی جاتی ہے۔ جن پر اعتماد و بھروسہ کیا جا سکے۔ لہٰذا اُمورِ مملکت اگر نا اہلوں کے سُپرد کر دیئے جائیں گے تو اس سے معاشرہ میں ناخوشگواریاں اور ناہمواریاں پیدا ہوں گی۔ بدیں وجہ کاروبارِ سلطنت نا اہلوں کی تحویل میں نہ دیا جائے۔ اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا ۙ وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ۔۔۔۔۔۔ (۴/۵۸) اللہ تمہیں اس امر کا تاکیدی حکم دیتا ہے کہ تم امانات کو اُن کے سُپرد کرو جو ان کے اہل ہوں۔ اور جب لوگوں میں فیصلہ کرو۔ تو ہمیشہ عدل کی رُو سے کرو۔ یہ بھی ایک مستقل قدر ہے۔

## ۱۲۔ افرادِ معاشرہ کو بنیادی ضروریات مہیا کرنے کی ذمّہ داری نظامِ مملکت پر ہوگی

اسلامی معاشرہ میں رزق کے سرچشمے جو خدا کی ملک ہیں مملکت کی تحویل میں چلے جائیں گے اس نظامِ مملکت میں وسائل پیداوار پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہوگی۔ تمام ذرائع رزق افرادِ معاشرہ کے پاس بطور امانت ہوں گے۔ زمین ام الوسائل ہے۔ جب زمین پر ہی کسی کے انفرادی و ذاتی حقوق تسلیم نہ کیے جائیں تو ظاہر ہے کہ تمام کارخانے، ملیں اور مکانات وغیرہ جن کی بنیاد زمین پر ہوتی ہے۔ وہ انفرادی ملکیت کیسے ہو سکتے ہیں۔ اقبالؒ فرماتے ہیں:۔

باطنِ اَلْاَرْضُ لِلّٰه ظاہر است
ہر کہ ایں ظاہر نہ بیند کافر است

اس مملکت میں رزق کے سرچشموں پر ذاتی ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا نہ افراد کی ملکیت نہ مملکت کی۔ اس میں مملکت بھی صرف ان کا انتظام کرتی ہے۔ جب تمام وسائل پیداوار مملکت کی تحویل میں ہوں گے۔ تو رزق کی ذمہ داری بھی نظامِ مملکت پر ہوگی۔

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا ......... (۱۱/۶)

"زمین میں کوئی چلنے والا ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری اللہ پر نہ ہو"۔

جو مملکت قوانینِ خداوندی کے مطابق نظامِ معاشرہ چلانے کی دعویدار ہوگی۔ وُہ یہ تمام ذمہ داریاں اپنے اُوپر لے گی۔ مملکت تمام افرادِ معاشرہ کو اس امر کی ضمانت دیتی ہے کہ ان کی اور اُن کی اولاد کے رزق کی ذمہ داری اس پر ہے کیونکہ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ (۶/۱۵۲)

"ہم تمہارے اور تمہاری اولاد کے رزق کے ذمہ دار ہیں"۔

رزق میں جسمانی پرورش اور انسانی صلاحیتوں کی نشوونما کے تمام سامان و ذرائع آجاتے ہیں۔ خدا نے تمام سامانِ رزق مخلوق کی پرورش کے لئے پیدا کیا ہے۔

وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ (۵۵/۱۰)

"اس کا پیدا کردہ رزق تمام ضرورت مندوں کی ضروریات پُورا کرنے کے لئے یکساں طور پر کھلا ہے۔ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيْنَ ٥ (۴۱/۱۰)

رزق انسانی زندگی کے لئے بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ لہٰذا تمام افرادِ معاشرہ کے رزق کی ذمہ داری نظامِ معاشرہ کے لئے ایک مستقل قدر ہے۔ جسے کسی حالت میں بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

## ۱۳- ذرائع رزق

جو نظامِ معاشرہ کی اتنی عظیم ذمہ داری اپنے اُوپر لے لیتا ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ ذرائع رزق اس کی تحویل و نگہداشت میں رہیں۔

قرآن نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ رزق کے ذرائع و وسائل تمام انسانوں کے لئے یکساں طور پر ہیں۔ یہ سب کے فائدے کے لئے ہیں۔ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ط (۲/۲۹) خدا وہ ہے جس نے جو کچھ زمین میں ہے سب کا سب

تم سب کے فائدے کے لئے پیدا کیا ہے۔ اس سے سب کو برابر متمتع ہونے کا حق ہے۔ یہ اس لئے نہیں کہ چند افراد یا مفاد پرستوں کا کوئی مخصوص گروہ وسائل پیداوار پر قابض ہو کر دُوسرے انسانوں سے اپنی اطاعت و فرماں برداری کرائے۔ دوسرے مقام پر ہے۔

وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ (۷/۱۰)

"یہ حقیقت ہے کہ ہم نے تمہیں زمین میں متمکن کیا ہے اور اس میں تم سب کے لئے سامانِ معاش رکھا ہے۔"

یعنی یہ سامانِ زیست تمام انسانوں کی ضروریات پُورا کرنے کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ لہٰذا اس کا انتظام ایسا ہونا چاہیئے کہ کوئی فرد رزق سے محروم نہ ہونے پائے۔

لہٰذا وسائل رزق کا تمام انسانوں کے لئے کھلا رہنا بھی ایک مستقل قدر ہے۔

## ۱۴۔ ضرورت سے زیادہ

قرآنی نظامِ مملکت میں نہ صرف یہ کہ ذرائع پیداوار اور وسائلِ رزق کو ذاتی ملکیت نہیں بنایا جا سکتا بلکہ زائد از ضرورت کو بھی نوعِ انسان کی بہبود و فلاح کے لئے کھلا رکھا جائے۔ تاکہ معاشرہ میں ضرورت مندوں کی ضروریات کو بطریقِ احسن پُورا کیا جا سکے۔

وَيَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۥ قُلِ الْعَفْوَ ط (۲/۲۱۹)

"تجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہم اپنی کمائی میں سے کس قدر دُوسروں کی فلاح و بہبود کے لئے کھلا رکھیں۔ ان سے کہہ دو کہ جس قدر تمہاری ضروریات سے زائد ہو۔ سب کا سب۔

اس عصرِ معیشت میں نباضِ فطرت حکیم الامت علامہ اقبالؒ نے دُنیا میں معاشرتی و معاشی زندگی کے تقاضے کیا رُخ اختیار کر رہے ہیں۔ نبضِ دوراں سے اندازہ لگا کر یہ فرمایا:۔

جو حرف قُلِ الْعَفْوَ میں پوشیدہ ہے ابتک
اس دَور میں شاید وُہ حقیقت ہو نمودار

زائد از ضرورت مال ضرورت مندوں کے لئے خرچ کرنا۔ اسے بہبُودِ دیگراں

کے لئے کھلا رکھنا۔ اپنی جائز ضروریات کے علاوہ سب کا سب دوسروں کی بہبود و فلاح کے لئے نظامِ خداوندی کے حوالے کرنا۔ یہ بھی ایک مستقل قدر ہے۔

## ۱۵۔ حفاظتِ عصمت

قرآن کی رُو سے حفاظتِ عصمت بھی ایک مستقل قدر ہے عصمت وعفت کی حفاظت مرد اور عورت دونوں کا یکساں فرض ہے۔ بلکہ قرآن نے پہلے مرد کو کہا ہے کہ اس کی نگاہوں میں خیانت اور بے باکی نہ ہو۔ عام طور پر اگر لڑکا جرائم جنسی کا ارتکاب کرے۔ تو اُسے اس قدر معیوب نہیں سمجھا جاتا لیکن اگر بیچاری لڑکی سے کہیں یہ جُرم سرزد ہو جائے۔ تو سوسائٹی اس کی رُسوائی کا سبب بنتی ہے۔ حالانکہ قرآن دونوں سے عفت وعصمت کی حفاظت کا مطالبہ کرتا ہے۔ بلکہ جنسی جرائم میں عموماً پہل مرد کی طرف سے ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں یہ شور و غوغا جسے سُن کر کان پھٹتے جاتے ہیں کہ دیکھو جی بے پردگی عام ہے۔ لڑکیاں سڑکوں۔ بازاروں میں کھلے بندوں چلتی پھرتی ہیں۔ معاشرہ کا اخلاق بگڑ رہا ہے۔ لیکن ان بھلے مانسوں کو خدا کا یہ حکم کہ (جو کہ مردوں کو پہلے دیا گیا ہے) ان کی نگاہیں بے باک نہ ہوں۔ مرد اس پر عمل کرنا ضروری نہیں سمجھتے یہ کتنی بڑی ناانصافی ہے کہ اپنے فرض کی بجاآوری سے اغماض اور گریز کیا جا رہا ہے۔ اور اپنی بہنوں۔ بیٹیوں کے پیچھے اخلاق سازی کا لٹھ لئے پھرتے ہیں۔ خیر یہ تو ضمناً ایک بات آگئی تھی۔ قرآن نے مرد اور عورت کا جنسی تعلق صرف نکاح کے معروف طریقہ کی رُو سے ہو اس کی اجازت دی ہے۔ اس کے علاوہ جنسی تعلق کو زنا کہا گیا ہے، جس کے قریب تک جانے سے روکا ہے۔ ”وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓی اِنَّهٗ کَانَ فَاحِشَةً ؕ وَ سَآءَ سَبِيْلًا ۝ (۱۷/۳۲)“ اور زنا کے قریب بھی نہ جاؤ۔ یہ بے حیائی کا کام ہے اور نہایت بُرا راستہ“۔ جو اس فعل کا مرتکب ہُوا اُسے سزا دی جائے گی۔ (۲۴/۲)

نکاح بالغ مرد اور عورت کی باہمی رضامندی سے معاہدہ کا نام ہے نکاح محض جنسی جذبہ کی تسکین کا نام نہیں مقصود و مطلوب باہمی مودّت اور محبّت کے تعلّقات استوار کرنا ہیں جس شخص کی نکاح کی صورت پیدا نہ ہو سکے ضبطِ نفس سے کام لے۔ ڈاکٹر انون جنہوں نے اپنی تمام عمر مختلف اقوام و قبائل کے جنسی تعلقات

کی تحقیق میں گزاری ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اگر کوئی قوم اپنے ہاں زنا کو عام کر دے۔ تو سو سال کے عرصہ میں اس میں قومی زوال اور انحطاط شروع ہو جاتا ہے۔

لہٰذا حفاظت عصمت بھی ایک مستقل قدر ہے۔ جس کا دامن کسی حالت میں بھی ہاتھ سے نہیں چھوڑا جا سکتا۔ کیونکہ جنسی بے راہ روی سے افراد کی صلاحیتوں میں اضمحلال واقع ہو جاتا۔

## لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ

اسلامی مملکت میں مستقل اقدار کو کسی سے زبردستی نہیں منوایا جاتا۔ اسلام نہ ذہنی اور نہ ہی جسمانی جبر و تشدد کی اجازت دیتا ہے۔ جو فیصلہ کوئی انسان برضا و رغبت نہ کرے۔ وہ اس انسان کا فیصلہ ہو ہی نہیں سکتا۔ قرآن معاملات میں زبردستی کی اجازت نہیں دیتا۔ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قف قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ج (۲/۲۵۶) دین کے معاملہ میں کوئی زبردستی نہیں۔ وحی نے سیدھی راہ اور غلط راہ واضح کر دی ہے۔ انسان کے صاحب اختیار و ارادہ ہونے کی وجہ سے قانونِ خداوندی اس کے ہر عمل، ہر حرکت کا محاسبہ کرے گا۔ سرکشانِ زور دست اور منکرانِ غائب و حاضر کسی بھی دستورِ حیات کو قبول کریں قرآن اس سے روکتا نہیں وہ صرف یہ کہتا ہے کہ دینِ خداوندی سے ہٹ کر محض تصورات کی فضاؤں میں خاک چھانتے پھرنا یا محض عقل ہی کی رہنمائی میں گوہرِ مقصود کے حصول کی کوشش درست نہیں۔ قرآن نے جادۂ حق و باطل کی تمیز کر دی ہے۔ اب جس کا جی چاہے سیدھی راہ اختیار کرے اور جس کا جی چاہے ٹیڑھی۔ خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل انسان کے ایک ایک کام اور ایک ایک عمل کو میزانِ خداوندی میں تولے گا کیونکہ جو کچھ انسان برضا و رغبت کرے گا۔ وہی عمل اس کا ہو گا۔ قانون اسی فعل کی ذمہ داری اس پر عائد کرے گا۔

وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ قف فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ ۚ (۱۸/۲۹)

"ان سے کہہ دو کہ تمہارے نشو و نما دینے والے کی طرف حق آگیا۔ اب جس کا جی چاہے اسے قبول کر لے اور جس کا جی چاہے اس سے انکار کر دے۔"

جو حق اختیار کرے گا۔ وہ اُس کے خوشگوار نتائج سے متمتع ہوگا۔ جو سرکشی کی راہ اختیار کرے گا۔ اس کے تباہ کن عواقب اس کے سامنے آئیں گے۔ جو لوگ دین سے انکار کرکے (کافرین) دوسرا مذہب اختیار کرلیں گے ان کی اس روش پر کہ انہوں نے یہ روش کیوں اختیار کی کسی قسم کی کارروائی نہیں کی جائے گی۔ انہیں مذہب کی شخصی آزادی (PERSONAL LIBERTY) دی جائے گی۔ بلکہ ان کے معابد کی حفاظت مملکت کے سپرد ہوگی۔ سورۂ حج میں ہے۔ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا ط (۲۲/۴۰)

اگر خدا ایک گروہ کی مدافعت و حفاظت دوسرے گروہ سے نہ کراتا۔ تو عیسائیوں کے کلیسا، راہبوں کی خانقاہیں، یہودیوں کے صومعے، اور مسلمانوں کی مساجد جن میں قانونِ خداوندی کو بکثرت سامنے لایا جاتا ہے۔ سب منہدم ہو جاتے۔ لہٰذا غیر مسلموں کی پرستش گاہوں کی حفاظت بلکہ ان کے جان و مال عزت۔ آبرو، عصمت، ہر متاع کی حفاظت نیز یہ لوگ ان حقوق و مراعات کے یکساں طور پر مستحق ہونگے۔ جو انسان ہونے کی جہت سے مستقل اقدار کی رُو سے ملتی ہیں۔ کسی پر جبر و استبداد کا شائبہ تک نہ ہوگا۔ لیکن جب کوئی شخص دل کی مرضی (برضا و رغبت) سے اسلام قبول کرکے مسلم معاشرہ کا فرد بن جائے تو اس کے لئے ضروری ہوگا۔ کہ وہ اسلامی قوانین کی اطاعت کرے۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ ایک فرد اسلامی معاشرہ میں آجائے اور اُسے اس کی مرضی پر چھوڑ دیا جائے کہ وہ جس قانون کی چاہے اطاعت کرے اور جس سے جی چاہے انحراف کرے۔ کیونکہ جب کوئی فرد برضا و رغبت اسلامی معاشرہ کا جزو بنتا ہے تو وہ قرآنی قواعد و ضوابط کی پابندی قبول کرلیتا ہے۔ ہاں اگر وہ قوانینِ اسلامی کی پابندی نہیں کرنا چاہتا تو اس کو اجازت ہے کہ اسلام کے دائرے سے نکل کر دوسرا مذہب اختیار کرے۔ لیکن جب تک وہ اسلامی معاشرہ کا فرد رہے گا۔ اسے احتسابِ خویش۔ امتحانِ خویش اور محاسبۂ خویش کے لئے قرآنی قانون کو سامنے رکھنا ہوگا۔ یہی لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ کا مفہوم ہے۔

مرگ و حشر۔ حشر و مرگ اور رزمگاہِ حیات میں انسانی اعمال کے نتائج خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل اپنے پیمانوں۔ اپنی اقدار اور اپنے اندازوں کے مطابق مرتب کرے گا۔ ظاہر ہے کہ جزا و سزا کے پیمانے بھی قانونِ خداوندی کے مطابق ہوں گے۔ جو لوگ قوانینِ خداوندی کا اتباع کریں گے۔ ان کے کھیت سرسبز و

شاداب اور وہ زندگی کی شادابیوں سے سرفراز ہوں گے۔ جو اسلام کے علاوہ دوسرا مذہب اختیار کریں گے۔ وہ امن وسلامتی سے محروم رہیں گے۔ کیوں کہ زندگی کی راہ میں ان کے ہاتھ میں چراغِ کائنات نہیں ہوگا۔ وہ رموزِ کائنات سے سرکشی اختیار کئے ہونگے۔ ان کی زندگی کی کھیتیاں جھلس جائیں گی۔ ان کی وادی وادی بے طائر و بے شاخ و برگ ہو گی۔ اس لئے کہ

این ہمہ فیضِ بہار از فطرت است
فطرت از پروردگارِ فطرت است (اقبالؒ)

# اَلْاَسْمَاءُ الْحُسْنٰی

صفاتِ الٰہیہ میں سے اس قسم کی صفات مثلاً ھُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وغیرہ کو چھوڑ کر باقی صفات سب مستقل اقدار ہیں۔ انہی کو قرآن نے اَلْاَسْمَاءُ الْحُسْنٰی کی جامع اصطلاح سے تعبیر کیا ہے۔ آپ قرآنِ کریم کا مطالعہ کریں۔ اس باب میں رموزِ حق آپ کے سامنے کھلتی اور نئی نئی حقیقتیں آپ پر منکشف ہوتی چلی جائیں گی۔ حیاتِ عالم انہی مستقل اقدار سے وابستہ ہے۔ انسانی زندگی کے اجزائے حیات انہی کو بطور معیار سامنے رکھنے سے صحیح طور پر نشوونما حاصل کر سکتے ہیں۔ پیکارِ حیات میں انسان اپنی ذات میں انسانی ممکنات کو مشہود کرنے کے لئے بطور نمونہ سامنے رکھے تو دین کا مقصد پورا ہو جاتا ہے۔ مطلوبِ حیات یہی ہے کہ انسان اپنی ذات میں مستقل اقدار کو منعکس کر کے استحکام پیدا کرے۔ ایسا کرنے سے بم و زیرِ حیات اور تقدیرِ حیات میں انسان کامیابی و کامرانی سے سرفراز ہوگا اور اس میں ان صفات کا ظہور ہوتا چلا جائے گا۔ مومن کہتے ہی اسے ہیں جس کی زندگی میں مستقل اقدار کی نمود ہو اور اس کی زندگی ان اقدارِ حیات سے ہم آہنگ ہو جائے۔

سابقہ اوراق میں جن مستقل اقدار کا مختصر سا تعارف کرایا گیا ہے۔ آپ اندازہ فرمائیں کہ عالمِ انسانیت میں ایسا معاشرہ متشکل ہو جائے کہ جس کے افرادِ معاشرہ کے کیریکٹر سے مستقل اقدار (ان صفاتِ الٰہیہ) کی نمود ہو تو وہ معاشرہ

امن و سلامتی کا کیونکر ضامن نہ ہوگا؟ زبانِ کائنات سے اس کے لئے تحسین و آفرین کے کلمات کیوں نہ نکلیں گے۔ اور یہ معاشرہ کیوں نہ حرص و ہوس کے سیلِ آتش سے محفوظ رہے گا۔ یقیناً ایسے معاشرہ میں ناخوشگواریاں اور ناہمواریاں راہ نہ پاسکیں گی۔

دانائے رمزِ اتحاد اقبالؒ نے قرآنِ عزیز کے مطالعہ کے بعد یہی نتیجہ اخذ کیا کہ امتیازِ رنگ و خوں۔ امتیازِ قبائل اور امتیازِ حسب و نسب نے انساں کو انسان کے خون کا پیاسا بنا دیا ہے۔ یہ آج تمام علم و حکمت اور شعور و آگہی کے باوجود فرنگ کے تراشے ہوئے لات منات (وطن و نسل اور رنگ و خون) کے بتوں کی پرستش میں منہمک ہے نظریۂ پاکستان پیش کیا اور اتحادِ انسانی کے لئے رنگ و وطن کے تصور کو انساں کا دشمن قرار دیا۔ فرماتے ہیں :۔

اَے اسیرِ رنگ پاک از رنگ شو
مومنِ خود، کافرِ افرنگ شو

اور

برگ و سازِ کائنات از وحدت است
اندریں عالم حیات از وحدت است
درگذر از رنگ و بو ہائے کہن
پاک شو از آرزو ہائے کہن

دُنیائے انسانیت میں حقیقی امن اور عالمِ انسانیت میں خوشحالی و خوشگواری کی فضائیں اُسی وقت پیدا ہونگی جب عالمِ انسانی رجعت الی القرآں کرے گا۔ خالقِ حقیقی کا یہی وہ "پیامِ آخریں" ہے۔ جو نوعِ انساں کی راہنمائی کے لئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے انسانوں کو دیا۔

مستقل اقدار کا سرچشمہ ذاتِ خداوندی ہے۔ ان صفاتِ الٰہیہ کو اگر انسان اپنے اندر منعکس کرے۔ تو یہی وہ اقدارِ حیات ہیں۔ جن کی نمود سے ایسا عالمگیر معاشرہ وجود میں آسکے گا جس میں انساں انسانی غلامی سے آزاد ہوگا۔ جیسا کہ پہلے لکھا گیا ہے یہی مستقل اقدار ہیں۔ جن کو قرآن "اَلْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی" کہتا ہے۔

# قَهَّارٌ

ہمارے ہاں عموماً یہ لفظ غصّہ۔ عتاب اور قہر کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ لیکن قہر سے مفہوم عتاب اور غصّہ نہیں۔ بلکہ غلبہ و تسلّط ہے۔ جب فرعون کے ذمّہ داران سلطنت نے فرعون سے کہا کہ موسیٰ کو (اور ان کی قوم کو) اس طرح آزاد چھوڑ دینا خالی از خطرہ نہیں کیونکہ

در نگاہِ او پیامِ انقلاب

تو فرعون نے انہیں تسلّی دی، کہا کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ میں ان کا ابھی انتظام اور بندوبست کئے لیتا ہوں۔

سَنُقَتِّلُ اَبْنَآءَهُمْ وَنَسْتَحْيِ نِسَآءَهُمْ ج وَاِنَّا فَوْقَهُمْ قٰهِرُوْنَ ۝ (۷/۱۲۷)

"ہم ان کے لڑکوں کو قتل کر دیں گے اور ان کی عورتوں کو زندہ رہنے دیں گے ہم اُن پر پُورا پُورا غلبہ و تسلّط رکھتے ہیں (وہ ہماری طاقت سے دبے ہوئے بے بس ہیں۔)

اس سے ظاہر ہے کہ قہر کے معنی قوّت و شدّت اور غلبہ و تسلّط کے ہیں۔ عربوں کے ہاں جب کوئی ہڈی ٹوٹ جائے۔ تو اس کے اُوپر نیچے لکڑیاں رکھ کر اسے زور سے باندھ دیا جاتا ہے۔ کچھ دنوں بعد وہ ہڈی جُڑ جاتی ہے۔ اس طریق علاج کو جبر کہتے ہیں۔ یعنی اس قسم کی قوت و شدّت جس سے (جڑی ہوئی ہڈیاں توڑی نہ جائیں بلکہ) ٹوٹی ہوئی ہڈیاں جوڑی جائیں۔

دوسری طرف لَحْمٌ مَقْهُوْرٌ کہتے ہیں۔ اُس گوشت کو جسے آگ پر رکھ کر گلایا جائے اور اس طرح کھانے کے قابل بنا دیا جائے۔ یعنی حرارت سے اس کی سختی میں نرمی پیدا کی جائے۔

ظاہر ہے کہ قہر اور جبر میں قوت و شدّت کا پہلو مضمر ہے۔ عام انسان اس قوت کو فساد کے لئے استعمال کریں گے۔ تو یہ جبر و قہر مذموم ہوگا۔ لیکن جب یہی قوت قوانینِ خداوندی کے نفاذ کے لئے استعمال کی جائے گی جس سے سرکش قوتوں کو قوانین کی گرفت میں رکھنا ہوگا۔

وَاِنْ یَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗٓ اِلَّا هُوَ ط
وَاِنْ یَّمْسَسْكَ بِخَیْرٍ فَهُوَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝ وَهُوَ
الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ ط وَهُوَ الْحَكِیْمُ الْخَبِیْرُ ۝ (۶/۱۷-۱۸)

(اے انسان) اگر خدا تجھے دکھ پہنچائے تو اس کا دور کرنے والا کوئی نہیں مگر اسی کی ذات۔ اور اگر وہ تجھے بھلائی پہنچائے۔ تو اس کا ہاتھ پکڑنے والا کون ہے! وہ ہر بات پر قادر ہے اور وہی ہے جو اپنے بندوں پر زور و غلبہ رکھنے والا (قاہر) اور حکمت والا باخبر ہے۔

دوسری جگہ:۔

هُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ وَیُرْسِلُ عَلَیْكُمْ حَفَظَةً ط (۶/۶۱)

وہی اپنے بندوں پر زور و غلبہ رکھنے والا۔ اور تم پر محافظ (قوتیں) بھیجتا ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے قید خانہ کے ساتھیوں سے کہا تھا:۔

ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَیْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۝
(۱۲/۳۹)

کیا الگ الگ آقاؤں کا ہونا بہتر ہے یا ایک ایسے خدا کا جو یگانہ اور سب پر غالب ہو۔

قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَیْءٍ وَّهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۝ (۱۳/۱۶)

"کہیے کہ اللہ ہی ہے جو ہر شے کا پیدا کرنے والا ہے۔ وہ یگانہ ہے وہ سب پر غالب ہے۔"

وہی اللہ ہے۔ جس نے نظامِ عالم کو ٹھیک پیمانہ کے مطابق جاری کر رکھا ہے۔ اسے کسی ساتھی اور حمایتی کی ضرورت نہیں۔ وہ ہر معاملہ پر غلبہ و تسلط رکھتا ہے۔ تقدیرات کائنات لاانتہا ہیں۔ لیکن اس نے سورج اور چاند کے طلوع و غروب کے پیمانے مقرر کر رکھے ہیں۔ دن اور رات کی گردشیں اسی کے قانون کے مطابق ہیں۔ چاند اور سورج کی تقدیریں اسی کے اختیار و قدرت میں ہیں۔ تمام سلسلۂ کائنات اسی کے اختیار و قوت سے ہے۔ وہ عزیز الغفار (۳۹/۵) غلبہ و قدرت والا حفاظت بہم

پہنچانے والا ہے۔ عالم کائنات میں انقلابات اسی کے قانون کے مطابق ظہور پذیر ہوتے ہیں۔

سُورۃ اَلْمُؤْمِن میں ہے:۔

يَوْمَ هُم بَارِزُونَ ۚ لَا يَخْفَىٰ عَلَى اللَّهِ مِنْهُمْ شَيْءٌ ۚ لِّمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ۖ لِلَّهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ‎(۴۰/۱۶)

جس دن تمام انسان (اس کے حضور) حاضر ہو جائیں گے۔ ان کے متعلق کوئی بات بھی اللہ سے چھپی ہوئی نہ ہوگی۔ اس دن سلطنت کس کی ہوگی؟

اس یگانہ اور غالب خدا کے سوا اور کس کی ہوگی؟

ہمارے ہاں مروجہ معنی کی وجہ سے قہار کا لفظ سنتے ہی انسانی ذہن جور و استبداد اور وحشت و بربریت کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ سُبْحَانَ اللّٰہِ تَعَالٰی عَمَّا یَصِفُوْنَ ؕ

اس سے ظاہر ہے کہ ایک نشو و نما یافتہ ذات میں جلال و جمال کی آویزش ہوتی ہے۔ جہاں ایک طرف محبت و رافت کی صفات ہوتی ہیں وہاں دوسری طرف قوت اور صلابت کی صفات بھی ہوتی ہیں تاکہ ان سے آتشِ فساد بھڑکانے والی قوتوں کو دبایا جا سکے۔ فساد انگیز قوتوں کو سرکشی سے روکا جا سکے۔ جمال و جلال کے اسی ربط کا مفہوم اقبالؒ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ:۔

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

نظامِ عدل اسی قسم کی ملت کے ہاتھوں قائم ہو سکتا ہے۔ جس کا ہر فرد حلقۂ یاراں میں بریشم کی طرح نرم اور رزمِ حق و باطل میں فولاد کی خصوصیت رکھے۔

دوسری جگہ اقبالؒ فرماتے ہیں:۔

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

جماعتِ مومنین کی یہی تعریف قرآن نے ان الفاظ میں کی ہے:۔

مُحَمَّدٌ الرَّسُوْلُ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗ اشدآءُ الکفار
وَرُحَمَا بَیْنَھُمْ۔

(محمدؐ) اور ان کے رُفقاء آپس میں رحیم اور سرکشانِ اسلام کے لئے نہایت سخت گیر ہیں۔

سرکش و چالاک قوتوں کو راہ راست پر لانے کے لئے صفت، قہاریت کا ہونا کتنا ضروری ہے۔ مندرجہ بالا سطور سے اس کا مفہوم ذہن نشین ہو گیا ہوگا۔

# اَلجَبَّارُ المُتَکَبِّرُ

قہار کی طرح جبار کا بھی ہمارے ہاں وہ مفہوم نہیں لیا جاتا جو صحیح ہے اس سے بھی انسانی ذہن جبر و اکراہ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ یہ اس لئے کہ اس لفظ کے صحیح معنی ہماری نظروں سے اوجھل ہیں۔ جیسا کہ قہار کے عنوان میں لکھا گیا ہے۔ کہ جبر کے معنی ہیں کسی بگڑی ہوئی بات کی اس انداز سے اصلاح کرنا جس میں قوت سے کام لیا جائے۔ جب ہڈی ٹوٹ جائے تو اسے دو لکڑیوں سے جکڑ کر بطریق احسن باندھ دیا جاتا ہے۔ جس سے وہ جڑ جاتی ہے۔ اس انداز اصلاح کو جبر کہتے ہیں جس لکڑی سے ہڈی کو اس طرح جکڑا جاتا ہے جبارۃ کہلاتی ہے۔ اور جس پٹی سے اسے باندھا جاتا ہے اسے جبیرۃ کہتے ہیں۔

لہٰذا جبار کے معنی ہیں وہ ذات جس نے تمام نظامِ کائنات کو اپنے قانون کے شکنجوں میں اس انداز سے جکڑ رکھا ہے کہ کوئی شئے اپنے مقام متعینہ سے ایک انچ بھی اِدھر اُدھر نہیں ہٹ سکتی۔ ظاہر ہے اس جکڑنے میں ظلم کا شائبہ تک نہیں بلکہ یہ سرتاسر حکمت و مصلحت پر مبنی نظامِ عالم کو جادۂ اعتدال پر چلانے کے لئے ہے۔ جبار کے معنی وہ ذات جو ہر بگڑی کو بنانے والی۔ اس علاج و اصلاح میں قوت و غلبہ کا بھی دخل ہے۔ جب انسان غلط طریق سے اپنی زندگی بسر کرے گا۔ تو اس سے زمین میں فتنہ و فساد پھیلے گا۔ اب اگر وہ اپنی اصلاح چاہتا ہے۔ تو اُسے اپنے آپ کو قوانین خداوندی کی زنجیروں میں جکڑنا ہوگا۔ زندگی کے دھارے

کو قوانینِ الٰہیہ کے پختہ ساحلوں کے اندر لے جانا ہوگا۔ اس سے اس کی بگڑی ہوئی حالت سُدھر جائے گی۔ یہی کیفیت اور یہی حالت کسی معاشرہ اور مملکت کی ہوگی۔

قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ کے لئے یہ لفظ صرف ایک مرتبہ آیا ہے یعنی (۵۹/۲۳) میں۔ لیکن یہی صفت جب انسانوں کی طرف منسوب ہوگی۔ عیب بن جائے گی۔ قرآن کسی انسان کو یہ حق نہیں دیتا کہ وہ کسی دُوسرے انسان کو شدّت و قوت کی بنا پر اپنا محکوم اور فرمانبردار بنائے۔ قرآن کسی انسان کو بھی دُوسرے انسانوں کو اپنا تابع فرمان بنانے کی اجازت نہیں دیتا۔ سُورہ ابراہیم میں ہے

كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيدٍ ۝ (۱۴/۱۵)

ہر سرکش و ضدّی خاسر و نامراد ہُوا

سُورہ المؤمن میں ہے :۔

كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ ۝ (۴۰/۳۵)

"اس طرح اللہ ہر متکبّر اور سرکش ضدّی کے دل پر مُہر لگا دیتا ہے"۔

لیکن یہی قوتیں جب نظامِ عدل و اصلاح اور قیامِ انسانیت کے لئے صرف کی جائیں گی۔ تو صفاتِ خُداوندی کا مظہر بن جائیں گی۔ یہ فرق ہے ایک نشو و نما یافتہ ذات کی طرف سے قوت کی نمود اور حیوانی سطح پر قوت کے استعمال میں۔

جبّار کے ساتھ متکبّر کا لفظ بھی آیا ہے۔ جب یہ لفظ عام انسانوں کے لئے بولا جائے گا۔ تو اس کے معنی سرکشانِ زور مست ہوگا۔ یعنی نشہ قوت و اقتدار سے بدمست ہو کر دُوسرے انسانوں کو اپنے سے کمتر سمجھیں۔ اُن پر حکومت اپنا موروثی حق قرار دیں۔ لیکن یہی صفت جب اللہ کی طرف منسوب ہو تو مفہوم عظمت و بلندی۔ جبروت و کبریائی ہوگا۔ یہ لفظ بھی جبّار کے ساتھ قرآن میں ایک ہی مرتبہ آیا ہے

سُورۂ نساء میں ہے :۔

اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيْرًا ۝ (۴/۳۴)

یقیناً اللہ عالی مرتبت۔ بلند و بالا اور بہت بڑا ہے۔

سورۂ جاثیہ میں ہے:۔

وَلَهُ الْكِبْرِيَاءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ۖ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۔ (۴۵/۳۷)

"زمین اور آسمان میں کبریائی اسی کے لئے ہے اور وہ غالب حکمت والا ہے۔"

یہی کبریائی جب اس جماعت کے حصہ میں آئے گی۔ جو زمین پر نظامِ خداوندی متشکل کرنے کے لئے صفاتِ خداوندی کو اپنے اندر منعکس کرے گی تو یہ تکبّر (بڑا ہونا) اسے زیب دے گا۔ جس تکبّر کو قرآن نے معیوب قرار دیا ہے۔ وہ تکبّر ہے۔ جو بغیر الحق ہو۔ سورۂ اعراف (۷/۱۴۶) سورۂ حٰمٓ میں ہے:۔

فَأَمَّا عَادٌ فَاسْتَكْبَرُوا فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۔ (۴۱/۱۵)

لہٰذا جو تکبّر (بڑائی) حق کے ساتھ ہو۔ وہ معیوب نہیں۔ یہ تو اس کی بنیادی خصوصیّت ہے۔ جس میں صفاتِ خداوندی کی جھلک ہو۔ یہ بڑائی نوعِ انسان کی نفع بخشیوں کے سلسلہ میں تعمیری نتائج پیدا کرنے سے حاصل ہوگی۔ اور یہی ان افراد کا شیوہ ہے۔ جن کی ذات کی نمود ہو چکی ہو۔

اقبالؒ کے الفاظ ہیں:۔

ذاتِ او توجیہ ذاتِ عالم است
از جلالِ او نجاتِ عالم است

دانائے مقاماتِ خودی حکیم الامّت دوسری جگہ فرماتے ہیں:۔

ظاہر او سوز ناک و آتشین
باطنِ او نورِ ربّ العالمین

# اَلْمُنْتَقِمُ۔ ذُوانْتِقَامٍ

صفاتِ باری تعالےٰ کے متعلق جس طرح اور بہت سے مروّجہ معانی کے اعتبار سے مفہوم وہ نہیں رہتا جو درحقیقت ہے ان میں ایک لفظ انتقام بھی ہے۔ اللہ کی ایک صفت ذوانتقام ہے۔ اس کا ترجمہ بالعموم کیا جاتا ہے۔

انتقام لینے والا۔ مروّجہ معانی کی وجہ سے ذہن فوراً غیظ و غضب کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ ہمارے ہاں انتقام میں غصّہ کا شائبہ ضرور پایا جاتا ہے۔
اللہ غیظ و غضب کے ان جذبات سے بلند و بالا ہے۔ جو انسانوں میں پائے جاتے ہیں۔ نقمۃ کے معنی وسطِ طریق کے ہیں۔ یعنی راستہ کا درمیانی حصّہ لہٰذا انتقام کے معنی یہ ہونگے کہ جو جانور راستے سے اِدھر اُدھر ہٹ جائیں انہیں گھیر کر پھر راستے کے بیچ میں لے آئیں تاکہ وُہ سیدھی راہ پر چلیں۔
ظاہر ہے اس سے مُراد بھی قانونِ مکافاتِ عمل کی رُو سے غلط اعمال کی پاداشں ہے۔ لہٰذا جب یہ کہا جائے گا۔ کہ اللہ ذوانتقام ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وُہ قانونِ مکافاتِ عمل کے مطابق مُجرموں کو ان کے اعمالِ بد کی سزا دیتا ہے۔
سرکشانِ عہد رسالت مآب اور منکرانِ حضور ختم المرتبیؐ کے متعلق فرمایا:۔

فَاِنَّا مِنْهُمْ مُّنْتَقِمُوْنَ ۙ (۴۳/۴۱)

ہم یقیناً ان کے اعمال کی سزا دیں گے۔

جب اللہ کا قانونِ مکافات پکڑتا ہے۔ تو پھر اس کی گرفت سے کوئی نہیں چھوٹ سکتا۔ یہ ہے اللہ کا انتقام۔

يَوْمَ نَبْطِشُ الْبَطْشَةَ الْكُبْرٰى ۚ اِنَّا مُنْتَقِمُوْنَ ۝ (۴۴/۱۶)

جس دن ہم انہیں ایک سخت گرفت سے پکڑیں گے۔ یقیناً ہم انہیں (ان کے) اعمال بد کی سزا دینے والے ہیں۔
وُہ مجرمین کو آگاہ کر دیتا ہے۔ کہ

حذر اَے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں!

ان میں سے جو اس تنبیہ پر کان نہیں دھرتے۔ اعمالِ حیات میں تبدیلی پیدا نہیں کرتے۔ اپنی ضد اور سرکشی پر اڑے رہتے ہیں۔ ان کی شامتِ اعمال اُن کے سامنے آجاتی ہے۔ عذابِ الٰہی کی اس گرفت سے انہیں پھر کوئی نہیں چھڑا سکتا۔ لیکن جو سرکشی سے تائب ہو کر اپنی زندگیاں قانونِ خداوندی کے سانچوں میں ڈھالتے ہیں۔ تو معاف کرتی ہے فطرت بھی ان کی تقصیریں۔

سُورۃ الزمر میں :-

اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ ؕ وَیُخَوِّفُوْنَکَ بِالَّذِیْنَ
مِنْ دُوْنِہٖ ؕ وَمَنْ یُّضْلِلِ اللّٰہُ فَمَا لَہٗ مِنْ ہَادٍ ۚ
وَمَنْ یَّہْدِ اللّٰہُ فَمَا لَہٗ مِنْ مُّضِلٍّ ؕ اَلَیْسَ اللّٰہُ
بِعَزِیْزٍ ذِی انْتِقَامٍ ۝ (۳۹/۳۶-۳۷)

کیا اللہ اپنے بندے کے لئے کافی نہیں ہے؟ یہ (کفار) چاہتے ہیں کہ تمہیں اللہ کے سوا اور چیزوں سے ڈرائیں۔ جسے اللہ (کا قانونِ مشیت) گمراہ کر دے اس کو کوئی راہِ ہدایت نہیں دکھا سکتا۔ اور جسے اس (کا قانون) ہدایت پر لے آئے۔ اُسے کوئی گمراہ نہیں کر سکتا۔ کیا اللہ سب پر غالب (مکافاتِ عمل کے مطابق) سزا دینے والا نہیں؟

نیکی و بدی اعمالِ انسانی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ خُدا ذوانتقام ان معنوں میں ہے۔ کہ وہ قانونِ مکافاتِ عمل کے مطابق اعمال سیئہ کی سزا دینے والا ہے۔ جو جماعت نظامِ معاشرہ قوانین الٰہیہ کے مطابق متشکل کرے گی۔ ذوانتقام کے اسی مفہوم کا عکس افرادِ جماعت کے کیریکٹر میں ہو گا۔ ان کے انتقام کی بُنیاد ذاتی عناد و رنجش نہیں ہو گی۔ ان کی محبّت اور عداوت اللہ کے لئے ہو گی۔ درحقیقت ان کی عداوت میں بھی اصلاح کا پہلو نمایاں ہو گا۔

زہر آلود انگلی کو کاٹ کر پھینک دینا بظاہر سفاکی ہے۔ جس کی نگاہِ جسم کے مفادِ کلی پر ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اس قطع و برید میں بھی شفقت کا جذبہ اور نشوونما ارتقاء کی تمنا کارفرما ہے۔

اِن بندگانِ خُدا کا انتقام نظامِ انسانیت کی بہتری و اصلاح اور خوشحالی و ہمواری کے لئے ہو گا۔ اس میں ذاتی انتقام کا شائبہ تک نہ ہو گا۔

## عَلِیْمٌ وَخَبِیْرٌ وَبَصِیْرٌ وَسَمِیْعٌ

کائنات کا یہ محیر العقول کارخانہ وہ ہستی چلا سکتی ہے۔ جسے نبضِ کائنات کی ہر حرکت معلوم ہو۔ نظامِ کائنات کا ربط و ضبط اور نظم و نسق

اسی قوت سے سرانجام پا سکتا ہے۔ جیسے قطرے سے لے کر سمندر اور ذرّے سے لے کر آفتاب تک ہر شئے کا پورا پورا علم ہو۔ پھر ایسا علم جس میں ظن و تخمین اور قیاس و گمان کا شائبہ تک نہ ہو۔ اس میں تزلزل اور بے یقینی کا کوئی دخل نہ ہو۔ اس یقین آباد میں وہم و گمان کی کوئی وادی نہ ہو۔ جس طرح خدا کی ذات عیوب و نقائص سے پاک۔ مکمل ترین ذات ہے۔ اسی طرح اس کا علم بھی یقینی اور مکمل ترین ہے۔ قرآن نے علم خداوندی کی ہمہ گیری کو اس جامعیت کے ساتھ مختصر الفاظ میں بیان کر دیا ہے۔ کہ نگہ بصیرت جوں جوں اس پر غور کرتی ہے۔ وجد میں آجاتی ہے یعنی

(وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ○ (۳/۲۹)

وہ ہر شئے کا پورا پورا علم رکھتا ہے۔

عَلِيمٌ میں دوام (ہمیشگی) پایا جاتا ہے۔ یہ نہیں کہ کسی وقت علم ہو اور کسی وقت نہ ہو۔ ہر شئے کا ہر وقت علم۔ اس حقیقت کو قرآنِ کریم نے مختلف مقامات پر مختلف مضامین میں دہرایا ہے۔ ملاحظہ ہو (۲/۲۳۱ و ۳/۲۸۳ و ۴۱/۸۱)

سورۂ حدید میں ہے:۔

هُوَ الْأَوَّلُ وَالْآخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ○ (۵۷/۳)

"وہی سب سے پہلے ہے۔ وہی سب سے آخر۔ وہی ظاہر ہے اور وہی مخفی۔ اور وہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۔

دوسرے مقام پر:۔

اَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَيْءٍ عِلْمًا ○ (۶۵/۱۱)

اللہ ہر شئے کو اپنے احاطۂ علم میں لئے ہوئے ہے۔

دوسری جگہ:۔

وَ اَحْصٰى كُلَّ شَيْءٍ عَدَدًا ○ (۷۲/۲۸)

اور وہ ہر شئے کے اعداد و شمار کو (محفوظ) رکھے ہوئے ہے۔

يَعْلَمُ السِّرَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط (۲۵/۵)

"وہ آسمانوں اور زمین کے تمام رازوں سے واقف ہے۔"

سورۂ نمل میں ہے:۔

وَمَا مِنْ غَآئِبَةٍ فِي السَّمَآءِ وَالْأَرْضِ إِلَّا فِي كِتَابٍ مُّبِينٍ ○ (۲۷/۷۵)

"زمین اور آسمان میں کوئی ایسی پوشیدہ چیز نہیں جو کتاب مبین (علم الٰہی) میں نہ ہو۔"

ایک مقام پر:۔

إِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ط وَاللَّهُ بَصِيرٌۢ بِمَا تَعْمَلُونَ ○ (۴۹/۱۸)

بے شک اللہ زمین و آسمان کی مخفی چیزوں کا علم رکھتا ہے اور تمہارے سب اعمال کو بھی جانتا ہے۔

کارخانۂ کائنات کا ہر ذرہ اپنے فرائض مفوضہ کی سرانجام دہی میں سرگرداں ہے اُسے سب کا علم ہے۔

يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي الْأَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيهَا ط وَهُوَ الرَّحِيمُ الْغَفُورُ ○ (۳۴/۲)

جو کچھ زمین کے اندر داخل ہوتا ہے اور جو کچھ اس سے باہر نکلتا ہے اور جو چیز آسمان سے نازل ہوتی ہے اور جو چیز اس کی طرف چڑھتی ہے اللہ سب کا علم رکھتا ہے۔ اور وہ غفور و رحیم ہے۔

سورۂ انعام میں ہے:۔

وَعِنْدَهُ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَا إِلَّا هُوَ ط وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ط وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ إِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِي ظُلُمٰتِ الْأَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ إِلَّا فِي كِتٰبٍ مُّبِينٍ ○ (۶/۵۹)

"اسی کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں۔ اسے اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ جو کچھ بیابانوں میں ہے اور سمندروں میں ہے وہ سب کا علم رکھتا ہے۔ (درختوں سے) کوئی پتا نہیں گرتا اور زمین کی تاریکیوں میں کوئی دانہ نہیں

(ڈالا جاتا) جس کا اسے علم نہ ہو اور خشک و تر میں کوئی چیز ایسی نہیں کہ جو علمِ الٰہی کے واضح نوشتہ (کتاب مبین) میں مندرج نہیں۔"

دوسری جگہ:۔

یَعْلَمُ مَا یَلِجُ فِی الْاَرْضِ وَمَا یَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا یَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا یَعْرُجُ فِیْهَا ط وَهُوَ مَعَكُمْ اَیْنَ مَا كُنْتُمْ ط وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ہ (۵۷/۴)

"وہ جانتا ہے جو کچھ زمین میں داخل ہوتا ہے اور جو کچھ اس سے نکلتا ہے۔ اور جو کچھ آسمانوں سے نازل ہوتا ہے۔ اور جو کچھ اس کی سمت میں چڑھتا ہے۔ تم جہاں کہیں بھی ہو۔ وہ تمہارے ساتھ ہوتا ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہوتا ہے۔"

سُورۂ انعام میں ہے:۔

یَعْلَمُ سِرَّكُمْ وَجَهْرَكُمْ وَیَعْلَمُ مَا تَكْسِبُوْنَ ہ (۶/۳)

"وہ تمہاری چھپی اور کھلی ہر قسم کی باتوں کا علم رکھتا ہے اور جو کچھ تم (اچھی یا بری) کمائی کرتے ہو وہ بھی اس کے احاطۂ علم سے باہر نہیں۔"

دوسری جگہ:۔

یَعْلَمُ الْجَهْرَ وَمَا یَخْفٰی ہ (۸۷/۷ و ۲۱/۱۸)

وہ کھلی اور پوشیدہ تمام باتوں کا علم رکھتا ہے۔

وَاللّٰهُ یَعْلَمُ اِسْرَارَهُمْ ہ (۴۷/۲۶)

اللہ ان کے رازوں سے واقف ہے۔

سُورۂ احزاب میں ہے:۔

اِنْ تُبْدُوْا شَیْئًا اَوْ تُخْفُوْهُ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمًا ہ (۳۳/۵۴)

"اگر تم کوئی بات کھلے طور پر کردو یا پوشیدہ (اللہ کے نزدیک یکساں ہے کیونکہ) اللہ تو ہر شے کا علم رکھتا ہے۔"

وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ یُحَاسِبْكُمْ

بذَاتِ الصُّدُوْرِ (۲/۲۸۴)

جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے۔ تم اسے ظاہر کرو یا پوشیدہ رکھو (ہر حال میں) اللہ اس سے واقف ہے، وہ تم سے ضرور اس کا حساب لے گا۔"

واضح الفاظ میں بیان کر دیا گیا کہ اللہ نگاہوں کی خیانت اور دل کے بھیدوں سے واقف ہے۔

يَعْلَمُ خَائِنَةَ الْأَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُوْرُ (۴۰/۱۹)

وہ نگاہوں کی خیانت اور دلوں کے بھید سے واقف ہے۔

ایک اور مقام پر:-

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ ۚ وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ ۝ (۵۰/۱۶)

اور یقیناً ہم نے انسان کو پیدا کیا (اس لئے اس کے خالق ہونے کی جہت سے) ہم خوب جانتے ہیں کہ اس کے دل میں کیا وساوس پیدا ہوتے ہیں۔ اور ہم تو اس کی شہ رگ (رگِ جان) سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں۔"

اپنے محدود علم کی بنا پر انسان نے زمان کو ماضی و حال و مستقبل کے حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ چونکہ خدا کا علم لامحدود ہے۔ اس کے لامتناہی علم کے لئے ماضی و حال و مستقبل کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے سامنے اقبال کے الفاظ میں،

ہر وقت ایک ابدی حال (ETERNAL NOW) ہے۔ لہٰذا

يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ج (۲/۲۵۵، ۲۱/۲۸، ۲۱/۲۸، ۲۲/۷۶)

جو کچھ انسان کے سامنے ہے وہ اسے بھی جانتا ہے۔ اور جو کچھ پیچھے ہے۔ وہ بھی اس کے علم سے باہر نہیں۔

زماں کی طرح مکاں (SPACE) کی بھی یہی کیفیت ہے۔ کہ کچھ چیزیں انسان کے سامنے مشہود ہوتی ہیں اور کچھ نامشہود (UN-SEEN) لیکن خدا کے نزدیک مشہود و نامشہود (حاضر و غائب) کی کوئی تمیز نہیں ہو سکتی۔ ہر شے ہر وقت اس کے سامنے ہے۔ قرآن میں اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان

کیا گیا ہے۔

عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ط $\frac{٦}{٧٤}$ و $\frac{٦}{٩٢}$ ز $\frac{٩}{١٨}$ ز $\frac{٢٣}{٩٢}$
ز $\frac{٢٢}{٩}$ ز $\frac{٥٩}{٢٢}$ ز $\frac{٦٢}{٨}$

**عَلَّامُ الْغُيُوْبِ** | اسی کو عَلَّامُ الْغُيُوْبِ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ حضرت عیسیٰؑ نے کہا:۔
تَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِيْ وَلَآ اَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِكَ ط
اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ۝ ($\frac{٥}{١١٦}$)

"اے اللہ! تو میرے دل کی بات جانتا ہے۔ لیکن میں تو تیرے ضمیر کے علم سے واقف نہیں ہوں۔ بے شک تو ہی غیب کی باتوں سے واقف ہے"۔

سُوْرَۃٔ توبہ میں ہے:۔

اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ سِرَّهُمْ وَنَجْوٰىهُمْ
وَاَنَّ اللّٰهَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ۝ج ($\frac{٩}{٧٨}$)

"کیا یہ لوگ اس حقیقت سے واقف نہیں۔ کہ اللہ تعالیٰ ان کی رازداریوں اور سرگوشیوں سے باخبر ہے۔ اور یہ کہ اللہ ہر غیب کی بات خوب جانتا ہے"۔

سُوْرَۃٔ حجرات میں ہے:۔

اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط وَاللّٰهُ
بَصِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝ع ($\frac{٤٩}{١٨}$)

"بے شک اللہ زمین و آسمان کے غیب کو جانتا ہے۔ اور وہ تمہارے اعمال سے بھی باخبر ہے"۔

نبی اکرمؐ سے کہا گیا ہے کہ:۔

فَقُلْ اِنَّمَا الْغَيْبُ لِلّٰهِ ($\frac{١٠}{٢٠}$)

(ان سے) کہہ دو کہ غیب کا علم صرف اللہ کے لئے ہے۔

دُوسری جگہ:۔

قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ
اِلَّا اللّٰهُ ط ($\frac{٢٧}{٦٥}$)

"کہئے کہ زمین و آسمان میں اللہ کے سوا کوئی نہیں جو غیب جانتا ہو۔۔۔۔"

اسے علم ہے کہ مفسد کون ہے اور مصلح کون۔

وَاللّٰہُ یَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ ط (۲/۲۲۰)

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے علمِ الٰہی پر ایمان ہمارے اعمال پر بڑا گہرا اثر ڈالتا ہے۔ اللہ انسان کی ان حرکات و سکنات سے بھی پوری طرح واقف ہے۔ جن کے متعلق اسے یقین ہو کہ میرے سوا ان سے کوئی اور واقف نہیں۔ اس لئے کہ وہ علیم ہے۔ وہ ہمارے ان اعمال سے بھی واقف ہے۔ جن کی ہم کسی دوسرے کو خبر نہ کریں۔ اس لئے کہ وہ خبیر ہے۔ وہ ہمیں اس وقت بھی دیکھتا ہے جب کہ ہم سمجھ رہے ہوتے ہیں کہ اس وقت ہمیں کوئی نہیں دیکھتا۔ اس لئے کہ وہ بصیر ہے۔ وہ ہماری خفیہ سرگوشیوں کو بھی سنتا ہے جن کے متعلق ہم مطمئن ہوتے ہیں۔ کہ کوئی نہیں سنتا اس لئے کہ وہ سمیع ہے۔ قرآنِ عزیز میں اِنَّ اللّٰہَ سَمِیْعٌ بَصِیْرٌ (۵۸/۱ ر ۲۲/۶۱) اس کا کم از کم بیالیس مرتبہ اعادہ ہوا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے علم کی وسعت کا جب یہ عالم ہو تو کونسی چیز۔ کونسی بات چھپائی جا سکتی ہے۔

## مکافاتِ عمل

جہاں تک انسان کا تعلق ہے اللہ کے علیم و خبیر و سمیع و بصیر ہونے سے مطلب یہ ہے کہ مکافاتِ عمل میں کسی قسم کا سہو یا فرو گذاشت نہیں ہو سکتی۔ ہر اچھے اور برے عمل کا نتیجہ (خواہ وہ کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو) انسان کے سامنے آجائے گا۔

## کوئی عمل بغیر بدلے کے نہیں رہ سکتا

فَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ خَیْرًا یَّرَہٗ ۝ وَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ شَرًّا یَّرَہٗ ۝ (۹۹/۸–۷)

جس نے ایک رائی کے دانہ کے برابر عملِ خیر کیا ہوگا۔ وہ بھی اس کے سامنے ہوگا۔ اور جس نے ایسا ہی کوئی برا کام کیا ہوگا اسے بھی وہاں موجود پائے گا

اندازہ فرمائیے۔ کہ جو معاشرہ ان اقدار اور اس معیار کے مطابق نظامِ خداوندی کے قیام کا ضامن ہوگا وہ کس قدر علیم و بصیر اور سمیع و خبیر ہوگا۔ مندرجہ بالا سطور میں خدا (مکمل ترین ذات) کے علم کی حقیقت اور کیفیت سامنے آچکی ہے۔ اس لامتناہی ذات کا علم بھی لامتناہی ہے۔ جو انسان اپنی ذات کی نشوونما صفاتِ خداوندی کے معیار کے مطابق کرے گا۔ اس کا علم بھی اس کی ذات کی نمود کے ساتھ ساتھ بڑھتا جائے گا۔ قرآن نے اربابِ علم و بصیرت اور صاحبانِ فکر و نظر کو اولوالالباب اور اولوالابصار کہا ہے۔ دوسری طرف اس نے یہ بھی وضاحت کی ہے کہ جو علم و دانش سے کام نہیں لیتے وہ اہلِ جہنم ہیں۔ وہ بد ترین مخلوق ہیں اور حیوانی سطح پر زندگی بسر کرتے ہیں۔ (۸/۲۲)

انسان اور حیوان میں بنیادی فرق ہی ذات کا تو ہے۔ سو جن انسانوں کی ذات خوابیدہ اور ناشگفتہ رہ جائے۔ وہ انسانی سطح پر آتے ہی نہیں۔ وہ معاشرہ جو ان اقدار کی روشنی میں متشکل ہوگا۔ جنّتی معاشرہ ہوگا۔ اس مملکت کا سربراہ اس قدر خبیر ہوگا کہ وہ اپنے فرائض میں کوتاہی کرے گا۔ جس طرح دشتِ شام میں رہنے والی بڑھیا نے حضرت عمرؓ کی توجہ ان کے فرائض منصبی کی طرف دلائی تھی کہ:۔

"اگر خلیفہ اپنے مملکت کے ہر فرد کے حالات سے باخبر رہنے کا انتظام نہیں کر سکتا تو اسے دستبردار ہو جانا چاہیئے۔ کوہ و صحرا، دشت و جبل اور شہر و قصبہ اور ہر وادی کی بڑھیا پوری جرأت و اعتماد سے اس کی توجہ اس کی ذمہ داریوں کی طرف مبذول کرا سکے گی۔

اس معاشرہ کا سربراہِ مملکت وہ شخص ہوگا جس کی ذات کی نمود باقی تمام افرادِ معاشرہ سے زیادہ ہو چکی ہو۔ یہ افرادِ معاشرہ خدا کے رنگ میں رنگے ہوئے ہوں گے یعنی (علیٰ حدِ بشریت) علیم و خبیر۔ سمیع و بصیر۔ یہ جماعتِ مومنین ان افراد پر مشتمل ہوگی جو

لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ۚ الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰي جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ

(د: لَاتُ ضِ ج: ۳ ـ ۹ ـ ۱۸۹)

وُہ صاحبانِ عقل و بینش جو کھڑے ۔ بیٹھے ۔ لیٹے ہر وقت قانونِ خداوندی کو اپنے سامنے رکھتے ہیں۔ اور کائنات کی تخلیق میں غور و فکر کرتے رہتے ہیں۔ ان صفات کی حامل اُمّت اور ان اوصاف سے متصف مِلّت کے متعلق اقبالؒ فرماتے ہیں:۔

چشمِ او بر زشت و خُوبِ کائنات
در نگاہِ او غیوبِ کائنات
دستِ او با آب و خاک اندر ستیز
آں بہم پیوستہ و ایں ریزہ ریز

# قَدِیْرٌ

قَدَرَ کے معنی اندازہ کرنے کے ہیں۔ اسی سے لفظ تقدیر ہے۔ اندازہ اور پیمانہ کو اصطلاحِ عام میں قاعدہ اور قانون کہا جاتا ہے۔ نگاہِ مومن میں کائنات کا نظم و نسق ان قوانین (ان پیمانوں اور اندازوں) کے مطابق سر انجام پا رہا ہے جو قادرِ مطلق (اللہ تعالیٰ) نے مقرر کر دیئے ہیں۔

قانون کسی محسوس قوت کا نام نہیں ہوتا۔ یہ ایک اُصول یا فارمولا ہوتا ہے۔ جس کے مطابق ایک اسکیم عمل پیرا اور نتیجہ خیز ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کسی قانون کو نتیجہ خیز بنانے کے لئے قوت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر قانون کے پیچھے قوتِ نافذہ نہ ہو تو وُہ قانون کچھ معنی نہیں رکھتا۔ نظامِ کائنات جس حسن و خُوبی سے چل رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان قوانین کے پیچھے قوتِ خداوندی کام کر رہی ہے۔ کشتِ گُل و لالہ زار۔ یہ خزاں اور بہار۔ اور نغمۂ جوئبار سب قانونِ خداوندی کے کرشمے ہیں۔

یہ قوت جو کارخانۂ کائنات کو بہ ایں نظم و نسق چلا رہی ہے مکمل اور عظیم ہے۔ اس قوتِ خُداوندی کو کہیں قوت اور کہیں قدرت سے تعبیر کیا ہے۔ لفظ قُدرت اس حقیقت پر دلالت کرتا ہے کہ (معاذ اللہ) قوتِ خُداوندی کسی مستبد ڈکٹیٹر کی قوت نہیں جو اندھا دُھند کام کرتی ہے۔ بلکہ ایک حکیمِ مطلق کی قوت ہے جو اس کے قوانین کے نتیجہ خیز ہونے میں صرف ہوتی ہے۔

سورۂ الذّٰرِیٰت میں ہے :۔
اِنَّ اللّٰہَ ھُوَ الرَّزَّاقُ ذُوالْقُوَّۃِ الْمَتِیْنُ ۝ (۵۱/۵۸)
یقیناً اللہ سب کو رزق پہنچانے والا قوت والا استوار ہے۔
دوسرے مقامات پر قَادِرٌ کا لفظ آیا ہے۔ مثلاً :۔
اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّ اللّٰہَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ قَادِرٌ عَلٰۤی اَنْ یَّخْلُقَ مِثْلَھُمْ ...... (۱۷/۹۹)
کیا ان لوگوں نے (جو حیات اُخروی کے منکر ہیں ۱۷/۹۸) اس بات پر غور نہیں کیا کہ جس اللہ نے زمین اور آسمانوں کو پیدا کر دیا ضرور اس پر قادر ہے کہ ان کی مثل اور بھی پیدا کر دے (انسانوں کی مثل یا ارض و سمٰوٰت کی مثل یا موجودہ زندگی کی مثل دوسری زندگی)
سورۂ یٰسین میں ہے :۔
اَوَلَیْسَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِقٰدِرٍ عَلٰۤی اَنْ یَّخْلُقَ مِثْلَھُمْ ؕ بَلٰی ٭ وَھُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِیْمُ ۝ (۳۶/۸۱)
کیا وہ اللہ جس نے زمین و آسمان پیدا کئے اس پر قادر نہیں ہے کہ ان کی مثل (دوبارہ پیدا کر دے۔ ضرور وہ قادر ہے اور وہ تخلیق کی بڑی قوتوں کا مالک اور ہر شئے کا) جاننے والا ہے۔
اس لئے کہ وہ زمین و آسمان کی تخلیق کے بعد تھک نہیں گیا کہ ان چیزوں کو دوبارہ پیدا نہیں کر سکتا۔ یا مرنے کے بعد انسانوں کو دوبارہ زندہ نہیں کر سکتا۔ جو قادر مطلق سلسلۂ کائنات کو عدم سے وجود میں لایا ہے اس کے لئے اس کی نشاۃِ ثانیہ کیا مشکل ہے :۔
قُلْ سِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا کَیْفَ بَدَاَ الْخَلْقَ ثُمَّ اللّٰہُ یُنْشِئُ النَّشْاَۃَ الْاٰخِرَۃَ ؕ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝ (۲۹/۲۰)
کہئے کہ زمین میں چلو پھرو اور دیکھو کہ اللہ نے مخلوق کو کس طور پر اوّل بار پیدا کیا پھر اللہ ان کو دوسری بار بھی پیدا کر دے گا۔ یقیناً وہ ہر شئے پر قادر ہے :

سورہ قیامۃ میں ہے کہ جس اللہ نے انسان کو حقیر سی شے سے پیدا کر دیا۔

اَلَیْسَ ذٰلِکَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓی اَنْ یُّحْیِیَ الْمَوْتٰی ۝ (۷۵/۴۰)

کیا وہ اس بات پر قدرت نہیں رکھتا۔ کہ مُردوں کو زندہ کر دے۔

**سرچشمۂ حیات پر قبضہ** ایک پانی کو لے لیجئے جس پر حیات کا اس قدر دارو مدار ہے۔ اگر وہ پانی کی ہیئت و خاصیت کو تبدیل کر دے یا اس کا موجودہ نظام بدل دے۔ تو دیکھئے زندگی پر ہر جگہ کس طرح موت طاری ہو جاتی ہے۔

**تبدیلِ اقوام پر اختیار** جس طرح خدا کا قانونِ حیات مظاہرِ فطرت میں جاری و ساری ہے۔ اقوام و ملل پر بھی اسی قسم کے قوانین کارفرما ہیں۔ قوموں کا عروج و زوال۔ ان کی حیات و ممات ان کا استخلاف و استبدال انہی قوانین کے مطابق عمل میں آتا ہے۔

...... اِنَّا لَقٰدِرُوْنَ ۝ عَلٰٓی اَنْ نُّبَدِّلَ خَیْرًا مِّنْهُمْ ۙ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِیْنَ ۝ (۷۰/۴۰-۴۱)

ہم اس پر قادر ہیں۔ کہ اُن کی جگہ ان سے بہتر لوگوں کو لے آئیں اور ہم ایسا کرنے سے عاجز نہیں۔

قوموں کی موت و حیات اور مقدراتِ اقوامِ عالم کے ستارے اسی کی رُو سے بنتے بگڑتے ہیں۔ اسی کا قانونِ مکافاتِ عمل اُن کے اعمالِ حیات کے نتائج مرتب کرتا ہے۔ اس کا قانون جب ان کے اعمالِ حیات کے نتائج و عواقب مسلط کرتا ہے۔ تو پھر کوئی قوت ایسی نہیں جو ان کو اس کے اثرات سے بچا سکے۔ کیوں کہ اللہ کی گرفت ایک صاحبِ قدرت و سطوت کی گرفت ہوتی ہے۔ کمزور و ناتواں کی گرفت نہیں ہوتی۔

اللہ کی مکمل ذات کو ایک عظیم اور مکمل قوت حاصل ہے۔ لہٰذا جس قدر انسانی ذات ان مستقل اقدار کی رُو سے اپنی نشو و نما کرتی چلی جائے گی۔ اسی قدر اس کی قوتوں میں بھی اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔ جیسا کہ آپ دیکھ چکے ہیں۔ کہ ذات کی نمود قوت سے ہوتی ہے۔ لیکن یہ قوتیں طوفانِ یم یا آندھی کا جھکڑ نہیں ہوتیں۔ جو اندھا دھند

تخریب کرتی چلی جائیں۔

یہ قوتیں قانون اور قاعدے کے ساحلوں کے اندر محصور رہتی اور تعمیر انسانیت کے لئے صرف ہوتی ہیں۔ مجرمین کو ان کے جرائم کی سزا دینا بھی تعمیر انسانیت ہی کا ایک گوشہ ہے۔ اس لئے کہ اگر دنیا میں تخریبی قوتوں کی روک تھام نہ کی جائے۔ تو تعمیر ناممکن ہو جائے۔

قرآن ایسے معاشرہ کی تشکیل چاہتا ہے۔ جس میں تمام افرادِ معاشرہ کی ذات کی نشوونما ہو رہی ہو۔ اور ان کی تمام قوتیں نوعِ انسانی کی فلاح و بہبود کے لئے صرف ہوں۔ انہی کو وہ خَيْرُ اُمَّةٍ کہہ کر پکارتا ہے۔ اسی امت کے نہ ہونے سے آج دنیا میں نارِ حرص و ہوا کی آتش ریزیاں اور ظلم و استبداد کے دہکتے انگاروں کی امن سوزیاں ہیں۔

# تقدیر

ہم شروع میں دیکھ چکے ہیں۔ کہ ذات کی بنیادی خصوصیت اختیار و ارادہ ہے۔ جس قدر کوئی ذات تکمیل یافتہ ہوگی۔ اُسی قدر اس کے اختیار و ارادہ کی وسعتیں زیادہ ہوں گی۔ اللہ تعالیٰ کی ذات مکمّل ترین ہے۔ اس لئے اس کے اختیار و ارادہ کی وسعتیں بھی حدود فراموش اور قیود ناآشنا ہیں۔ وہ جو جی میں آئے کرسکتا ہے۔ اس کے اختیار و ارادہ اور حکم پر کوئی کسی قسم کی پابندی عائد نہیں کرسکتا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہم نے دیکھا ہے کہ انسان کو بھی ذات (PERSONALITY) عطا کی گئی ہے۔ اور چونکہ ذات کی بنیادی خصوصیت اختیار و ارادہ ہے۔ اس لئے (چھوٹے پیمانے پر ہی سہی) انسان بھی صاحبِ اختیار و ارادہ ہے اور جُوں جُوں اس کی ذات کی نشوونما ہوتی جائے گی۔ اس کے اختیار و ارادہ کی وسعتیں بھی بڑھتی جائیں گی۔

اس سے ایک اُلجھن پیدا ہوتی ہے۔ پُوری کائنات میں کامل اختیار و ارادہ خدا کا کارفرما ہے۔ لیکن اس کائنات میں خدا کے علاوہ ایک اور ہستی بھی ہے۔ (یعنی انسان) جو اپنے دائرہ میں صاحبِ اختیار و ارادہ ہے۔ یہ دونوں صُورتیں

ایک دوسرے سے متضاد ہیں۔ اگر خدا مطلق اختیار و ارادہ کا مالک ہے۔ تو انسان صاحبِ اختیار و ارادہ نہیں ہو سکتا (اگر خدا کے حکم کے بغیر ایک پتّہ بھی نہیں ہل سکتا۔ تو انسان اپنے اختیار و ارادہ سے کوئی کام کس طرح کر سکتا ہے؟) اور اگر انسان اپنے اختیار و ارادہ سے کوئی کام نہیں کر سکتا۔ تو اسے صاحبِ ذات، کس طرح قرار دیا جا سکتا ہے۔ (اور اپنے اعمال کا ذمہ دار کس طرح ٹھہرایا جا سکتا ہے؟)

یہ ہے وہ اُلجھن جس نے ذہنِ انسانی کو اُس وقت سے طلسمِ پیچ و تاب بنائے رکھا ہے۔ جس وقت سے اس نے ان اُمور کے متعلق غور و فکر کرنا شروع کیا ہے۔ اور اس قدر پیہم اور مسلسل غور و فکر کے باوجود، اس کی یہ اُلجھن آج تک دُور نہیں ہو سکی۔ مذہب کی دُنیا میں یہ اُلجھن بہت زیادہ دُور رس نتائج کی حامل بن جاتی ہے اس لئے کہ فلسفہ کی دُنیا میں یہ اُمور محض فکری مسائل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جن کا تعلق ذہنِ انسانی سے ہوتا ہے۔ لیکن مذہب کی دُنیا میں یہ سوالات عقاید کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں جن سے انسان کی نجات اور بخشش کا سوال وابستہ سمجھا جاتا ہے۔ خود مسلمانوں میں پہلی بحث جس نے ان میں دو فرقے پیدا کر دئیے۔ جبر اور

### جبر و قدر کی بحث

قدر کے عقیدہ[1] کی بحث تھی۔ یہ فرقے اگرچہ اپنی (ابتدائی) امتیازی شکل میں اب موجود نہیں۔ لیکن خیالات کے اعتبار سے یہ فرق بدستور جاری ہے۔ ہمارے ہاں عام عقیدہ یہی ہے کہ جو کچھ ہوتا ہے۔ خدا کی طرف سے ہوتا ہے۔ انسان مجبور ہے۔ قسمت کے لکھے کو کوئی مٹا نہیں سکتا۔ تقدیر اٹل ہے۔ غریبی، امیری، صحت، بیماری، زندگی، موت سب خدا

[1] اس قسم کے دیگر نظری مسائل کی طرح یہ بحث بھی ایرانیوں کے ہاں سے آئی تھی۔ فرقہ قدریہ کا بانی معبد بن خالد جہنی ہے۔ مقریزی نے لکھا ہے کہ معبد نے اساورہ کے ایک آدمی (ابو یونس) سے اس مسئلہ کو سیکھا تھا۔ اساورہ شہنشاہِ ایران کے شاہی لشکر کا نام تھا۔ ایران کی شکست کے بعد یہ لوگ (حضرت سعد فاتحِ ایران کی اجازت سے) مسلمانوں کے مختلف شہروں بصرہ، کوفہ وغیرہ میں پھیل گئے۔ اور انہوں نے اپنے عقائد کو مسلمانوں میں عام کرنا شروع کر دیا۔

کی طرف سے مقدر ہے۔ اس میں نہ کوئی دخل دے سکتا ہے۔ نہ کسی قسم کی تبدیلی کر سکتا ہے۔ غرضیکہ یہ عقیدہ ایران سے ہمارے ہاں بھی چلا آیا۔ اور آج کا مسلمان

تن بہ تقدیر ہے آج ان کے عمل کا انداز
تھی نہاں جن کے ارادوں میں خدا کی تقدیر (اقبالؒ)

دُوسری طرف وہ طبقہ ہے۔ جو یہ کہتا ہے کہ انسان جو کچھ کرتا ہے۔ اپنے اختیار و ارادہ سے کرتا ہے۔ اسی لئے یہ اپنے اعمال کے نتائج کا ذمہ دار قرار پاتا ہے۔ اگر اسے مجبور تصوّر کر لیا جائے تو دُنیا و آخرت دونوں کا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔ دُنیا کا اس طرح کہ، آپ کسی مجرم کو (اس تصوّر کے ماتحت) سزا نہیں دے سکتے۔ جب آپ کو تسلیم ہے۔ کہ اُس نے وُہ کام اپنے اختیار و ارادہ سے نہیں کیا بلکہ وہ ایسا کرنے پر مجبور تھا۔ تو اسے اس کی سزا کیسے دی جا سکتی ہے؟ اور آخرت کا اس طرح کہ جب ہدایت اور ضلالت کی روش کا اختیار کرنا۔ یا نیک اور بد کام کرنا انسان کے بس کی بات نہیں۔ کوئی اور قوت ہے۔ جو اس سے یہ سب کچھ کراتی ہے۔ تو پھر اُس سے عقائد اور اعمال کا مواخذہ کیسا؟ نہیں! بلکہ اس سے بھی آگے یہ کہ پھر اللہ کی طرف سے وحی کا نازل کرنا۔ رسُولوں کا بھیجنا۔ اُن کا اس طرح تبلیغ کرنا۔ سب بے معنی ہو جاتا ہے۔ نیز دُنیاوی مقاصد ہوں یا اُخروی زندگی کے مطامح، اُن کے حصول کے لئے سعی و عمل اور جدّ و جہد تصوّر ہی ختم ہو جاتا ہے۔ جو کچھ ہوتا ہے اگر اسے بہر حال و بہر حیثیت ہو کر رہنا ہے۔ تو پھر کامیابی و کامرانی کے لئے تگ و تاز کے کیا معنی۔ اور مصائب و نوائب سے بچنے کے لئے سامانِ حفاظت، اور تدابیر مدافعت سے کیا مطلب؟ آپ نے غور کیا کہ وہی اُلجھن جو شروع میں دو الگ الگ فرقوں کی شکل میں نمودار ہوئی تھی، فکر و عقیدہ کے اس تفاوت کی صُورت میں اب تک موجود ہے۔

**قُرآن سے تائید** اس اُلجھن میں سب سے بڑی دُشواری اس وقت پیش آتی ہے جب دونوں خیالات کے ترجمان اپنے اپنے عقیدہ یا نظریہ کی تائید میں قرآنی آیات پیش کرتے ہیں۔ اسے دیکھ کر ایک غیر جانبدار مبصّر یا حقیقت کا متلاشی اس کش مکش میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ کہ اگر

قرآن سے اس قدر باہمدگر متضاد اور متخالف نظریات کی تائید مل سکتی ہے۔ تو پھر اس کا یہ دعویٰ کس طرح برحق قرار پا سکتا ہے۔ کہ اس کے منجانب اللہ ہونے کی دلیل یہ ہے۔ کہ اس میں کہیں کوئی اختلاف نہیں۔ تضاد نہیں، تبائن نہیں، اس سوال نے اس مسئلہ کو اور بھی زیادہ مشکل اور نازک بنا دیا ہے۔ لیکن یہ دشواری اور کشمکش۔ یہ الجھن اور پریشانی اس لئے پیدا ہوئی ہے۔ کہ قرآن نے اپنے متعدد گوشوں میں باہمی ربط و تطبیق کی جو صورت بنائی ہے۔ اسے پیش نظر نہیں رکھا جاتا۔ اگر قرآن کی مختلف آیات کو اس اصول کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ تو نہ صرف یہ کہ ان میں کسی قسم کا تضاد اور تخالف باقی نہیں رہتا۔ بلکہ جبر اور قدر کی وہ گتھی، جسے نہ اہل فلسفہ سلجھا سکے تھے اور نہ ارباب مذہب کی طرف سے کوئی اطمینان بخش حل پیش کیا جا سکا ہے۔ خود بخود (حل ہی نہیں بلکہ) ناپید ہو جاتی ہے، لیکن اسے ذرا غور سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اس لئے کہ جو تصورات ہمارے لاشعور میں صدیوں سے متوارث چلے آ رہے ہیں۔ انہیں دل کی گہرائیوں سے نکال کر باہر پھینک دینا ہمت طلب مرحلہ ہوتا ہے۔ اور قرآن سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ جب تک قلب و دماغ کو ان تمام تصورات سے پاک اور صاف نہ کر لیا جائے۔

کھو گیا جو مطلب ہفتاد و دو ملت میں ہیں
سمجھے گا نہ تو جب تک بیرنگ نہ ہو ادراک

سب سے پہلے یہ سمجھ لینا ضروری ہے۔ کہ زیر نظر موضوع تین اہم اور بنیادی گوشوں میں بٹ جاتا ہے۔ اور جب تک قرآن کی آیات کو ان کے متعلقہ گوشوں میں نہ رکھا جائے۔ ان کا صحیح مفہوم سمجھ میں نہیں آ سکتا۔

ہمارے زمانہ تک فلسفہ کی تحقیقات اور سائنس کے انکشافات جس مقام تک پہنچے ہیں۔ ان کی رو سے یہ حقیقت سامنے آ گئی ہے۔ کہ کائنات کا یہ

## گوشۂ اوّل مشیت مطلقہ

محیر العقول نظام علت، معلول (CAUSE AND EFFET) کی محکم زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ ہر نتیجہ (EFFECT) کا ایک سبب (CAUSE) ہے اور کوئی نتیجہ

بلا سبب کے پیدا نہیں ہو سکتا۔ لیکن یہ مفکّرین اور سائنسدان علّت و معلول کے اس سلسلہ کو پیچھے کی طرف لے جاتے ہیں۔ تو ایک مقام ایسا آجاتا ہے جہاں یہ ماننا پڑتا ہے کہ اس زنجیر کی پہلی کڑی کسی نہ کسی طرح بلا سبب کے وجود میں آگئی۔ یہ وہ مقام ہے۔ جہاں سے مختلف اشیائے کائنات کی ابتدا ہوتی ہے۔ جہاں سے یہ عدم سے وجود میں کس طرح آسکتی ہے۔

یہ چیز ہمارے ذہن میں اس لئے نہیں آسکتی کہ ہمارا ذہن محدود ہے اور کسی محدود کے لئے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ لامحدود کا تصوّر کر سکے۔ لیکن یہ بات ہمارے ذہن میں آسکے یا نہ آسکے۔ اسے بہرحال ماننا پڑتا ہے کہ اشیائے کائنات کے سلسلہ میں ایک مقام ایسا ضرور آجاتا ہے۔ جہاں سے اس شئے کے وجود کا آغاز ہوا تھا۔ یہ وہ مقام ہے جہاں علّت و معلول کا قانون ختم ہو جاتا ہے۔ یہ وہ گوشہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ کو بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۲/۱۱۷) کہا ہے۔ بَدِیْعٌ کے معنی ہیں (ORIGINATOR) یعنی کائنات کو عدم سے وجود میں لانے والا۔

ضمناً یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ (جیسا کہ خالق کے عنوان میں بتایا جا چکا ہے۔ قرآن نے (CREATION) اور (ORIGINATION) کے لئے الگ الگ الفاظ استعمال کئے ہیں۔ بَدِیْعٌ کے معنی ہیں (ORIGINATOR) اور خَالِقٌ کے معنی ہیں (CREATOR) بداعت کے معنی ہیں۔ کسی چیز کو عدم سے وجود میں لانا اور تخلیق کہتے ہیں۔ مختلف عناصر میں نئی نئی ترتیب اور تراکیب سے نئی نئی چیزیں وضع کرتے جانا۔ بَدِیْعٌ تو خدا کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا لیکن صنعتِ تخلیق میں انسان بھی شامل ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ کو اَحْسَنَ الْخَالِقِیْنَ (۲۳/۱۴) کہا ہے۔ یعنی تخلیق کرنے والوں میں سب سے زیادہ موزوں اور حسین طور پر تخلیق کرنے والا۔ یہ بھی یاد رہے کہ تخلیق (CREATION) اور تولید (PROCROATION) میں بڑا فرق ہے۔ تولید (افزائش نسل) حیوان بھی کرتے ہیں لیکن تخلیق صرف انسان ہی کر سکتا ہے۔ انسانی سطح پر اس شخص یا قوم کو سمجھا جا سکتا ہے۔ جس

میں قوتِ تخلیق اَور اس کی نمود ہو۔

یہ ضمنی گوشہ تھا۔ اصل موضوع کے سلسلہ میں کہا یہ جا رہا تھا کہ تخلیقِ کائنات کے سلسلہ میں ایک مقام وُہ آ جائے گا۔ جہاں خدا نے اسے (ORIGINATE) کیا تھا۔ یہ کیسے ہُوا تھا؟ اسے ہم بالکل نہیں سمجھ سکتے۔ ہم صرف علّت و معلول کے قانون کو سمجھ سکتے ہیں۔ جس مقام پر یہ قانون ختم ہو جاتا ہے۔ وہاں کیا کچھ ہوتا ہے اور کس طرح ہوتا ہے۔ یہ ہمارے حیطۂ ادراک سے باہر کی چیز ہے۔

**عالمِ امر** | یہ وُہ گوشہ ہے جس کے متعلق قرآن نے کہا ہے :۔

اِنَّمَآ اَمْرُہٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَیْئًا اَنْ یَّقُوْلَ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ ۝ (۳۶/۸۲)

اس گوشہ میں خُدا کا امر اس طرح کام کرتا ہے کہ جب وُہ کسی شئے کا ارادہ کرتا ہے تو وُہ کہہ دیتا ہے کہ ہو جا۔ اور بس وُہ ہو جاتی ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ چیز خُدا کے اختیارِ مطلق (منشاء۔ مرضی، ارادہ، اختیار، مشیّت) کے مطابق ہوتی ہے۔ اس میں کسی قاعدے اور قانون کی پابندی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ جب کسی شئے کو عدم سے وجود میں لایا جائے گا۔ تو اس کے، متعلق یہ بھی طے کیا جائے گا۔ کہ اُسے کیسا ہونا چاہیئے۔ اس کی خصوصیات کیا ہوں گی۔ اس کے خواص و اثرات کیا ہوں گے۔ اس کی ماہیّت کیا ہوگی۔ اس کی کیفیّت کیا ہوگی۔ اس کا دائرۂ عمل کیا ہوگا۔ دُوسری چیزوں کے خلاف اس کا ردِّ عمل کیا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ جب اس شئے کا وجود، خُدا کی مشیّت (امر۔ اختیارِ مطلق) کے ماتحت عمل میں آیا ہے تو اس کے متعلق یہ تضمنات بھی اسی مشیّت (امر) کے مطابق طے پائیں گے۔ یہ تضمنات (یعنی اس شئے کے خواص و اثرات) وغیرہ، وُہ بنیادیں ہیں جن پر قوانینِ فطرت (LAWS OF NATURE) کی ساری عمارت استوار ہوتی ہے۔ لہٰذا یہ قوانین بھی خُدا کے امر (مشیّت۔ اختیارِ مطلق) کے مطابق متعیّن ہوں گے۔

شہد کو شیرینی اور نمک کو نمکینی کیوں ملی اَور سنکھیا قاطعِ حیات اور پانی ممدِ زندگی کیوں ہے؟ اس کا جواب ہم نہیں دے سکتے، اس لئے کہ ہم اسے سمجھ

ہی نہیں سکتے۔ لہٰذا نہ صرف اشیائے کائنات کا عدم سے وجود میں آنا ہی خدا کی مشیّت مطلقہ (کامل اختیار و ارادہ) کے مطابق ہوتا ہے بلکہ ان سے متعلق قوانین کی بنیادیں بھی اسی کے مطابق طے پاتی ہیں۔ یہ قوانین صرف طبعی دنیا (PHYSICAL WORLD) تک ہی محدود نہیں انسانی زندگی (حیوانی زندگی نہیں) کے متعلق قوانین بھی

## مستقل اقدار

اُسی گوشے سے متعین ہوتے ہیں۔ جس طرح انگور کے بیج میں یہ خصوصیت رکھ دی گئی ہے۔ کہ اس کی بیل میں نہایت لطیف اور شیریں آویزے لٹک جائیں اور تخمِ حنظل کا ثمر نہایت تلخ ہو اسی طرح یہ قانون بھی وہیں سے متعین ہوا ہے۔ عدل و احسان کا نتیجہ زندگی کی خوشگواریاں ہوں اور حقوقِ انسانیت میں کمی کرنے (ظلم) کا نتیجہ تلخیاں اور تباہیاں۔ جس طرح یہ قانون وہیں سے متعین ہوا ہے۔ کہ جسمِ انسانی کی نشوونما اُس خوراک سے ہو سکتی ہے۔ جسے وُہ شخص خود کھائے (دُوسرے کے مُنہ میں لقمہ ڈالنے سے اپنے جسم کی پرورش نہیں ہو سکتی) اسی طرح یہ قانون بھی وہیں سے متعین ہُوا ہے کہ انسانی ذات کی نشوونما ہر اُس شئے سے ہوتی ہے۔ جسے انسان دُوسروں کی نشوونما کے لئے دے۔ ان قوانین کو انسانی زندگی کی مستقل اقدار کہتے ہیں۔ جس طرح یہ سوال پیدا نہیں ہوتا کہ شہد کو شیرینی اور نمک کو نمکینی کیوں ملی ہے اسی طرح یہ سوال بھی پیدا نہیں ہوتا کہ انسانی زندگی کی نشوونما اور فوز و فلاح کے لئے (مستقل اقدار) کیوں وضع کی گئی ہیں۔ جو مشیّت، اشیائے کائنات (جن میں انسانی جسم بھی شامل ہے) کو وجود میں لائی ہے، وُہی مشیّت انسانی ذات کو بھی وجود میں لائی ہے۔ اس لئے جس مشیّت نے خارجی کائنات کے لئے قوانین مرتب کئے ہیں۔ اس نے انسانی ذات کے لئے بھی قوانین متعین کئے ہیں۔

یہ ہے وُہ گوشہ (یعنی اشیائے کائنات کو عدم سے وجود میں لانے اور ان کے متعلق قوانین مرتب کرنے کا گوشہ) جس کے متعلق کہا گیا ہے۔ کہ یَفۡعَلُ اللّٰہُ مَا یَشَآءُ (۱۴/۲۷) اللہ اپنی مشیّت اپنی مرضی کے مطابق جو چاہتا ہے کرتا ہے، اِنَّ اللّٰہَ یَفۡعَلُ مَا یُرِیۡدُ (۲۲/۱۴) وُہ اپنے اختیار و ارادہ کے مطابق جیسے چاہتا ہے کرتا ہے اِنَّ رَبَّکَ فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیۡدُ (۱۱/۱۰۷)

یقیناً تیرا رب اپنے ارادے کے مطابق جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ مَا يُرِيْدُ ہ (۵ے) وہ اپنی مرضی کے مطابق جس قسم کا فیصلہ چاہتا ہے کرتا ہے کسی کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ اس سے پوچھے کہ اس نے فلاں چیز کو ایسا کیوں بنایا اور فلاں قانون اس قسم کا کیوں متعین کیا۔ لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْئَلُوْنَ (۲۱/۲۳) اُس سے سوال نہیں کیا جا سکتا۔ کہ تم نے ایسا کیوں کیا۔ اس کے سوا اور سب سے یہ پوچھا جا سکتا ہے۔ یہ ہے وہ گوشہ جہاں خدا کامل خود مختارانہ حیثیت سے، اپنی مشیّت (مرضی) کے مطابق جس طرح جی چاہتا ہے کرتا ہے۔ اس گوشہ کے متعلق نہ ہمیں علم ہو سکتا ہے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے اور نہ ہی ہم اس سے پوچھ سکتے ہیں۔ کہ وہ ایسا کیوں کرتا ہے۔

## دوسرا گوشہ۔ خارجی کائنات

اب ہم اس گوشے کی طرف آتے ہیں جس میں خارجی کائنات سرگرمِ عمل ہے۔ ہم اُوپر دیکھ چکے ہیں کہ خدا نے اپنی مشیّت کے مطابق کائنات کو پیدا کر دیا اور اپنی مشیّت ہی سے اشیائے کائنات کے لئے قوانین متعین کر دئے۔ یہ سب کچھ امرِ الٰہی کے مطابق ہوا۔ لیکن اس گوشے میں پہنچ کر خدا کے امر کی کیفیت بدل گئی۔ گوشۂ اوّل میں خدا کا امر (مشیت۔ مرضی)، کسی قاعدے اور ضابطہ کا پابند نہیں تھا۔ لیکن یہ امر ضابطوں کے پیمانوں میں گھر گیا۔ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُوْرًا ہ (۳۳/۳۸) خدا کا امر مقررہ اندازوں کا پابند ہو گیا (قدر کے معنی ہی اندازہ اور پیمانہ کے ہیں) دُوسری جگہ ہے کہ اس نے ہر شئے کے لئے ایک پیمانہ (ضابطہ) مقرر کر دیا۔ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا ہ (۶۵/۳) پیمانے اور اندازے متعیّن کرنے کے معنی یہ ہیں کہ یہ پیمانے اور اندازے مستقل اور غیر متبدّل ہیں۔ مثلاً پانی کے لئے پیمانہ یہ مقرّر کیا گیا ہے کہ وہ ایک خاص درجۂ حرارت کے اندر سیّال رہتا ہے۔ جس برتن میں ڈالو اس کی شکل قبول کر لیتا ہے۔ اس درجۂ حرارت سے نیچے جا کر منجمد ہو جاتا ہے۔ اس سے اُوپر لے جائیں۔ تو بھاپ بن جاتا ہے۔ پانی کی ان خصوصیّات کو ہم پیمانہ (یا قانون) اسی صورت میں کہہ سکتے ہیں۔ جب یہ غیر متبدّل ہو۔ اگر صورت یہ ہو کہ ایک ہی درجۂ حرارت پر پانی کبھی سیّال ہو جائے

**غیر متبدل قوانین**

اور کبھی برف بن جائے یا (مثلاً) آگ کبھی حرارت پہنچانے لگ جائے۔ اور کبھی ٹھنڈک دینے لگ جائے تو اسے قانون نہیں کہا جائے گا۔ لہٰذا قرآن نے جہاں یہ کہہ دیا کہ خدا نے ہر شے کے پیمانے مقرر کر دئے ہیں وہیں یہ بھی کہہ دیا کہ خدا اب اپنی اس سُنّت (عادت) میں تبدیلی نہیں کرتا۔ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا (۲۳/۴۸)

غور کیجئے کہ وُہی خدا جس نے کہا تھا کہ يَفْعَلُ مَا يَشَاءُ (وہ جیسا چاہتا ہے کرتا ہے) وَيَحْكُمُ مَا يُرِيدُ (جیسا چاہتا ہے حکم دیتا ہے) اب کہہ رہا ہے۔ کہ تم ہماری روش۔ عادت۔ سُنّت۔ قانون میں کوئی تبدیلی نہیں پاؤ گے۔ یہ کتنی بڑی پابندی ہے۔ جسے خدا نے (خود) اپنے اختیارِ مطلق پر عائد کر لیا ہے۔ واضح رہے کہ جو پابندیاں از خود عائد کر لی جائیں ان سے پابندی عائد کرنے والے کے اختیار و ارادہ پر کسی قسم کا حرف نہیں آتا۔ حرف اس پابندی سے آتا ہے جو کسی دوسرے کی طرف سے عائد کی گئی ہو۔ مثلاً کسی شخص کو تھانیدار حکم دیتا ہے۔ کہ وہ ہر روز (صبح) فلاں وقت پر فلاں جگہ پہنچ کر حاضری دیا کرے۔ ظاہر ہے کہ اس حکم کی پابندی محکومی کہلائے گی۔ لیکن ایک شخص خود فیصلہ کرتا ہے کہ وہ ہر روز صبح سیر کرتا ہوا فلاں وقت پر فلاں مقام پر پہنچا کرے گا۔ تو اس پابندی کو محکومی نہیں کہیں گے۔ لہٰذا کوئی صاحب اختیار ذات جب اپنے آپ پر کوئی پابندی عائد کرے تو اس سے اس کے اختیارات پر کسی قسم کا حرف نہیں آتا۔

بہر حال یہ گوشہ وہ ہے جس میں خدا کا امر ایک غیر متبدل قانون کی شکل میں کارفرما ہوتا ہے۔ لہٰذا اس گوشے میں جب امر، اذن، مشیّت۔ ارادہ وغیرہ کے الفاظ آئیں گے۔ تو ان سے مفہوم قانونِ خداوندی ہو گا۔ ان مقامات میں جب کہا جائے گا۔ کہ اللہ یوں کرتا ہے، تو اس سے مطلب یہ ہو گا کہ خدا اپنے مقرر کردہ قانون کے مطابق ایسا کرتا ہے۔ مثلاً سورۂ نحل میں ہے:۔

**امر کے معنی قانون**

وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ط (۱۶/۱۲) اس نے رات اور دن اور سورج اور چاند کو،

(قانون کی زنجیروں میں) جکڑ دیا ہے تاکہ تم ان سے کام لے سکو۔ وَالنُّجُوْمُ مُسَخَّرٰتٌ بِاَمْرِہٖ (۱۶/۱۲) اور اس طرح ستارے بھی اُس کے امر سے جکڑے ہوئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اجرام فلکی کے متعلق تمام قوانین غیر متبدّل ہیں۔ ان میں کبھی کسی قسم کا تغیّر و تبدّل نہیں ہو سکتا۔ ان قوانین کا غیر مقبول ہونا ہی وہ محکم بنیاد ہے جس پر علم الافلاک (ASTRONOMY) کی اس قدر محیر العقول عمارت استوار ہے اور جس کے مطابق اب دُنیا کے سائنسدان سچ مچ چاند اور دیگر ستاروں کو مسخّر کر لینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس گوشے میں ایک چیز اور بھی قابلِ غور ہے۔ (جیسا کہ ہم اُوپر دیکھ چکے ہیں) اشیائے کائنات میں سے ہر ایک کے لئے ایک قانون مقرر ہے۔ اسے قرآن کی اصطلاح میں اس شئے کی تقدیر کہتے ہیں۔ یعنی اس شئے کے خواص و اثرات کا پیمانہ۔ یہ قانون اٹل ہے۔ یعنی ہر شے کی تقدیر

**اشیاء کی تقدیر**

متعین اور اٹل ہے۔ اور کسی چیز کو اختیار نہیں کہ وہ اپنی اس تقدیر کو بدل لے۔ کائنات کی ہر شئے قانونِ خداوندی کے سامنے سجدہ ریز ہے۔ وَلِلّٰہِ یَسْجُدُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ (۱۶/۴۹) کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے۔ اللہ (کے قانون) کے سامنے سجدہ ریز ہے۔ پانی کی یہ تقدیر ہے کہ وہ سیال ہے۔ نشیب کی طرف بہتا ہے۔ اپنی سطح ہموار رکھتا ہے۔ جس برتن میں ڈالئے اس کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ ایک خاص درجہ حرارت پر جا کر بھاپ بن کر اُڑ جاتا ہے۔ اور ایک خاص درجہ حرارت پر جا کر بھاپ بن کر اُڑ جاتا ہے۔ اور ایک خاص درجہ حرارت پر پہنچ کر منجمد ہو جاتا ہے۔ نہ خُدا کا یہ قانون بدلتا ہے۔ اور نہ ہی پانی کو اس کا اختیار دیا گیا ہے۔ کہ وہ اس روش کو چھوڑ کر کوئی دُوسری روش اختیار کرے۔ اس لئے کہ اختیار و ارادہ تو صرف ذات کا خاصہ ہے۔ اور خارجی کائنات میں کسی شئے کو ذات دی نہیں گئی۔ لہٰذا خارجی کائنات میں ہر شئے اپنی اپنی تقدیر کی پابند رہے اور اس کی تقدیر اٹل اور غیر متبدّل ہے۔

**تیسرا گوشہ۔ انسانی دُنیا**

اَب تیسرے گوشے کی طرف آئیے۔ یعنی انسانی دُنیا کی طرف۔ جہاں تک خُدا کے قانون کا تعلق ہے۔ وہ

اس گوشے میں بھی اسی طرح محکم اور غیر متبدل طریق پر کام کرتا ہے جس طرح خارجی کائنات میں۔ لیکن انسان کو چونکہ ذات بھی عطا کی گئی ہے۔ اس لئے اسے اس کا اختیار حاصل ہے۔ کہ یہ جی چاہے تو اس قانون کے مطابق زندگی بسر کرے اور جی چاہے تو اس کے خلاف روش اختیار کرے۔ اس کے لئے واضح الفاظ میں کہہ دیا گیا کہ وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ۔ ان سے کہہ دو کہ تمہارے رب کی طرف سے محکم اور اٹل قانون حیات آگیا ہے۔ فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَاءَ فَلْيَكْفُرْ (۱۸/۲۹) اب تم میں سے جس کا جی چاہے اسے اختیار کرے اور جس کا جی چاہے اس سے انکار کر دے۔

آپ نے دیکھا کہ ان تینوں گوشوں میں کس قدر بنیادی فرق ہوتا چلا گیا۔ گوشۂ اول میں خدا کا مطلق اختیار کارفرما تھا۔ جو کسی ضابطہ اور قاعدہ کا پابند نہیں تھا وہاں مشیتِ خداوندی کے معنی تھے۔ جس طرح خدا نے اپنے ارادے کے مطابق چاہا کر دیا۔ دوسرے گوشے میں اسی مشیت خداوندی نے اپنے اوپر خود پابندیاں عائد کر لیں اور غیر متبدل قوانین کی شکل میں کارفرما ہونے لگے۔ دوسری طرف جن اشیاء کے متعلق یہ قوانین متعین ہوئے تھے۔ انہیں بھی اس کا اختیار نہیں دیا گیا کہ وہ ان سے سرتابی کر سکیں۔ لیکن تیسرے گوشے میں خدا کا قانون تو بدستور غیر متبدل رہا لیکن انسان کو اختیار دے دیا گیا کہ وہ جونسا راستہ جی چاہے اختیار کرلے۔ اب "مشیت" (یعنی جس طرح جی چاہے انسان کی طرف لوٹ آئی۔ اب اس

**انسانی مشیت**

سے کہہ دیا کہ اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ (۴۱/۴۰) "جیسا تمہارے جی میں آئے کرو"۔ واضح رہے کہ یہ اختیار و ارادہ بھی خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق ہی ملا ہے۔ اور چونکہ خدا کے قوانین اٹل اور غیر متبدل ہیں اس لئے انسان کے اس اختیار و ارادہ کو خدا سلب نہیں کرتا۔ وہ انسان کی "مشیت" میں دخل ہی نہیں دیتا۔ اگر اس نے دخل دینا ہوتا تو وہ اسے اختیار و ارادہ دیتا ہی کیوں؟ یہ دوسری پابندی ہے۔ جسے خدا نے اپنے اختیار مطلق پر خود عائد کر لیا ہے۔

لیکن انسان کے اس اختیار کے ساتھ ہی ایک جبر کا پہلو بھی ہے۔ اسے اس کا تو اختیار ہے۔ کہ دو راستوں میں سے جونسا راستہ جی چاہے اختیار کرے۔

لیکن اسے اس کا اختیار نہیں کہ جو راستہ اختیار کرے اس کے نتائج کو بدل دے مثلاً کسی شخص کے سامنے شکر کی ڈلی اور سنکھیا کا ٹکڑا رکھا ہے۔ اسے اس کا اختیار

**اختیار میں جبر**

ہے کہ وہ جی چاہے تو شکر کی ڈلی منہ میں ڈال لے اور جی چاہے تو سنکھیا نگل لے۔ لیکن یہ اس کے اختیار میں نہیں کہ نگل تو لے سنکھیا اور اس کے نتائج شکر کی ڈلی کے سے پیدا کرے۔ یہ نتائج خدا کے متعین کردہ قانون کے مطابق مرتب ہوں گے۔ ان پر انسان کا کوئی اختیار نہیں۔ اس لئے جہاں یہ کہا کہ اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ (جس طرح تمہارا جی چاہے کرو) اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (۴۱/۴۰) خدا کا قانون اچھی طرح دیکھ رہا ہے کہ تم کیا کرتے ہو؟ عمل کا انتخاب تو تمہارے اختیار میں ہے۔ لیکن یہ تمہارے اختیار میں نہیں کہ تم اس کا نتیجہ بدل ڈالو۔ نہ تم اس کا نتیجہ بدل سکتے ہو اور نہ ہی اس کے نتیجہ کی زد سے بچ سکتے ہو۔ اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ (۸۵/۱۲) یقیناً تیرے رب کے قانون مکافات کی گرفت بڑی سخت ہے۔

تصریحات بالا سے واضح ہے کہ (تقدیرات حق لا انتہا است) خدا کے بے شمار قوانین (تقدیرات) بکھرے پڑے ہیں۔ انسان کی مرضی ہے کہ جس قسم کا قانون (تقدیر) اپنے لئے چاہے اختیار کرلے۔ جس قسم کا قانون وہ اپنے لئے اختیار کرے گا۔ اسی قسم کا نتیجہ اس کے سامنے آجائے گا۔ یعنی یہاں سررشتۂ اختیار (iNiTiATiVE) انسان کے ہاتھ میں ہے اور خدا کا قانون اس (انسان) کے فیصلہ کے پیچھے پیچھے چلتا ہے یا یوں کہیے کہ اس کا پیچھا کرتا ہے۔ مثلاً قرآن میں ہے فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ (۶۱/۵) جب انہوں نے ٹیڑھا راستہ اختیار کر لیا تو اللہ نے ان کے دلوں کو ٹیڑھا کر دیا یعنی جیسا راستہ انہوں نے اختیار کیا۔ اسی کے مطابق خدا کا قانون ان پر منطبق ہو گیا۔ دوسری جگہ ہے۔ يُؤْفَكُ عَنْهُ مَنْ اُفِكَ (۵۱/۹) اس (صحیح راستے) سے اسی کو پھرا جاتا ہے، جو خود اس سے پھر جاتا ہے۔ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ (۲/۲۸۴) جو شخص ہلاکت اور تباہی سے محفوظ رہنا چاہتا ہے اسے ہمارا قانون ہلاکت سے محفوظ

**جیسے تم ویسی تقدیر**

کر دیتا ہے۔ اور جو تباہ ہونا چاہتا ہے۔ اسے وہ تباہ کر دیتا ہے۔ جو شخص جیسا چاہتا ہے۔ ویسا ہی ہمارا قانون

کر دیتا ہے۔ جو جیسا بن جاتا ہے۔ اسی کے مطابق اس کی تقدیر بن جاتی ہے۔
اقبالؒ کے الفاظ ہیں ؎

حرفِ ہاریکش بہ رمزے مضمر است
تو اگر دیگر شوی او دیگر است

خاک شو، نذرِ ہوا سازد ترا
سنگ شو، بر شیشہ اندازد ترا

شبنمی؟ افتندگی تقدیرِ تست
قلزمی؟ پایندگی تقدیرِ تست

تم اگر ایک حالت میں ہو اور اس کے مطابق قانونِ خداوندی کے نتائج تمہارے لئے ناخوشگوار ہیں۔ تو اس میں رونے کی کوئی بات نہیں۔ تم اپنے اندر تبدیلی پیدا کرو۔ اس سے خدا کا دوسرا قانون تم پر منطبق ہو جائے گا۔ تمہاری تقدیر بدل جائے گی۔

گر زیک تقدیر خوں گردد جگر　　　خواہ از حق حکم تقدیرے دگر
تو اگر تقدیرِ نو خواہی رواست　　　زانکہ تقدیراتِ حق لا انتہا است

اسی حقیقت کی تشریح حضرت عمرؓ کا واقعہ کرتا ہے۔ کہ جب ایک جگہ طاعون پھیلا تو آپ نے کہا کہ اس بستی کو چھوڑ کر جنگل میں چلے جانا چاہیئے۔ اس پر حضرت ابو عبیدہؓ نے کہا کہ افرار من قدر اللہ۔ کیا آپ خدا کی تقدیر سے بھاگنا چاہتے ہیں۔ آپ نے جواب دیا کہ نعم ۔۔۔ افر من قضاء اللہ الی قضاء اللہ۔ ہاں میں خدا کی (ایک) تقدیر سے بھاگ کر اس کی (دوسری) تقدیر کی طرف جانا چاہتا ہوں۔

ان تصریحات کی روشنی میں آپ قرآن کے ان مقامات کو دیکھئے۔ جن میں کہا گیا ہے۔ کہ ان کی دنیا میں مصائب، خدا کی مشیت، کے مطابق آتی ہیں۔ یہاں کے واقعات "خدا کے حکم" کے مطابق رونما ہوتے ہیں۔ سب کچھ، خدا کے امر کے مطابق ہوتا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ ان تمام مقامات میں مشیت۔ اذن۔ امر۔ وغیرہ سے مراد خدا کے قوانین ہیں۔ جو اس کی مشیت سے متعین ہوئے تھے مثلاً سورۂ ابراہیم

میں ہے کہ

انسانی معاشرہ کا نظام دو قسم کا ہو سکتا ہے۔ ایک وُہ جو مستقل اقدارِ حیات کے مطابق چلے۔ اس نہج سے زندگی بسر کرنے کا نتیجہ زندگی کی خوشگواریاں اور آخرت کی کامرانیاں ہوتا ہے۔ اس کی مثال ایسے شجرِ طیب کی سی ہے۔ جس کی جڑیں پاتال میں ہوں اور شاخیں آسمان کو چھو رہی ہوں۔ اس کے برعکس دُوسرا نظریۂ زندگی انسانوں کا خود ساختہ ہے۔ اس کی مثال اس پودے کی سی ہے۔ جس کی جڑیں زمین کے اُوپر ہی ہوں اور اسے ہوا کا ذرا سا جھونکا اکھیڑ کر پھینک دے۔ اس کے بعد ہے:۔

يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَيُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ (۱۴/۲۷)

اللہ اپنے اس محکم قانون کے مطابق۔ اس قانونِ حیات پر ایمان رکھنے والی جماعت کو قریبی مفاد کی زندگی میں مستحکم اور استوار رکھے گا۔ اور ان کی مستقبل کی زندگی بھی بڑی خوشگوار ہو گی۔ ان کے برعکس جو قوم حقوقِ انسانیت میں کمی کرے گی۔ اس کی تمام کوششیں رائگاں چلی جائیں گی۔

آپ نے دیکھ لیا کہ زندگی کی کامرانیوں اور ناکامیوں کے لئے کیسا واضح قانون بتایا گیا ہے۔

## يَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ کے معنی

لیکن اس کے بعد ہے يَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ (۱۴/۲۷) اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ نہ صرف یہ کہ بظاہر ان دونوں باتوں میں کوئی ربط نہیں بلکہ یہ ایک دُوسرے سے متضاد دکھائی دیتی ہیں۔ یعنی سلسلۂ کلام یُوں چلا آرہا تھا کہ دُنیا میں قوموں کی زندگی اور موت۔ ان کے عرُوج و زوال کے لئے ایک محکم اُصول مقرر ہے اور اُسی اُصول کے مطابق نتائج مُرتّب ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا۔ کہ "اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ اگر اعمال کے نتائج مذکورہ صدر قانون کے مطابق مرتّب ہوتے ہیں۔ (جو غیر متبدّل ہے) تو پھر یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے اور اگر حقیقت

یہ ہے کہ" اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ تو پھر اس قانون سے کیا مطلب جس کا ذکر پہلے کیا گیا ہے۔ یہ اُلجھن اسی صُورت میں پیدا ہوتی ہے۔ جب اس بنیادی نقطہ کو سامنے نہ رکھا جائے۔ جسے شروع میں بیان کیا گیا ہے۔ اُسے سامنے رکھنے سے بات بآسانی سمجھ میں آجاتی ہے۔ یعنی

اللہ نے یہ قانون بنایا ہے۔ کہ اس قسم کے نظریۂ حیات کا نتیجہ یہ ہوگا۔ اور اُس قسم کے اندازِ زندگی کا نتیجہ وُہ۔ اس سے یہ سوال سامنے آتا تھا کہ ایسا قانون کیوں بنایا گیا؟ کیوں یہ قاعدہ مقرّر کردیا گیا کہ فلاں قسم کے معاشرہ کا مآل یہ ہوگا اور فلاں قسم کے نظامِ زندگی کے عواقب یہ؟ سنکھیا کو مُہلک کیوں بنایا گیا اور شہد کو صحت بخش کیوں؟ اس کے جواب میں کہا گیا کہ تم یہ سوال اُٹھا نہیں سکتے۔ اس لئے کہ کائنات اور انسانی زندگی کے متعلق اُسی گوشے میں مُرتّب ہوتے ہیں۔ جہاں خُدا کا مطلق اختیار و ارادہ کام کرتا ہے۔ یہ مفہوم ہے يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ کا۔ یعنی

یہ قانون سازی خُدا کی مشیّت کے مطابق ہوتی ہے۔ لہٰذا اس قسم کی آیات کا صحیح ترجمہ یُوں ہوگا کہ ایسا کچھ خُدا کے قانونِ مشیّت کے مطابق ہوتا ہے"۔ یا" اللہ یہ کچھ اپنے قانونِ مشیّت کے مطابق کرتا ہے"۔ یعنی یہاں جو کچھ ہوتا ہے۔ قانون اور قاعدے کے مطابق جو خُدا کی مشیّت کے مطابق متعیّن ہُوئے ہیں۔ یونہی ہنگامی طور پر وجُود میں نہیں آگئے۔

یا مثلاً سورۂ آلِ عمران میں ہے۔ کہ جنگ اُحد میں جب تمہیں (وقتی شکست کی وجہ سے) کچھ تکالیف پیش آئیں تو قُلْتُمْ اَنّٰی هٰذَا؟ تم کہنے لگے۔ کہ یہ مصیبت کہاں سے آگئی؟ اس کے جواب میں اللہ نے کہا کہ قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ۔ (اے رسُول) ان سے کہہ دو کہ یہ خُود تمہارے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی ہے؟ (اور کہاں سے آگئی؟) اس کے بعد کہا اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ۔ ($\frac{3}{164}$)

اللہ نے اپنے قانون کے مطابق تمام چیزوں کے اندازے مقرّر کئے ہوئے ہیں۔ اور ان پر اس کا مستقل اور دوامی کنٹرول ہے تاکہ تمام نتائج ان کے مطابق مرتّب ہوتے رہیں۔

## اِذْنِ اللّٰہِ کے معنی

یہاں تک بات بالکل واضح ہے۔ اس کے بعد ہے:-

وَمَآ اَصَابَکُمْ یَوْمَ الْتَقَی الْجَمْعٰنِ فَبِاِذْنِ اللّٰہِ (۳/۱۶۵)

دونوں فوجوں کے تصادم کے دن جو واقعہ پیش آیا وہ اللہ کے اذن سے ہوا تھا

اس سے اِذْنِ اللّٰہِ کا مفہوم بالکل واضح ہے۔ یعنی اللہ نے یہ قانون مقرر کر رکھا ہے۔ کہ مقابلہ کے وقت اگر یوں کیا جائے۔ تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا۔ تم نے وہی کچھ کیا اس لئے اس کا نتیجہ ویسا ہی مرتب ہو کر سامنے آگیا۔ اسی طرح سورۂ توبہ میں ہے۔ قُلْ لَّنْ یُّصِیْبَنَآ اِلَّا مَا کَتَبَ اللّٰہُ لَنَا ج (۹/۵۱) "ان سے کہہ دو کہ ہم پر کوئی مصیبت نہیں آسکتی بجز اس کے" جسے اللہ نے ہمارے لئے لکھ دیا ہے" یا مقرر کر دیا ہے۔ لیکن دوسرے مقام پر اس کی وضاحت یہ کہہ کر کر دی کہ وَمَآ اَصَابَکُمْ مِّنْ مُّصِیْبَۃٍ فَبِمَا کَسَبَتْ اَیْدِیْکُمْ ...... (۴۲/۳۰) جو مصیبت بھی تمہیں پیش آتی ہے وہ تمہارے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی ہوتی ہے جو حوادث تمہیں پیش آتے ہیں۔ وہ تمہارے اپنے فیصلوں اور عملوں کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ لیکن چونکہ وہ نتائج ہمارے قانون کے مطابق مرتب ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ وہ (نتائج) خدا کی طرف سے مقرر شدہ ہوتے ہیں۔

اسی طرح (مثلاً) حکومت و مملکت کے متعلق ایک جگہ کہا کہ:-

قُلِ اللّٰھُمَّ مٰلِکَ الْمُلْکِ تُؤْتِی الْمُلْکَ مَنْ تَشَآءُ وَ تَنْزِعُ الْمُلْکَ مِمَّنْ تَشَآءُ ...... (۳/۲۶)

کہو! اے اللہ تو حکومت و مملکت کا مالک ہے۔ تو جسے چاہے حکومت عطا کر دے۔ جس سے چاہے حکومت چھین لے۔

اسی طرح دوسری جگہ ہے:-

اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰہِ قف یُوْرِثُھَا مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِہٖ (۷/۱۲۸)

مملکت خدا کی ملکیت ہے۔ وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہے عطا کر دے۔

لیکن سورۃ انبیاء میں ہے :-

إِنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ ٥ (۲۱/۱۰۵)

اللہ مملکت وحکومت ان بندوں کو عطا کرتا ہے جو اس کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

اس کی تشریح دوسری جگہ ان الفاظ میں کر دی کہ :-

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ص ... ... ... ... (۲۴/۵۵)

تم میں سے جو لوگ ، قوانینِ خداوندی کی صداقت پر ایمان لائیں۔ اور اعمالِ صالحہ کریں۔ ان سے اللہ نے وعدہ کر رکھا ہے۔ کہ وہ انہیں اس طرح استخلاف فی الارض عطا کرے گا جس طرح ان سے پہلے لوگوں کو عطا کیا تھا۔

## حضرت طالوت کا انتخاب

سورۃ بقرہ میں ہے۔ جب بنی اسرائیل نے اپنے نبی سے کہا کہ ہمارے لئے کسی کمانڈر کو مقرر کر دیجئے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرت طالوت کو کمانڈر منتخب کر دیا۔ لوگوں نے اعتراض کیا۔ کہ طالوت کو کمانڈر کیسے مقرر کر دیا گیا۔ حالانکہ یہ دولتمند آدمی نہیں۔ اس کے جواب میں اللہ تعالےٰ نے کہا کہ اسے یہ منصب اقتدار اس لئے تفویض کیا گیا ہے کہ زَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ اللہ نے اسے علم اور جسمانی قوت کی بڑی فراوانی عطا کی ہے۔ یعنی یہاں یہ بتا دیا کہ طالوت کو یہ اقتدار کن وجوہات کی بنا پر عطا کیا گیا ہے۔ مَن يَّشَاءُ کے یہ معنی نہیں کہ جسے خدا دینا چاہے اُسے یونہی دے دیتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ اُسی کو ملتی ہے۔ جو اسے خدا کے قانون کے مطابق لینا چاہے (من یشاء) جو لینا چاہے) مائدہ ارض پر خدا کی یہ نعمتیں بکھری پڑی ہیں جو انہیں لینا چاہے۔ لے لے۔ جو اُٹھانا چاہے۔ اُٹھا لے۔ اس کے لئے اللہ کا قانون مقرر ہے۔ جو اس قانون کے مطابق عمل کرے گا۔ یہ اس کے حصہ میں آجائیں گی۔

ہست ایں میکدہ و دعوتِ عام است ایں جا
قسمتِ بادہ باندازۂ جام است ایں جا

ایک مقام پر حکیم الامت علامہ اقبالؒ یوں فرماتے ہیں :۔

جز خدا کس خالقِ تقدیر نیست
چارۂ تقدیر از تدبیر نیست

کتنے حسین پیرائے میں اقبالؒ نے اس حقیقت کی وضاحت کی ہے کہ انسان اپنے اعمال کے نتائج خود مرتب نہیں کر سکتا۔ صاحبِ اختیار و ارادہ ہونے کی وجہ سے انسان جو چاہے کر سکتا ہے۔ وہ جس میدان میں چاہے عقلِ سرکش اور علمِ بے باک کے گھوڑے دوڑا سکتا ہے۔ وہ اپنے ذہن کے تراشیدہ نظاموں کے مطابق مملکت (معاشرہ) تشکیل کر سکتا ہے۔ وہ جونسا نظامِ حیات چاہے اپنے لئے اختیار کر سکتا ہے۔ لیکن اُسے یہ اختیار نہیں کہ وہ نتائج بھی اپنی مرضی کے مطابق مرتب کر سکے۔ نتائج خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کے اندازوں اور پیمانوں کے مطابق ہی مرتب ہوں گے۔ ایک حلقہ میں اقبالؒ کے اس شعر کو غلط معنی پہنائے جاتے ہیں۔ یہ وہ حلقہ ہے جسے روایتی تقدیر کی افیون نے ناکارہ بنا کر رکھ دیا ہوا ہے۔ حالانکہ واضح ہے۔ کہ تقدیرِ خداوندی کے لئے انسان ہزار تراکیب اور کروڑوں تدابیر اختیار کرے۔ اعمالِ انسانی کے نتائج خدا کے قانون کے مقرر کردہ پیمانوں کے مطابق مرتب ہوں گے۔ کیونکہ خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل خالقِ تقدیر کے منشا و مشیت اور قانون کے برخلاف نتائج نہیں دے سکتا۔

**یہ قوانین کہاں سے ملیں گے** ابتدا میں عرض کیا جا چکا ہے۔ کہ ان قوانین کا علم اللہ تعالیٰ نے وحی کی رُو سے عطا کر دیا۔ چنانچہ وحی کو "امر منزل من اللہ" کہا گیا ہے۔ ذَالِكَ أَمْرُ اللّٰهِ أَنزَلَهُ إِلَيْكُمْ (۶۵/۵) یہ اللہ کا امر ہے۔ یعنی وُہی امر جو گوشہ اوّل میں اللہ تعالیٰ کے اختیارِ مطلق کی حیثیت سے کارفرما تھا۔ پھر وہ گوشۂ دوم میں مختلف اشیائے کائنات کی تقدیر (پیمانوں) کی حیثیت سے نافذ ہُوا۔ اب گوشۂ سوئم میں وحیِ خداوندی کی حیثیت سے قرآن کے غیر متبدل کلمات (قوانین)

بن کر یاں نمط سامنے آیا کہ جس کا جی چاہے اختیار کرے اور جس کا جی چاہے اس سے انکار کردے۔ ایک ہی امر جو گوشۂ اوّل میں مشیّت کہلاتا ہے۔ گوشۂ دوم میں کائنات کی تقدیر بن جاتا ہے اور گوشۂ سوئم میں احکامِ الٰہی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اقبالؒ کے الفاظ میں :-

تقدیر کے پابند نباتات و جمادات
مومن فقط احکامِ الٰہی کا ہے پابند

آپ عام طور پر یہ سُنتے ہیں۔ کہ انسان کی فطرت ہی ایسی ہے صاحب۔ اسی لئے وُہ ایسا کرتا ہے۔ یہ تصوّر قرآن کے سراسر خلاف ہے۔ پانی کی فطرت ہے کہ وہ نشیب کو بہتا ہے۔ آگ کی فطرت ہے کہ وہ جلاتی ہے۔ اسے یہ اختیار نہیں کہ کبھی جلالے اور کبھی برف کی مانند ٹھنڈی ہو جائے۔ کبھی اس کی شعلہ ریزیاں چاروں طرف آگ برسا کر آنِ واحد میں گھروں اور محلوں کو راکھ کا ڈھیر بنا کر رکھ دیں اور کبھی اس کے انگاروں کو چھُوا جائے۔ تو ہاتھ کی اُنگلیاں برف کی سی برودت محسوس کریں۔ لیکن انسان کو اللہ تعالےٰ نے ذات عطا کی ہے۔ یہ صاحبِ اختیار و ارادہ ہے۔ اس لحاظ سے اس کی کوئی فطرت نہیں۔ اس میں بُرے بھلے کی تمیز پیدا کر کے اسے بتلا دیا گیا ہے کہ اگر صراطِ مستقیم پر چلے گا۔ تو اعمالِ حسنہ کا نتیجہ حسنات (زندگی کی خوشگواریاں) ہوگا۔ اگر سیدھے راہِ حیات کو چھوڑ کر یہ اپنی خود ساختہ روش پر چلے گا۔ تو اس کا نتیجہ (سیّئات) زندگی کی بدحالیاں اور ناہمواریاں ہوتا ہے۔ حسنات اللہ کے قانون کی پیروی کی وجہ سے اللہ کی طرف سے اور سیّئات انسانی اعمال کا نتیجہ ہوتی ہیں۔

مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ز وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ ط ($\frac{4}{79}$)

جو کچھ اچھی بات پہنچتی ہے۔ وُہ اللہ کی طرف سے اور جو تکلیف پہنچتی ہے وُہ تیری اپنی وجہ سے ہے۔

انسان کے خود کردہ اعمال جو وحی کے خلاف ہوتے ہیں۔ قانونِ مکافات

عمل ان کے نتائج بھی مُرتّب کر دیتا ہے۔ حسنات (خوشگواریاں) توانینِ خداوندی کی متابعت سے ملتی ہیں۔ سیّات خدا کے قانون سے ہٹ کر خود تجویز کردہ راستوں پر چلنے سے۔ یہ خُدا کے غیر متبدل قانون کی رُو سے ہوتا ہے۔ جسے اُس نے اپنی مشیّت کے مطابق کیا ہے (کُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰہِ) آج انسان اپنے خود کردہ اعمال کے نتائج کی وجہ سے ناہمواری و نااستواری کے امن سوز جہنم میں جھلس رہا ہے۔ نسل و وطن اور رنگ و خُون کے امتیازات کی بنا پر یہ تفریق و تمیز جس کی وجہ سے انسان انسان کے خُون کا پیاسا ہے اقبالؒ نے نظریۂ پاکستان میں اس کی مکمّل نفی کی ہے۔ فلسفۂ یونان اور ویدانت کی وجہ سے یہ تسلیم کیا جاتا تھا کہ زندگی ایک دائرہ کے اندر گھری ہوئی ہے اور وُہ بے مقصد و منزل اسی گول چکر میں گردش کرتی رہتی ہے۔ اس تصوّر نے زندگی کی جادۂ حیات کی طرف صحیح راہنمائی نہیں کی۔ لیکن قرآن نے صراطِ مستقیم کی طرف رہنمائی کر کے زندگی کے لئے راستہ صاف و ہموار کر دیا۔

اب اگر انسان چاہے تو اوہام و ظنون کے اس چکّر سے نکل کر قرآن کی متعین کردہ صحیح راہِ حیات پر گامزن ہو کر زندگی کی خوشحالیاں اور خوشگواریاں حاصل کر سکتا ہے۔ اور صحنِ حیات میں امن و مسرّت کے جھولے جھول سکتا ہے۔ کیونکہ قرآنی تصوّرِ حیات ارتقائے زندگی کا پُورا پُورا ساتھ دیتا ہے۔ کیونکہ قرآن کا خُدا ذوالمعارج ہے۔ اس لیئے وُہ زندگی کو تشکیک و فریب کی پستیوں سے نکال کر معراجِ انسانیت کے بلند و بالا مقام تک لے جاتا ہے۔ اس نظامِ حیات میں انسان کے اعمال و کردار کا محاسبہ اس لیئے ہے۔ کہ کائنات میں انسان کو انفرادیت اور ذات عطا کی گئی ہے۔ چونکہ آدم صاحب اختیار و ارادہ ہے۔ اس لئے اس کے خود کردہ اعمال کے نتائج بھی دراصل اس کے خود کردہ کے نتائج ہونگے۔ جو خُدا کا قانونِ مکافاتِ عمل مرتّب کرے گا۔

## اَلْحَکِیْمُ

اَلْحِکْمَۃُ گھوڑے کی لگام کو کہتے ہیں۔ لگام کا کام یہ ہے کہ وُہ جانور کو

مُنہ زور اَور سرکش نہ ہونے دے۔ بلکہ ٹھیک رفتار سے صحیح راستے پر چلائے جائے۔ لہٰذا اَلْحِکْمَۃُ کے معنی ہیں معاملات کو صحیح حدُود میں ملحوظ رکھنا اور کسی کو اُن سے اِدھر اُدھر نہ ہونے دینا۔ حَکِیْمٌ اس شخص کو کہتے ہیں۔ جو ہر چیز کو صحیح تناسب و توازن کے ساتھ اس کے ہر تقاضے کو ملحوظ رکھتے ہُوئے نہایت حسن و خُوبی کے ساتھ نباہئے۔ نیز تمام معاملات کو اسی طرح سرانجام دے جب خُدا کو اَلْحَکِیْمُ کہا جائے گا تو اس سے مفہوم کیا ہوگا۔ چونکہ یہ صفتِ خُداوندی بڑی بنیادی اَور اہم ہے۔ اس لیئے قرآن میں اس کا ذکر بے شمار مقامات میں آیا ہے۔ حَکِیْمٌ خَبِیْرٌ (۱۱/۱) حَکِیْمٌ عَلِیْمٌ (۶/۱۲۹) وغیرہ۔

اس سے ظاہر ہے کہ جو معاشرہ ان افراد پر مشتمل ہوگا۔ جن کی ذات صفاتِ خُداوندی کی مظہر ہو گی۔ اس میں ہر معاملہ کس طرح مبنی بر حکمت ہوگا۔

# اَلْحَلِیْمُ

جس شخص کے اعصاب کمزور ہوں وُہ ذرا ذرا سی بات پر مشتعل اور چھوٹی چھوٹی تنقیدوں سے اس کے جذبات بھڑک اُٹھتے ہیں۔ اس کے برعکس جس شخص کی توانائی قائم ہو۔ مزاج میں اعتدال ہو۔ اعصاب اَور قویٰ مضبوط ہوں۔ تربیت صحیح ہو۔ وُہ ثقہ۔ بھاری بھرکم۔ متین اور سنجیدہ ہوتا ہے۔ وُہ ذرا سی بات پر بھڑک نہیں اُٹھتا۔ معاملات پر سنجیدگی سے غور کرتا۔ نہایت تدبّر اَور احتیاط سے فیصلہ تک پہنچتا۔ اَور پھر اُس فیصلہ پر عزم راسخ سے جم کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ ایسے شخص کو حَلِیْمٌ کہتے ہیں۔ خُدا کے حَلِیْمٌ ہونے کے معنی یہ ہیں۔ کہ اس کا قانونِ مکافاتِ عمل یُونہی کفِ بر آتش نہیں ہو جاتا۔ بلکہ اُصول اَور آئین کے مطابق اعمال کو ان کے نتائج تک پہنچاتا ہے۔ اور اگر اس دوران میں ان اعمال میں اصلاح کر لی جائے۔ تو وہ ان کے مُضر اثرات سے سامانِ حفاظت بہم پہنچا دیتا ہے۔ دیکھئے اس حقیقت کو قرآن نے کس انداز میں بیان کیا ہے۔

سورۂ بقرہ میں ہے:-

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ۝ (2/225)

تمہاری قسموں میں جو لغو اور بے معنی قسمیں ہوں۔ اُن پر اللہ مؤاخذہ نہیں کرے گا۔ تم پر جو کچھ مؤاخذہ ہوگا۔ وہ تو اُسی بات پر ہوگا جو سچ مچ تم نے سمجھ بوجھ کر کی ہے اور اس لئے تمہارے دلوں نے (اپنے عمل سے) کمائی ہے۔ اور اللہ غفور اور حلیم ہے۔

اس کے علاوہ سات آٹھ دیگر مقامات پر بھی یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ۝ (5/31) غَنِيٌّ حَلِيْمٌ ۝ (2/264) عَلِيْمٌ حَلِيْمٌ (22/59) (4/12) شَكُوْرٌ حَلِيْمٌ ۙ (64/17) حَلِيْمًا غَفُوْرًا (17/44) (35/41) عَلِيْمًا حَلِيْمًا (33/51)

## الغفور
## الغفار
## العفو

جب کسی شہر میں وبائی امراض کا حملہ ہو۔ تو اکثر و بیشتر آبادی اس کا شکار ہو جاتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود بعض لوگ اس کے حملہ سے محفوظ رہتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں، جن میں قوتِ مدافعت زیادہ ہوتی ہے ان کی یہ قوت امراض کے مُضر اثرات کا مقابلہ کرکے انسان کو ان سے محفوظ رکھتی ہے۔ اسے مغفرت کہتے ہیں۔ خدا کے قانونِ مکافات کی رُو سے ہر عمل اپنا نتیجہ مُرتّب کرتا ہے۔ اگر کسی فرد یا قوم کے تعمیری نتائج پیدا کرنے والے اعمال زیادہ ہوں تو وہ ان اعمال کے تخریبی نتائج (مضر اثرات) سے محفوظ رہتی ہے۔ جو اس سے سہو و خطا کے طور پر سرزد ہو جائیں۔ اسے صفت غفاری اور غفوری کہتے ہیں۔ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (2/218) اس صفت کا ذکر بھی بے شمار مقامات پر آیا ہے۔ چند ایک مقامات پر غفور

غَفُوْرٌ (۲۴/۹) بھی آیا ہے۔ یعنی مواخذہ کرنے کے بجائے آگے بڑھ جانے (درگذر کرنے) والا۔

# اَلتَّوَابُ

آپ کسی جگہ جا رہے ہیں۔ راستے میں ایک دوراہے سے آپ غلط سمت کی طرف مڑ جاتے ہیں۔ کچھ دور جا کر آپ کو احساس ہوتا ہے (یا کوئی آپ کو بتاتا ہے۔ کہ آپ غلط راستے پر پڑ گئے۔ یہاں سے صحیح راستے پر جانے کے لئے ضروری ہے کہ آپ پھر اس مقام پر واپس آ جائیں جہاں سے آپ کا قدم غلط سمت کی طرف اُٹھا تھا۔ اس طرح واپسی کو توبہ کہتے ہیں۔ ہم دیکھ چکے ہیں۔ کہ خدا کے قانونِ مکافات کی رُو سے عمل اور اس کے نتیجہ کے نمودار ہونے میں ایک وقفہ ہوتا ہے۔ اگر اس دوران میں انسان اس غلط روش سے باز آ کر صحیح روش اختیار کرے اور پھر ایسے تعمیری کام کرے جن سے سابقہ تخریب کے مُضر اثرات سے حفاظت مل جائے، تو وہ شخص تباہی اور بربادی سے بچ سکتا ہے۔ اس صفتِ خداوندی کا نام توّابیت ہے۔ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا (۱۱۰/۳)

# رَءُوْفٌ

رحمت اور رافت قریب قریب مرادف الفاظ ہیں۔ اس فرق کے ساتھ کہ رحمت کے معنی ہیں۔ سامانِ نشوونما کا عطا کرنا اور رافت کے معنی ہیں اُن موانع کو دُور کرنا جو کسی کی نشوونما کے راستے میں حائل ہوں۔ اس کے قرآن میں رءوف اور رحیم کی صفات بالعموم یکجا آتی ہیں۔

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ وَاَنَّ اللّٰهَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ (۲۴/۲۰)

اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور رحمت نہ ہوتی (تو تم ان مفسدہ پردازوں کے شر سے محفوظ نہ رہتے) اور یاد رکھو کہ اللہ رءوف و رحیم ہے۔

دیگر مقامات کے لئے دیکھئے $\frac{2}{143}$ و $\frac{16}{47-7}$ ؛ $\frac{22}{65}$ ؛ $\frac{57}{9}$ ؛ $\frac{59}{10}$

سُورۂ توبہ میں ایک جگہ حضورِ اکرمؐ کی صفت بھی رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ آئی ہے۔ ($\frac{9}{128}$)۔ یہی صُورت حضورؐ کے ان متبعین کی ہوگی۔ جن میں صفاتِ خُداوندی منعکس ہوں گی۔

# اَلْوَدُوْدُ

حضرت شعیبؑ نے اپنی قوم سے فرمایا:۔

وَاسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ ط اِنَّ رَبِّیْ رَحِيْمٌ وَّدُوْدٌ ۝ ($\frac{11}{90}$)

(اَے قوم!) اپنے رب سے مغفرت مانگو اور اس کی طرف لوٹو یقیناً میرا رب رحیم (رحمت والا) اور وَدُود (مُحبّت کرنے والا ہے)

سُورۂ بروج میں جزا و سزا کے تذکرہ کے فرمایا:۔

وَهُوَ الْغَفُوْرُ الْوَدُوْدُ ۝ ($\frac{85}{13}$)

اور (اللہ) بخشنے والا۔ محبت کرنے والا ہے۔

واضح رہے کہ خُدا کی رحمت۔ مغفرت۔ مُحبّت وغیرہ کا ابرِ نیساں اس کے خاص قوانین کے ماتحت گہربار ہوتا ہے۔ اور اس گہرباری سے بہرہ اندوز ہونے کے لئے اپنے آپ کو اہل بھی بنانا پڑتا ہے۔ زمینِ شور اس سے کیا متمتع ہوگی؟

# اَلْكَرِيْمُ

عربوں کے ہاں کریم کا لفظ بڑا وسیع المعنی تھا۔ یُوں سمجھئے کہ جس کے متعلق وُہ یہ کہنا چاہیں کہ اس میں انسانیت کی تمام بلند خصلتیں اور عُمدہ صفتیں موجُود ہیں اسے وُہ اَلْكَرِيْمُ کے لفظ سے تعبیر کرتے تھے۔ ہر قسم کی عزّت و تکریم کا مالک۔ بے بہا جود و سخا۔ بخشش و عنایات بذل و کرم کا حامل۔ ایک نشو و نما یافتہ ذات۔ ان تمام صفاتِ حسنیٰ کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب خُدا کے متعلق یہ لفظ بولا جائے گا تو اس سے کیا مقصود و مفہوم ہوگا۔

سُورۂ نمل میں ہے :-

وَمَنْ شَكَرَ فَإِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ج وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ رَبِّيْ غَنِيٌّ كَرِيْمٌ ه (۲۷/۴۰)

جو سپاس گزار ہوگا اس کے شکر کا فائدہ اس کی ذات کو پہنچے گا اور جو ناسپاس ہوگا۔ تو اس کا نقصان بھی اسی کو ہوگا، میرا رب (انسانوں کے شکر و کفر سے) بے نیاز اور کریم ہے۔

یعنی اسے کسی کے شکر کی احتیاج نہیں اور کسی کا کفر اس کا کچھ بگاڑ سکتا ہے۔ البتہ جو شکر گزار ہوگا۔ اس پر اس کے فضل و کرم کی بارشیں ہوں گی۔

سُورۂ انفطار میں ہے :-

يٰٓاَيُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ ۙ الَّذِيْ خَلَقَكَ فَسَوّٰىكَ فَعَدَلَكَ ۙ (۸۲/۶-۷)

اے انسان وہ کونسی چیز ہے جس نے تجھے رب کریم کی طرف سے فریب دے دیا۔ وہ رب جس نے تجھے پیدا کیا پھر (مختلف) مدارج طے کرانے کے بعد، تجھے سنوارا۔ اور تیرے اعضاء ہیں) تناسب پیدا کر دیا!

یعنی انسان کی تخلیق اور پھر تقویم احسن سب اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ہے۔ یہاں اللہ تعالےٰ کو کریم کہا گیا ہے لیکن دوسرے مقام پر اسے اکرم کہا ہے۔

اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۙ الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۙ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ۙ (۹۶/۳-۴-۵)

پڑھو۔ اور تمہارا رب اکرم (بہت بڑا کریم) اور تعلیم انسانی کے وقت رب اکرم۔ کریم اور اکرم میں وہی فرق ہے جو تخلیق و تعلیم میں ہے۔ تخلیق و تسویہ بھی اس کے کرم سے ہے، اور تعلیم بھی اس کے کرم سے۔ لیکن تخلیق کی نسبت تعلیم بہت بڑا کرم ہے۔ اس لئے اس کے لئے اکرم (بہت زیادہ کرم کرنے والا) کا لفظ آیا ہے۔

# اَلْبَرُّ

اَلْبَرُّ کے معنی ہیں حدود فراموش وسعتوں کا مالک۔ زندگی میں کشادگی کی راہیں پیدا کرنے والا۔ یہ صفت بھی رحیم کے ساتھ آئی ہے۔ اہل جنت کے متعلق فرمایا کہ وہ کہیں گے۔

فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَوَقٰنَا عَذَابَ السَّمُوْمِ ۝ اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلُ نَدْعُوْهُ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْبَرُّ الرَّحِيْمُ ۝ ($\frac{52}{28-27}$)

سو اللہ نے ہم پر احسان فرمایا اور ہمیں عذاب سموم سے بچایا۔ ہم یقیناً اس سے پیشتر بھی اللہ کو پکارتے تھے۔ یقیناً وہ بہت بڑی وسعتوں کا مالک اور رحمت والا ہے۔

# اَلْحَفِيْظُ

(حفاظت کرنے والا)

اَلرَّقِيْبُ ——— (نگران)

اَلْمُهَيْمِنُ ——— (محافظ)

اَلْحَيُّ ——— (زندہ اور زندگی بخش)

اَلْقَيُّوْمُ ——— (قائم)

اَلْمُقِيْتُ ——— (محافظ۔ نگراں)

اللہ تعالیٰ جب تمام کائنات کا خالق۔ رزاق۔ پروردگار ہے۔ وہ ہر شے کا علم رکھتا ہے۔ خبیر و علیم ہے۔ تو ظاہر ہے کہ ہر شے کا نگران بھی وہی ہے۔ وَرَبُّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ حَفِيْظٌ ۝ ($\frac{34}{21}$ ز $\frac{11}{57}$) اور تیرا رب ہر شے کا نگران ہے۔

جب حضرت یعقوبؑ کے بیٹوں نے آپ سے کہا کہ حضرت یوسفؑ کا چھوٹا بھائی ان کے ساتھ کر دیا جائے اور وعدہ کیا کہ وہ اس کی حفاظت کریں گے تو آپ نے فرمایا کہ تم کیا حفاظت کرو گے۔ فَاللّٰهُ خَيْرٌ حٰفِظًا ص ($\frac{12}{64}$) اللہ بہترین

حفاظت کرنے والا ہے۔ سُورۂ بقرہ میں ہے کہ کائنات کی نگرانی و حفاظت میں اس کے لیے کوئی تھکاوٹ نہیں لَا یَئُوْدُہٗ حِفْظُھُمَا ج (۲/۲۵۵) اس لیے کہ لَا تَاْخُذُہٗ سِنَۃٌ وَّلَا نَوْمٌ ط (۲/۲۵۵) نہ اس کی آنکھوں کے لئے نیند ہے نہ دماغ کے لیے اُونگھ، وُہ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ہے (۲/۲۵۵ ز (۳/۱) ز (۲۰/۱۱۱) ز (۴۰/۶۵)

ایسا زندہ جس کی زندگی کے لئے فنا و زوال نہیں۔ ہر شے اس کے حکم سے قائم ہے۔ اور وہ اپنے قیام کے لئے کسی کا محتاج نہیں۔ وُہ ہر شے پر محافظ ہے کَانَ اللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ مُّقِیْتًا ۝ (۴/۸۵)

اَلْحَیُّ خُدا کی عظیم صفت ہے۔ کائنات میں سب سے اہم شے زندگی ہے۔ اہم کے علاوہ محیر العقول بھی۔ اس لئے کہ انسانی تحقیقات ابھی تک اس راز کو پا نہیں سکیں کہ زندگی کا سرچشمہ کیا ہے۔ قرآن نے بتایا کہ خدا کی ذات اَلْحَیُّ ہے۔ یعنی وُہ از خود زندہ ہے۔ اور دُوسروں کو زندگی عطا کرنے والا۔ ظاہر ہے کہ جب یہی صفت انسانی ذات میں منعکس ہو جائے تو خود اُس کی اپنی کیفیت کیا ہو جائے گی۔ اور اس کے نتائج کس قدر نفع بخش ہوں گے۔ اس کی اپنی کیفیت تو یہ ہوگی کہ وُہ موت سے بھی مر نہیں سکے گی۔ وُہ حیاتِ جاوید کی اہل ہو جائے گی۔ اور اس کے اثرات کا یہ عالم کہ وُہ دُوسروں کو سامانِ حیات عطا کریگی جو معاشرہ ایسے افراد پر مشتمل ہوگا اور جو نظام ان کے ہاتھوں سے متشکل۔ اس میں افرادِ انسانیہ کے لئے زندگی کا سامان فراوانی سے موجود ہوگا۔ نہ صرف طبعی زندگی کا۔ بلکہ انسانی زندگی کا بھی۔ یعنی اس میں تمام افراد کی نشوونما کا بھی سامان موجود ہوگا۔

## اَوَّلُ وَاٰخِرُ

اللہ تعالیٰ جہت زمان و مکان سے بلند و بالا ہے۔ جب کچھ نہ تھا تو وہ موجود تھا۔ جب کچھ نہ ہوگا تو وُہ موجود رہے گا۔ ھُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ (۵۷/۳) وُہ ازلی و ابدی ہے) ظاہر و باطن ہر جگہ موجود ہے۔ وَالظَّاھِرُ وَالْبَاطِنُ ج (۵۷/۳) ہر مقام پر حاضر و ناظر ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ شَہِیْدٌ ۝ (۲۲/۱۷)

(اللہ حاضر و ناظر ہے) اس سے کوئی شے پوشیدہ نہیں۔

## قَرِیْبٌ

جب وہ ہر مقام پر موجود ہے۔ تو یہ سمجھنا بھی غلط ہے۔ کہ وہ کسی خاص مقام پر مقیم ہے فرمایا:۔

وَاِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ط اُجِیْبُ دَعْوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ (۲/۱۸۶)

اور (اے رسول) جب میرا کوئی بندہ میری نسبت تم سے دریافت کرے (تو تم اسے بتلا دو کہ) میں اس کے قریب ہوں۔ وہ جب پکارتا ہے تو اس کی پکار سنتا اور قبول کرتا ہوں!

سورۂ ہود میں ہے کہ:۔

اِنَّ رَبِّیْ قَرِیْبٌ مُّجِیْبٌ ۝ (۱۱/۶۱)

یقیناً میرا رب قریب ہے اور پکار کا جواب دیتا ہے

سورہ سبا میں ہے:۔

اِنَّہٗ سَمِیْعٌ قَرِیْبٌ (۳۴/۵۰)

وہ سب کچھ سننے والا قریب ہے

وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْہِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ ۝ (۵۰/۱۶)

ہم انسان کی رگِ جان سے بھی قریب ہیں۔

اللہ تعالےٰ کی ذات کس طرح ہر جگہ موجود ہے اور ہماری رگِ جان سے بھی قریب ہے۔ اس کے متعلق ہم کچھ نہیں سمجھ سکتے۔ لیکن جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے۔ ہمارا اور خدا کا تعلق اُس کے قوانین کی رُو سے وابستہ ہے۔ اس لئے ہمیں یہ سمجھنا چاہیئے کہ اس کا قانونِ مکافات اس طرح محیط ہے۔ کہ ہم کہیں بھی ہُوں اور کسی حالت میں بھی ہوں، ہم اس (قانون) کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہو سکتے۔ حتیٰ کہ ہمارے دل میں گذرنے والے خیالات اور نگاہوں کی خیانت بھی

اس کی زد سے باہر نہیں رہ سکتی۔ بالفاظِ دیگر ہمارا ہر عمل۔ خیال اور ارادہ خدا کے قانون کے مطابق نتیجہ مرتب کر کے رہتا ہے۔

یہی کیفیت اس معاشرہ کی ہوگی جو قوانین خداوندی کے مطابق متشکل ہوگا۔ اس میں بھی ہر عمل نتیجہ خیز ہو کر رہے گا۔ نہ کسی کی محنت ضائع ہوگی۔ نہ مجرم پاداش عمل سے بچ سکے گا۔

## لَطِيْفٌ

لیکن اتنا قریب ہونے کے باوجود اتنا لطیف کہ نظر نہ آسکے۔

لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ ٥ (۶/۱۰۴)

اسے نگاہیں نہیں پا سکتیں۔ لیکن وہ تمام نگاہوں کو پا رہا ہے۔ وہ بڑا ہی باریک بین و آگاہ ہے۔

لَطِيْفٌ خَبِيْرٌ کے لئے دیکھئے (۳۱/۱۶ ز ۲۲/۶۳ ز ۶۷/۱۴ ز ۳۳/۳۴)

لطیف کے معنی نرمی کا برتاؤ کرنے والا بھی ہیں۔ اَللّٰهُ لَطِيْفٌۢ بِعِبَادِهٖ (۴۲/۱۹) اللہ اپنے بندوں پر (راہنمائی دینے میں) نرمی کا برتاؤ کرتا ہے۔ اِنَّ رَبِّيْ لَطِيْفٌ لِّمَا يَشَآءُ ط (۱۲/۱۰۰) یقیناً میرا رب اپنی مشیّت کے مطابق نرمی کا برتاؤ کرنے والا ہے۔

## اَلشَّهِيْدُ (حاضر و ناظر)

لطیف ایسا کہ نگاہوں سے اوجھل لیکن قریب ایسا کہ ہر جگہ حاضر و ناظر۔ اور ہر شے پر شاہد۔ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ٥ (۵۸/۶ نیز ۴/۳۳ ز ۵/۱۱۷ ز ۲۲/۱۷ ز ۳۴/۴۷ ز ۳۳/۵۶)

کوئی عمل بظاہر کیسا ہی چھپا ہوا کیوں نہ ہو۔ اللہ کے علم سے نہیں چھپ سکتا۔ کیونکہ وہ ہر عمل پر شاہد ہے۔ وَاللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰى مَا تَعْمَلُوْنَ ٥ (ز ۴۶/۱۱)

جب کوئی ایسا معاملہ سامنے آجائے۔ جس کے لئے کوئی گواہ نہ ملے تو اللہ اس پر

بھی شاہد ہوتا ہے۔

ایک مقدمہ میں داؤدؑ اور سلیمانؑ کا فیصلہ کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا ہے۔
وَكُنَّا لِحُكْمِهِمْ شٰهِدِيْنَ ۙ (۲۱/۷) اور ہم ان کے فیصلے پر شاہد تھے اور صرف اسی ایک فیصلہ پر شاہد نہیں۔ حق جہاں بھی ہو اللہ اس پر شاہد ہوتا ہے۔

حضورؐ کی رسالت پر گواہی

وَاَرْسَلْنٰكَ لِلنَّاسِ رَسُوْلًا ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ؀ (۴/۷۹)
(اے پیغمبر) ہم نے تمہیں تمام نوعِ انسانی کے لئے رسول بنا کر بھیجا ہے۔ اس پر اللہ کی شہادت کفایت کرتی ہے۔

ایسا پیغامبر جس کا پیغام رشد و ہدایت دنیا کے ہر آئین و مسلک پر غالب آنے والا ہو۔

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَي الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ؀ (۴۸/۲۸)
وہ ذات جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا تاکہ اسے تمام ادیانِ (عالم) پر غالب کرے۔ اور (اس حقیقت پر) اللہ کی شہادت کافی ہے۔

سلسلۂ رشد و ہدایت کی مختلف کڑیوں پر نگاہ ڈالئے، داعی الی الحق کی پہلی صدا، بظاہر ایک بے یار و مددگار کی صدا ہوتی ہے۔ لوگ عناد و شرارت کی بنا پر اس کی تکذیب کرتے ہیں۔ اور یوں حق و باطل میں مقابلہ شروع ہو جاتا ہے۔ ظاہری اسباب کی تمام قوتیں باطل کے ساتھ نظر آتی ہیں اور حق، بے کسی و بے بسی کے عالم میں دکھائی دیتا ہے۔ اس وقت محض دنیاوی اسباب و علل پر نگاہ رکھنے والوں میں سے کوئی شخص اس کی گواہی نہیں دیتا۔ کہ اس معرکہ میں حق کامیاب ہوگا۔ لیکن وہیں ایک ایسا شاہد بھی ہوتا ہے۔ جو علی الرّغم شہادت دیتا ہے کہ انجام کار فتح حق کی ہی ہوگی۔ اور پھر نتائج بتا دیتے ہیں کہ یہ شہادت کتنی بڑی صداقت پر مبنی تھی۔ فرمایا:۔

قُلْ اَيُّ شَيْءٍ اَكْبَرُ شَهَادَةً ۭ قُلِ اللّٰهُ ۣ شَهِيْدٌۢ

بَیْنِیْ وَ بَیْنَکُمْ قف وَ اُوْحِیَ اِلَیَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَکُمْ بِهٖ وَ مَنْۢ بَلَغَ ط اَئِنَّکُمْ لَتَشْهَدُوْنَ اَنَّ مَعَ اللّٰهِ اٰلِهَةً اُخْرٰی ط قُلْ لَّآ اَشْهَدُ ج قُلْ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّ اِنَّنِیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ۝ ( $\frac{6}{19}$ نیز $\frac{10}{29}$ $\frac{17}{96}$ $\frac{29}{52}$ $\frac{46}{8}$ )

اَے رسول - ان معاندین سے پوچھو کہ، کونسی چیز ہے جس کی گواہی سب سے بڑی گواہی ہے؟ تم کہدو کہ (اللہ کی گواہی ہے) اللہ میرے اور تمہارے درمیان گواہ ہے - اس نے مجھ پر اس قرآن کی وحی کی ہے تاکہ اس کے ذریعہ تمہیں اور انہیں جن تک اس کی تعلیم پہنچ جائے (باطل پرستی کے انجام سے) آگاہ کروں (اب کہو تمہارا کیا کہنا ہے) کیا تم گواہی دیتے ہو کہ خدا کے ساتھ دوسرے معبود بھی شریک ہیں؟ (اے پیغمبر) تم کہو (اگر تمہاری گواہی یہی ہے تو سن رکھو کہ) میں اس کی گواہی نہیں دیتا - میری گواہی یہی ہے کہ وہی معبود یگانہ ہے - اس کے سوا کوئی نہیں اور جو کچھ تم شریک ٹھہراتے ہو میں اس سے بیزار ہوں (بس اب ایک گواہی تمہاری ہوئی اور ایک میری) اور فیصلہ خدا کے ہاتھ ہے - تم دیکھو گے کہ فیصلہ کس کے حق میں ہوتا ہے!)

ان معاملات میں خدا کی شہادت کے معنی یہ ہیں - کہ جب قرآن پر علم و بصیرت کی روشنی میں غور و فکر کیا جائے گا - تو وہ اپنے من جانب اللہ ہونے کی شہادت آپ بن جائے گا - اسی طرح جب قرآنی نظام کے نتائج سامنے آئیں گے تو ان سے بھی اس امر کی شہادت مل جائے گی - اس سے آگے بڑھیے تو مومن کی زندگی اور جماعت مومنین کا کردار خود اس امر کی شہادت ہوگا کہ یہ لوگ حق کے علمبردار ہیں - حقیقت یہ ہے کہ ہر نشوونمایافتہ ذات، حق کی شاہد ہوتی ہے -

## اَلْحَسِیْبُ

جب وہ ہر عمل پر شاہد ہے - تو ظاہر ہے کہ تمام اعمال و افعال پر محاسبہ بھی اسی کا ہے - ایک ذرہ بھی اس کے قانونِ مکافاتِ عمل کے احاطہ سے باہر نہیں

ہو سکتا۔ اس کے علم کے سامنے ظاہر و باطن یکساں ہے۔ اس لئے کوئی عمل حدودِ مجازات سے باہر نہیں جا سکتا۔

وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ط (۲/۲۸۴ نیز ۱۵/۹۲) جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے۔ تم اسے ظاہر کرو۔ یا پوشیدہ رکھو۔ وہ تم سے اس کا محاسبہ کرتا ہے۔ اور اس کے لئے اسے کسی معاون و مددگار کی ضرورت نہیں۔ وہ حساب لینے کے لئے کافی ہے۔ وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا ۝ (۴/۶ نیز ۴/۸۶ و ۳۳/۳۹)

ایک ایک ذرّہ محاسبہ کی گرفت میں آجاتا ہے:-

وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْــًٔا ط وَاِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا ط وَكَفٰى بِنَا حٰسِبِيْنَ ۝ (۲۱/۴۷)

اور ظہورِ نتائج کے وقت ہم انصاف کی ترازو کھڑی کر دیں گے۔ اس میں کسی کے ساتھ ذرا بھی ناانصافی نہ ہوگی۔ اگر رائی برابر بھی کسی کا عمل ہوگا تو ہم اسے وزن میں لے آئیں گے۔ جب ہم (خود) حساب لینے والے ہوں تو پھر اس کے بعد باقی کیا رہا۔

وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ ط وَنُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰىهُ مَنْشُوْرًا ۝ اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ط كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا ۝ (۱۷/۱۳-۱۴)

اور ہم نے ہر انسان کی شامت خود اس کی گردن میں باندھ دی ہے (کہیں باہر سے آکر نہیں گرتی)، قیامت کے دن ہم (ان کے نامۂ اعمال کی) ایک کتاب نکال کر پیش کریں گے۔ وہ اسے اپنے سامنے کھلا دیکھ لے گا۔ اور ہم کہیں گے اپنا نامۂ اعمال پڑھ لے۔ آج کے دن خود تیرا نفس ہی تیرے احتساب کے لئے کافی ہے۔

جہنم کی آگ خود انسانی اعمال ہی کی بھڑکائی ہوئی ہوتی ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں:-

اہلِ دُنیا جہاں جو آتے ہیں
اپنے انگارے ساتھ لاتے ہیں

اسی کو دُوسرے الفاظ میں یُوں کہا گیا ہے کہ ہر شخص کا حساب خُدا کے ذمہ ہے:-

إِنَّ إِلَيْنَا إِيَابَهُمْ ۝ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُمْ ۝ (۸۸/۲۵-۲۶)

یقیناً ان (تمام انسانوں) کو ہماری طرف لوٹنا ہے۔ اور ان سب کا حساب ہمارے ذمہ ہے۔

جب انسانی معاشرہ کی تشکیل ان افراد کے ہاتھوں سے ہو۔ جن کی ذات، صفاتِ خداوندی کی آئینہ دار ہو۔ تو اس میں ہر شخص کے اعمال کا محاسبہ ہوتا رہے گا۔ نہ کسی کا حسنِ عمل بلا نتیجہ رہے گا۔ نہ جُرم چُھپ سکے گا۔ اس میں نہ کسی کی رعایت ہوگی۔ نہ کسی کے ساتھ زیادتی۔

میزانِ عدل ہوگی اور لوگوں کے اعمالِ حیات۔

## اَلشَّاکِرُ
## اَلشَّکُوْرُ

اَلشَّاکِرُ اور اَلشَّکُوْرُ کے معنی ہیں۔ اعمالِ انسانی کی ان کی حیثیت کے مطابق قدر کرکے ان کا بدلہ دینے والا۔

سُورۂ فاطر میں فرمایا کہ جو لوگ کتاب اللہ کی اتباع میں نظامِ صلوٰۃ قائم کرتے ہیں۔ اور زکوٰۃ کا انتظام کرتے ہیں۔ وہ اپنا اثاثہ ایک ایسی تجارت میں لگاتے ہیں جس میں کبھی نقصان نہیں ہوسکتا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ بابِ تجارت کھولا ہی اس لئے ہے:-

لِيُوَفِّيَهُمْ أُجُورَهُمْ وَيَزِيدَهُم مِّن فَضْلِهِ ۚ إِنَّهُ غَفُورٌ شَكُورٌ ۝ (۳۵/۳۰)

تاکہ وُہ (ان کے اعمال کا پُورا پُورا بدلہ انہیں دے۔ اور اپنے فضل سے اس پر اضافہ بھی کرے۔ یقیناً وہ سامانِ حفاظت کرنے والا۔ (اعمال کا) بہترین بدلہ دینے والا ہے۔

# اَلسَّلَامُ ـــــ اَلْمُؤْمِنُ

قرآنِ کریم نے انسانی زندگی کی انتہائی کامیابیوں کو ایک جامع لفظ میں بیان کیا ہے اور وُہ لفظ ہے سلام۔ غور کیجئے تمام انسانی جدّوجہد کا مقصود اور اس کی ساری تگ و تاز کا مفہوم اس کے سوا اور کیا ہے کہ اسے سلامتی حاصل ہو۔ امن و سکون کی زندگی۔ اطمینان و سلامتی کی زندگی۔ وُہ زندگی جس میں کوئی خوف و حزن نہ ہو۔ کسی قسم کا رنج و ملال نہ ہو۔

وہ فریبِ سکون نہیں جو آرزوؤں کے فنا اور خواہشات کے ترک کر دینے سے حاصل ہوتا ہے۔ بلکہ وُہ اطمینانِ قلب جو تسخیرِ کائنات کے بعد رضا جوئی باری تعالیٰ سے میسّر ہوتا ہے۔ اسی لئے خُدا کی صفات اَلسَّلَامُ اَلْمُؤْمِنُ (۵۹/۲۳) (امن و سلامتی کا عطا کرنے والا) بھی ہے۔ واضح رہے کہ سلام کے معنی امن و سلامتی کے علاوہ کسی شے کو مکمل کر دینے کے بھی ہیں۔ خُدا کی ذات مکمل ترین ہے۔ جو انسان اُس کے قوانین کی اطاعت کرتا ہے۔ اُس کی ذات بھی مکمّل ہو جاتی ہے۔ یہ ہے وُہ سلام (مکمّل ہو جانا) جس کی طرف خُدا کا نظام دعوت دیتا ہے۔

وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ ۚ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ (۱۰/۲۵)

اور اللہ سلامتی کے گھر کی طرف بلاتا ہے۔ اور جو چاہتا ہے اُسے (اپنے قانونِ مشیّت کے مطابق) سلامتی کی سیدھی راہ پر لگا دیتا ہے۔

وَهٰذَا صِرَاطُ رَبِّكَ مُسْتَقِيْمًا ۭ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ ۝ لَهُمْ دَارُ السَّلٰمِ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَهُوَ وَلِيُّهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ (۶/۱۲۷-۱۲۸)

اور یہ تمہارے پروردگار کی سیدھی راہ ہے۔ بے شک ہم نے ان لوگوں کے لئے جو نصیحت و موعظت پر دھیان دینے والے ہیں (راہِ حق کی) نشانیاں تفصیل کے ساتھ بیان کردی ہیں۔ ان لوگوں کے لئے ان کے پروردگار کے نزدیک سلامتی اور عافیت کا گھر ہے۔ اور ان کے حسن اعمال کی وجہ سے اللہ ان کا رفیق و مددگار ہے۔

یہی وہ راہِ راست ہے۔ جس پر چلنے والوں کے لئے سلامتی ہے۔ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰی ه (۲۰/۴۷) اور الہدیٰ (خدا کی ہدایت) اب قرآن کریم کے علاوہ اور کہیں نہیں۔ اس لئے جس شب مبارک میں امن و سلامتی کے پیغام کا نزول شروع ہوا۔ اس کے متعلق فرمایا:۔

سَلٰمٌ ۛ هِیَ حَتّٰی مَطْلَعِ الْفَجْرِ ه (۹۷/۵)

(اس شب مبارک میں) تمام اُمور میں سلامتی ہی سلامتی ہے۔ یہانتک کہ طلوع فجر ہو جائے۔

قرآن کریم مسلمانوں کی ذہنی و قلبی تعلیم کا مرکز ہے اس لئے وہ سرتاپا امن و سلامتی کا سرچشمہ ہے۔ ملتِ اسلامیہ کا سیاسی مرکز کعبہ ہے۔ اس لئے وہ بھی امن و عافیت کا کفیل ہے۔ وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا (جو کوئی اس کی حدود میں داخل ہوگیا۔ امن و حفاظت میں آگیا) غور کیجئے! دنیا کو ایسے خطۂ ارض کی کتنی ضرورت ہے۔ جہاں تک کسی مستبد کے دستِ استبداد کی رسائی نہ ہو۔ جہاں پہنچ کر انسان کامل حریت و آزادی کی فضا میں سانس لے۔ جہاں اسے کسی قسم کا خوف و حزن نہ ہو۔ جہاں اس کا سب کچھ محفوظ ہو۔ یہ امن و عافیت کا مرکز کعبہ ہے۔ اس لئے کہ وہ دنیا میں حکومتِ خداوندی کا مستقر ہے اور یہ ظاہر ہے کہ جس نظام کا مرکز امن و سلامتی کا سرچشمہ ہو اس کا دائرہ از خود امن و عافیت کا کفیل ہوگا۔ اگر قلب و زبان اور الفاظ و اعمال میں ہم آہنگی نہ ہو تو ان الفاظ کا قرآنی میزان میں کوئی وزن نہیں ہو سکتا۔ بلکہ یہ وہ منافقت ہے۔ جو خدا کے ہاں بدترین لعنت کی متوجب ہے۔

كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ه (۶۱/۳)

"اللہ کے نزدیک یہ بہت بُری بات ہے کہ تم زبان سے وہ کچھ کہو جس پر تمہارا عمل شاہد نہ ہو"

اس لئے کہ اسلامی معاشرت میں "السّلام علیکم" صرف دو الفاظ کا مجموعہ نہیں بلکہ سوسائٹی کے افراد کے قلبی تعلّقات کا مظہر ہے۔ وہ تعلّقات جو باہمی مودّت و مواخات، باہمی خواہی اور سلامت روی کی بنیادوں پر استوار ہوں۔ چونکہ ملّتِ ابراہیمی کا نام اسلام ہے۔ اس لئے اس کے طریق سلام و تہنیت کا سلسلہ بھی حضرت ابراہیمؑ تک جا ملتا ہے۔

قرآنِ کریم کا ارشاد :-

وَاِذَا جَآءَكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِنَا فَقُلْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۙ (۶/۵۴)

اور (اے پیغمبر) جب وہ لوگ تمہارے پاس آئیں جو ہماری آیاتپر ایمان رکھتے ہیں تو تم ان سے کہو تم پر سلام ہو تمہارے ربّ نے اپنے اوپر رحمت لازم ٹھہرا دی ہے۔

یعنی افرادِ اُمّت کے لئے امن و سلامتی کی آرزوئیں اور ان کی تکمیل کے لئے عملی پروگرام کا تعیّن خود مرکزِ ملّت کی طرف سے ہونا چاہیئے۔

اَلْاَعْلٰى (بالاتر)
اَلْعَظِيْمُ (صاحبِ عظمت)
اَلْعَلِيُّ (برتر)
اَلْمُتَعَالُ (بلند مرتبہ)

صفحۂ ارض پر سب سے زیادہ بلند مرتبت ہستی انسان کی ہے۔ کائنات میں اسی کو یہ شرف بخشا گیا کہ اسے ذات عطا کی گئی۔ انسانیت کی میزان میں اس شخص کو سب سے زیادہ عالی مرتبت سمجھا جاتا ہے جس کی ذات (PERSONALITY) سب سے زیادہ نشوونما (DEVELOPED) ہو۔ اللہ کی ذات مکمل ترین ہے اس لئے اس کا مقام بھی بلند ترین ہے۔ جس عظمت اور بلندی کا مالک وہ ہے اس کا تصوّر بھی انسان نہیں کرسکتا۔ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ (۲/۲۵۵ نیز ۴۲/۴)

اور وہ ذات سب سے بلند اور عالی مرتبت ہے۔ عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ

الْكَبِيْرُ الْمُتَعَالِ ۝ (۱۳/۹) غیب و شہادت کا جاننے والا۔ سب سے بڑا بلند مرتبہ، عالم اور ساتھ حکیم بھی۔ اِنَّهٗ عَلِیٌّ حَکِیْمٌ ۝ (۴۲/۵۱) بے شک وہ صاحبِ حکمت و مرتبت ہے۔ علم و حکمت سے آگے بڑھ کر انسان کے نزدیک بلندی مرتبت کا معیار حکومت و سطوت ہے (۴۳/۴) جتنا بڑا صاحبِ حکومت اتنا ہی بڑا صاحبِ مرتبت۔ لیکن قرآنِ کریم اللہ کے سوا کسی کی حکومت کو تسلیم ہی نہیں کرتا۔ اس لئے جب حکومت اس کی ہے تو بلندی و کبریائی کے شایانِ شان بھی وہی ہے۔ فَالْحُکْمُ لِلّٰهِ الْعَلِیِّ الْکَبِیْرِ ۝ (۴۰/۱۲) حکومت تمام اس خدا کی ہے جو بلند مرتبہ صاحب (جبروت) کبریائی ہے۔ اس حکومت میں اس کا کوئی شریک نہیں۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّ مَا یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ هُوَ الْبَاطِلُ وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْعَلِیُّ الْکَبِیْرُ ۝

(۲۲/۱۲ نیز ۳۱/۳۰، ۳۴/۳۲)

یہ اسی لئے ہے کہ حق اللہ ہی کی ہستی ہے اور جن ہستیوں کو یہ اس کے سوا پکارتے ہیں باطل ہیں اور اس لئے بھی کہ اللہ ہی کی ہستی بلند مرتبہ بڑائی والی ہے!

وہی جہاندارِ حقیقی ہے۔ بادشاہِ حقیقی فقط وہی ہے۔ فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ج (۲/۱۱۴ و ۲۳/۱۱۶) "بس ہر طرح کی بلندی اللہ کے لئے ہے"۔ انسان کے لئے یہی زیبا ہے کہ ساری دنیا سے بڑا ہو کر، اس بڑائی کے مالک (خدا) کے سامنے جھکے۔ کائنات کی ہر شے اس کے تابع فرمان ہو۔ لیکن یہ اس شاہنشاہِ حقیقی کے متعین فرمودہ پروگرام کی تکمیل میں سرگرمِ عمل رہے۔ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِیْمِ ۝ (۵۶/۷۴ : ۵۶/۹۶) "اپنے عظمتوں والے پروردگار کے نام کی برتری و بلندی دنیا میں ثبت کر"۔ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى ۝ لا (۸۷/۱) اس لئے کہ کوئی اس کی برابری کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ وہ اس سے بہت بلند ہے۔ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا یُشْرِكُوْنَ ۝ (۱۶/۱) اس کی ذات شرک سے پاک اور بلند ہے۔ ان تمام باتوں سے منزہ اور بلند جو انسانی ذہن اس کی

طرف منسوب کرتا ہے۔ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَصِفُوْنَ ۝ (۶/۱۰۱) ان تمام ہفوات سے پاک اور برتر جو اس کے متعلق جہالت کی بنا پر کہی جاتی ہیں۔ سُبْحٰنَهٗ وَتَعَالٰى عَمَّا يَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا كَبِيْرًا ۝ (۱۷/۴۳)

ظاہر ہے کہ جب خدائے بلند و برتر اس درجہ عالی مرتبت ہے۔ تو دنیا میں اس کی حکومت قائم کرنے والے بندے بھی کس بلندی پر ہوں گے۔ ایسی بلندی پر کہ کوئی قوم ان کی گرد تک بھی نہ پہنچ سکے۔ انہی کے متعلق کہا کہ:-

وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝

مت ہمت ہارو۔ بالکل غمگین نہ ہو۔ تم ہی سب سے برتر و اعلیٰ ہو۔ بشرطیکہ تم سچے مومن ہو!

جس جماعت کی شان میں حکیم الامتؒ فرماتے ہیں:-

مومنے بالائے ہر بالا ترے
غیرت او بر نتابد ہمسرے

جس طرح ان کا خدا تمام موجودات میں اپنے علو مرتبت اور رفعت شان کے لحاظ سے وحدہٗ لاشریک ہے۔ اسی طرح اس کے بندوں کی یہ جماعت تمام نوعِ انسانی میں اپنا شریک و حریف نہیں رکھتی۔ اقبالؒ فرماتے ہیں:-

خرقۂ لاتحزنوا اندر برش | انتم الاعلون تاجے بر سرش
میکشد بار دو عالم دوشِ او | بحر و بر پروردۂ آغوشِ او
پیشِ باطل تیغ و پیشِ حق سپر | امر و نہی او عیارِ خیر و شر
در فضائے ایں جہانِ ہائے و ہو | نغمہ پیدا نیست جز تکبیرِ او

لیکن اس ملت کی یہ رفعت اور بلندی سرکشی و تمرد کی پیدا کردہ نہ ہوگی۔ نہ اسے پیدا کرنے کا سبب خوئے فرعونی جس کا دعویٰ تھا کہ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى ۝ (۷۹/۲۴) "میں تمہارا پروردگار ہوں" سب سے بڑا۔ لیکن اس کا یہ دعویٰ خود فریبی پر مبنی تھا۔ تمرد و سرکشی کبھی حقیقی بڑائی نہیں ہو سکتی۔ بڑائی وہی بڑائی ہے۔ جو قوانینِ خدا کے سامنے جھکنے سے حاصل ہو۔ قیام وہی قیام ہے۔ جس کے ساتھ

سجدہ بھی شامل ہو۔ حقیقی بڑائی فرعون کا حصہ نہ تھی۔ حضرت موسیٰؑ کا حصہ تھی۔
جب ساحرینِ فرعون سے مقابلہ ہوا اور حضرت موسیٰؑ نے ہراس محسوس کیا۔ کہ لوگ ساحرین کے جادو سے متاثر نہ ہو جائیں تو ارشاد ہوا کہ لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰى ٥ (۲۰/۶۸) "اندیشہ نہ کرو یقیناً تم ہی غالب رہو گے"۔ اس لئے کہ حقیقی غلبہ کے لئے صداقت ضروری ہے۔ اور صداقت حضرت موسیٰؑ کے ساتھ تھی آل فرعون کے ساتھ نہ تھی۔ اسی لئے حق و صداقت کی مخالفت کرنے والوں کے منصوبے ہمیشہ پست ہو جاتے ہیں۔ اور اللہ کی بات بلند رہتی ہے۔

وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰى ط وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا ط وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ٥

اور اس نے (بالآخر) کافروں کی بات پست کی۔ اور اللہ ہی کی بات ہے جس کے لئے بلندی ہے اور اللہ غالب حکمت والا ہے۔

لہٰذا ہر قسم کی بڑائی اور عظمت، اللہ کے لئے، اللہ کے دین کے لئے اور اس ملت کے لئے ہے۔ جو دنیا میں اس کے دین کے تمکن کا باعث ہو۔

اَلْمَتِيْنُ (قوت والا)
اَلْعَزِيْزُ (زبردست۔ غالب)

عزت کے معنی بھی قوت کے ہیں۔ لیکن ایسی قوت جس کے ساتھ غلبہ بھی شامل ہو۔ اس لئے عزیز کے معنی صاحبِ غلبہ ہوں گے۔ متانت میں بھی قوت کا مفہوم پنہاں ہے لیکن ایسی قوت جس میں کہیں ڈھیل نہ ہو۔ کسر نہ ہو، اس لئے متین ایسا صاحبِ قوت ہو گا۔ جس کی تدابیر مضبوط و محکم ہوں۔

اللہ تعالیٰ تمام قوتوں کا مالک اور متین و مقتدر ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ ٥ (۵۱/۵۸)

یقیناً اللہ رزق دینے والا۔ محکم قوتوں کا مالک ہے۔

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کے لئے عزیز کا لفظ متعدد مقامات پر استعمال ہوا ہے کہیں عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ہے (۲/۲۴۰) یعنی وہ ذات جس کا غلبہ معاذ اللہ اندھا دھند قوت کے بل بوتے پر مبنی نہیں۔ بلکہ سراپا حکمت و اصلاح پر مبنی ہے۔

کہیں عَزِیْزٌ ذُو انْتِقَامٍ (۳/۴) یعنی اس کا غلبہ اس لئے ہے کہ قانونِ مکافات کی رُو سے اعمال کی جزا و سزا پُورے پُورے طریق پر دی جا سکے۔ کمزور کی حکومت میں نہ حقدار کو حق ملتا ہے نہ مجرمین کو پاداشِ عمل اس لئے مجازات کے لئے محکم غلبہ اور پائیدار تسلّط کی ضرورت ہے۔ اسی لئے لَقَوِیٌّ عَزِیْزٌ بھی آیا ہے (۲۲/۴۰) یعنی اس کا غلبہ یونہی اتفاقی طور پر عمل میں نہیں آ گیا۔ بلکہ اس کی لامحدود قوتوں کا نتیجہ ہے۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعِزَّةَ فَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ جَمِيْعًا ط (۳۵/۱۰)

جو عزّت کا متلاشی ہے اُسے معلوم ہونا چاہیئے کہ تمام کی تمام عزّت اللہ کے لئے ہے۔

وُہ عزّت کے متلاشیوں کو عزّت عطا کرتا ہے۔ لیکن کیسے؟

اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ ط (۳۵/۱۰)

نوعِ انسانی کے لئے منفعت بخش نظریاتِ زندگی اس کی طرف بلند ہوتے ہیں۔ اور وُہ عملِ صالح اس کو اوج اور رفعت عطا کرتا ہے۔

عزّت تمام اللہ کے لئے ہے اور (اس کی عطا فرمودہ) اس کے رُسول اور جماعتِ مومنین کے لئے کہ وُہ اس کتاب کے وارث و متبع ہیں۔ جو خود عزیز ہے وَ اِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيْزٌ (۴۱/۴۱) اس میں شُبہ نہیں کہ بظاہر ہمیں نظر آتا ہے۔ کہ اس کتاب کے منکرین بھی صاحبِ عزّت و قوّت ہیں۔ لیکن ان کی عزّت جھوٹے نگوں کی مینا کاری ہے جو ظاہر بین نگاہوں کو خیرہ کر سکتی ہے۔ لیکن سچے معیار کی آزمائش کی کبھی تاب نہیں لا سکتی۔

یہ سب کچھ اس لئے کہ ان لوگوں نے عزّت و تکریم کے غلط معیاروں سے اپنے آپ کو فریب دے رکھا تھا۔

عزّت کا معیار صرف یہ ہے کہ

وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ۔ (۶۳/۸)

تمام تر عزّت اللہ اور اس کے رُسول اور جماعتِ مومنین کے لئے ہے

لہٰذا جو قوم دُنیا میں ذلت کی زندگی بسر کرے وُہ کبھی جماعتِ مومنین نہیں ہو سکتی۔

# اَلْبَارِئُ ـــــ اَلْمُصَوِّرُ

سُورۂ حشر میں ہے:-

ھُوَ اللّٰہُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ۔ (۵۹/۲۴)

اللہ خالق بارؔی اور مُصوّر ہے۔

ایک نشوونما یافتہ ذات کی بُنیادی خصوصیّت تخلیق (CREATION) ہے۔ اللہ تعالیٰ کی صفتِ خالقیت کے متعلق (شروع میں) لکھا جا چکا ہے اَلْبَارِئُ اور اَلْمُصَوِّرُ بھی درحقیقت عملِ تخلیق کے مراحل سے متعلق ہیں۔ تخلیق کے معنی ہیں مختلف عناصر میں خاص تناسب اور ترتیب سے ایک نئی چیز بنا دینا۔ اس ترتیب نو میں حشو و زوائد کو الگ کیا جاتا ہے۔ یہ باری کی صفت ہے۔ اس کے بعد ایک خاص شکل (FORM) عطا کرنا صفتِ مصوّریت (صُورت گری اور نقوش سازی) ہے۔ انہی مراحلِ تخلیق و تسویہ کو دُوسری جگہ ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

اَلَّذِیْ خَلَقَكَ فَسَوّٰىكَ فَعَدَلَكَ ۙ فِیْٓ اَیِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ ؕ (۸۳/۸۵)

وُہ پروردگار (جس نے تمہیں پیدا کیا۔ پھر ٹھیک ٹھیک دُرست کر دیا پھر اعضا و جوارح میں) اعتدال و تناسب پیدا کیا۔ پھر جیسی صورت بنانا چاہی اس کے مطابق ترکیب دے دی!

پہلا مرحلہ تخلیق۔ اس کے بعد عیوب و نقائص کو دُور کر کے تناسب و موزونیت کا پیدا کرنا۔ اور آخرالامر نوک پلک دُرست کر کے صحیح صحیح نقشہ مُرتّب کر دینا جس سے اس میں حسن و جمال کی تمام رعنائیاں سمٹ کر نادرکاری کا زندہ اعجاز بن جائیں وَلَکُمْ فِیْهَا جَمَالٌ (۱۶/۶) یہ آخری مرحلہ مصوّریت

---

۱؎ یہ لفظ سُورۂ بقرہ میں دو مرتبہ آیا ہے۔ ملاحظہ ہو (۲/۵۴)

ہے ھُوَ الَّذِیْ یُصَوِّرُکُمْ فِی الْاَرْحَامِ کَیْفَ یَشَآءُ ط (۔۔۔) وُہ ذات جو رحم (مادر) میں اپنی مشیّت کے مطابق تمہاری صُورت آرائی کرتی ہے۔ ایسی متنوّع صُورت گری کہ ایک کا نقشہ دُوسرے سے نہیں ملتا۔ اور ایسا تناسب کہ دیکھنے، سُونگھنے، سانس لینے کے "آلات" جو اگر محض پُرزوں کی مانند بے ڈول بے ڈھنگے ہوتے تو بھی طبعی ضروریات اسی طرح پُوری ہو جاتیں۔ ہزاروں جاذبیتوں کے حسین وجمیل پیکر بن گئے۔ وَصَوَّرَکُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَکُمْ (۶۴/۳) "اُس نے بہترین صُورت میں تمہاری صُورت گری کی۔"

کیا یہ (معاذ اللّٰہ) کسی "اندھی فطرت کی کرشمہ زائی قرار دی جا سکتی ہے؟ اگر کسی جاذبِ نگاہ تصویر کی سحرکاری و ندرت آفرینی مصوّر کے حسنِ کمال کی مُنہ بولتی شہادت سمجھی جا سکتی ہے۔ تو کیا اس تمام نگارخانۂ رنگ وتعطر کی رعنائی و زیبائی اس کے خالق کی فقید المثال کاریگری کی دلیل نہیں ٹھہرائی جا سکتی؟ خالق اور خالق کے ساتھ پھر باری اور مصوّر بھی۔ فَتَبَارَکَ اللّٰہُ اَحْسَنُ الْخَالِقِیْنَ۔

# اَلْوَاسِعُ

علم الافلاک کے ماہرین بتاتے ہیں۔ کہ جب وُہ اجرام سماوی میں سے کسی ایک کے نظام پر غور کرتے ہیں۔ تو اس کی لامحدُود وُسعتوں کو دیکھ کر انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں کہ اس کائنات کی حدُود و قیُود کہاں تک پھیلی ہُوئی ہیں!

یہ اس کارگہ عالم کے ایک شعبہ کے ایک ضمنی گوشے کا حال ہے۔ ذرا تصوّر میں لائیے کہ یہ تمام و کمالِ کائنات کیا ہوگی؟ لیکن وُہ تصوّر کہاں سے لایا جائے جس میں ان بے پناہ وُسعتوں کا خاکہ بھی سما سکے۔ اور جب کائنات کا یہ عالم ہے تو خُود خالقِ کائنات کی وُسعتیں کس کے حیطۂ تصوّر و قیاس و گمان و وہم میں سما سکتی ہیں! ایسی بے پایاں وُسعتوں کا مالک۔ بلاحدُود وسعتیں۔ بلاقیود پہنائیاں۔ ایسے خُدا کے لئے مکان اور جہت کی نسبت؟

سُبْحَانَ اللّٰہِ تَعَالٰی عَمَّا یَصِفُوْنَ۔ حقیقت یہ ہے کہ جہت اور مکان کی نسبت اجسام کے لئے درست قرار پاسکتی ہے۔ ذات ان نسبتوں سے بلند ہوتی ہے۔

وَلِلّٰہِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْہُ اللّٰہِ اِنَّ اللّٰہَ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ ○ (۲/۱۱۵)

(اور دیکھو) مشرق ہو یا مغرب (ساری دنیا) اللہ ہی کے لئے ہے جہاں کہیں بھی تم ہو وہ تمہارے سامنے ہے۔ بلاشبہ اس کی قدرت کی وسعت بڑی ہی وسعت ہے۔ اور وہ سب کچھ جاننے والا ہے۔

قرآن میں اللہ کی وَاسِعٌ کی صفت بالعموم عَلِیْمٌ کے ساتھ آتی ہے۔ (۲/۲۴۷، ۲/۲۶۸، ۳/۷۲، ۵/۵۴) لہٰذا یہ وسعت درحقیقت اس کے علم و حکمت کی وسعت ہے۔ چونکہ یہ وسعت لامحدود ہے اس لئے ہمارا محدود ذہن اس کا تصور نہیں کر سکتا۔ البتہ اتنا تو ہم بھی جانتے ہیں کہ جسم کے مقابلہ میں انسانی ذات کی دنیا کس قدر وسیع ہے۔ ہمارے تصورات و خیالات کہاں کہاں پہنچتے ہیں) اس کا اندازہ ہی نہیں کیا جا سکتا۔

خدا کے علم کی وسعتوں سے نیچے اتر کر اگر ہم اپنی معاشی اور معاشرتی دنیا میں اس کا نظارہ کرنا چاہیں تو قوانینِ خداوندی کے مطابق معاشرہ متشکل کر کے دیکھیں کہ کس طرح ایک ایک دانہ سات سات سو میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

اسی لئے فرمایا کہ احکامِ خداوندی کے اتباع میں یہ فکر دامنگیر نہیں ہونی چاہیئے کہ کھانے کو کہاں سے ملے گا؟ نظامِ معاشرت و معیشت خدائی خطوط پر متشکل کر لو۔ پھر دیکھو کہ اس کی وسعتیں کس طرح بے حساب دیتی ہیں۔ (۴/۱۳۰، ۲۴/۳۲)

# اَلْوَهَّابُ

موہبت ایسے عطیۂ کو کہتے ہیں۔ جو نہ کسی غرض کے لئے دیا جائے۔ نہ معاوضہ کی خاطر۔ کائنات میں انسانی نشو و نما کے لئے جس قدر سامان موجود ہے وہ سب خدا کی طرف سے اسی قسم کا عطیۂ ہے۔ اس لئے خدا کی صفت اَلْوَهَّابُ

ہے۔انسانی نشوونما میں، سامانِ زیست کے علاوہ، وحی کی راہ نمائی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ یہ بھی خُدا کی طرف سے موہبتہً ملتی ہے۔ اس میں نہ دینے والے (خُدا) کی طرف سے کسی معاوضہ کا سوال ہوتا ہے۔ نہ لینے والے (نبی) کے کسی کسب و ہُنر کا دخل، یہی وُہ راہنمائی ہے۔ جس کی رہروِ حیات کو ہر وقت ضرورت رہتی ہے۔ اسی لئے جماعتِ مومنین کی دُعا یہ ہوتی ہے کہ

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَیْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ؕ (۳/۸)

اے پروردگار! ہمیں سیدھے راستے پر لگا دینے کے بعد ہمارے دلوں کو ڈانواڈول نہ کر اور ہمیں اپنے پاس سے رحمت عطا فرما۔ یقیناً تو ہی ہے۔ کہ بخشش میں تجھ سے بڑا کوئی نہیں۔

انسانی دُنیا میں، جن افراد کی ذات، اس صفتِ خُداوندی کی آئینہ دار ہوگی۔ ان کی کیفیت بھی یہ ہوگی کہ وُہ باقی افرادِ انسانیہ کو سامانِ زیست بلا مزدو معاوضہ عطا کریں گے۔ اسی کا نام نظامِ ربوبیت ہے۔ جو جماعتِ مومنین کے ہاتھوں متشکل ہوتا ہے۔

## اَلْغَنِیُّ

اِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِیٌّ عَنْكُمْ ۫ وَلَا یَرْضٰی لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ ۚ وَاِنْ تَشْكُرُوْا یَرْضَهُ لَكُمْ ؕ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی ؕ ثُمَّ اِلٰی رَبِّكُمْ مَّرْجِعُكُمْ فَیُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ؕ اِنَّهٗ عَلِیْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۳۹/۷﴾

اگر تم کفر کرو گے تو اللہ (کو تمہارے ایمان کی ضرورت نہیں وُہ) تم سے بالکل بے نیاز ہے (صرف اتنی بات ہے کہ) وہ اپنے بندوں کے لئے کفر پسند نہیں کرتا (یعنی کفر بندوں کے لئے فائدہ رساں نہیں ہوتا) اور اگر تم سپاس گزاری کرو گے تو وُہ اسے تمہارے لئے پسند کرے گا۔

(یعنی اس کا فائدہ تمہیں ہوگا) کوئی شخص کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا پھر (آخرالامر) تم سب کو اپنے رب کی طرف لوٹنا ہے۔ وہ تمہیں بتا دے گا۔ جو کچھ تم نے کیا ہوگا۔ وہ تو دلوں کے بھیدوں (تک) سے واقف ہے۔

شکر اور کفر۔ سپاس گزاری سب انسان کی اپنی ذات کے لئے ہے۔

وَمَنْ یَّشْکُرْ فَاِنَّمَا یَشْکُرُ لِنَفْسِہٖ ج وَمَنْ کَفَرَ فَاِنَّ اللّٰہَ غَنِیٌّ حَمِیْدٌ ۝ (۳۱/۱۲ نیز ۲۷/۴۰)

جو شکر (نعمت) کرے گا۔ تو (اس کا نتیجہ) اس کی اپنی ذات کے لئے ہوگا۔ اور جو انکار کرے گا (تو اس کا وبال اسی پر پڑے گا) یقیناً اللہ (تمہارے کفر و شکر سے) بے نیاز و ستودہ صفات ہے۔

عرصۂ حیات میں جدّوجہد اور سعی و عمل خود انسان کے اپنے نفع کے لئے ہے۔ جو صحیح انداز میں کوشش کرے گا۔ اس کے نتائج سے خود متمتع ہوگا۔ جو ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ جائے گا۔ اس کے عواقب سامنے آجائیں گے۔

زمین و آسمان میں سب کچھ اسی کا ہے۔ وہ جملہ کائنات کا مالک اور خالق ہے۔ وہ احتیاج اور ضرورت کی لطیف سے لطیف نسبت سے بھی پاک اور بلند ہے۔ وہ غنی عن العلمین ہے۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ ذات (PERSONALITY) کی بنیادی خصوصیات حریت اور استغنا (FREEDOM AND INDEPEN DANCE) ہے ایک نشوونما یافتہ ذات، خود مکتفی اور دوسروں کے سہاروں سے بے نیاز ہوتی ہے۔ لہٰذا خدا کی ذات کسی کی محتاج کس طرح ہو سکتی ہے؟ یہی کیفیت ان لوگوں کی ہوگی۔ جن کی ذات، صفاتِ خداوندی کی آئینہ دار ہوگی۔ وہ بھی دنیا میں کسی کے محتاج نہیں ہوں گے۔ اور جو معاشرہ ان لوگوں کے ہاتھوں سے متشکل ہوگا۔ وہ بھی دوسروں کے سہاروں سے مستغنی ہوگا۔

---

# اَلْفَتَّاحُ

فتح کے معنی ہیں کھولنا۔ حق و باطل میں تمیز کرنا۔ یہیں سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے۔ کہ جس چیز کو قرآن کریم فتح کہتا ہے۔ اس کا صحیح مفہوم کیا ہے۔ قرآنِ کریم کی رُو سے یہ فطرت کا اٹل قانون ہے۔ کہ حق غالب رہے گا۔ اور باطل مغلوب ہوگا۔ جس مقام پر جس معرکہ میں حق اور باطل کی یہ فطری تمیز کھل کر سامنے آجائے۔ اسے فتح کہیں گے۔ اس لئے قرآنِ کریم جہاں مومنین کے لئے فتح کا ذکر کرتا ہے اس سے مفہوم مجرّد (VICTORY) نہیں۔ بلکہ حق کا غلبہ ہے۔ اور چونکہ حق و باطل کی یہ تمیز، اللہ کے قانون کے مطابق ہوتی ہے۔ اس لئے اللہ فتّاح ہے۔ فاتح ہے۔ اسی طرح جب کسی مردِ مومن کے لئے فاتح و منصور کے الفاظ استعمال ہوں گے۔ تو ان الفاظ کا صحیح مفہوم کیا ہوگا؟ یعنی قوانینِ خداوندی کے مطابق حق و باطل میں تمیز کرنے والا۔ ایک دُنیاوی فاتح اور قرآنی فاتح میں یہی نازک لیکن اہم ترین فرق ہے۔ جسے نظر انداز کر دینے سے سطح بین نگاہیں عمر فاروقؓ اور ہلاکو خان میں تمیز نہیں کر سکتیں۔ حالانکہ ایک کے سامنے محض ذاتی غلبہ واستیلأ ہے۔ اور دُوسرے کے پیشِ نظر، اللہ کی صفتِ فتاحیت کے مظہر ہونے کی حیثیت سے حق و باطل میں امتیاز۔ وہ امتیاز جو عقل اور علم کی رُو سے کیا جاتا ہے۔ اس لئے کہ اللہ ایسا فتّاح ہے۔ جو حق ہے اور علیم۔ انسانی زندگی میں اللہ کے یہ فیصلے قرآنِ کریم کے مطابق ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ قرآن قولِ فیصل ہے۔

اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ ۙ وَّمَا هُوَ بِالْهَزْلِ ۝ (۸۶ / ۱۴-۱۳)

یقیناً قرآن ایک فیصل کُن (حقیقت ہے) یُونہی لاحاصل (اور بے معنی) شے نہیں۔

خود حقیقت ثابتہ اور حق و باطل میں صاف صاف فیصلہ کر دینے والا۔ اس لئے عدالتِ خداوندی کا ضابطۂ قوانین یہی کتاب ہے۔ اور اللہ کی حاکمیت اور فتاحیت کا مظاہرہ اسی ضابطہ کی تنفیذ و ترویج سے ہوگا۔

# اَلحَقّ

حق اسے کہتے ہیں۔ جو ثابت ہو۔ اٹل ہو۔ نمٹ ہو۔ اپنی جگہ پر قائم ہو۔ حقیقت کے ہر معیار پر پورا اترے۔ علم و بصیرت کی ہر کسوٹی پر کھرا ثابت ہو اس کے نتائج ہمیشہ تعمیری ہو۔ اللہ کے حق ہونے پر ایمان لانے سے مفہوم یہ ہے۔ کہ جو کچھ اس کی طرف سے ہے۔ اسے حق سمجھا جائے۔ وہ خود حق ہے اس لئے اس نے کائنات کو حق کے ساتھ پیدا کیا ہے۔

وَهُوَ الَّذِىْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ط
وَيَوْمَ يَقُوْلُ كُنْ فَيَكُوْنُ ط قَوْلُهُ الْحَقُّ ط وَلَهُ الْمُلْكُ
يَوْمَ يُنْفَخُ فِى الصُّوْرِ ط عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ط
وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْخَبِيْرُ ٥ ($\frac{6}{72-73}$)

اسی کی ذات ہے۔ جس نے آسمانوں کو اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا ہے (اسی کی قدرت کا یہ عالم ہے کہ) جس وقت وہ کہہ دے ہو جا (تو جیسا وہ چاہے) ویسا ہی ہو جائے۔ اس کا قول حق ہے۔ اسی کے لئے پادشاہی ہے۔ جس دن صور پھونکا جائے گا۔ وہ غیب و شہادت کا جاننے والا ہے۔ حکمت والا ہے۔ ہر شے سے باخبر۔

کائنات حق کے ساتھ پیدا کی اور انسانی دنیا کی راہ نمائی کے لئے قرآن کو حق کے ساتھ نازل کیا۔ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ($\frac{2}{26}$) لہٰذا آج حق قرآن کے اندر ہے۔ یعنی کائنات میں اشیائے فطرت حق کی مظہر۔ اور قرآن کریم کے قوانین انسانی دنیا میں حق کے پیکر۔ یہی نظام وہ دین الحق ہے۔ جو انسانوں کے وضع کردہ تمام نظاموں پر غالب آنے والا ہے۔

هُوَ الَّذِىْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ
لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ٥ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ٥
($\frac{9}{33}$ نیز $\frac{2}{119}$)

اللہ وہ ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت یعنی دین حق کے ساتھ بھیجا تاکہ اس

دین کو (تمام انسانی نظامہائے زندگی پر غالب کر دے۔ اگرچہ مشرکوں کو ایسا ہونا پسند نہ آئے (کیونکہ وہ انسانوں کے وضع کردہ قوانین حیات کے تابع رہنا پسند کرتے ہیں)

اللہ حق۔ کائناتِ فطرت حق کے ساتھ پیدا کردہ۔ اس کا رسول حق کے ساتھ ارسال فرمودہ۔ اس کا لایا ہوا دین، حق اور جماعت وارثین کتاب، حق کی علمبردار۔ اس کے علاوہ اور سب باطل۔ حق باقی رہنے والا۔ باطل مٹ جانے والا۔ باقی وہی رہے گا جس کی نسبت حق کے ساتھ ہے۔ یہی ایک حقیقت ہے۔ باقی افسانہ طرازیاں۔

# حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ

قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ کی جس قدر صفات بیان ہوئی ہیں۔ انہیں سامنے رکھیئے اور پھر دیکھیئے کہ خوبی و کمال کی وہ کونسی صفت ہے جس سے اس کی ذات متصف اور نقص و زوال کی وہ کونسی شق ہے۔ جس سے اس کی ہستی مبرّا نہ ہو۔ حسن و جمال کی تمام زیبائشوں سے مزیّن اور شانِ کبریائی کی تمام ستائشوں کی سزاوار لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى (۵۹/۲۴) ہر قسم کی تعریف و توصیف اور ہر انداز کی ستائش و نیائش اسی کے لئے ہے۔ اس لئے قرآن کریم کی ابتدا ہی اس انتہا سے ہوتی ہے کہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ۙ (۱/۱ نیز ۴۵/۳۶)

تمام تعریفیں اس اللہ کے لئے ہیں۔ جو جملہ کائنات کا رب ہے۔

خدائے حمید کی صراطِ حمید پر چل کر مقام محمود تک پہنچنا یقینی ہے۔ یہی شرفِ انسانیت کی تکمیل ہے۔ یہی زندگی کی معراج ہے۔ یہی منتہائے مقصود ہے۔ اور در خور حمد و ستائش ہیں وہ سعادت مند جو اس مقام پر سرفراز ہوں۔ یہی وہ افراد ہیں جن کی نشو و نما یافتہ ذات، صفاتِ خداوندی کی مظہر ہوتی ہے۔ فلہذا در خور حمد و ستائش۔ یعنی جب دنیا ان کے وہ کارنامے دیکھتی ہے۔ جو نوعِ انسانی کی مرفہ الحالی اور شادکامی کے ضامن بنتے ہیں۔ تو لوگوں کی زبان

پر بے اختیار نغماتِ تبریک و تہنیت زمزمہ بار ہو جاتے ہیں۔

# تسبیح

**مفہوم** | کائنات کی ہر شے اس قانون کے سامنے سرِ تسلیم خم کئے ہے۔ جس کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لئے وہ پیدا کی گئی ہے۔

وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا ...... (۳/۸۲)

زمین و آسمان میں، جو کوئی بھی (موجود) ہے۔ اللہ (کے حکم) کے سامنے طوعاً و کرہاً سرِ تسلیم خم کئے ہے۔

اشیائے فطرت میں جو کام جس کے سپرد کیا گیا ہے۔ وہ اس کی تکمیل میں سرگرمِ عمل ہے۔ اور یوں اللہ کے احکام کے سامنے سجدہ ریز ہے۔

وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا ...... (۱۳/۱۵ نیز ۲۲/۱۸)

زمین و آسمان میں جو کوئی بھی ہے اللہ (کے احکام و قوانین) کے آگے سجدے میں گرا ہوا ہے۔

اس تسلیم و سجود کی تشریح سورۂ نمل میں یوں بیان کی گئی ہے:۔

وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ وَّالْمَلٰٓئِكَةُ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ۝ يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ۝ (۱۶/۴۹-۵۰)

اور آسمانوں میں جو کچھ ہے اور زمین میں جس قدر جاندار ہیں سب اللہ کے آگے سر بسجود ہیں۔ نیز فرشتے وہ سرکشی نہیں کرتے اور اپنے پروردگار سے ڈرتے رہتے ہیں جو ان کے اوپر موجود ہے۔ اور انہیں جو کچھ حکم دیا جاتا ہے۔ اس کی تعمیل کرتے ہیں۔

سَبْحٌ کے معنی تیرنا۔ گھوڑے کا تیزی سے دوڑنا۔ یعنی جس طرح تیرنے میں

---

ل فلکی کروں کے متعلق قرآن کریم میں ہے كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ۝ (۲۱/۳۳ و ۳۶/۴۰) ہر کرہ اپنے اپنے دائرہ میں تیزی سے تیرتا پھرتا ہے۔ فلکی کروں کی گردش کے لئے فضا میں تیرنے کا لفظ کس قدر جامع اور بلیغ ہے۔

بازوؤں کو اُن کی وسعت تک پھیلایا جاتا ہے۔ اسی طرح جب گھوڑا پورے قدم پھیلا کر سرپٹ دوڑے تو اُسے سَبَّحَ کہا جاتا ہے۔ اس لئے اس لفظ میں تیزی اور دوری (دور دور ہاتھ پاؤں مارنے) دونوں کا مفہوم مضمر ہے۔ چنانچہ تَسَبَّحَ فِی الْاَرْضِ کے معنی ہیں "دور دراز ملکوں میں سفر کرنا"۔ اِنَّ لَکَ فِی النَّھَارِ سَبْحًا طَوِیْلًا (۷۳/۷) "تیرے لئے (اے رسول) دن میں (کاروبار اور معاملات کی) لمبی چوڑی مصروفیتیں ہیں"۔ لہٰذا جب یہ کہا جائے کہ کائنات کی ہر شے اللہ کے لئے "تسبیح خواں" ہے۔ تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ ان فرائض کی سرانجام دہی میں جو اُسے تفویض کئے گئے ہیں۔ پوری تیزی سے مصروفِ عمل ہے۔

**تسبیح اور حمد** اب ایک اور چیز پر بھی غور کیجئے۔ آپ کے سامنے ایک مشین ہے۔ جس کا ہر پُرزہ اپنی اپنی جگہ پر ٹھیک نصب (فٹ) ہے۔ پوری کی پوری مشین نہایت عمدگی سے چل رہی ہے۔ کہیں کوئی نقص نہیں۔ کوئی چوک نہیں محکم، مضبوط، پائیدار، اپنی جگہ پر قائم۔ جس غرض کے لئے بنائی گئی ہے۔ اس کے مطابق زندہ نتائج سامنے چلے آرہے ہیں۔ اس مشین کے دیکھتے ہی آپ اس کے بنانے والے (صناع) کی حمد و ستائش میں رطب اللسان ہو جائیں گے۔ آپ کی زبان پر بے اختیار اُس کی تعریف کے کلمات آجائیں گے۔ یہ مشین اپنے صانع کی مجسّم حمد ہوگی۔ ہر عمدہ تصویر اپنے مصوّر کی نادرہ کاری اور معجز نگاری کا منہ بولتا قصیدہ مدحیہ ہوتی ہے۔ ہر حسین مجسّمہ سنگ تراش کے کمالِ فن کی زندہ دلیل ہوتا ہے۔ جب ان چھوٹی چھوٹی چیزوں کی یہ کیفیت ہے۔ تو غور کیجئے کہ کائنات کا یہ عظیم المرتبت اور محیر العقول کارخانہ جس نظم و ضبط اور حسن و خوبی سے سرگرم عمل ہے۔ کیا یہ اپنے فقید المثال صناع کی زندہ حمد و ثنا نہیں؟ یہاں کا ذرّہ ذرّہ کمال رعنائی و زیبائی کی چلتی پھرتی تصویر ہے۔ کیا یہ تصویریں اور ان کی جاذبِ نگاہ رنگینیاں اس المصوّر کی شانِ جمالی کے قصائد مدحیہ نہیں ہیں؟

لہٰذا ہر وہ شَے جو اپنے فریضۂ مفوّضہ کی تکمیل میں سرگرداں ہے۔ چشمِ بینا کے لئے، اپنے خالق، ربّ العزّت کی حمد و ستائش کا زندہ پیکر ہے۔ اس کی

سرگرمی عمل خدا کی تحمید و تقدیس کا زمزمۂ قدس اور اس کی ہر حرکت اُس کی تعریف و توصیف کا نغمۂ سرمدی ہے۔

مظاہرِ فطرت کی اجمالی "تسبیح خوانی" کا ذکر کئی ایک مقامات پر فرمایا :-

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ج

پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے اللہ کی تسبیح کرتا ہے۔

جماعتِ مومنین کی تسبیح و تحمید :-

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ۙ وَرَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۙ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا ۠ ( ۱۱۰ / ۱ - ۳ )

جب اللہ کی نصرت اور کامیابی (سامنے) آجائے اور تو دیکھے کہ لوگ فوج در فوج دینِ خداوندی میں داخل ہو رہے ہیں، تو اس وقت اپنے رب کی حمد کی تسبیح کر اور اس سے اپنی فرو گذاشتوں کی مغفرت طلب کر۔ وُہ یقیناً رحمتوں کے ساتھ لوٹ آنے والا ہے۔

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن
گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان

یہ ہے مومن کی حمد اور یہ ہے اس کی تسبیح - خود قوانینِ الٰہیہ کے مطابق زندگی بسر کرے اور ساری دُنیا میں ان قوانین کی تنفیذ و ترویج کا موجب بنے - اب سوچیئے کہ جب مسلمانوں نے حمد و ستائش اور تکبیر و تقدیس کا صحیح مفہوم سمجھا تھا تو ان کی زندگی اور دُنیا کی حالت کیا تھی - اور اُس کے بعد جب دین نام رہ گیا محض "سبحہ شماری" کا تو ان کی حالت کیا ہو گئی؟

یا وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل
یا خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات
وُہ مذہبِ مردانِ خود آگاہ و خدامست
یہ مذہبِ مُلّا و جمادات و نباتات

(اقبالؒ)

جیسا کہ شروع میں لکھا جا چکا ہے اسلام ایک سیدھا سادا - صاف و شفاف نصاب تعلیم و ضابطۂ عمل ہے - اس میں نہ بے مقصد فلسفیانہ نکتہ آفرینیاں

ہیں نہ بے مطلب عالم خیال کی قیاس آرائیاں۔

اسلام سے مفہوم یہ ہے کہ نبی اکرمؐ پر نازل شدہ قرآن کے مطابق خدا پر ایمان فکر و نظر کے تمام گوشوں کا مرکز ہو اور امکانی حدود کے اندر صفاتِ خداوندی کا اپنے اندر منعکس کرتے جانا اعمالِ حیات کے تمام شعبوں کا محور۔

مستقل اقدار کی رو سے نظریۂ حیات یہ ہے۔ انسانی زندگی کا مقصد یہ ہے کہ انسان فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے پوری انسانیت کی زندگی کو بلند سے بلند تر کرتا چلا جائے۔ جس طرح پانی اپنی سطح ہموار رکھتا ہے۔ اس معاشرہ میں جو مستقل اقدار کی روشنی میں متشکل کیا گیا ہو بھی کہیں نشیب و فراز اور ناہمواریاں نہ ہوں۔ اس طرح جب انسانیت کی زندگی کا معیار بلند ہوتا ہے۔ تو اس میں پوری انسانیت کی سطح ہموار ہوتی ہے۔

مستقل اقدار کی رو سے، جس قدر کوئی انسان، دوسروں کے لئے نفع بخشیوں کا سامان بہم پہنچائے اسی قدر اس کی اپنی انسانی زندگی سنورتی چلی جاتی ہے۔ وہ دوسرے انسانوں کے لئے زیادہ سے زیادہ محنت کرنے کے لئے ہمہ وقت تیار رہتا ہے جسے بظاہر "دوسروں کی خاطر" کچھ کرنا سمجھا جاتا ہے، وہ درحقیقت اپنے لئے ہوتا ہے۔ وہ نظریۂ زندگی جس میں انسان صرف سامانِ شکم کے لئے جینا اور مرنا اپنا فرض سمجھتا ہے۔ قرآن اسے کفر اور حیوانی سطح کی زندگی قرار دیتا ہے۔ سورۂ محمدؐ میں ہے،

وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا یَتَمَتَّعُوْنَ وَیَاْکُلُوْنَ کَمَا تَاْکُلُ
الْاَنْعَامُ ........ (۴۷/۱۲)

"جو لوگ کفر کرتے ہیں وہ حیوانات کی طرح کھاتے پیتے اور سامانِ زندگی سے متمتع ہوتے ہیں۔

میں نے مستقل اقدار کو قدرے تفصیل کے ساتھ اس باب میں دے دیا ہے تاکہ "نظریۂ پاکستان" کو سمجھنے میں کوئی دقت نہ ہو۔ یہ باب اسی لئے کافی طویل ہو گیا ہے۔ لیکن اس کا یہ فائدہ ضرور ہو گا۔ کہ مستقل اقدار (صفاتِ باری تعالیٰ) جنہیں انسان اپنے اندر منعکس کر کے وہ کریکٹر پیدا کر سکتا ہے جس کا قرآن تقاضا کرتا ہے۔ کافی وضاحت کے ساتھ قاری کے سامنے آجائیں گی۔ اور وہ

تصوّرِ حیات جسے اقبالؒ نے نظریۂ پاکستان میں پیش کیا ہے وُہ بھی نکھر اور اُبھر کر سامنے آجائے گا۔ اس کے علاوہ یہ سمجھنے میں بھی دُشواری نہیں ہوگی۔ کہ ایسا پاکیزہ۔ خوشحال اور خوشگوار معاشرہ اقبالؒ جسے پاکستان میں دیکھنے کے متمنّی تھے۔ وُہ جماعت کن صفات کی حامل ہوگی۔ جس کے ہاتھوں متشکّل ہوگا۔ اور دُنیائے انسانیت اس مثالی معاشرہ کو دیکھ کر اپنے احوال کی اصلاح کرے گی۔ یہی وُہ جلوۂ خورشید (قرآن کی عطا کردہ مستقل اقدار) ہے۔ جس سے انسانی زندگی کی شبِ تاریک گریزاں ہوگی۔ اور جہانِ انسانیت نغمۂ توحید سے معمور ہوگا۔

اگلے باب میں ربّ العالمین، رحمۃ للعالمینؐ اور ذکر العالمین کے مفہوم کو قدرے وضاحت سے پیش کیا جائے گا۔ تاکہ اتحادِ انسانی اور عالمگیر اُخوّت و مودّت کے متعلق انسانی ذہن مزید صاف ہو جائے۔

---

## ساتواں باب

# ربّ العالمین

قرآن کی ابتداء اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ سے ہوتی ہے جس کا مطلب یہ ہے۔ کہ حمد و ستائش کا سزاوار "العالمین" کی ربوبیت کا ذمہ دار ہے۔ حمد تہنیت و تبریک کے ان کلمات کو کہتے ہیں۔ جو ایسی ذات کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔ جو حقیقی طور پر صحیح معنوں میں ایسی صفات کی حامل ہو۔ ایسی خوبیوں سے مزین ہو کہ بے ساختہ تعریفی کلمات انسان کی زباں پر آجائیں۔ انسان کے عمقِ قلب سے یہ خواہش پیدا ہو کہ اس ذات پر تحسین و آفرین کے پھول نچھاور کئے جائیں۔ قرآن کی انتہا ربّ النّاس۔ ملک النّاس، الٰہ النّاس پر ہوتی ہے۔ جس کے معنی ہیں کہ قوت و اقتدار اور غلبہ و تسلّط بھی اسی خدا کے شایانِ شان ہے جو عالمینی ربوبیت کا ذمہ دار ہے۔ صرف نسلِ انسانی کا نہیں بلکہ

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ رِزْقُهَا۔۔۔۔۔

(۱۱/۶ نیز ۱۷/۳۱ ز ۲۹/۹۰)

زمین پر (یعنی اس حصّہ ارض میں جس میں یہ معاشرہ قائم ہے) کوئی چلنے والا ایسا نہیں جس کا رزق اللہ (یعنی قرآنی معاشرہ کے) ذمہ نہ ہو۔

قرآن میں دابۃ کا لفظ آیا ہے۔ ہر ذی روح کی پرورش کا ذمہ دار۔ ظاہر ہے کہ انسانی ذات اسی صورت میں قابل حمد اور لائق ستائش ہوگی۔ جب وہ خدا کی صفت ربّ العالمینی کی مظہر ہوگی۔ ظاہر ہے کہ ایسی ذات کی نشوونما قرآنی معاشرہ میں ہوگی نہ کہ خلوت کدوں، حجروں، گوشوں اور تجرّد گاہوں میں۔

ممفورڈ کے الفاظ میں:۔

"فرد کو اپنی ذات کی تکمیل کے لئے ایک عالمگیر معاشرہ کی ضرورت ہے"۔

(THE CONDUCT OF LIFE)

دیکھا اب مفکرین مغرب بھی تعمیرِ انسانیت کے لئے عالمگیر نظامِ حیات کی ضرورت شدت سے محسوس کر رہے ہیں۔ خالقِ ارض و سمٰوات کے انفس و آفاق میں جاری و ساری قانونِ حیات کے علاوہ ایسی مستقل اقدارِ حیات اور کہاں سے مل سکتی ہیں۔ جن کی اصل و اساس پر ایسا انسانی معاشرہ تعمیر کیا جا سکے جو انسانیت کے لئے امن و سکون اور خوشحالی و خوشگواری کا گہوارہ بن سکے۔

اس مقام پر یہ عرض کرنا ضروری ہے۔ کہ خارجی کائنات میں خدا کی ربوبیت خدا کے قانونِ کائنات کی رُو سے از خود کارفرما ہوتی ہے۔ لیکن انسانوں کی دنیا میں یہ ربوبیت انسانوں کے ہاتھوں سے پوری ہو سکتی ہے جو نظامِ معاشرہ ربّ العالمین کے قانون کے مطابق قائم ہوتا ہے۔ وہ ان تمام ذمہ داریوں کو اپنے سر لے لیتا ہے۔ جو ربّ العالمین کی طرف منسوب ہیں۔ افرادِ معاشرہ تمام فرائض و واجبات کو پورا کرتے ہیں اور یہ اس نظام کی اطاعت کے اس وقت تک مکلف ہوتے ہیں۔ جب تک یہ نظام ان ذمہ داریوں کو پورا کرتا ہے۔ اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ کا یہی عملی مفہوم ہے۔

نظامِ ربوبیت (ربّانیون) نظامِ ربوبیت کی حامل جماعت کے ہاتھوں ہی یہ معاشرہ عمل پذیر ہوتا ہے۔ اس ربّ العالمینی نظامِ زندگی میں معاشرہ ہر فردِ معاشرہ کی نشوونما کے لئے وہی کچھ کرتا ہے۔ جو فردِ معاشرہ انسانیت کی نشوو ارتقاء کے لئے کرتا ہے۔ نظامِ معاشرہ کی تکمیل کے لئے مملکت کی تشکیل و قیام ناگزیر ہوتا ہے۔ یہی روح نظریۂ پاکستان میں کارفرما ہے۔ یہاں اس حقیقت کا اظہار ضروری ہے کہ جب انسانی جسم کی پرورش کائنات کے طبیعی قوانین کے مطابق ہوتی ہے۔ تو انسانی ذات کی تربیت و تکمیل بھی قوانینِ خداوندی کے مطابق ہوگی۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ انسانی جسم کی پرورش تو خدا کے طبیعی قوانین کے کے مطابق ہو اور ذات کی نشوونما انسان اپنے ذہن کے تراشیدہ نظامہائے حیات (یعنی علمِ سرکش اور عقلِ چالاک کے بنائے ہوئے اصولوں کے مطابق کرنا چاہیئے۔

سورۂ حٰم (سجدہ) میں ہے:-

قُلْ اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِیْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِیْ یَوْمَیْنِ وَتَجْعَلُوْنَ لَهٗۤ اَنْدَادًا ؕ ذٰلِكَ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ۚ (۴۱/۹)

اُن سے کہدو کہ کیا تم اس خدا کے قانونِ ربوبیت سے انکار کرنا چاہتے ہو۔ جس نے زمین کو دو مدارج میں (پیدائش کے قابل) بنایا۔ اس لئے کہ وہ تمام کائنات کا ربوبیت کرنے والا ہے۔ لیکن تم اپنے قوانین کو اس کے قانونِ ربوبیت کا ہمسر بنا دیتے ہو؟

دوسرے مقام پر:۔

فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا ؕ وَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ (۶/۴۵)

انجام کار اس گروہ کی جڑیں کٹ جائیں گی جو لوگوں کے حقوق میں کمی کرتے ہیں اور اس کے بعد خدائے رب العالمین کا قانونِ ربوبیت سب کے لئے وجۂ ستائش بن جائے گا۔

اس زمانۂ عظیم کے لئے جب دینِ خداوندی تمام ادیانِ عالم پر غالب آکر رہے گا۔

یَّوْمَ یَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ (۸۳/۶)

تمام نوعِ انسانی خدا کی ربوبیتِ عامہ کے لئے اُٹھ کھڑی ہوگی۔

اس طرح:۔

فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَرَبِّ الْاَرْضِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ (۴۵/۳۶)

"تمام حمد و ستائش اس اللہ کے لئے ہے۔ جس کی ربوبیت کا ظہور ارض و سموات میں ہو رہا ہے۔ اور جس کی ربوبیت عالمگیر ہے"۔

جو ملت خدا کی رب العالمینی کی صفت کو اپنے کریکٹر میں منعکس کرے گی اس کا ہر فرد ملت کے مقدر کا ستارہ ہوگا۔ یہی افراد ہوں گے جو بتانِ رنگ و بو کو توڑ کر ملت میں گم ہوں گے۔ عالمِ انسانی کی ربوبیت انہی افرادِ نسلِ انسانی کے ذمہ ہوگی۔ یہی معاشرہ معاشرتی ناہمواریوں کے زلزلوں سے محفوظ رہ سکے گا۔ حیات سوز جہنمی معاشرہ سے ملتِ انسانیہ کو بچانے کی یہی ایک ترکیب ہے کہ انسانی معاشرہ

میں نظامِ ربُ العالمین قائم کیا جائے۔ کیونکہ

ہر کہ عاشق شد جمالِ ذات را
اوست سیّدِ جملہ موجودات را

جملہ کائنات پر اسی اُمّت کی کارفرمائی۔ اسی ملّت کی حاکمی اور کبریائی ہوگی۔ جو عالمینی ربوبیت کے اجراء اور نفاذ کی علمبردار ہوگی۔ اسرارِ کائنات کا انکشاف اور رموزِ کائنات کا انکشاف انہی افرادِ نسلِ انسانی کے ہاتھوں ہوگا۔ تسخیرِ کائنات کے بعد جن کا مقصدِ حیات فوز و فلاحِ عامہ ہوگا۔ یہی ملّت ہوگی۔ جو قوانینِ خداوندی کی اتباع سے آشکارائی تقاضائے وجود، کی زندہ شہادت ہوگی۔ یہ اپنی زندگی خود آراستہ کرے گی۔

زندگی خود را بخویش آراستن
بر وجودِ خود شہادت خواستن (اقبالؒ)

اسی ربُ العالمین کے قانونِ زندگی کی حامل اُمّت کے ہاتھوں وُہ انسانی معاشرہ متشکل ہوگا۔ جس کی خوشگواریوں۔ خوشحالیوں اور ہمواریوں کو دیکھ کر زبانِ حقیقت بے ساختہ نغمہ بار ہوگی کہ

اس کو کہتے ہیں عالم آرائی

یہ باد و خاک و آب اس ملّت کے ادنیٰ غلام ہوں گے۔ تسخیرِ کائنات اور تسخیر شدہ اشیاء کا قوانینِ خداوندی کے مطابق صرف کرنا جس کی زندگی کا مقصد اوّلین و آخرین ہوگا۔ یہ اُمّت امتحانِ خویش اور محاسبۂ خویش سے کسی لمحہ غافل نہیں ہوگی۔ یہ مفادِ خویش کی بجائے بہبودِ دیگراں کو پیشِ نظر رکھے گی۔ یہ اپنے اعمال کو خُدا کے قانونِ مکافات کی میزان میں تولے اور اپنے افعال کو منشائے خُداوندی کے سانچوں میں ڈھالے گی۔ یہ اپنے حسنِ کردارانہ انداز سے عالمِ انسانیت کے حُسن کو نکھارے گی۔ کیونکہ

حرفِ اِنّی جاعِلٌ تقدیرِ او
از زمین تا آسمان تفسیرِ او (اقبالؒ)

اسی اُمّت کے ہاتھوں امتیازِ قبائل مٹ کر عالمِ بے امتیازِ رنگ و

خون معرضِ وجود میں آئے گا۔ اس ملت کا ایک ایک فرد فردِ عالم اور بے رنگ و بو انسانیت کا ہمدرد و ہمدم اور خدمت گزار و غمگسار ہوگا۔ یہ امّت پردہ تہذیب میں غارت گری اور آدم کشی نہیں کرے گی اس کی تقدیر حیات بشری تہذیب ہوگی۔ جو آدم گری کی ضامن ہوگی۔ اس کے نورِ حیات سے احترام آدمیت کی شعاعیں ضیا پاش ہوکر پوری دنیائے انسانیت اور پورے عالم آدمیت کو منوّر کردیں گی۔ اس کا مقصود و مطلوب خدمتِ خلق خدا ہوگا۔ یہ اس رازِ خدائی سے آشنا ہوگی۔

خدمت از رسم و رہ پیغمبری است
مزدِ خدمت خواستن سوداگری است (اقبالؒ)

رب العالمین کے نظامِ ربوبیت کی علمبردار اور ربّ کائنات کی اشیائے کائنات کی تسخیر کا ولولہ و جوش رکھنے والی امّت

ظاہر او سوز ناک و آتشین
باطنِ او نور ربّ العالمین

یہ خویش مست امّتِ انسانیہ خدا مست بندوں پر مشتمل ہوگی۔
یہی وجہ ہے کہ انبیا کرام جو اس نظامِ رب العالمینی کی تشکیل کے اوّلین داعی ہوئے ہیں اپنے لوگوں سے بالوضاحت کہہ دیتے تھے کہ

وَمَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۚ (۲۶/۱۰۹)

"میں تم سے اس کے معاوضے میں کچھ نہیں چاہتا۔ میرا اجر اس خدا کے (قانون ربوبیت) ذمّے ہے۔ جو تمام کائنات (العٰلمین) کی پرورش کا ذمّہ دار ہے"

اس نظام میں انسان جس قدر زیادہ دوسروں کی ربوبیت کے لئے دیتا ہے اسی قدر زیادہ اس کی ذات کی نشو و تکمیل ہوتی ہے۔

قُلْ اِنِّيْ نُهِيْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَمَّا جَآءَنِيَ الْبَيِّنٰتُ مِنْ رَّبِّيْ ۡ وَاُمِرْتُ اَنْ اُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (۴۰/[illegible])

"اَے پیغمبرِ اسلام! کہدے کہ مجھے (میرے خدا کی طرف سے) منع کر دیا گیا ہے کہ مَیں ان معبدوں کی عبودیت (محکومیت و اطاعت) تسلیم کروں جنہیں تم لوگ اللہ کے سوا پکارتے ہو (خصوصاً) جبکہ میرے پاس اس باب میں میرے پروردگار کی طرف سے کھلی کھلی دلیلیں بھی آچکی ہیں۔ اور مجھے یہ حکم دیا گیا ہے۔ کہ مَیں (اپنی ہر حرکت اور ہر عمل میں) تمام جہانوں کے پروردگار (اللہ) کی اطاعت کروں۔"

ظاہر ہے کہ یہاں تمام نظامہائے باطلہ سے انکار کر کے خدا کے قانونِ حق کی اطاعت مقصود ہے۔ جو پیغمبرِ اسلام سالارِ انسانیت حضور اقدس و اعظمؐ کی وساطت سے دُنیائے انسانیت کو ملا۔

تصریحاتِ بالا سے رب العالمین کا مفہوم ذہن نشین ہو گیا ہوگا۔ اور یہ سمجھ لیا ہوگا۔ کہ ربّ العالمین پر ایمان لانے والی اُمّت کی ذمّہ داریاں کیا ہوتی ہیں۔

## ذکرٌ لِلعٰلمین

اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ۙ (۸۱/۲۷)

یہ قرآن تو تمام دُنیا و جہان کے لئے نصیحت نامہ ہے

دُوسری جگہ:-

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ ؕ قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْعٰلَمِيْنَ ۠

(۹۱/۶)

(اَے پیغمبر) یہ وُہ لوگ ہیں جنہیں خدا نے راہِ حق دکھا دی۔ پس اس راہ کی تم بھی پیروی کرو۔ تم کہہ دو کہ میں اس (رہنمائی) پر تم سے کوئی بدلہ نہیں مانگتا۔ یہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ تمام دُنیا کے لئے پند و نصیحت ہے۔

ذکرٌ للعالمین (قرآنِ کریم)، نوعِ انسان کے لئے "پیامِ آخریں" ہے۔ جو حضور اکرمؐ خدا کی طرف سے انسانوں کے لئے لائے۔ آپ سے قبل جتنے نبی یا رُسول آئے کسی

ایک بستی یا کسی ایک قوم کے لئے مبعوث کیا گیا۔ اب انسانیت عہدِ طفولیت سے نکل کر سِنِ شعور تک جا پہنچی تھی۔ لہٰذا دُنیائے انسانیت کے لئے آخری ضابطۂ ہدایت۔ اقبالؒ کی زبان میں

نوعِ انساں را پیامِ آخریں

اس عالمگیر ضابطۂ خُداداری کے لئے دُوسرے مقام پر

يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَتْكُمْ مَوْعِظَةٌ مِنْ رَبِّكُمْ وَشِفَاءٌ لِمَا فِي الصُّدُورِ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِلْمُؤْمِنِينَ ۝ قُلْ بِفَضْلِ اللَّهِ وَبِرَحْمَتِهِ فَبِذَٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوا هُوَ خَيْرٌ مِمَّا يَجْمَعُونَ ۝ ( ۱۰ / ۵۸-۵۷ )

"اے لوگو! تمہارے پروردگار کی جانب سے ایک ایسی چیز آ گئی ہے۔ جو دل کی تمام بیماریوں کے لئے شفا ہے۔ اور ہدایت و رحمت ہے۔ ان لوگوں کے لئے جو (اس پر) یقین رکھتے ہیں (اے پیغمبر تم کہو، یہ اللہ کا فضل ہے اور اللہ کی رحمت ہے۔ پس چاہیئے کہ اس پر خوشی منائیں۔ اور یہ اُن ساری چیزوں سے بہتر ہے جنہیں وہ (دُنیا کی زندگی) جمع کرتے رہتے ہیں!"

نظریۂ پاکستان کے خالق اقبالؒ اسی درخشندہ و تابناک نورافشاں حقیقت اور زندہ و پائندہ منشورِ انسانیت کی طرف مسلمان کی توجہ مبذول کراتے ہیں۔ دیکھئے کس طرح ایک ایک لفظ سے قرآنِ کریم کی محبت و عشق کی چاشنی ٹپکتی ہے۔

تو ہمہ دانی کہ آئینِ تو چیست | زیرِ گردوں سرِ تمکینِ تو چیست
آں کتاب زندہ قرآنِ حکیم | حکمتِ او لایزال است و قدیم
نسخۂ اسرارِ تکوینِ حیات | بے ثبات از قوتش گیرد ثبات
حرف او را ریب نے تبدیل نے | آیہ اش شرمندۂ تاویل نے

اور سُنیئے :۔

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است | ایں کتابے نیست چیزے دیگر است
چوں مسلماناں اگر داری نظر | در ضمیر خویش و در قرآں نگر

صد جہانِ تازہ در آیات اوست | عصرہا پیچیدہ در آنات اوست
بندۂ مومن ز آیاتِ خدا ست | ہر جہاں اندر برِ او چوں قبا ست
چوں کہن گردد جہانے در برش
می دہد قرآں جہانے دیگرش

اس میں ضمیرِ خویش اور عصرہا پیچیدہ کی خوبصورتی نگہ بصیرت کو وجد میں لے آتی ہے۔ قرآنِ کریم کی آیات میں جہاں اندر جہاں۔ زمانہ در زمانہ لپٹا ہوا ہے۔ ہر زمانے کے تقاضوں کا حل اس کے اندر موجود ہے۔ قرآن کتاب فطرت ہے۔ یعنی جس طرح فطرت کی کوئی شئے ایسی نہیں جو کسی زمانہ میں جاکر کہہ دے کہ میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتی۔ اسی طرح خدائے بصیر و خبیر۔ علیم و حکیم اور سمیع کا عطا کردہ ضابطۂ حیات ایسا نہیں کہ جو کسی مقام پر تھک کر کاروانِ انسانیت کو یہ کہہ دے کہ میں اب تمہارا ساتھ نہیں دے سکتا۔ دراصل یہ زماں و مکاں اور ماضی و حال و مستقبل تو انسانوں ہی کے بنائے ہوئے پیمانے ہیں۔ خالقِ ارض و سمٰوات کی ذات اعظم و برتر ان سے کہیں بلند و بالا اور بے نیاز ہے۔ آپ قرآنِ کریم کی آیات کو کھولتے جائیے انسان کے لئے ہر دور میں مسائل حیات کا حل ان کے اندر موجود ہوگا۔ حضور اقدس و اعظمؐ کی ختم المرسلینی کی اس سے ٹھوس دلیل اور کیا ہو سکتی ہے۔ یہ ضابطۂ خداوندی ہر زمانہ کے اُبھرتے تقاضوں کا حل اپنے اندر رکھتا ہے۔

آپ کو معلوم ہے ایک زمانہ میں لوگ صرف اتنا جانتے تھے کہ پانی سے پیاس بجھائی جاتی ہے یا زیادہ سے زیادہ اس سے نہایا بھی جاتا ہے۔ لیکن پانی کے اندر چھپی ہوئی خصوصیتیں زمانہ کی عقل و علم۔ تجربہ و مشاہدہ۔ وسعت و بلندی کے ساتھ ساتھ کھلتی گئیں جیسے کہ وہ اس کی لہروں کے بیچ میں لپٹی ہوئی تھیں۔ آج دیکھئے پانی سے کیا کیا کام لئے جا رہے ہیں۔ اشیائے کائنات میں سے ہر ایک شئے کی کیفیت یہ ہے۔ یہی کیفیت قرآنِ کریم کی اور یہی خصوصیت اس (نظامِ خداوندی) کتاب اللہ کی ہے زمانہ علم و بصیرت، فہم و فراست اور تحقیق و دانش کی جتنی بلندیوں تک بلند ہوتا چلا جائے۔ علومِ تازہ کی وسعتیں حدود فراموش ہو جائیں قرآن انسانی راہنمائی کے لئے اس سے بھی آگے نظر آئے گا۔

یہ علومِ تازہ کی سرمستیوں کو گناہ قرار نہیں دیتا۔ یہ علم کو علمِ خداوندی کے ساحلوں میں پابند کر کے جوئے رواں کی طرح آگے لے جاتا ہے۔ جس کا پانی مرجھائی ہوئی کھیتیوں کو سرسبز و توانا بنا دیتا ہے۔ اسی طرح علمِ خداوندی کی ضیا بخش راہنمائی میں آگے بڑھنے والا علم انسانی قلوب کو حیاتِ تازہ عطا کرتا ہے۔

جو بات آج کی نسل کی سمجھ میں نہیں آتی اسے کل کی آنے والی نسلیں تجربات و مشاہدات کی روشنی میں خود بخود سمجھ لیں گی۔

قرآنِ عزیز کی ایک ایک آیت حقیقتِ ثابتہ بن کر سامنے آتی جائے گی۔ قرآنِ کریم میں اللہ تعالٰی کا ارشاد:۔

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ ۗ ( ۴۱/۵۳ )

"ہم عنقریب ان کو اپنی نشانیاں اس نظامِ کائنات میں اور خود نفسِ انسانی کے اندر دکھاتے جائیں گے۔ یہاں تک کہ اُن پر حقیقت واضح ہو جائے کہ قرآن فی الواقعہ حق ہے۔"

یہ زندگی فشاں قانون۔ یہ ابدیت کنار عالمگیر دستورِ حیات جو قصرِ انسانیت کو معاشرتی زلزلوں۔ معاشی ناہمواریوں اور سکوں سوز سرمایہ داری اور جبر و استبداد سے نجات دلا سکتا ہے اس کے متعلق دوسرے مقام پر فرمایا ہے کہ یہ ضابطۂ خداوندی تمام نظامہائے حیات پر غالب آ کر رہے گا۔ یہ نورِ عالم عالمِ انسانیت کو منوّر کر دے گا۔ اس آفتابِ عالمتاب کی شعاعیں پوری دنیائے انسانی کے لئے محیط ہیں۔

هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ ○

( ۹/۳۳ )

"(ہاں) وہی ہے جس نے اپنے رسول کو حقیقی ہدایت اور سچے دین (ذکر للعالمین) کے ساتھ بھیجا، تاکہ اس دین (ضابطۂ حیات) کو تمام ادیانِ عالم (نظامہائے حیات) پر غالب کر دے۔ اگرچہ مشرکوں کو ایسا ہونا پسند نہ آئے۔"

اس نورِ ہدیٰ سے قافلۂ آدمیت کے راہوں کی تاریکیاں چھٹ جائیں گی۔ اس جلوۂ خورشید سے کاروانِ انسانیت کے راستہ میں ادیانِ باطلہ کی پھیلائی ہوئی ظلمتیں دُور ہو جائیں گی۔ اسی سے قصرِ آدمیت میں نغمۂ توحید کی زمزمہ باری اور امن و راحت کی نغمہ ریزیاں ہوں گی۔ اقبالؒ اس حقیقت کو نہایت حتم و یقین سے پیش کرتے ہیں۔

شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ جہاں معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

انسان صاحبِ اختیار و ارادہ ہے (کائنات میں (ذات) اختیار و ارادہ اسی کو دیا گیا ہے) اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں۔ ہم نے اسے دیکھنے کے لئے آنکھیں عطا کرکے فضا میں سورج کی روشنی پھیلا دی۔ اب جس کا جی چاہے صراطِ مستقیم پر پر چلے۔ جو اپنی ہلاکت چاہتے ہیں ٹیڑھی راہ اختیار کر لیں۔ قانونِ مکافاتِ اعمالِ انسانی کے نتائج میرے قانون کے مطابق مرتب کرے گا۔ نتائج کے مرتب کرنے میں انسانی اختیار و ارادہ کا کوئی دخل نہیں ہوگا۔ اگر مسلم بن کر سلامتی کی زندگی چاہتے ہو تو بتانِ شعوب و قبائل کو توڑ کر ملّتِ واحدہ بن کر رہو۔ اقبالؒ فرماتے ہیں:۔

گر تو می خواہی مسلمان زیستن
نیست ممکن جز بقران زیستن

تاکہ:۔

از بم و زیر حیات آگہ شوی
ہم ز تقدیر حیات آگہ شوی

کیونکہ:۔

امتیازِ قبائل تمام تر خواری

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً قف فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ
مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ص وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ
بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ وَمَا

اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًاۢ بَيْنَهُمْ ۚ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ ۭ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ (۲/۲۱۳)

چونکہ نوعِ انسانی کے لئے مطابقِ فطرت یہی زندگی تھی کہ وہ ایک جماعت بن کر رہیں، اس لئے اللہ نے نبیوں کو مبعوث کیا۔ وہ ایمان و عمل کی برکتوں کی، بشارت دیتے، اور انکار و بدعملی کے نتائج سے ڈراتے تھے، نیز ان کے ساتھ کتاب الٰہی نازل کی گئی تاکہ جن باتوں میں لوگ اختلاف کرنے لگے تھے، ان میں وہ فیصلہ کر دینے والی ہو (اور تمام لوگوں کو راہِ حق پر متحد کر دے) اور یہ جو لوگ باہمدگر مختلف ہوئے تو اس لئے نہیں کہ، ہدایت سے محروم اور حقیقت سے بے خبر تھے نہیں وحی الٰہی کے واضح احکام اُن کے سامنے تھے (اور ان میں تفرقہ و اختلاف کی کوئی گنجائش نہ تھی) مگر پھر بھی محض آپس کی ضد اور مخالفت سے اختلاف کرنے لگے تھے (اور دین کی راہ پر مجتمع رہنے کی جگہ الگ الگ گروہ بندیوں میں بٹ جاتے تھے) بالآخر اللہ نے ایمان والوں کو (دین کی وہ حقیقت دکھا دی جس میں لوگ مختلف ہو گئے تھے) (اور ایک دوسرے کو جھٹلا رہے تھے) اور اللہ جو چاہتا ہے دین کی سیدھی راہ دکھلا دیتا ہے!

اقبالؒ کا شعر قدرے تصرّف کے ساتھ

فرقہ بندی تھی، کہیں اور کہیں ذاتیں تھیں
یہ زمانے میں پنپنے کی بھلا باتیں تھیں

قرآن نے نسلِ آدم کو وحدتِ انسانیہ کا انسانیت ساز پیغام دیا جس سے انسان عالمیت کا مظہر بنا۔ ظاہر ہے ایسی عالم آرائی ایک عالمگیر ضابطۂ قوانین (یعنی قرآن) ہی کی روشنی میں ہو سکتی ہے۔ یہی اسلامی نظریہ۔ نظریۂ پاکستان ہے جس سے نسل وطن اور رنگ و خون کے بُت پاش پاش ہو جائیں گے۔ اسلام کا یہی بھولا ہوا سبق حکیم الامّتؒ نے مسلمانانِ ہند کو دیا جس سے شعوب و قبائل کے امتیازات ختم کر کے وارفتگانِ ملک و نسب کو عالمگیر برادری کا فرد بنایا جا سکتا ہے۔ یہی وہ اصولِ

حیات ہے جس سے نیشنلزم کے پیدا کردہ نفاق و شقاق کا قلع قمع کیا جا سکے گا یہی زندہ حقیقت اُفقِ پاکستان پر روشن ستاروں کی طرح درخشاں ہے۔ افسوس ہے کہ معرکۂ دین و وطن میں ہند کے عالمانِ زنار پوش ملت کے توحید پرستوں کو وطن پرستی کی تعلیم دیتے رہے۔ اس رزم کفر و دین میں زبان سے لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ کہنے والوں کی عملی کیفیت یہ تھی کہ

مومناں با خوئے و بُوئے کافراں
لَا اِلٰہ گویاں و از خود مُنکراں (اقبالؒ)

ان کا سوراجی اسلام قدم قدم پر تحریکِ ملی کی مخالفت کرتا رہا۔

نا قبول و نا اُمید و نامراد
ملتے از کارِ شاں اندر فساد!

ایسے غدارانِ ملت کا نقشہ حکیم الامتؒ نے ان الفاظ میں کھینچا ہے۔ جن کی زندگی کا مقصد تخریبِ خود اور تعمیرِ غیر رہا ہے۔

گاہ او را با کلیسا ساز باز
گاہ پیشِ دیریاں اندر نیاز
دین او آئین او سوداگری است
عنتری اندر لباسِ حیدری است
جعفر اندر ہر بدن ملت کش است
ایں مسلمانے کہن ملت کش است!
خند خنداں است و باکس یار نیست
مار اگر خنداں شود جز مار نیست
از نفاقش وحدتِ قومے دو نیم
ملتِ او از وجودِ او لئیم!

ملتے را ہر کجا غارت گرے است
اصلِ او از صادقے یا جعفرے است

الاماں از رُوحِ جعفر الاماں
الاماں از جعفرانِ ایں زماں!

یہ عالمانِ زنار پوش اور بتانِ باطل فروش مسلمان کی کشتِ دل میں وطن کا تخمِ ظلمت کاشت کرتے رہے اور بزعمِ خویش توحید پرستی کے دعویدار یہ عالمانِ کم نظر مسلمانوں کو خدا پرستی کے بجائے وطن پرستی کی تعلیم دیتے رہے۔ یہی عالم دیکھ کر اقبالؒ نے بہ زبانِ حقیقت یہ کہا:-

شیخِ ملت با حدیثِ دلنشیں
بر مرادِ او کند تجدیدِ دین

یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ دار دھائی مہاتما کی خواہش پوری کرنے کے لئے انہوں نے سوراجی اسلام تراشا۔ جن لوگوں نے حکیم الامت کے شاگردوں کی حیثیت سے اس وار دھائی نبوت کے پرخچے اڑوائے تھے ان کی معنوی اولاد آج پاکستان میں رہ کر اُن پر کیچڑ اُچھالنے کی جسارتیں کر رہی ہے۔ ان میں سے ایک ایک مفسر قرآن اور شیخ الحدیث ہونے کا دعویدار تھا۔

ہر یکے دانائے قرآن و خبر
در شریعت کم سواد و کم نظر

اس زمانہ میں ان کا اسلامی ہونے کا دعویٰ سراپا کافری نظر آرہا تھا۔ یہ نیشنلسٹ علماء یہ حجتِ نا استوار پیش کرتے رہے کہ قوم وطن سے بنتی ہے۔ ان تیرہ باطنوں کو حضور اقدس و اعظم۔ چراغ کائنات اور وجہ کائنات ختم المرتبت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ سُنّت۔ یہ اسوہ حسنہ کہیں نظر نہ آیا کہ

اگر قوم از وطن بودے محمدؐ
ندادے دعوتِ دین بولہب را (اقبالؒ)

یہ وہ دور تھا جب اسلامک آئیڈیالوجی کی مخالفت کے لئے یہ علمائے کرام ہندو کانگریس کے اشارے پر قیامِ پاکستان کی مخالفت کرتے تھے۔

شیخ در عشق بتاں اسلام باخت
رشتۂ تسبیح از زنّار ساخت

اس گنگا جمنی اسلام اور ان عالمانِ زنّار پوش نے ہماری ملّی تحریک کو کس قدر ضعف پہنچایا یہ حقیقت تاریخ کے صفحات پر ایک اٹل اور انمٹ شہادت کی حیثیت سے ثبت ہے۔ اس مقام پر ضمناً یہ بات آگئی۔ ذکر یہاں (ذکر للعٰلمین) قرآن کریم کا ہو رہا تھا۔ جو انسانیت کو نسل و خون۔ اور رنگ و وطن کے اغلال و سلاسل کی غلامی سے نجات دلا کر توحید پر انسانی برادری استوار کرتا ہے۔ نوعِ انسان کے لئے یہی پیامِ آخریں ہے جو نسلِ آدم کے لئے شمع ہدایت ہے۔

الٓرٰ قف كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۙ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ

الْحَمِيْدِ ۝ (۱۴/۱)

**رحمۃ اللعالمین** الف - لام - را

یہ ایک کتاب ہے جو ہم نے تجھ پر اُتاری ہے، تاکہ لوگوں کو اُن کے پروردگار کے حکم کی تعمیل میں، تاریکیوں سے نکالے اور روشنی میں لائے کہ غالب اور ستودہ خدا کی راہ ہے۔

وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝ (۲۱/۱۰۷)

یہ حیات افروز حقیقت کہ قرآن کا عطا فرمودہ نظام عالمگیر انسانیت کا نظام ہے۔ ہمارے سامنے آچکی ہے۔ یہ قانونِ حیات نسلِ انسانی کو قومیّت۔ وطنیت اور نسلیت کے تنگ دائروں سے نکال کر عالمنیت کی حدود فراموش فضاؤں میں لے جاتا ہے۔ یہ بتان رنگ و خون کو توڑ کر انسانیت کو ان اغلال و سلاسل سے آزاد کرا دیتا ہے جو امتیاز قبائل۔ وطن پرستی اور نسل پرستی نے اس کو پہنا رکھے ہیں۔ یہ نیشنلزم کو لعنت قرار دیتا ہے۔ اس نظام کا دینے والا ربّ العالمین (۱/۱) اس نظام کا ضابطہ ذکر اللعٰلمین (۶/۹۱) اور جس رسول کی وساطت سے یہ نظام ملا وہ رحمۃ للعالمین۔ تمام نظامہائے عالم میں یہ واحد نظام ہے۔ جس میں انسان حقیقی معنوں میں حریّت و آزادی سے ہمکنار ہو کر کامل آزاد ہونے کا احساس کر سکتا ہے (۲۱/۱۰۷) صفحہ ارض پر انسان کے لئے نہ اس سے آگے کوئی منزل ہے اور نہ اس سے بلند کوئی اور مقام۔ انسانی سیرت کا مقامِ محمود حضورِ اقدس و اعظم کے اسوۂ حسنہ کی پیروی مضمر ہے۔

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بُو ․․․ آنکہ از خاکش بروید آرزو
یا ز نورِ مصطفےٰ اُو را بہا است ․․․ یا ہنوز اندر تلاش مصطفےٰ است

خلق و تقدیر و ہدایت ابتدا ست
رحمۃ للعالمینی انتہا است

وَصَلَّى اللّٰهُ عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ مُحَمَّدٍ وَّبَارِكْ وَسَلَّمَ

پہلے نبی یا رسول کسی خاص قوم یا کسی ایک خاص بستی کے لئے آیا کرتا تھا جب ذہنِ انسانی سنّ شعور کو پہنچ گیا۔ اور اس کی تمدّنی زندگی کی وسعتوں میں

اضافہ شروع ہوگیا۔ اس کی حدود اس قدر پھیلنے لگیں کہ تمام نوعِ انسانی کو محیط ہونے لگیں۔ اب سامان رسل ورسائل اور ذرائع نشر و اشاعت کی ہمہ گیریت کی وجہ سے دُنیا سمٹ سمٹا کر ایک بستی اور اس کے رہنے والے ایک خاندان کے افراد بن رہے ہیں۔ اس لئے اب رسالت بھی قومی اور قبائلی ادوار و اعصار سے نکل کر عالمگیر بن گئی۔ قرآنِ کریم نے اس حقیقت کو شدت و تکرار کے ساتھ نمایاں کیا کہ نبی اکرمؐ تمام نوعِ انسانی کے لئے رسول اور قرآن قیامت تک کے لئے دُنیائے انسانیت کے لئے ہدایت اور قانونِ زندگی ہے۔

یہی شمع فروزاں ہے جو ازل سے روشن ہے اور ابد تک رہے گی کہیں ہے کہ

وَاَرْسَلْنٰكَ لِلنَّاسِ رَسُوْلًا ط (۴/۷۹)

ہم نے تمہیں نوعِ انسانی کے لئے رسول بنا کر بھیجا ہے۔

دُوسرے مقام پر:۔

قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا (۷/۱۵۸)

تمام نوعِ انسانی سے کہہ دو کہ مَیں تم سب کی طرف رسول ہوں۔

اور کہیں ہے:۔

وَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا (۳۴/۲۸ نیز ۲/۱)

یہ آیت جلیلہ:۔

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَاۤ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ط وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِيْمًا (۳۳/۴۰)

محمدؐ تمہارے مَردوں میں سے کسی کے باپ نہیں۔ لیکن اللہ کے رسول اور خاتم النبیینؐ اور اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔

ذکر للعلمین کے موضوع میں (قرآن کریم) کے متعلق اقبالؒ کا ایک مصرع دیا تھا۔ وہ پورے شعر کی تکمیل یوں کرتے ہیں:۔

نوعِ انساں را پیامِ آخریں
حاملِ او رحمۃ للعالمینؐ

وارفتگانِ ملک ونسب کی ہدایت کے لئے

جوہر او نے عرب نے اعجم است
آدم است وہم ز آدم اقدم است

رحمۃ للعالمین کی امّت بھی عالمِ انسانی کے لئے رحمت ہونی چاہیئے

ماز حکم نسبتِ او ملتیم — اہل عالم را پیام رحمتیم
پس خدا برما شریعت ختم کرد — بر رسولؐ ما رسالت ختم کرد
رونق از ما محفلِ ایام را — او رسل را ختم و ما اقوام را
لانبی بعدی ز احسانِ خدا است — پردۂ ناموسِ دین مصطفےٰؐ است

آگے چل کر وحدتِ امّت مسلمہ کے متعلق فرماتے ہیں:-

قوم را سرمایۂ قوت ازو
حفظِ سرِّ وحدتِ ملّت ازو
از رسالت صد ہزار ما یک است
جزو ما از جزو ما لاینفک است
از رسالت در جہاں تکوین ما
از رسالت دین ما آئین ما

رحمۃ للعالمینؐ سے حکیمِ امّت نگاہ التفات کے لئے ملتجی ہو رہے ہیں۔ اور اس مقام پر نہایت حسین انداز میں حضرتِ انساں کی تخلیق کے متعلق اشارہ کر گئے ہیں۔ کہ کائنات انسان کی جولاں گاہ ہے۔ یہ مرغ و ماہی۔ مہر و مہ اور چاند تارے انسانی عظمت و قوت کا طواف کرنے کے لئے مجبور ہیں۔

عرض کرتے ہیں:-

گرد تو گردد حریم کائنات
از تو خواہم یک نگاہ التفات
ذکر و فکر و علم و عرفانم توئی
کشتی و دریا و طوفانم توئی

اقبالؒ

یہ قرآنِ کریم کا ارشاد اور مسلمانوں کا ایمان ہے کہ حضور اقدس و اعظم دنیائے انسانیت کے لیئے رحمت بنا کر بھیجے گئے وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ غیر مسلم اقوام بجا طور پر یہ سوال کر سکتی ہیں کہ مسلمان اپنے پیغمبر کے متعلق جو چاہیں عقیدہ رکھیں لیکن وہ یہ دعویٰ کس طرح کر سکتے ہیں کہ ان کا پیغمبر پوری نوع انسان کے لیئے رحمت ہے؟ یہ سوال بڑا اہم ہے اور اس کے جواب کی ذمّہ داری مسلمانوں پر عائد ہوتی ہے۔ یہ دعویٰ خود اتنا بڑا ہے کہ خود اس کی اہمیت اس کے ثبوت کا تقاضا کرتی ہے۔ کیونکہ ہمارا دعویٰ یہ ہے کہ

ہر کجا ہنگامۂ عالم بُود
رحمۃ للعالمینے ہم بُود

قرآنِ کریم میں حضور اکرمؐ کے متعلق یہ کہا ہے کہ ویضع عنهم اصرهم والاغلال التی کانت علیهم وہ ان تمام بندشوں کو توڑ دے گا جو نوعِ انسانی کی حریّت و آزادی کی راہ میں حائل تھیں اور وہ ان تمام زنجیروں کو کاٹ ڈالے گا۔ جس میں انسانیت جکڑی چلی آ رہی تھی۔ غرضیکہ نبی اکرمؐ کی رسالت کا مقصد یہ بتایا گیا ہے۔

اب ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ وہ کونسی زنجیریں تھیں جن میں انسانیت جکڑی چلی آ رہی تھی اور نبی اکرمؐ نے انہیں کس طرح توڑا؟

سب سے پہلے نظامِ حکومت کو لیجیئے۔ انسانوں کو دنیا میں مل جل کر رہنا ہے اس کے سوا ان کی زندگی کی کوئی اور صورت نہیں۔ انسان مدنی الطبع واقع ہوا ہے۔ اس کے سوا اس کے لیئے اور کوئی چارہ کار نہیں کہ یہ اپنی رہن سہن کے لیئے ایک معاشرہ تشکیل کرے۔ لیکن مل جل کر رہنے سے آپس میں مفادات کا ٹکراؤ ناگزیر ہے۔ پھر اس ٹکراؤ سے اختلاف اور نزاع پیدا ہوں گے۔ اس اختلاف اور نزاع کا فیصلہ امن و سلامتی سے کرنے کے لیئے جو ادارہ بنایا جائے۔ اسے حکومت کہتے ہیں۔ یہ صورت تو تجویز کی گئی مسائل کے حل کے لیئے لیکن لوگوں کے ہاتھوں میں اقتدار آ گیا انہوں نے اسے اپنے مفاد کے لیئے استعمال کرنا شروع کر دیا۔ جب

**نظامِ حکومت** | انہیں یہ خدشہ پیدا ہوا کہ اپنے مقاصد کے حصول کے لیئے بے محابہ

اقتدار کا استعمال اور ان کی یہ مستبدانہ اور ظالمانہ روش لوگوں کے دلوں میں نفرت کے جذبات پیدا کردے گی اور لوگ بغاوت کے لئے اٹھ کھڑے ہوں گے۔ اپنے تحفظ کے لئے ارباب اقتدار نے آہستہ آہستہ اس قسم کا عقیدہ پیدا کردیا۔ کہ بادشاہ خدائی اختیارات کا مالک ہوتا ہے۔ اور باقی دوسرے انسان اس کی خدمت اور اطاعت کے لئے پیدا ہوتے ہیں۔ ظہور نبی اکرمؐ کے وقت تمام مہذب دنیا کی یہی حالت تھی۔ ہر ملک، ہر قوم میں ایک بادشاہ اور تمام اقتدارات واختیارات اس کے ہاتھ میں ہوتے تھے۔ بادشاہ کو خدا کا سایہ (ظلّ اللہ) سمجھا جاتا تھا۔ بادشاہ اقتدار وحاکمی کے لئے۔ باقی انسان خدمت گذاری اور فرماں پذیری کے لئے زندہ رکھے جاتے تھے۔ دنیا اس نظامِ حکومت کی اس درجہ خوگر ہو چکی تھی۔ کہ اس کے علاوہ کوئی نظامِ حکومت ان کے تصور میں بھی نہیں آتا تھا لیکن

ظہورِ مصطفویؐ را بہانہ بولہبی است

حضورِ اقدس واعظم سالارِ انسانیتؐ تشریف لائے انہوں نے ساری دنیا کو للکارا کہ کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ کسی دوسرے انسان پر حکومت کرے۔ انہوں نے اس مقراضِ حیاتِ انسانی کو پولادِ ایمانی سے کاٹ کر رکھ دیا۔ آپ نے فرمایا کہ باہمی معاملات کا فیصلہ باہمی مشوروں سے طے ہونا چاہیئے۔ یعنی نظامِ حکومت مشاورتی ہونا چاہیئے نہ کہ شخصی اور استبدادی۔ آپ کے اس آوازۂ حق نے غلامی اور محکومی۔ زبردستی اور فرماں پذیری کی ان تمام زنجیروں کو کاٹ کر رکھ دیا۔ جن میں صدیوں سے انسانیت جکڑی چلی آ رہی تھی۔ آپ نے دنیا کو بتایا کہ آدم بے بصری کی وجہ سے بندگیٔ آدم کر رہا ہے۔ کیا سحر اعجاز کی اس آواز نے دنیا کی حالت تبدیل نہیں کی۔ کیا یہ تمام نوعِ انسانی کے لئے نشیدِ رحمت نہیں ثابت ہوئی؟ یہ ملوکیت کی غلامی تھی۔ جس سے حضورؐ نے انسان کو نجات دلائی۔ آپؐ کی آمد سے پہلے جو کیفیت تھی اقبالؒ اپنے احساسات یوں پیش کرتے ہیں:۔

هنوز اندر جہاں آدم غلام است
نظامش خام و کارش ناتمام است

غلام فقر آں گیتی پناہم
کہ در دینش ملوکیت حرام است

اب ایک اَور سمت دیکھئے کہ ملوکیت کی غلامی انسان کے جسم کی غلامی تھی۔ لیکن اس سے بدتر ایک اَور غلامی تھی جس میں انسان کی رُوح جکڑی ہوئی تھی۔ یہ غلامی تھی پیشوائیت (PRIESTHOOD) کی غلامی۔ بادشاہ کے احکام کے خلاف

**پیشوائیت**

بغاوت سے تو انسان کی دُنیا خراب ہوتی تھی لیکن مذہبی پیشواؤں کے ارشاد کی تعمیل میں ذرا سی تاخیر اَور کوتاہی سے دُنیا اور آخرت دونوں سامانِ رُسوائی آدم بن جاتی تھیں۔ ان کی حکومت انسان کی رُوح پر چھائی ہُوئی تھی۔ انہیں خدا کے ارادوں میں دخیل سمجھا جاتا تھا۔ ان کی ہیبت انسان کے خون کے ذرّوں کے اندر حلول ہو چکی تھی۔ حضورِ اقدس و اعظم[۳] تشریف لائے اور آپ نے عالمِ انسانی کو للکار کر کہہ دیا کہ خُدا اور اُس کے بندے کے درمیان کوئی قوت حائل نہیں ہو سکتی۔ کوئی انسان بارگاہِ خُداوندی کا حاجب اور دربان نہیں۔ اطاعت صرف خُدا کے قانون کی ہے اور انسان بطور انسان سب یکساں اَور واجب التکریم و تعظیم ہیں۔ اس آوازۂ حریت نے عقید تمندیوں کی ان تمام جڑوں کو کاٹ کر رکھ دیا۔ اس حریت آموز اَور انقلاب آفریں آواز نے رُوحِ انسانیت کو باطل کی ان زنجیروں سے آزاد کرا دیا جو پاپائیت اور کاہنیت نے اپنی مفاد پرستیوں اور عیش کوشیوں کے لئے رُوحِ انسانی کو پہنا رکھی تھی۔ اقبالؒ کی زبان میں:۔

پیرِ کلیسا! یہ حقیقت ہے دلخراش
ہر گرگ کو ہے برّۂ معصوم کی تلاش

یہ کلیساؤں کے لات و منات مخلوقِ خُدا کو اپنی غلامی و محکومی کے لئے مجبور کرتے تھے۔ حضورِ اکرمؐ کے اس انسانیت ساز اعلان نے

بندۂ درماندہ را گوید کہ خیز
ہر کہن معبود را کن ریز ریز

ان کے زُہد و تقدس سے نقاب سرکایا اور ان کے مکر و ریا کی بساط اُلٹ

کر رکھ دی۔ آپ کے آوازۂ حریت نے جب انسان کو پیغامِ آزادی دیا اور انسانی عقل و شعور اور علم و بصیرت نے یہ محسوس کیا کہ میں ناداں بن کر اپنے ایسوں ہی کی غلامی میں مبتلا رہا ہوں۔ اب اس نے مقامِ انسانیت کو دیکھ لیا اور جسم و روح کی زنجیروں کو جھٹکتے ہوئے فخر و ناز سے سربلند ہو کر یہ نغمۂ حریت الاپا

کردہ ام اندر مقاماتش نگہ
لا سلاطین، لا کلیسا، لا اِلٰہ

ابوجہل نے اپنے نوحہ میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ جس میں وہ اپنے معبودوں سے التجا و آہ و زاری کر کے کہتا ہے کہ محمدؐ بن عبداللہ عرب کی فضیلت کا منکر ہے اور ہم نے انسانوں میں جو ادنیٰ و اعلیٰ کے درجات قائم کئے ہوئے ہیں۔ ان کو تسلیم نہیں کرتا۔ وہ یہ بات اعلانیہ کہہ کر ہم سردارانِ قریش کی توہین کرتا ہے۔ کہ ہر انسانی بچہ انسان ہونے کی حیثیت سے یکساں اور برابر ہے۔ بلکہ اس نے ہمارے مروجہ طریقوں کو ختم کرنے کے لئے ایسا عمل شروع کر دیا ہے کہ

در نگاہِ او یکے بالا و پست
با غلامِ خویش بر یک خواں نشست

حضورؐ کی تشریف آوری سے قبل جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے:۔

بود انساں در جہاں انساں پرست
ناکس و نابود مند و زیر دست

نبی اکرمؐ نے انسان کو انسان کی غلامی سے نجات دلائی۔ کیا یہ آوازِ نوعِ انسانی کے لئے نویدِ رحمت نہیں۔ ملوکیت اور پیشوائیت نے اپنے استبداد کی زنجیروں کو مضبوط کرنے کے لئے یہ عقیدہ وضع کر رکھا تھا۔ کہ کچھ انسان پیدائشی طور پر حکومت اور پرستش کے حقوق لے کر آتے ہیں۔ اور دوسرے انسان پیدائشی

**پیدائشی امتیازات**

طور پر جنم ہی نیچ قوموں میں لیتے ہیں۔ انسانوں کی یہ تقسیم خدائی قانون کے مطابق ہے۔ اس لئے اس کے خلاف لب کشائی خدا کے فیصلوں کے خلاف سرکشی ہے۔ ظہورِ اسلام کے وقت یہ قریب ملوکیت و پیشوائیت ایک مسلمہ کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ حضور اکرمؐ

احترامِ آدمیت کا پرچم بلند کرتے ہوئے آگے بڑھے اور ساری دُنیا کو مخاطب کر کے فرمایا کہ پیدائش کے اعتبار سے کوئی بڑا چھوٹا نہیں۔ اسلام کے نزدیک نسلی تفوّق اور اضافی نسبتوں کی کوئی حقیقت نہیں۔ خُدا کے قانون کے نزدیک معزّز و محترم وہ ہے۔ جو اکرم ہے۔ خاندانی نسبتیں اور پیدائشی امتیازات انسان کو کوئی مرتبہ و مقام نہیں دے سکتے۔ اس کی بارگاہ میں قبولیت صرف جوہرِ ذاتی کو ہے۔ پیدائشی نسبتوں کے امتیازی خطوط کھینچنے والے فسادِ آدمیت کے جُرمِ عظیم کے مرتکب ہوتے ہیں۔ آپ کی اس ایک آواز نے تمام انسانوں کو ایک ہی صف میں لا کر کھڑا کر دیا۔ اور اس طرح پیدائشی امتیازات کے وُہ تمام بندھن ٹُوٹ گئے۔ حسب و نسب پر فخر کرنے والوں کے سرِ غرُور خاک میں مل گئے۔ انسانیت ان بندھنوں سے آزاد ہو گئی جن میں وُہ جکڑی ہوئی تھی۔ آپ نے واشگاف الفاظ میں فرما دیا کہ اسلام انسانی اُخوّت کا قیام نسب پر نہیں رکھتا۔ کیونکہ اس نظریہ کو اپنانے سے انسانیت ہزار پارہ ہو جاتی ہے۔ اور ہر قوم اور ہر قبیلہ اپنے بتّوں کا زنّاری بن جاتا ہے۔ اس سے احترامِ انسانیت ختم ہو جاتا ہے۔

گر نسب را جزوِ ملّت کردۂ
رخنہ در کارِ اُخوّت کردۂ

یہ ضیائے شعور اقبالؒ کو قرآن کے مطالعہ نے دی۔ جسے وُہ نظریۂ پاکستان کے ذریعے دُنیائے آدمیّت میں عام کر کے احترامِ آدمیّت کے لئے آدم کو مقامِ آدمیّت سے باخبر کرنا چاہتے ہیں۔

دُوسری جگہ :۔

برتر از گردوں مقامِ آدم است
اصلِ تہذیب احترامِ آدم است

اسی لئے اقبالؒ نے مرغِ حرم سے کہا تھا کہ

غبار آلود ہیں نام و نسب بال و پر تیرے
تو اے مُرغِ حرم اُڑنے سے پہلے پرفشاں ہو جا

اقبالؒ اسلامی نقطۂ نظر سے یہ بات کہنے کے لئے مجبور تھے۔ کیونکہ "مُرغِ حرم"

(توحید پرست مسلمان) کے پَر و بال خاکِ نام و نسب سے گرد آلود نہیں ہوتے چاہئیں۔ اسلام انسان کو انسانوں کی غلامی کے چنگل سے نجات دلانے اور حسب و نسب کے بجائے کردار پر فخر و ناز کرنے کا سبق دینے کے لئے آیا ہے۔

اَور آگے بڑھیئے:۔

انسانوں نے مختلف ملکوں اَور مختلف خطّوں میں بسنا شروع کیا اَور یہی خطّے ان کا وطن قرار پا گئے۔ اس سے زیادہ ان جغرافیائی حدُود کی حیثیت کچھ نہ تھی۔ لیکن ذہنِ انسانی کی تنگ نظری سے ندّیوں اور دریاؤں، سمندروں

**نیشنلزم**

اَور پہاڑوں کی یہی لکیریں قومی امتیازات کے سانپ بن گئیں۔ ہر خطّے کا انسان دُوسرے خطّے کے انسان کو اپنا دشمن تصوّر کرنے لگا۔ اس طرح ایک دُوسرے سے دُشمنی نے قومیت پرستی (نیشنلزم) پیدا کی۔ نیشنلزم کی بنیاد پر انسانیت کا بے بہا خُون بہایا گیا۔ نیشنلزم کے شیطان نے انسانوں ہی کے خلاف انسانوں کی اس صف آرائی کو مذہبی فریضہ قرار دیا۔ اس طرح سے انسان کے خُون کی وُہ ارزانی ہُوئی کہ انسانی تاریخ اس المناک صداقت پر آج تک نوحہ گر تھی۔ حضورِ اکرمؐ نے تمام دُنیا کو پکار کر کہہ دیا کہ تمہارے وطنوں کی لکیریں خود ساختہ ہیں۔ تمام انسان بلا تمیز رنگ و نسل۔ خُون و وطن ایک درخت کی شاخیں اور ایک کُنبے کے افراد ہیں۔ ان سب کو ایک بن کر رہنا ہوگا۔ کیونکہ ان سب کی حیات کا سرچشمہ ایک ہے۔ آج فضائے عالم میں ایک حکومت اور وحدتِ انسانیت کے حق میں جو آوازیں اُٹھ رہی ہیں کیا اسی پیغام احترامِ آدمیّت کی صدائے بازگشت نہیں جو حضورِ اکرمؐ نے بلند کی تھی؟ ساری دُنیا کے انسانوں کا ایک برادری بن کر رہنا اور ایک عالمگیر نظام کے تحت زندگی بسر کرنے کے لئے ایک حاکم (خُدا) ایک قانون (قُرآنِ عزیز) پر ایمان لانے کی دعوت کیا نوعِ انسان کے لئے پیغامِ رحمت نہیں؟

اقبالؒ کہتے ہیں:۔

نیست از رُوم و عرب پیوندِ ما
نیست پابندِ نسب پیوندِ ما

دِل بہ محبُوب حجازی بستہ ایم

زیں جہت بایک دگر پیوستہ ایم

حضورؐ کی رحمۃ للعالمینی نظریۂ پاکستان میں پُوری طرح جھلمل جھلمل کر رہی ہے۔ دیکھنے کے لئے اقبالؒ ہی کے نُورِ بصیرت کی ضرورت ہے۔ جس کے عام کرنے کے لئے اقبالؒ نے دُعا کی تھی کہ

خُدایا آرزو میری یہی ہے

مرا نُورِ بصیرت عام کر دے

اب انسانی زندگی کے ایک اور گوشے کو لیجئے۔ حالت یہ تھی کہ مذہبی دُنیا میں ہر فرد اپنی اپنی نجات کے فکر میں غلطاں و پیچاں تھا۔ اور معاشی دُنیا میں ہر شخص مفادِ خویش کی فکر میں سرگرداں۔ یعنی ساری دُنیا میں محض افراد بستے تھے۔ انسانیت کا کہیں نام و نشان تک نہ تھا۔ ذرا سوچیئے کہ جس جہاں میں ہر فرد اپنی اپنی نجات کی فکر میں مضطرب و بے چین اور ذاتی مفاد پرستی کو مقصدِ حیات قرار دیتا ہو۔ وہاں نفسا نفسی کا کیا عالم ہوگا۔ اس انفرادیت کا نتیجہ سودِ خویش کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ ایسی زندگی کا یہی وُہ ثمر خبیثہ ہے جسے سرمایہ داری کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس عالمِ نفسا نفسی میں مُحسنِ انسانیتؐ تشریف لائے۔ اور آپ نے انسانی ذہنیت کو یہ کہہ کر تبدیل کر دیا کہ ہر فرد کی نشو و نما دُوسرے افراد کی نشو و ارتقا میں مضمر ہے۔ آپ نے وحدتِ انسانیت کے اس راز کو اُجاگر کیا کہ ایک فرد کی ذات کی بالیدگی و برومندی اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ وُہ دوسرے افرادِ معاشرہ کی نشو و نما کے لئے زیادہ سے زیادہ کوشش کرے۔ اس طرح سے آپ نے انسان کو زندگی اور زندگی کو نئی تعبیر عطا کی۔ وُہ مفاد پرست قوتیں رگِ آدم سے خُون کشید کر کے اپنی سرمستیوں اور عیش کوشیوں کے لئے آبِ لالہ گوں تیار کرتی تھیں ان کے ہاتھ رُک گئے۔ انسانی دنیا نے یہ سمجھ لیا کہ ہر فرد کی ذات کی نشو و نما دُوسروں کی مضمر صلاحیتوں کی نشو و نما کے لئے سامانِ پرورش بہم پہنچانے میں ہے۔ سالارِ انسانیتؐ نے دُنیائے انسانیت کے سامنے یہ واضح اعلان

**سرمایہ داری**

کیا کہ جو نظام افرادِ معاشرہ کی ضروریاتِ زندگی کا کفیل اور ان کی مضمر صلاحیتوں کی برومندی اپنے ذمّہ نہیں لیتا اسے دُنیا میں قائم رہنے کا کوئی حق نہیں۔ یہ وُہ زلزلہ انگیز اعلان تھا جس سے دُنیا کا ہر قارون زمین میں دھنس گیا۔ اور اس کے تمام خزانوں اور دفینوں کے دروازے ہر حاجت مند کے لئے کُھل گئے۔ آج بھی جو معاشرہ اسلام کے اُصولوں پر قائم ہوگا۔ افرادِ معاشرہ کے رزّق کی ذمّہ داری اس کے نظام کے ذمّہ ہوگی۔

نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَإِيَّاهُمْ ( ٦/١٥٢ )

ہم تمہارے اور تمہاری اولاد کے رزّق کی ذمّہ داری لیتے ہیں۔

ظاہر ہے یہ اُسی صُورت میں ممکن ہے کہ وسائل پیداوار تمامتر نظامِ معاشرہ کی تحویل میں ہوں جو مملکت افرادِ معاشرہ کی ربوبیت کی ذمّہ داری اپنے سر نہیں لیتی وُہ اسلامی مملکت نہیں کہلا سکتی۔ ارض کے لئے قرآن نے کہہ دیا کہ اُسے خُدا نے مخلوق کی پرورش کے لئے پیدا کیا۔ وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ ( ٥٥/١٠ ) جب تک تمام وسائل پیداوار ضرورت مندوں کی ضروریات پُورا کرنے کے لئے یکساں طور پر کھلے نہ رہیں ایسا کرنا ناممکن ہے۔ زمین اُمّ الوسائل ہے۔ اس کا حقِ ملکیت خالقِ ارض و سمٰوٰت نے اپنے قانون کو دیا ہے۔ یہ ذرائع پیداوار انسانوں کی تحویل میں رہیں گے لیکن افرادِ معاشرہ انہیں اپنی مرضی سے نہیں ربّ العالمین کے نظامِ ربوبیت کی رُو سے ضرورت مندوں میں تقسیم کریں گے۔

رحمۃ للعالمینؐ نے ڈنکے کی چوٹ یہ اعلان کیا:۔

وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِى الْاَرْضِ ط ( ١٣/١٧ )

یعنی۔ رُوئے زمین پر وُہی نظام تمکّن اور غلبہ حاصل کرے گا۔ جو نوعِ انسانی کے لئے نفع بخش ثابت ہوگا۔

آپ کی ذات گرامی علاّمہ اقبالؒ کے الفاظ میں:۔

"آپ کی ذات گرامی دُنیائے قدیم اور دُنیائے جدید کے درمیان ایک حدِ فاصل کے طور پر کھڑی ہے اس مقام سے انسانیت کی تاریخ ایک نیا موڑ مُڑی ہے جس سے اس کے سامنے زندگی کی جدید راہیں کُھل گئی ہیں۔

آپ دیکھیں گے کہ اس تیرہ سو سال میں انسان کی داخلی اور خارجی دُنیا میں جس قدر ایسے انقلابات آئے ہیں۔ جن کے نتائج تعمیرِ انسانیت کے لئے ممد و معاون ثابت ہُوئے ہیں۔ ان کا سرچشمہ وُہی پیغام تھا جو محمدؐ رسول اللہ کی وساطت سے دُنیا کو ملا۔ اس پیغام نے انسان کو نئی زندگی اور زندگی کو نئی تعبیر عطا کی جس سے نیضِ کائنات باندازِ نوتپش آمادہ ہوگئی"

کارلائل کے الفاظ میں:۔

"نوعِ انسان خشک نیستاں کی طرح ایک شرارے کے انتظار میں تھی وُہ بجلی کا شرارہ اس بطلِ جلیل کی صُورت میں آسمان سے آیا اور ساری دُنیا کو شعلہ صفت بنا گیا"

لیکن ظاہر ہے کہ سُورج کی روشنی اسی کو راستہ دکھا سکتی ہے جو اپنی آنکھوں سے کام لے۔ بارش اسی کسان کی جھولی موتیوں سے بھر سکتی ہے۔ جس نے اپنے کھیت کو سیرابی کے قابل بنا رکھا ہو۔ اسی طرح رسالتِ محمدیہ صحیح معنوں میں انہی کے لئے رحمت بن سکتی ہے۔ جو اپنے معاشرے کو ان خطوط پر متشکل کریں جو اس پیغامِ خداوندی نے نوعِ انسانی کی ربوبیت کے لئے متعین کئے ہیں۔

اسی طرح دُوسرے مقام پر:۔

رحمۃ للذین اٰمنوا منکم۔ یہ رحمت ہے ان لوگوں کے لئے جو اس نظامِ خداوندی کو اپنا نصب العین بنائیں۔ رحمت کہتے ہیں اس قالب (PATTERN) کو جس کے اندر کوئی شئے اپنی تکمیل کو پہنچے۔

ظاہر ہے انسانی صلاحیتیں صرف اسی قالب کے اندر اپنی کامل نشوونما حاصل کر سکتی ہیں جو آئینِ خداوندی کی حدُود سے متشکل ہوتا ہے۔ جب عالمِ انسانی اس نظام کے قالب میں ڈھل جائے گا۔ اس وقت انسان دیکھے گا۔ کہ کس طرح رسولِ اکرمؐ فی الواقعہ رحمۃ للعالمینؐ ہیں۔

موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لئے
نے کوئی فغفور و خاقاں نے فقیرِ رہ نشیں

یہی وہ سرچشمۂ ہدایت ہے۔ دنیائے آدمیت جس وقت اس نظامِ حیات کو اپنا لے گی۔ انسانیت حضورؐ کی ردائے رحمۃ للعالمینی میں آجائے گی۔ کیونکہ خالقِ کائنات کا عطاکردہ قانونِ زندگی ہی

ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

رحمۃ للعالمینؐ بزم کونین سجانے اور انسانوں کو ہر قسم کی غلامی سے نجات دلانے کے لئے تشریف لائے۔ وحدتِ انسانیہ آپ کے مشن کا مقصد اوّلین و آخرین تھا۔ گروہ در گروہ۔ فرقوں اور قوموں۔ ملکوں اور نسلوں میں بٹی ہوئی انسانیت

ایک مدت سے بھٹکتے ہوئے انسانوں کو
ایک مرکز پہ بلانے کے لئے آپؐ آئے

کیا یہ انقلاب انگیز پیغام نوعِ انسانی کے لئے آیۂ رحمت نہیں تھا؟ کہ آپؐ نے نسل و وطن۔ رنگ و خون۔ ملک و قوم کے امتیازات کو ختم کر کے آئیڈیالوجی کی بنا پر انسانیت ساز عالمگیر معاشرہ تشکیل کرنے کی دعوت دی۔

## ایک غلط فہمی کا ازالہ

مسلمانوں میں یہ عقیدہ عام پایا جاتا ہے۔ کہ حضورؐ اکرم رحمۃ للعالمین کے بعد بھی اللہ کی طرف سے مجدد۔ مہدی۔ مسیح آئیں گے۔ ہمارے لٹریچر میں ایسی روایات ہیں۔ جن سے اس خیال کو تقویت ملتی ہے ہمارے نزدیک حضور اقدس و اعظمؐ کی ختم المرسلینی اور ختم نبوت پر اس خیال سے حرف آتا ہے۔ اور یہ عقیدہ ختم المرسلینی اور رحمۃ للعالمینی کے مفہومات کی نافہمی کی وجہ سے دلوں میں راسخ ہو گیا ہے۔ حکیم الامت علامہ اقبالؒ اس کے متعلق کیا رائے تھی ملاحظہ فرمائیے:۔

"ہاں یہ ٹھیک ہے کہ آپ کو کسی عالم سے یہ سوالات کرنے چاہئیں جو آپ نے مجھ سے کئے ہیں۔ میں زیادہ سے زیادہ آپ کو صرف اپنا عقیدہ بتا سکتا ہوں اور بس۔

فرماتے ہیں:۔

"میرے نزدیک مہدی۔ مسیحیت اور مجددیت کے متعلق جو احادیث[1] ہیں وہ ایرانی اور عجمی تخیلات کا نتیجہ ہیں۔ عربی تخیلات اور قرآن کی صحیح سپرٹ سے ان کو کوئی سروکار نہیں"۔

**نوٹ**:۔ چوہدری محمد احسن کے نام جن کے بڑے بھائی حافظ محمد حسن کا تعلق جماعت احمدیہ لاہور سے ہے ان کے خط کے جواب میں

مکاتیب اقبال حصہ دوم صفحہ ۲۳۰ و ۲۳۱
مرتبہ شیخ عطا محمد

اس کی تائید ان کے بہت سے اشعار سے ہوتی ہے۔ یہاں پر ایک شعر درج کیا جاتا ہے۔

بینار دل پہ اپنے خدا کا نزول دیکھ
اب انتظار مہدی و عیسٰی بھی چھوڑ دے

قرآنی تعلیم صرف ایک ہی حقیقت سے روشناس کراتی ہے کہ اب یہ فریضہ خیر امت کے ذمے ہے۔ اب کوئی مامور من اللہ انسانوں کی ہدایت کے لئے نہیں آئے گا۔ یہ حقیقت ہے کہ اس غیر قرآنی نظریے کی تردید اکثر دماغوں کو ناگوار گزرے گی۔ لیکن چونکہ ہم اقبالؒ کے نظریہ پاکستان کو پیش کر رہے ہیں۔ اس لئے حکیم الامت کے عقیدہ ختم نبوت اور حضورؐ کی رحمۃ للعالمینی کی حیثیت کو مدنظر رکھتے ہوئے اس مقام پر پہلو تہی ممکن نہ تھی اور یہ ناگزیر تھا کہ اقبالؒ ختم نبوت سے کیا مفہوم لیتے ہیں۔ اس کی وضاحت کی جائے۔ یہ حقیقت ہے کہ آج تک جتنے جھوٹے مدعیان نبوت پیدا ہوئے ہیں۔ ان کی اٹھان کی تائید یہی غلط روایات تھیں جنہیں اقبالؒ ایرانی اور عجمی تخیلات کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ ایک دوسرے مقام پر

کھلے جاتے ہیں اسرار نہانی — گیا دور حدیث لن ترانی
ہوئی جس کی خودی پہلے نمودار — وہی مہدی وہی آخر الزمانی

ایسے نظریات و خیالات اور ایسے عقائد پر اظہار تاسف کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

---

[1] انہیں احادیث کہنا ہی نہیں چاہیئے کیونکہ حضورؐ کا فرمان روح قرآنی کے خلاف نہیں ہو سکتا۔ (مؤلف)

مسلماں ہے توحید میں گرمجوش　　مگر دل ابھی تک ہے زنّار پوش
تمدّن تصوّف شریعت کلام　　بُتانِ عجم کے پجاری تمام
حقیقت خرافات میں کھو گئی
یہ اُمّت روایات میں کھو گئی

اقبالؒ کے نزدیک آنے والے کا نظریہ غیر قرآنی ہے۔ رسول اللہ کی رسالت قرآن کی دفتین میں قیامت تک کے لئے محفوظ ہے۔ اس رسالت کا عملی نفاذ قرآنی نظامِ حکومت کی شکل میں ہوگا۔ اس نظام کی وارث ملّتِ اسلامیہ خیرِ اُمّت ہے۔ بہترین اُمّت۔ امام للنّاس۔ قوموں کی امامت و قیادت کرنے والے۔ یہ عقیدہ کہ خیرِ اُمّت اپنی حالت کو جیسا جی چاہے رکھے۔ دُنیا کی ذلیل ترین قوموں میں اس کا شمار ہو، بے کسی و بے بسی۔ محکومی و غلامی کے عذاب خداوندی میں گرفتار رہے۔ اس لئے عذابِ خداوندی سے نجات حاصل کرنے کے لئے کسی کوشش و عمل کی ضرورت نہیں۔ آخری وقت جناب ایک آنے والا آئے گا اور افرادِ اُمّت کی ذلّت اور رُسوائیوں کو عزت و عظمت میں بدل دے گا۔ خود فریبی اور خدا فریبی ہے۔ خُدا کا قانون ہمارے سامنے غیر مبہم اور واضح طور پر موجود ہے کہ

جب تک کوئی قوم اپنے ضمیر میں انقلاب نہیں پیدا کرتی۔ اس کے حوالی میں انقلاب پیدا نہیں ہو سکتا (۱۳/۱۱) إِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوا مَا بِأَنْفُسِهِمْ ط

یہاں فرقوں کی بحث نہیں۔ قرآن کی رُو سے فرقہ آرائی اور فرقہ سازی کفر و شرک ہے۔ مقصود ختمِ نبوّت اور رحمۃ للعالمینی کی وضاحت ہے جس کے لئے سندِ حکیم الامّتؒ کے مولہ بالا خط کو ٹھہرایا گیا ہے۔

"آنے والے" کا انتظار اس وقت ہوتا ہے کہ جب قوم میں بڑھنے اور زندہ رہنے کی قوت باقی نہ رہے۔ ظاہر ہے کہ جو قوم اس درجہ شکستہ بازو ہو چکی ہو اس کی متاعِ حیات خوانِ یغما بن جاتی ہے کہ جس کا جی چاہے چھین جھپٹ کر لے جائے۔ اپنی ہزار سال کی تاریخ پر نظر ڈالئے اور

خرمنِ ملّت کے لئے کس درجہ غارت گر واقع ہوئے۔ عہد گذشتہ کے مدعیان کو چھوڑیئے۔ عہد حاضر میں ایران کے سید علی محمّد باب اور مرزا حسین علی بہا اللہ، مہدویت کے اس دروازے سے نبوّت اور پھر مظہر الوہیت کے ادعائی مقام تک پہنچے۔ پنجاب میں مرزا غلام احمد صاحب کو یہی دروازہ کھلا نظر آیا اور وہ بھی دبے پاؤں مجددیت، مہدویت، مسیحیت کے منازل طے کرتے ہوئے نبوّت کی چوکی تک پہنچے۔ علاّمہ اقبالؒ کے الفاظ ہیں:-

"ہمارے زمانہ کی ان دو تحریکوں میں جنہوں نے زمانۂ قبل از اسلام کے مجوسی تصوّر کا احیاء کرنا چاہا بہائیت قادیانیت سے دیانت دار ہے اس لئے کہ بہائیت اپنے آپ کو علانیہ اسلام سے الگ قرار دیتی ہے لیکن قادیانیت اسلام کے بعض خارجی علامات کو برقرار رکھ کر اندرونی طور پر ایک ایسا تصوّر پیش کرتی ہے۔ جو اسلام کی رُوح اور مقاصد کے یکسر خلاف ہے۔" (احمدیت اور اسلام)

ہمارے مولوی صاحبان پچاس برس سے قادیانیوں کے ساتھ مناظرے، مباحثے، مجادلے، مباہلے کرتے چلے آ رہے ہیں۔ لیکن بھنور میں پھنسی ہوئی لکڑی کی طرح معاملہ وہیں کا وہیں ہے۔ اس لئے کہ یہ مولوی صاحبان خود ایک "آنے والے" کے انتظار میں ہیں اس بحث کا مدار روایات و آثار پر ہوتا ہے۔ جن میں موافق اور مخالف دونوں کو اپنے دعاوی کی تائید میں کچھ نہ کچھ مل جاتا ہے۔ خود مرزا صاحب کے دعاوی کا مدار روایات پر تھا لیکن بایں ہمہ، روایات کے متعلق وہ کہا کرتے تھے کہ

حدیثوں کی کتابوں کی مثال تو مداری کی پٹاری کی ہے جس طرح مداری جو چاہتا ہے اس میں سے نکال لیتا ہے۔ اسی طرح جو چاہو نکال لو۔

(الفضل قادیان۔ بابت ۱۵ر جولائی ۱۹۲۴ء)

اگر بحث کا مدار قرآن پر ہوتا اور قرآنی نظام صحیح طور پر سمجھ لیا جاتا تو سارا قصّہ دو منٹ میں ختم ہو جاتا رسالت قرآن میں محفوظ ہے اور جب تک قرآن باقی ہے۔ رسالت بھی باقی رہی امامت (امارت) سو اس کا نظام ملّت خود قائم کر سکتی ہے

اس کے لئے کسی مامور من اللہ کی ضرورت ہی نہیں۔ مہدی، مجدد، مسیح موعود کے تصورات غیر قرآنی ہیں اور ظل و بروز کے نظریات، یکسر مجوسی اور آریائی اوتار کے چربے جن کا اسلام سے کوئی واسطہ نہیں۔ نبوت کی قسمیں نہیں ہوتیں۔ نبوت کی ایک ہی قسم ہے وہ اصلی اور حقیقی نبوت ہے۔ جو اللہ کی طرف سے وہبی طور پر ملتی ہے۔ ظلی۔ بروزی۔ تدریجی۔ اتباعی نبوت کا تخیل غیر قرآنی ہے۔

(معراج انسانیت صفحہ ۸۰۶ و ۸۲۶)

ہمارے نزدیک ختم المرسلینیؐ (ختم نبوت) اور رحمۃ للعالمینیؐ کی صراحت کے لئے یہ نہایت ضروری تھا۔ اسی لئے اس مقام پر اقبالؒ و پرویز کی تحریرات کو ایک دوسرے کی تائید میں جمع کر دیا ہے۔ اب جس کا جی چاہے پرویز کو منکرِ حدیث اور اقبالؒ کو عاشقِ رسولؐ۔ قلندرِ لاہوری اور مفکرِ اسلام کہے۔ لیکن جہاں تک حقیقت کشائی کا تعلق ہے۔ دونوں کے خیالات یکساں اور حرف بحرف ایک دوسرے کی تائید کرتے ہیں۔ اب آئندہ باب میں وحدتِ خالق۔ وحدتِ مخلوق اور وحدتِ قانون کے موضوع کو پیش کیا جائے گا۔

---

## آٹھواں باب

# وحدتِ خالق ــــ وحدتِ مخلوق ــــ وحدتِ قانون

برگ و سازِ کائنات از وحدت است
اندریں عالم حیات از وحدت است (اقبالؒ)

یہ زندہ حقیقت ہے۔ کہ انفس و آفاق میں ایک ہی قوت (ربّ العالمین) کا قانون کارفرما ہے۔ یعنی وہی قانونِ ربوبیت جو خارجی کائنات میں از خود نافذ العمل ہے اسے انسانی دُنیا میں بھی نافذ العمل ہونا چاہیئے۔ کیونکہ انسان کسی دُوسرے قانون کے ذریعے کامیاب زندگی بسر نہیں کرسکتا۔ اس وحدتِ قانون (UNITY OF LAW) کے معنی ہیں۔ وحدتِ خالق۔ وحدتِ خالق کا لازمی نتیجہ وحدت مخلوق۔ یعنی تمام نوعِ انسانی ایک عالمگیر برادری (ONE SINGLE COMMUNITY) قرآن نے اس حقیقت پر بڑا زور دیا ہے۔ کیونکہ انسانی دُنیا میں قانونِ رب العالمینی کی تمام عمارت اسی بنیاد پر قائم ہے۔ وہ کہتا ہے کہ نوعِ انسانی کی تخلیق ایک نفسِ واحد (ONE BREATH OF LIFE) سے ہوئی ہے۔

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَّاحِدَةٍ (۷/۱۰۹)

تمام انسان ایک ہی درخت کی شاخیں، ایک ہی برادری کے افراد، ایک ہی جسم کے مختلف حصے ہیں۔ اس لئے ان سب کی تخلیق اور زندگی کی اُٹھان نفس واحد (ONE SINGLE SOUL) کی طرح ہونی چاہیئے۔ (مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ اِلَّا لِنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ) انسان کی ہوسناکیوں نے اس عالمگیر برادری کو ٹکڑے ٹکڑے کر رکھا ہے۔

ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انسان کو
اخوت کی زباں ہوجا محبّت کا بیاں ہوجا

یہ ہندی وہ خراسانی یہ افغانی وُہ تورانی
تو اَے شرمندۂ ساحل اُچھل کر بیکراں ہو جا

دُوسرے مقام پر:۔

جہاں را زیک آب و گِلِ آفریدم
تو ایران و تاتار و زنگ آفریدی (اقبالؒ)

لیکن وحی کا مقصود یہ ہے کہ نوعِ انسانی کو اُمّتِ واحدہ بنایا جائے۔ (کَانَ النَّاسُ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً قف فَبَعَثَ اللّٰہُ النَّبِیّٖنَ ...... ۲/۲۱۳)
اس وحدتِ انسانیت کا عملی طریقہ یہ ہے کہ خدا کی ربوبیتِ عامہ کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا لیا جائے۔ انبیاء کرامؑ کا مشن اسی طریق پر اُمّتِ واحدہ تشکیل کرنا تھا (یہی حقیقت نظریۂ پاکستان میں جھلمل جھلمل کر رہی ہے) اس کے لئے وُہ خود سب سے پہلے ایک (اُمّتِ واحدہ) بنتے تھے (بعد میں آنے والے نبی اور رسول پہلے انبیاء کرامؑ کی تصدیق کرتے چلے آئے اور ایک قوتِ حاکمہ کے ایک ہی قانون کی اطاعت کے لئے لوگوں کو ہدایت کرتے رہے)
وَاِنَّ ھٰذِہٖۤ اُمَّتُکُمْ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً وَّاَنَا رَبُّکُمْ فَاتَّقُوْنِ ○ (۲۳/۵۲) قرآن وحدتِ انسانیہ کی قدر پر زور دیتا ہے۔ اس کا اندازہ سُورۂ مائدہ کی اس ایک آیت سے لگایا جا سکتا ہے جس میں وُہ کہتا ہے کہ جس شخص نے کسی ایک جان کو بھی ناحق قتل کر دیا تو یہ نہ سمجھو کہ اس نے ایک جان ضائع کر دی۔ یہ سمجھو کہ اُس نے تمام نوعِ انسانی کو قتل کر دیا (مَنْ قَتَلَ نَفْسًاۢ بِغَیْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِی الْاَرْضِ فَکَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِیْعًا ط ۵/۳۲)
اور اس طرح جس نے کسی ایک شخص کو زندگی کا سامان بہم پہنچا دیا تو اُس کے متعلق یُوں سمجھو گویا اس نے تمام نوعِ انسانی کو زندگی عطا کر دی (وَمَنْ اَحْیَاھَا فَکَاَنَّمَآ اَحْیَا النَّاسَ جَمِیْعًا ط ۵/۳۲)

وحدتِ انسانیہ ایک ایسی حقیقت ہے۔ اب رفتہ رفتہ تمام دُنیا اسے تسلیم کرنے پر مجبور ہو رہی ہے۔ تحقیقاتِ جدیدہ نے بھی یہ ثابت کر دیا ہے۔ کہ کائنات مختلف عناصر و اجسام کا ڈھیر نہیں بلکہ ایک ناقابلِ تقسیم وحدت ہے۔

بلکہ وحدتِ عظیم ہے۔

**ڈریش (HANS DRIESH)** اپنی کتاب (THE PROBLEM OF INDIVIDUALITY) میں اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے:-

"یہ نظریہ کہ تمام کائنات ایک منظم وحدت ہے، وحدتِ نظم کی اصطلاح سے تعبیر کیا جانا چاہیئے۔ اس کے بعد وہ لکھتا ہے کہ وحدتِ نظم کا یہ تصوّر نظمِ کائنات کے متعلق دیگر تمام تصوّرات کو منسوخ کر دیتا ہے۔ اس کی رُو سے کائنات میں الگ الگ نظام کہیں باقی نہیں رہتے، بلکہ تمام کائنات وحدتِ نظم کا مظہر بن جاتی ہے۔ اس وحدتِ نظم کے پیشِ نظر قوانینِ فطرت کے تصوّر میں بھی تبدیلی کرنی پڑے گی۔ کیونکہ اس صورت میں فطرت میں متعدد "قوانین" نہیں بلکہ صرف ایک قانون کارفرما نظر آئے گا۔ اور یہی وہ واحد قانون ہوگا۔ جس کی روشنی میں ہم، کائنات کے متعلق سب کچھ جان لیں گے جس کا جان لینا انسان کے لئے ممکن ہے (P ۸۳، ۸۴)

اسی طرح:-

**SIMPSON** اس باب میں لکھتا ہے:-

"نظریۂ ارتقاء سے ہمیں سب سے پہلا اور عظیم الشان سبق یہ ملا کہ حیات ایک ہے۔ یعنی وحدتِ حیات کا سبق۔ یہ عقیدہ عیسائیت اور دیگر مذاہب میں بھی پایا جاتا ہے کہ تمام انسان آپس میں بھائی بھائی ہیں لیکن ارتقاء کا نظریہ ہمیں اس سے بھی آگے لے گیا۔ اس نے بتایا کہ نہ صرف تمام انسان آپس میں بھائی بھائی ہیں بلکہ تمام اشیائے کائنات میں یہی رشتۂ اخوّت کارفرما ہے۔ اس طرح کہ ان کا سرچشمہ بھی ایک ہے۔ اور یہ سب ایک ہی طریقہ سے مختلف گوشوں میں نشوونما پا کر اپنی موجودہ حالت تک پہنچی ہیں۔ انسان کائنات ہی کا ایک جزو ہے۔ اس لئے اس کا رشتہ تمام زندگی (ALL LIFE) سے ہے۔"

THE MEANING OF EVOLUTION. P. 136

دیکھئے حکیم الامتؒ کا یہ فرمان کس قدر موزوں ہے:-

زمانہ ایک حیات ایک کائنات بھی ایک
دلیلِ کم نظری قصۂ جدید و قدیم

**F.W. JONES کی وحدتِ نظم**

مانچسٹر یونیورسٹی کا اٹانومی کا پروفیسر (F.W. JONES) اپنی کتاب (DESIGN AND PURPOSE) میں اس موضوع پر شرح و بسط سے گفتگو کرکے بتاتا ہے کہ کائنات میں کس طرح وحدتِ نظم موجود ہے۔ اور یہ تمام نظام کس طرح ایک سوچی ہوئی تدبیر (PLAN) کے ماتحت سرگرم عمل ہے۔ بحث کے دوران میں وہ (TOMAS DWIGHT) کے حوالہ سے لکھتا ہے:-

"اگر اس بات کو بفرض محال تسلیم بھی کرلیا جائے کہ اس قسم کا تحیّر انگیز پلان (PLAN) محض اتفاق (CHANCE) کی پیداوار ہے تو بھی اس طرح کے بے شمار منظّم پلان کا اس طرح موجود ہونا اس مفروضہ کو مہمل قرار دے دیتا ہے۔ ہم ذی حیات اور غیر ذی حیات دونوں میں تحیّر انگیز نظم دیکھتے ہیں۔ جوں جوں ہم عناصر اور ان کے مرکبات سے متعلق قوانین کا مطالعہ کرتے ہیں۔ یہ حقیقت اور بھی واضح ہوجاتی ہے کہ ساری کائنات میں ایک ہی قانون نافذ العمل ہے۔ (P.59)

**سیمیوئیل بٹلر**

اسی حقیقت کو ایک مثال سے سمجھاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسانی جسم خلیّات (CELLS) کا مجموعہ ہے۔ ہر ایک (CELL) اپنی اپنی جگہ اپنے مفوضہ فرائض کی سرانجام دہی میں مصروف ہے۔ لیکن نہ تو ہمیں ان خلیات کا احساس ہوتا ہے۔ اور نہ ہی یہ خلیات (CELLS) جانتے ہیں کہ انسانی جسم کا یہ نظام، جو انہی خلیات پر مشتمل ہے، کیا ہے اور کس طرح مصروفِ عمل رہتا ہے؟

اسی طرح ہم اس کائنات کے "عظیم جسم" کے (CELLS) ہیں لیکن ہمیں کچھ معلوم نہیں کہ کائنات ایک عجیب و غریب نظام کے مطابق چلی جا رہی ہے۔ ہمیں اپنا ہی علم ہے جس کائنات کے ہم خلیات ہیں۔ اس کے نظم کا کچھ علم نہیں۔

لیکن علم ہو یا نہ ہو یہ کائنات ایک ذرّہ سے لے کر آفتاب تک ایک عظیم القدر اور محیر العقول نظام کے ماتحت مصروفِ کار ہے۔

CC. F. LIFE AND HABIT – QUOTED BY F. W. JONES

نظریۂ پاکستان کے خالق کا فرمان

اے انفس و آفاق میں پیدا ترے آیات
حق یہ ہے کہ ہے زندہ و پائندہ تری ذات

اَور

تو خالقِ اعصار و نگارندۂ آنات

کچھ عرصہ ہُوا ایک کتاب (THE GREAT DESIGN) شائع ہوئی تھی۔ اس کے ایڈیٹر نے دُنیا بھر کے ائمہ فکر و نظر کو دعوت دی تھی۔ کہ وُہ اپنے اپنے شعبۂ علم کی تحقیقات کو سامنے رکھ کر غیر جانبدارانہ طور پر بتائیں کہ ان کے نزدیک اس کائنات میں کوئی نظم و ربط ہے یا یہ سلسلہ یونہی اندھا دھند چلے جا رہا ہے۔ چنانچہ اس دعوت پر مختلف علوم و فنون کے ماہرین نے الگ الگ مقالے لکھے، جو اس کتاب میں جمع کر دیئے گئے۔ نباتات، حیوانات، انسانیات، طبیعیات، حیاتیات، نفسیات، فلکیات وغیرہ، تمام شعبوں کے مقالات۔ ان میں سے ہر مقالہ میں بتایا گیا کہ سائنس کی تحقیقات اس حقیقت کو دن بدن بے نقاب کیے جا رہی ہے۔ کہ یہ تمام سلسلۂ کائنات عجیب و غریب نظم و ضبط کے ماتحت جاری و ساری ہے۔ اَور جیسا کہ کتاب کے نام سے ظاہر ہے، یہ سب کچھ حیرت انگیز (DESIGN) کے مطابق ہو رہا ہے۔ جس میں کوئی سقم نہیں، کوئی جھول نہیں، کوئی دراڑ نہیں، کوئی سلوٹ نہیں۔

حکیم الامتؒ فرماتے ہیں:۔

نقطۂ ادوارِ عالم لا اِلٰہ
انتہائے کارِ عالم لا اِلٰہ
چرخ را از زورِ او گردندگی
مہر را پایندگی رخشندگی

صد جہاں در یک فضا پوشیدہ اند
مہرہا در ذرّہ ہا پوشیدہ اند

**مقصد** | مَا تَرٰی فِی خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُت - اس (DESIGN) اور (PLAN) کا تقاضا ہے۔ کہ کائنات کے سامنے کوئی مقصد بھی ہو، اس لئے کہ ڈیزائن اور پلان ہمیشہ کسی مقصد کے حصول کے لئے عمل میں آتا ہے اسی لئے آئمہ فکر کائنات کو ذی مقصد (PURPOSEFUL) تسلیم کر رہے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ تکوینی سلسلہ یونہی ہنگامی طور پر وجود میں نہیں آ گیا، یہ باطل نہیں، بلکہ ایک مقصد کے لئے ما تحت عمل میں لایا گیا ہے۔

**پال** (LESLIEPAUL) | اپنی کتاب (THE MEANIN OF HUMAN ESCISTANCE) میں نظریۂ ارتقاء بحث کرتا ہوا لکھتا ہے۔ کہ ارتقاء ممکن ہی اس صورت میں ہو سکتا ہے کہ جب یہ تسلیم کیا جائے کہ ہر نامی (ORGANIC) شے زندہ رہنے اور آگے بڑھنے کے لئے جدّ و جہد (STRUGGLE) کر رہی ہے۔ اسی خصوصیّت کی رُو سے ان اشیاء کو (DYNAMIC) کہا جاتا ہے۔ لیکن (DYNAMIC) ہونے سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ ان کی توانائی انہیں ایک خاص سمت (DIRECTION) کی طرف لے جا رہی ہو۔ اس لئے کہ اگر ان کی حرکت و عمل کے لئے کوئی سمت متعین نہیں ہو گی تو ضروری نہیں کہ اس حرکت کا نتیجہ ارتقاء ہی ہو۔ عدم سمت کی صورت میں ہو سکتا ہے کہ یہ سب توانائی (ENERGY) یونہی گردش میں ضائع ہو جائے۔

اس کے بعد پال لکھتا ہے کہ:-

"یہ بات بڑی غیر معقول سی نظر آتی ہے کہ ایک طرف تو یہ تسلیم کر لیا جائے کہ زندگی (DYNAMIC) ہے۔ وہ ایک خاص سمت میں حرکت کر رہی ہے تاکہ وہ باقی رہے اور آگے بڑھے اور اس کے ساتھ ہی یہ کہا جائے۔ کہ زندگی کے پیش نظر کوئی مقصد نہیں (PURPOSLESS) اگر مقصد نہیں تو پھر (STRAGGLE) کا تصوّر ہی باقی نہیں رہتا۔ اسی منطقی توجیہ کا نتیجہ ہے کہ جو ئین ہکسلے یہ کہنے پر مجبور ہو گیا ہے کہ میکانکی فکر

کی جدید کامیابی یعنی ڈارون کے نظریۂ ارتقاء نے اب انسان کو یہ ضمانت دے دی ہے کہ انسان کے باہر ایک قوت ہے جو اس سلسلہ کو "خیر" کی طرف بڑھائے جا رہی ہے"۔

قرآن کا اعجازِ حسن دیکھئے کہ لفظ "خیر" کو کس طرح موزوں کیا ہے :-

وَقِيلَ لِلَّذِينَ اتَّقَوْا مَاذَا أَنزَلَ رَبُّكُمْ ط (۱۶/۳۰)

جن لوگوں نے قرآن سے رشتہ جوڑ لیا ہے ان سے پوچھا جاتا ہے کہ تمہارے رب نے کیا نازل کیا ہے۔

سوال کا جواب

ایک لفظ ہیں :-

قَالُوا خَيْرًا ط (۱۶/۳۰)

وہ کہتے ہیں ہمارے رب نے "خیر" نازل کیا ہے۔

پال کی عقلِ سلیم اور فکرِ رسا نے کس طرح اس کو قرآنی حقیقت سمجھا دی۔ لیکن افسوس تو اُن پر ہے۔ جو عقل و بصیرت سے کام ہی نہیں لیتے۔ کیونکہ پال بھی وحی کی روشنی میں آگے نہیں بڑھ رہا اس لئے آگے چل کر راستے کی تاریکی میں ٹھوکر کھاتا ہے۔

آگے چل کر تعجب اس بات پر ہوتا ہے کہ اس کے ساتھ ہی کیسے یہ بھی کہتا ہے کہ یہ "ارتقاء" کی قوت اندھی ہے۔ اگر یہ قوت "خیر" کی طرف لئے جا رہی ہے تو پھر اندھی کیسے ہے؟ اسی طرح جب کوئی جسم اپنی بقاء و ارتقاء کے لئے جدّ و جہد کرتا ہے۔ تو اسے کسی صورت میں بھی مشین نہیں کہا جا سکتا (P - 71 - 72)

مسلمانوں میں بھی ارباب علم کا ایک طبقہ جنہیں دعویٰ آگہی اور نازِ شعور بھی ہے یہ کہتے سُنے جاتے ہیں کہ سائنس کے انکشافات واکتشافات پر اعتماد و بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ کائناتی مفکرین کبھی ایک نتیجہ سامنے لاتے ہیں۔ کبھی اس کے بالکل برعکس دوسرا۔ ان مدعیانِ علم و فکر کو یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ سائنس قوانینِ فطرت کا انکشاف کرتی ہے بناتی نہیں۔ لہٰذا جو نتیجہ قانونِ قدرت کے مطابق ہوگا۔ اس پر یقین و بھروسہ نہ کرنا بھی عقل و علم کی توہین ہے۔ علم کی رُو سے جو حقیقت سامنے

آجائے اُسے تسلیم کرلینا چاہیئے کیونکہ

وُہ محرمِ عالمِ مکافات
اِک بات ہیں کہہ گیا ہے سو بات
وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ....... (۲/۳۱)

اور ہمیں نے آدم کو حقائق الاشیاء سے باخبر کر دیا ہے۔ اے فرشتو! تمہیں وُہ علم نہیں دیا گیا ہے جو آدم کو دیا گیا ہے۔

انسان خصائص الاشیاء معلوم کرنے کے لئے اپنی جان کھپا کر اب کس طرح اشیائے کائنات کو انسانیت کے لئے مفید اور حیات بخش بنا رہا ہے اس کا اندازہ کائناتی مفکرین کی دن رات کی تحقیقات سے لگایا جا سکتا ہے (یہ مسخر شدہ قوتیں انسانی ہلاکت کا سامان بھی بن رہی ہیں یہ موضوع اس کتاب سے متعلق نہیں) ان حضرات کے ایسے خیالات طلبا کے علومِ سائنس کے حصول کے شوق و جذبہ کی راہ میں روک بن جاتے ہیں اور یہ ان کے دل و دماغ میں ایسے ابہام و ظنون پیدا کر دیتے ہیں۔ جو اُنہیں اشیائے کائنات کی حقیقت و ماہیت کو سمجھنے سے روکتے ہیں اور اس طرح ان کے لئے وحدتِ خالق۔ وحدتِ مخلوق اور وحدتِ قانون کا قُرآنی فلسفہ سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے جو دراصل مومن کی زندگی کا فرض اوّلین ہے۔

حکیم الامتؒ نے رموزِ قرآن کو جس گہرائی سے دیکھا اور سمجھا ہے اور شعورِ قرآنی کی روشنی میں جو خیال آرائی کی ہے اسے دیکھ کر انسان اعترافِ حقیقت کے طور پر یہ کہنے کے لئے مجبور ہو جاتا ہے کہ

حاضر آرائی و آیندہ نگاری از تُست

اقبالؒ فرماتے ہیں:۔

می ندانی آیۂ اُمّ الکتاب
اُمّتِ عادل ترا آمد خطاب
آب و تاب چہرۂ ایام تو
در جہاں شاہد علی الاقوام تو

آگے چل کر:۔

تا بدست آوردِ نبضِ کائنات
وا نمود اسرارِ تقویم حیات
لالہ پیہم سوختن قانونِ او
بر جہد اندر رگِ او خونِ او
بحر گوہر آفریدا ز تابِ او
موج در دریا تپید از تابِ او

یہ تصوّر کہ، کائنات ایک مقصد کے ماتحت وجود میں لائی گئی ہے اور اب یہ اس مقصد کے حصول کے لئے جانبِ منزل رواں دواں چلی جا رہی ہے خود انسانی زندگی پر کس درجہ اثر انداز ہوتا ہے اور اس میں کس قدر خوشگوار انقلاب پیدا کر دیتا ہے، اس کے متعلق پروفیسر جونز لکھتا ہے کہ:-

**پروفیسر جونز** "اگر انسان نے اپنے فکر میں یہ تبدیلی پیدا کر لی کہ انسانی زندگی کو با مقصد تسلیم کرنے سے یہ بھی تسلیم کیا جائے گا کہ تمام ذی حیات اشیاء اور غیر ذی حیات اشیاء غرضیکہ پوری کائنات با مقصد ہے۔ ایسا ہو سکتا ہے کہ ایک دن انسان شاہراہِ حیات پر اس طرح گامزن ہو کہ اسے نظر آئے کہ

اس کے ساتھ تمام سلسلۂ کائنات اسی منزل کی طرف جا رہا ہے جو اس کا منتہائے نگاہ ہے۔ اور یہ اس کاروانِ حیات کا ایک راہ رو ہے، اس شاہراہِ کائنات پر تمام افراد کے حقوق یکساں ہیں۔ اس شاہراہ کے منتہیٰ کا ہمیں علم نہیں لیکن اس سے ہم اس حقیقت کا احساس تو کر سکتے ہیں کہ یہ چیز کائنات کے بس میں نہیں کہ وہ اس راہ اور اس پر چلنے والے افرادِ کارواں کو فنا کر سکے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

تاریخ کے جس دور سے ہم گذر رہے ہیں اس میں یہ احساس بھی ضروری ہو گیا ہے کہ کائنات کا یہ عظیم القدر سلسلہ، ایک مقصد کا ثبوت پیش کر رہا ہے اور ہر انسانی زندگی خواہ وہ کسی قدر غیر اہم کیوں نہ ہو اس کائناتی مقصد کا جزو ہے۔

(DESIGN AND PURPOOE THE END)

کیونکہ :-

باطنِ ہر شے ز آئینے قوی

**کائنات** کائنات کے متعلق قرآن کریم میں ہے وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا ط

کائنات (ارض و سمٰوات) اور جو کچھ ان کے درمیان ہے انہیں ہم نے بلا مقصد پیدا نہیں کیا۔ ذٰلِكَ ظَنُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ج ($\frac{۳۸}{۲۷}$) جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ کائنات یونہی بلا مقصد پیدا ہو گئی ہے۔ وہ کافر یعنی حقیقت کا انکار کرنے والے ہیں۔

خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ط

اللہ نے کائنات کو بالحق پیدا کیا اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّلْمُؤْمِنِیْنَ ($\frac{۲۹}{۴۴}$) اس میں ان لوگوں کے لئے جو حقیقت پر یقین رکھتے ہیں، بڑی بڑی نشانیاں ہیں۔

قرآن مومنین اور علماء انہیں بتاتا ہے جو اٹھتے، بیٹھتے، لیٹتے، ہر وقت قوانینِ خداوندی کو اپنے سامنے رکھتے ہیں اور تخلیق کائنات پر غور و فکر اور تجربات و مشاہدات سے اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ج ($\frac{۳}{۱۹۱}$)

خدا نے کائنات کی کسی شئے کو بلا مقصد پیدا نہیں کیا۔

یہی ہیں جن کی فطرت آئینہ روزگار ہے۔ علامہ کہتے ہیں :-

میری فطرت آئینہ روزگار
غزالانِ افکار کا مرغزار
مرا دل مری رزم گاہِ حیات
گمانوں کے لشکر یقین کا ثبات

ان کی آنکھ فطرت کے ارشادات دیکھتی ہے۔ کافر و مومن (ارباب باطل) اور (اہل ایمان) کے خصائص کیا ہیں۔ مندرجہ بالا آیت سے آپ کو معلوم ہو گیا۔ کائنات کے متعلق یہ منفیانہ اندازِ فکر کہ یہ بلا مقصد یونہی پیدا ہو گئی ہے۔ اس سے انسانیت کی مزرعِ ہستی آتشِ ابہام میں جل کر راکھ کا ڈھیر بن جاتی ہے قرآن مومن کی زندگی کا مقصد تسخیرِ کائنات بناتا ہے۔

اقبال کہتے ہیں :-

دشنہ زن در پیکر این کائنات
در شکم دارد گہر چو سومنات

**علم** | قرآن علم کی تعریف (DEFINITION) یوں کرتا ہے۔ لَا تَقْفُ مَا لَیْسَ لَکَ بِہٖ عِلْمٌ۔ یاد رکھو! جس کا تمہیں علم نہ ہو اس کے پیچھے مت لگا کرو۔

آیت کا اتنا حصہ بھی کچھ کم حقیقت کشا اور بصیرت افروز نہیں لیکن اس کے بعد چند الفاظ نے علم کی ایک ایسی تعریف دے دی ہے کہ بات نکھر کر سامنے آجاتی ہے۔ فرمایا اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ کُلُّ اُولٰٓئِکَ کَانَ عَنْہُ مَسْئُوْلًا ○ (۱۷/۳۶)

یہ حقیقت ہے کہ تمہاری سماعت، بصارت اور فواد ہر ایک پر ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ قرآن کے نزدیک اولی الالباب وہ ہیں جو ارض و سمٰوات کی تخلیق اور رات اور دن کی گردش میں غور و فکر کرتے ہیں۔ رات اور دن کی گردش میں صاحبانِ عقل و بصیرت کے لیے بڑی بڑی نشانیاں ہیں۔

**علماء** | قرآن اس حقیقت کو اور بھی یہ کہہ کر واضح کر دیتا ہے کہ علماء کون ہیں؟ قرآن میں علماء کا لفظ صرف دو مقامات پر آیا ہے۔ ایک جگہ سورۂ شعرا میں (۲۶/۱۹۸)، جہاں علمائے بنی اسرائیل کا ذکر ہے اور دوسری جگہ سورۂ فاطر میں جہاں خدا کے بندوں میں سے علماء کا ذکر ہے۔ اس تذکرہ کی ابتدا یوں ہوتی ہے:۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجْنَا بِہٖ ثَمَرٰتٍ مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُھَا۔

کیا تو نے اس پر غور نہیں کیا کہ اللہ کا قانون کس طرح بادلوں سے مینہ برساتا ہے اور اس سے انواع و اقسام کے پھل پیدا ہوتے ہیں۔ وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌۢ بِیْضٌ وَّحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُھَا وَغَرَابِیْبُ سُوْدٌ۔

اور پہاڑوں میں کس کس انداز کے سرخ و سفید طبقے ہیں۔ جن کے رنگ اور اقسام مختلف ہیں اور ان میں بعض گہرے سیاہ رنگ کے ہیں۔ وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَآبِّ وَالْاَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُہٗ کَذٰلِکَ۔

اور اسی طرح انسانوں اور دیگر جانداروں اور مویشیوں کے بھی مختلف اقسام ہیں۔ یہاں کائنات کے مختلف گوشوں۔ بساطِ فطرت کے متنوّع شعبوں کا، سائنس کے مختلف علوم کا۔ طبیعیات (PHYSICS) نباتیات (BOTANY) طبقات الارض (GEOLOGY) حیوانیات (ZOOLOGY) اور انسانیات کے تمام شعبے اس کے اندر آجاتے ہیں۔ ان علوم وفنون کے تذکرہ کے بعد ہے۔

اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا ط

حقیقت یہ ہے۔ کہ خدا کے بندوں میں سے علماء ہی وہ ہیں جن کے دل پر اس کی عظمت اور ہیبت چھا جاتی ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ عَزِیْزٌ غَفُوْرٌ (۳۵/۲۸-۲۷) کیونکہ وہ علیٰ وجہ البصیرت اس حقیقت کا مشاہدہ کر لیتے ہیں کہ خدا کتنی بڑی قوت کا مالک ہے۔ اور کس طرح اس عظیم کارگہ کائنات کو ہر قسم کی تخریب سے محفوظ رکھ کر آگے بڑھائے جا رہا ہے۔ اس مقام پر قرآن نے علماء کا لفظ سائنٹسٹ (کائناتی مفکّرین) کے لئے استعمال کیا ہے۔ وہ لوگ جو کائناتی نظام کا مطالعہ و مشاہدہ کرنے کے بعد مشاہدات و تجربات کے بعد تسخیرِ کائنات کرتے ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے فطرت کی تمام طاقتوں کو عُریاں کرنے کا انسان کو حکم دیا ہے۔ اس لئے تمام کائناتی قوتیں انسان کے سامنے سجدہ ریز ہو گئیں۔ وَسَخَّرَ لَکُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ، لیکن ان قوتوں کو اپنے کنٹرول (قابو) میں ہی رکھ سکتا ہے۔ جو ان قوانین سے واقف ہو۔ جن کے مطابق یہ قوتیں کام کرتی ہیں۔

تسخیرِ فطرت کے بعد، فطرت کی قوتوں کو قوانینِ خداوندی کے مطابق انسانیت کی بہبود کے لئے عام کرنا اور قانونِ خداوندی کے مطابق صرف کرنا نہایت ضروری ہے۔ قرآن اُدْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّۃً (۲/۳) کا حکم دیتا ہے۔

قوائے فطرت کو قوانینِ خداوندی کے مطابق صرف کرنے کے لئے قرآن کے علم کی ضرورت ہے یہی وہ وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ (۳/۷) ہیں جو قرآن پر علی وجہ البصیرت ایمان رکھتے ہیں۔ اور تمام اُمورِ حیات کے فیصلے اسی کے مطابق کرتے ہیں۔ مَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْکٰفِرُوْنَ ہ (۵/۴۴) جو کتاب اللہ کے مطابق فیصلے نہیں کرتے وہ مومن نہیں کافر ہیں۔

اس کفر کا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ انسانی معاشرہ دولت اور رزق کی فراوانی کے باوجود آتشِ جہنّم میں جل جاتا ہے۔ جیسا کہ تسخیر کائنات کے بعد یورپ انسانی زندگی کے معاملات میں صحیح حل تلاش نہیں کر پایا۔

جب تک علم اور عالم کے متعلق ہمارا موجودہ تصور نہیں بدلتا، خدا تک پہنچنا تو ایک طرف ہم زندہ قوموں کے زمرے میں بھی شامل نہیں ہو سکتے۔ اور نہ ہی علم کی روشنی میں دُنیائے انسانیت کو ایک مرکز پر لا سکتے ہیں۔ کیونکہ دفیھا آیات لقوم یعقلون۔

متّقی تو کہا ہی اُسے جاتا ہے۔ جس نے اپنی خداداد صلاحیتوں کی نشوونما پُوری طرح کر لی ہو۔ جن انسانوں کی ذات خوابیدہ اور ناشگفتہ رہ جائے انہیں تو انسانی سطح پر بھی شمار نہیں کیا جا سکتا۔ چہ جائیکہ انہیں علمائے دین قرار دیا جائے اور متّقی و پرہیزگار۔ یہ تو خود ناشناس اور خدا ناشناس زمین کے وہ زندہ پتھر ہیں جن میں خود تو زندگی نہیں لیکن علم و عقل سے پُوری طرح دشمنی رکھتے ہیں۔

یہاں علم اور عالم کی قرآنی تشریح کو اس لئے ضروری سمجھا گیا کہ وحدتِ خالق، وحدتِ مخلوق، اور وحدتِ قانون کے اسلامی فلسفہ کو سمجھنے میں آسانی ہو۔

حکیم الامّت علاّمہ اقبالؒ نے ایک خط میں اکبر منیر کو لکھتے ہیں:۔

"دُنیا کے دل میں انقلاب ہے۔ اس واسطے قلوبِ انسانی اس سے متاثر ہو رہے ہیں۔ اسلام کی عظمت کا زمانہ انشاءاللہ قریب آ رہا ہے۔"

"تحریکِ انسانیت" کے متعلق صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کے نام ایک خط میں رقمطراز ہیں:۔

"دُنیائے اسلام میں تحریکِ ذہنی عملاً اس وقت مسدود ہو گئی اور یورپ نے مسلم حکماء کے غور و فکر کے ثمرات سے بہرہ اندوز ہونا شروع کیا۔ یورپ میں جذبۂ انسانیت کی تحریک بڑی حد تک اُن قوتوں کا نتیجہ تھی جو اسلامی فکر سے بروئے کار آئیں۔ یہ کہنا مطلق مبالغہ نہیں ہے کہ جدید یورپ میں جذبۂ انسانیت کا جو ثمر جدید سائنس اور فلسفہ کی شکل میں برآمد ہوا ہے اسے کئی لحاظ سے محض اسلامی تمدّن کی توسیع پذیری کہا جا سکتا ہے

اس اہم حقیقت کا احساس نہ آجکل یورپین کو ہے اور نہ مسلمانوں کو کیونکہ مسلمان حکماء کے جو کارنامے محفوظ ہیں وہ ابھی تک یورپ، ایشیا اور افریقہ کے کتب خانوں میں منتشر اور غیر مطبوعہ شکل اور حالتوں میں ہیں۔"

اقبال نامہ مکاتیب اقبالؒ حصہ دوئم

صفحہ ۲۱۳، ۲۱۴

مرتبہ شیخ عطا اللہ لاہور ۱۲ فروری ۱۹۲۷ء

علامہؒ کا یہ فرمانا درست ہے۔ کہ یورپ کی تحریکِ انسانیت یورپی مفکرین کے مسلم حکماء سے متأثر ہونے کی وجہ سے خدمتِ انسانیت کے لئے اٹھی لیکن جیساکہ آپ نے فرمایا ہے کہ یورپین فکرِ اسلام کو ابھی پوری طرح نہیں سمجھ پائے اس کا نتیجہ تھا کہ (HUMANISTS) اس مقام پر ٹھوکر کھا گئے۔ کہ اگر خارجی کائنات میں قانونِ قدرت کی کارفرمائی ہے۔ تو انسانیت کی راہنمائی و رہبری کے لئے ابھی اُسی خدائے مستقل اقدارِ حیات عطا کی ہیں۔ علمبردارانِ تحریکِ انسانیت نے کاروانِ انسانیت کو وحی سے الگ ہٹ کر محض عقل کی روشنی میں چلانا چاہا اس لئے وہ قافلۂ آدمیت کو منزلِ مراد تک نہ لے جا سکے۔ اس میں وہ بھی زیادہ قصوروار نہیں کیونکہ ان کے سامنے جو انجیل تھی وہ وحی کی مسخ شدہ صورت تھی۔ بدیں وجہ وہ نفسِ وحی سے منحرف ہوگئے۔ اور انسانی راہ نمائی کے لئے عقل کو معیار ٹھہرایا۔ یہ فکری تحریک اس اعلان کے ساتھ آگے بڑھی کہ انسانی راہنمائی کے لئے عقل سے بلند کوئی سرچشمہ نہیں۔

## ہیومنزم (تحریکِ انسانیت)

ہیومنزم (تحریک انسانیت) یورپ میں ایک فکری تحریک رونما ہوئی جس کی رُو سے کہا یہ گیا کہ اس کائنات کے پیچھے تو یقیناً ایک قوت ہے۔ جو اسے حسن و خوبی سے چلا رہی ہے۔ لیکن جہاں تک انسانی معاملات کا تعلق ہے۔ خدا اور اس کی راہ نمائی کا ان سے کوئی واسطہ نہیں۔ اصل میں اہل مغرب نے سائنس کی دُنیا (کائناتی علوم) میں اس قدر تحقیق و تفتیش کی۔ اس کے سامنے مذہب (عیسائیت) وہ تھا۔ جو علم کا دشمن اور عقل کا حریف تھا اور جن حقائقِ کائنات کو وہ مذہب، وحی

کی بنا پر پیش کرتا تھا، وہ علمی تحقیقات کی روشنی میں ایک ثانیہ کے لئے بھی نہیں ٹھہر سکتے تھے (اس لئے کہ جو وحی حضرت عیسیٰؑ کی طرف نازل ہوئی تھی وہ اپنی اصلی شکل میں موجود نہ تھی، اور جس تعلیم کو وحی (انجیل) کہا جاتا تھا وہ دراصل انسانوں کی خود ساختہ تعلیم تھی۔ نتیجہ اس کا یہ کہ یورپ کے یہ محققین نفسِ وحی سے بدگمان ہو گئے۔

چنانچہ وہاں یہ فکری تحریک رونما ہوئی جس کی رُو سے انسانی راہنمائی کے لئے عقل سے بلند کوئی سرچشمہ نہیں۔ یہ تحریک (HUMANISM) کے نام سے متعارف ہے۔ اس تحریک کے علمبردار اسے محض فکری تحریک تک محدود نہیں رکھنا چاہتے تھے۔ ایک مذہب کی حیثیت سے اختیار اور رائج کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ اس تحریک کے ایک مشہور مفکر (JULIAN HUXLEY) نے ایک کتاب لکھی جس کا نام (RELIGION WITHOUT REVELATION) یعنی وہ مذہب جس کی بنیاد وحی پر نہیں۔ ان مفکرین کا مسلک یہ ہے کہ اس خدا کو تو مان لیا جائے۔ جس کے قوانین خارجی کائنات میں کارفرما ہیں لیکن اس خدا سے انکار کیا جائے جس کے قوانین انسانی دُنیا میں راہ نمائی کا کام دیتے ہیں۔ ان کی یہ روش ایک قسم کا نفسیاتی تضاد (PSYCHOLOGICAL COUNTRADICTION) ہے۔ جس کی رُو سے وہ ایک طرف اس تسکین کو حاصل کرنا چاہتے ہیں جو خدا پر ایمان سے نصیب ہوتی ہے۔ اور دوسری طرف ان پابندیوں سے آزادی چاہتے ہیں۔ جو خدا پر ایمان کا لازمی نتیجہ ہوتی ہیں۔ قرآن نے ان (HUMANISTS) کو للکار للکار کر پکارا ہے اور واضح الفاظ میں کہا ہے کہ اس خود فریبی سے حاصل کیا ہے؟ محض کائناتی خدا کو ماننا اور انسانی دُنیا سے اس کا کوئی واسطہ نہ سمجھنا، خدا پر ایمان نہیں۔ اس سے انکار کرنا ہے۔ اگر تم نے اسے ماننا ہے تو پُورے طور پر مانو ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً (۲:۲۰۸) اور اگر انکار کرنا ہے۔ تو کھلے بندوں انکار کر دو۔

منکرِ مے بودن و ہمرنگِ مستاں زیستن

یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس زمانے میں (HUMANISTS) کہاں تھے؟

قرآن کا اعجاز یہ ہے کہ وہ ہر انسانی فکر کی لغزش کو نمایاں (POINT OUT) کرتا اور اس کی ہر خامی کو واضح کر کے، مثبت دلائل سے اس کی تردید کرتا ہے۔
قرآن نے اس غلط نگہی کو کس انداز سے پیش کیا ہے اور کس طریق سے اس کی تردید کی ہے۔ سورہ المؤمنون میں ہے۔ قُلْ لِّمَنِ الْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهَآ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (۲۳/۸۴) ان سے پوچھو کہ زمین اور جو کچھ اس کے اندر ہے وہ سب کس کے پروگرام کی تکمیل کے لئے ہے۔ اور اس کا مالک و آقا کون ہے؟ اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہو کہ وہ اس کا جواب جہالت اور تعصب سے نہ دیں، علم و بصیرت کی رو سے دیں۔ اس کے بعد قرآن کہتا ہے کہ اس کے جواب میں یہ یقیناً یہی کہیں گے کہ یہ سب کچھ خدا کے پروگرام کی تکمیل کے لئے ہے اور وہی اس کا مالک اور آقا ہے۔ (سيقولون لله) اس لئے کہ علم کی بارگاہ سے اس کے سوا کچھ اور جواب مل ہی نہیں سکتا۔ بلکہ ان سے یہ پوچھو کہ اس تمام کائنات کی نشوونما کا مرکزی کنٹرول کس کے ہاتھ میں ہے؟ قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ۝ (۲۳/۸۶) اس کے جواب میں بھی وہ یہی کہیں گے کہ یہ سارا کنٹرول خدا ہی کے لئے ہے (سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ)

خارجی کائنات میں قوانین خداوندی کی ان کارفرمائیوں کا اقرار لینے کے بعد، قرآن یہ پوچھتا ہے کہ جب تمہارا علم و بصیرت تمہیں خود اس نتیجہ پر پہنچا رہا ہے۔

۱۔ خارجی کائنات کی تمام اشیاء ایک غیر متبدل، مستقل، محکم قانون کے مطابق چل رہی ہیں اور

۲۔ یہ قوانین ان کے اپنے بنائے ہوئے نہیں، بلکہ خدائے کائنات کے متعین کردہ ہیں۔

تو کیا اس کا نتیجہ یہ نہیں نکلتا کہ انسان کے لئے بھی غیر متبدل قوانین حیات اور مستقل اقدار کی ضرورت ہے اور یہ مستقل اقدار عقل و خرد کی وضع کردہ نہیں ہو سکتیں۔ کیا انسان بھی اسی کائنات کا جزو نہیں؟ انسان کو اگر باقی اشیائے کائنات سے امتیاز حاصل ہے تو صرف اس میں کہ یہ ان قوانین کی اطاعت بطیب خاطر (اپنی مرضی سے) کرتا ہے۔ دیگر اشیائے کائنات ان کے مطابق چلنے کے لئے

مجبور پیدا کی گئی ہیں۔ انسان کے معاملہ میں یہ صورت نہیں کہ اسے مستقل قوانین کی ضرورت ہی نہیں۔ یا یہ ان قوانین کو خود وضع کر سکتا ہے۔ یہ قوانین خدا ہی کی طرف سے مل سکتے ہیں۔ بل اٰتَیْنٰھُمْ بِالْحَقِّ ہم ہی انہیں اٹل اور غیر متبدل قوانین دے سکتے ہیں۔ اگر یہ ان قوانین سے انکار کرتے ہیں اور خارجی دنیا میں خدا کی کبریائی پر ایمان لاتے ہیں تو یہ اپنے دعویٰ ایمان میں جھوٹے ہیں۔

وَاِنَّھُمْ لَکٰذِبُوْنَ ۝ (۲۳/۹۰)

قرآن نے یہ کچھ چودہ سو سال قبل کہا تھا لیکن اب مغرب کے مفکرین (HUMANISM) کے مسلک کی بنیادی غلطی کو محسوس کر کے خود اس نتیجہ پر پہنچ رہے ہیں کہ خدا کے ماننے کے معنی ہی یہ ہیں کہ اس کی راہ نمائی پر ایمان لایا جائے۔ چنانچہ ہمارے دور کا ایک عظیم طبیعیاتی ایڈنگٹن اپنی کتاب (SCIENCE AND THE UNSEEN WORLD) میں لکھتا ہے کہ

> اصل سوال خدا کی ہستی کا نہیں بلکہ اس امر کا یقین ہے کہ خدا بذریعہ وحی انسانوں کی راہ نمائی کرتا ہے۔

اوسپنسکی (OUSPENSKY) اس حقیقت کو اور بھی واضح الفاظ میں بیان کرتا ہے۔ جب وہ کہتا ہے کہ:-

> اگر وحی کا تصور نہ ہو تو مذہب ہی باقی نہیں رہتا۔ اور مذہب میں کوئی عنصر تو ایسا ہوتا ہے جو فکرِ انسانی کے احاطے سے باہر ہو۔ اس لئے کہ اگر یہ کوشش کی جائے کہ جن باتوں کو انسانی عقل اچھا سمجھتی ہے انہیں ایک جگہ اکٹھا کر کے اس کا نام مذہب رکھ لیا جائے تو اس سے کچھ حاصل نہ ہوگا ایسی کوششوں کا نتیجہ مذہب نہیں۔ بلکہ ایک زبوں حال فلسفہ ہوگا۔
>
> (NEW MODEL OF THE UNIVERSE)

اس کتاب میں جگہ بجگہ۔ نسلِ انسانی، وحدتِ انسانیہ، افرادِ نسلِ انسانی کاروانِ انسانیت اور افرادِ انسانیہ قسم کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ جن سے مقصود جمعیتِ آدم ہے۔ جو آئیڈیالوجی (کلمہ توحید) کی اصل پر استوار ہوتی ہے یہ تحریکِ انسانیت (HUMANISM) جو اہلِ مغرب نے شروع کی تھی اس مقام

پر اس کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے۔ کہ قاری کے ذہن میں اس تحریکِ انسانیت اور اُس تحریکِ انسانیت جو نسل و رنگ و وطن کے امتیازات سے پاک ربّ العالمین کے عطا کردہ ضابطۂ حیات (قرآن کریم) کی مستقل اقدار کی روشنی میں تشکیل ہوتی ہے۔ فرق واضح ہو جائے۔

یورپی مفکرین کے ایک گروہ کا خیال ہے۔ کہ خدا نے کائنات کو بنا دیا۔ اب اس کے بعد وہ اس مشینری کے چلانے میں دخل نہیں دیتا۔ یہ مشین انسان کے سپرد کر دی گئی ہے۔ لہٰذا کائنات میں اب الوہیاتی منصب خود انسان کو مل چکا ہے۔ کاسٹ (AUGUSTE COMTE. 1798-1857) اس نظریہ کا موجد تھا۔ جس نے کہا کہ

"انسانیت[1] ہی خدا ہے"۔ اس نظریہ کو ہیومنزم کہتے ہیں۔

لیکن قرآنِ کریم منتہیٰ، وحدتِ قانون کی بنیاد پر، تمام نوعِ انسانی کو ایک عالمگیر برادری بنانا ہے۔ اس کا ارشاد ہے کہ کَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً (۲/۲۱۳) تمام نوعِ انسانی ایک قوم ہے۔ اور یہ بھی ایک مستقل قدر ہے۔ یعنی کفر اور ایمان هُوَ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ فَمِنْکُمْ کَافِرٌ وَّ مِنْکُمْ مُّؤْمِنٌ ط (۶۴/۲)

## نوعِ انسان کی ایک اُمّت

اس کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ قرآنِ کریم کی مستقل اقدار کی صداقت پر یقین رکھیں اور اس کے مطابق اپنا معاشرہ متشکل کر لیں، وہ ایک قوم کے افراد۔ اور جو اس کے خلاف، انسانوں کے خود ساختہ قوانین کے مطابق زندگی بسر کریں وہ دوسری قوم کے افراد۔ قرآنِ کریم کی رُو سے تمام مسلمان ایک قوم کے فرد ہیں۔ لہٰذا اس میں فرقوں اور پارٹیوں کے وجود کو گوارا نہیں کیا جاتا کیونکہ اسلامی نظام وحدتِ قانون اور وحدتِ اُمّت کی بنیادوں پر متشکل ہوتا ہے۔ قرآنِ کریم نے تو فرقہ بندی کو شرک قرار دیا ہے۔

وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۙ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ

---

[1] ان نظریات کے متعلق (OHEEN) کی کتاب (PHILOSOPHY OF RELIGION) اور (BRIGHTMAN) کی کتاب PHILOSOPHY OF RELIGION دیکھئے۔

وَكَانُوْا شِيَعًا ط كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ہ (۳۰ / ۳۱)
دیکھنا! کہیں تم مشرک نہ ہو جانا۔ یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے اپنے دین میں فرقے پیدا کر لئے اور گروہوں میں بٹ گئے۔

نبی اکرمؐ نے فرمایا:۔

عَلَيْكُمْ بِالْجَمَاعَةِ فَاِنَّهٗ مَنْ شَذَّ شُذَّ فِی النَّارِ۔

ہمیشہ جماعت کے ساتھ رہو جو جماعت سے الگ ہوا سیدھا جہنم میں گیا۔

حضرت علیؓ کا قول ہے:۔

اِيَّاكُمْ وَالتَّفَرُّقَةَ۔ فَاِنَّ الشَّاذَّ مِنَ النَّاسِ لِلشَّيْطَانِ لَمَا اِنَّ الشَّاذَّ مِنَ الْغَنَمِ لِلذِّئْبِ۔ اِلَّا مَنْ دَعَا اِلٰی هٰذَا الشِّعَارِ فَاقْتُلُوْنِ۔ وَلَوْ كَانَ تَحْتَ عِمَامَتِیْ هٰذَا۔

ہمیشہ تفرقہ سے بچو! یاد رکھو کہ جو شخص ملّت سے کٹ کر تنہا رہ جاتا ہے وُہ اسی طرح شیطان کا شکار ہو جاتا ہے۔ جس طرح ایک بھیڑ گلے سے جُدا ہو کر بھیڑیے کا شکار ہو جاتی ہے۔

دیکھو! جو شخص تمہیں اس شعار کی طرف دعوت دے اسے قتل کر ڈالو خواہ وُہ سر بسر سے ہی عمامہ کے نیچے کیوں نہ ہو۔

اللہ اسی لئے اس عالمتاب عالم کو جگمگاتا چراغ کہہ کر پکارتا ہے:۔

اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ہ وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ الْاَغْلٰلَ الَّتِیْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ط (۷ / ۱۵۷)

اُس نے تمام اغلال و سلاسل کو ایک ایک کر کے توڑ دیا جس میں انسانیت جکڑی ہوئی تھی۔ احبار و رہبان کی برہمنیت کے اطواق و سلاسل (قیصری و کسرٰی کی زنجیریں) توہم پرستی کی بصیرت سوز بندشیں تقسیمِ انسانیت کے انسانیت کُش نسلی، جغرافیائی۔ وطنی۔ امتیاز رنگ و خون کے غیر فطری اور باطل معیار سب ایک ایک کر کے ٹوٹتے چلے گئے۔ اربابِ حسب و نسب منہ چھپاتے پھرتے تھے۔ اور نیشنلزم کے شیطان جان بچانے کے لئے پناہیں ڈھونڈ رہے تھے۔ اب معیارِ افضلیت جوہرِ ذاتی قرار پایا۔ اضافی نسبتوں کے کھوٹے سکوں کا بازارِ انسانیت

میں چلن نہ رہا۔ جذبہ نسل پرستی سرد پڑ گیا۔ کیریکٹر کی بنا پر فرزند آدم معزز و مکرم قرار دیا گیا۔ غرضیکہ اس چراغِ کائنات نے ان تمام تاریکیوں کا خاتمہ کر دیا۔ جو تعصب و جہالت اور غرور و فخر نے فضائے انسانیت میں پھیلا رکھی تھی۔

**وحدتِ قانون** | اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ قف وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ ط وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ○ (۳/۱۹)

بلاشبہ الدین (یعنی اصلی دین) اللہ کے نزدیک الاسلام ہی ہے۔ (اس دین کے سوا اور کوئی دین نہیں) اور جو اہل کتاب نے باہم گر اختلاف کیا تو یہ (اس لئے نہیں ہوا کہ اس دین کے سوا نہیں کسی اور دین کی راہ دکھا دی گئی تھی) یا دین کی راہ مختلف ہو سکتی ہے۔ بلکہ اس لئے کہ علم کے حصول کے بعد وہ اس پر قائم نہیں رہے اور آپس کی ضد اور عناد سے الگ ہو گئے اور یاد رکھو جو کوئی اللہ کی آیتوں سے انکار کرتا ہے اور ہدایت سے گمراہی کو ترجیح دیتا ہے، تو اللہ کا قانون بھی (حساب لینے میں سست رفتار نہیں۔

سورۂ روم کی مندرجہ ذیل آیات پر غور کرو:۔

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ط فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِىْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ط لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ط ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ق وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ق (۳۰/۳۰)

اے پیغمبر اسلام! ہر طرف سے منہ موڑ کر اس نظامِ زندگی (الدین) کی طرف اپنا رُخ پھیر لو۔ جو اس فطرتِ خداوندی کے عین مطابق ہے جس پر خدا نے تمام نوعِ انسانی کو پیدا کیا ہے (یاد رکھو) خدا کی تخلیق میں کوئی تبدیلی نہیں ہوا کرتی۔ یہی صحیح نظامِ زندگی (الدین القیم) ہے لیکن (افسوس) اکثر لوگ اس (حقیقت سے) واقف نہیں ہیں۔

دوسری جگہ:۔

إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلّٰهِ ؕ أَمَرَ أَلَّا تَعْبُدُوٓا إِلَّآ إِيَّاهُ ؕ ذٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ۝

(۱۲/۴۰)، نیز ۱/ ۷۷-۶۲

حکومت (حاکمیت و فرماں روائی) اللہ ہی کے لئے (مخصوص) ہے اس کا فرمان یہ ہے۔ کہ صرف اسی کی عبودیت (اطاعت و فرماں پذیری) اختیار کرو، اور کسی کی نہ کرو۔ یہی صحیح دین (نظام زندگی) ہے۔ مگر اکثر آدمی ایسے ہیں جو اس (حقیقت) سے واقف نہیں۔

قرآن بار بار اس کا اعادہ کرتا ہے کہ ارض و السّمٰوٰت کو بے مقصد (باطل) پیدا نہیں کیا گیا۔ یہ بالمقصد پیدا کی گئی ہے۔ اور یہ قانونِ قدرت کے اہم پروگرام کا اہم جزو ہے۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ۝ (۴۴/۳۸)

کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے ہم نے اسے یونہی کھیلتے ہوئے پیدا نہیں کیا۔

تخلیقِ کائنات ایک نہایت اہم (SERIOUS) پروگرام کا جزو ہے۔ کھیل تماشہ نہیں اسے بالحق پیدا کیا گیا ہے۔

**لقاءِ رب** اُن غلط تصوّرات و اعتقادات نے جو ایران کے راستے اسلام میں داخل ہوئے۔ اور مسلمانوں کے دل و دماغ میں جاگزیں ہوئے۔ لقاءِ رب کے لئے صُوفیوں کو زاویوں اور گوشوں جنگلوں اور صحراؤں میں آلتی پالتی مار کر بیٹھنے کی ترغیب دی۔ سمجھایا گیا کہ اس طریقِ زُہد و عبادت سے قُربِ خُداوندی حاصل ہوگا۔ یہ محض خود فریبی اور خدا فریبی ہے۔ قُرآنی تصوّرات سے اس خیال و عمل کا دُور کا بھی واسطہ نہیں۔ قرآن کریم اللہ سے مُلاقات کا کیا طریق بتاتا ہے۔

سُورۂ رعد میں ہے:۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا

اللہ کی ذات وُہ ہے جس نے ایسے ایسے عظیم کرّوں کو فضا کی بلندیوں میں

بغیر کسی ایسے ستون کے جو تمہیں نظر آئے، اس حسن و خوبی سے اٹھا رکھا ہے۔ تَرَوْنَهَا کا لفظ غور طلب ہے۔ یعنی یہ کرّے اس فضا میں "ستونوں" کے سہارے قائم ہیں۔ لیکن وہ ستون ایسے نہیں جو تمہیں دکھائی دے سکیں۔ وہ (VISIBLE) نہیں ہیں۔ یہ ستون وہ کششِ ثقل و انجذاب ہے۔ جس سے یہ کرّے اس طرح فضا میں معلّق ہیں اور کشش کی قوّت ایسی چیز نہیں۔ جو آنکھوں سے دکھائی دے سکے۔ اس ضمنی تشریح کے بعد اس آیت کا بقایا حصّہ یہ ہے۔ کہ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ۔ اور وہ خدا اس تمام کائنات کے مرکزی کنٹرول کو اپنے ہاتھ میں رکھے ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى۔ اس نے چاند اور سورج کو اپنے قانون کی زنجیروں میں اس طرح جکڑ رکھا ہے کہ وہ مقرر کردہ راستوں پر ایک وقتِ معین تک کے لئے بلا چون و چرا چلے جا رہے ہیں۔ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ وہ خدا اپنے پروگرام کو حسنِ تدابیر سے چلائے جا رہا ہے يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ اور اپنی ان آیات کو تمہارے سامنے کھول کھول کر بیان کرتا ہے۔ لَعَلَّكُمْ بِلِقَآءِ رَبِّكُمْ تُوْقِنُوْنَ (۱۳/۲) تاکہ تم اپنے رب کی ملاقات کا پورا پورا یقین کر سکو۔

قرآن نے یہ کہا ہے کہ نظامِ کائنات کے متعلق یہ تمام تفصیلات اس لئے بیان کی جاتی ہیں کہ تمہیں اس بات کا یقین آ جائے کہ تم اپنے رب سے مل سکتے ہو۔ تمہارا رب تمہارے سامنے آ سکتا ہے۔ اس کا مطلب صاف ہے کہ اگر تم اپنے رب کو اپنے سامنے دیکھنا چاہتے ہو۔ تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ تم نظامِ کائنات کا مطالعہ کرو۔ ایک ایک شئے پر غور و فکر کرو۔

مختلف تجربات سے اس حقیقت کا انکشاف کرو کہ یہ تمام سلسلۂ کائنات کس محکم قانون کے مطابق چل رہا ہے۔ اس طرح وہ تمام پردے ایک ایک کر کے اٹھ جائیں گے۔ جو خدا کے نظام کو سطح بین نگاہوں سے چھپائے رکھتے ہیں اور تم علیٰ وجہ البصیرت دیکھ لو گے کہ اس کا قانونِ ربوبیت کس طرح کائنات کی نشو و نما کئے جا رہا ہے۔ اس طرح تم اپنے رب کو اپنے سامنے بے نقاب دیکھ لو گے۔

اس مقام پر اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ جہاں تک خدا کی ذات کا تعلق ہے

آنکھوں سے دیکھ لینا تو ایک طرف اس کا تصوّر بھی ذہنِ انسانی میں نہیں آ سکتا لَا تُدۡرِکُہُ الۡاَبۡصَارُ (۶/۱۰۴) انسانی نگاہیں اسے پا ہی نہیں سکتیں۔ اس لئے "لقاءِ رب" کے یہ معنی نہیں کہ خُدا کی ذات بے نقاب ہو کر انسان کے سامنے آ سکتی ہے۔ اس کے معنی یہی ہیں کہ فطرت کے مشاہدے سے خُدا کا نظامِ ربّ العالمینی انسان کے سامنے بے نقاب ہو کر آ جاتا ہے۔ اور وہ اس کے نظامِ ربوبیت کی کار فرمائیوں اور کرشموں سازیوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتا ہے۔ حکیم الامتؒ کے الفاظ ہیں

نمود تیری نمود اس کی نمود تیری
خُدا کو تو بے حجاب کر دے خُدا تجھے بے حجاب کر دے

بہر حال یہ حقیقت واضح ہے کہ قرآن کی رُو سے "لقاءِ رب" کا یقین انہی کو آ سکتا ہے۔

ارشاد ہے:۔

**متّقی کون ہے**

اِنَّ فِی اخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَالنَّهَارِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ فِی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّتَّقُوۡنَ۔

یقیناً دن اور رات کی گردش اور کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے۔ اس کی تخلیق میں تقویٰ شعار قوم کے لئے خدا کی آیات ہیں۔

یہ نہیں کہ کسی قوم کے پاؤں کے نیچے صدیوں سے ذھب سیال (LIQUID GOLD) بہتا رہے اور وہ اس بیش بہا نعمتِ خداوندی کی نفع بخشیوں سے اپنی نالائقی اور غفلت کی وجہ سے محروم رہے۔ دُنیا میں عروج و اقبال کا بنیادی راز یہی ہے۔ کہ جو قومیں حاضر و موجود پر شاکر و قانع ہو کر بیٹھ جائیں اور اشیائے کائنات کی تسخیر سے مُنہ موڑ لیں۔ وہ دُنیا بھر کی رُسوائیاں اپنے دامن میں باندھ لیتی ہیں اور زوال و ادبار اور ذلّت و پستی کے عمیق گڑھوں میں جا گرتی ہیں۔ اور جو قومیں کائنات کی پستی و بالائی میں غور و فکر کر کے اشیائے کائنات کے خصائص معلوم کر کے ان کائناتی قوتوں کو اپنا غلام بنا لیتی ہیں۔ دُنیا ان کے

ان جذبوں سے مرعوب - ان کے خزانے اس دولت سے معمور یہ قو میں اپنی ان جہدوں - کاوشوں اور انکشافات و اکتشافات کے ذریعے حاصل کی ہوئی شوکتوں اور بلندیوں کے طفیل دنیا میں حیاتِ باشرف کی سرفرازیوں اور بامراد زندگی کی عظمتوں کو پالیتی ہیں - یہ مصافِ زندگی میں کہیں آگے نکل جاتی ہیں - اور یہ اپنی ان قوتوں کے نشہ سے سرشار ہوتی ہیں - لیکن جو لوگ آیاتِ خداوندی میں غور و فکر کے عادی نہیں وہ خدا کے عطا فرمودہ سامان نشوو ارتقار سے محروم رہ جاتے ہیں -

وَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ہ (۲۹/۲۴)

یعنی یہ لوگ ایک دردناک عذاب کی زندگی بسر کرتے ہیں -

آپ نے دیکھ لیا کہ "تقارب" کے یقین کے لئے کائنات میں "آیات اللہ" کا مشاہدہ اور مطالعہ ضروری ہے - وحدتِ خالق - وحدتِ مخلوق اور وحدتِ قانون کا قرآنی فلسفہ تمام کا تمام اس میں آجاتا ہے - کیونکہ یہ تمام نظامِ کائنات علم و حقیقت کی بنیاد پر قائم ہے ظن و قیاس کا یہاں کوئی دخل نہیں - اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں :-

اَنْزَلَهُ الَّذِيْ يَعْلَمُ السِّرَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط

قرآن اس خدا کی طرف سے نازل ہوا ہے جو کائنات کے تمام رموز و اسرار سے واقف ہے -

آپ نے اندازہ فرما لیا ہوگا کہ یہی نظامِ انسانیت جو قرآن کی مستقل اقدار کی اصل و اساس پر قائم ہوگا - اسی کے لئے بقاء ہے جو نظامِ معاشرت امتیاز رنگ و خوں اور نسل و وطن پر قائم ہو اس کی عالم سوز تہذیب - ننگِ انسانیت تمدن اور وحشیانہ تعلیم (کہ محض جغرافیائی حدود اور رنگ و نسل کے فرق کی وجہ سے انسان انسان کے خون کا پیاسا ہو) دنیائے انسانیت کو پرامن اور خوشگوار زندگی سے ہمکنار نہیں کر سکتی - انسانی افکار و تخیلات کی بنیاد پر قائم شدہ معاشرہ کبھی وحدتِ انسانی کے لئے وہ وحدتِ مقصد پیدا نہیں کر سکتا جو اللہ کے نظامِ ربوبیت سے پیدا ہو سکتی ہے - عمرانی

زندگی کے جتنے مصائب و آلام آج انسان کو در پیش ہیں۔ صرف جماعتی امتیازات کی بنا پر ہیں۔ وحی کی روشنی سے الگ رہ کر اشتراکِ شعور کا فلسفہ اس قدر نامحکم اور خلافِ حقیقت ثابت ہُوا ہے کہ محض عقل کی بنیادوں پر اٹھائے ہوئے انسانی معاشرے آج جس انسانیت سوز جہنم میں جُھلس رہے ہیں۔ اس کا اندازہ ان خون ریزیوں اور انسان کُشی سے کیا جا سکتا ہے۔ جو آج علم و دانش اور تہذیب و تمدّن کے نام پر جاری ہے۔

تشکیلِ انسانیت کے لئے بلا امتیاز خُون و رنگ لاجماعتی معاشرہ صرف ربّ العالمین کے عطا کردہ نظامِ حیات کے قیام اور اُس کی ترویج و تنفیذ ہی سے انسانوں کو میسّر آ سکتا ہے۔ آج دُنیا نے دیکھ لیا ہے کہ نسلی اور جغرافیائی وحدتیں تشتت و انتشار کے سوا کچھ نہیں ہیں۔ ان مفکّرین کا عجزِ فہم اور افلاسِ تدبّر پکار پکار کر کہہ رہا ہے۔ کہ تشکیلِ انسانیت کے لئے ایسے خوشگوار اور خوشحال معاشرہ کی ضرورت ہے۔ جس میں معیارِ فضیلت صرف جوہرِ ذاتی ہو۔ نظریۂ پاکستان میں اسی طرز کے ایک آزاد اور ہموار معاشرے کے قیام کی ترغیب ہے۔ جو وطن اور نسل۔ رنگ اور خُون کی تفریقات سے یکسر پاک اور منزّہ ہو اور جو انسانی مساوات کا گہوارہ کہلا سکے۔ ہمارے نزدیک انسان امن و سلامتی کی دُنیا اُسی وقت تعمیر کر سکے گا۔ جب نظریۂ پاکستان کے مطابق انسان کو وطن و نسل کے تعصّب انگیز سلاسل اور امتیازات شعوب و قبائل کی پیدا کردہ حقارت و نفرت کی جہاں سوز آگ سے محفوظ کر سکے گا۔ جب انسان یہ تسلیم کرے گا۔ کہ انسان کا رشتہ بلا لحاظ زمان و مکاں اور حدُود ملک و نسب سے دُوسرے انساں سے محض انساں ہونے کا رشتہ ہی واحد رشتہ ہے۔ اسلام یہ رشتہ آئیڈیا لوجی (تصوّرِ حیات کی بنا پر استوار کرتا ہے۔

کسی نظامِ حیات کو برپا اور نافذ کرنے کے لئے کسی مادّی مرکز کی ضرورت کی اہمیّت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے اسلام کے قیام کے لئے مکّہ کو مادّی مرکز قرار دیا۔ دُنیا کے تمام انسان جو اس نظریۂ حیات اور اس تصوّرِ زندگی پر ایمان رکھیں گے۔ ان کا مرکزی کنٹرول ایک مرکز کے تابع ہوگا۔

# مرکزِ ملّت

قوم را ربط و نظام از مرکزے
روزگارش را دوام از مرکزے

ملّت اسلامیہ کا فکرِ خصوصی خُدا کی حاکمیت کا تصوّر ہے۔ لیکن اس عالمگیر تصوّرِ زندگی کو محسُوس و مشہود شکل میں محسوسات کے خوگر انسان کے سامنے لانے کے لئے محسُوس پیکر (مادّی مرکز) کی ضرورت ہے۔ ہر نظامِ حیات ایک مرکز کا محتاج اور مرکز کے قیام و بقار کا تقاضا ہوتا ہے کہ اس کے پیچھے قوت و اقتدار موجود ہو۔

جس طرح پُرکار کا پاؤں سنٹر سے ہل جانے سے پورے کا پُورا دائرہ بگڑ جاتا ہے۔ اُسی طرح اگر کسی قوم کی مرکزیت میں خلل و انتشار واقع ہوجائے تو اس کی ملّی حیثیت کا شیرازہ بکھر جاتا ہے۔ ربّ کائنات نے اُمّت مسلمہ کے لئے مکّہ کو مشہود مرکز قرار دیا۔ قوموں کے قیام و فنا میں ان کے دارالسلطنت کو کتنا بڑا دخل ہوتا ہے۔ اس کا اندازہ اس بات سے ہو سکے گا کہ کسی وسیع و عریض سلطنت کو فتح کرنے کے لئے اگر اس کے دارالخلافہ کو فتح کرلیا جائے تو وہ سلطنت اکثر حملہ آور کے زیرِ اقتدار آجاتی ہے۔ اگرچہ دارالخلافہ اینٹ۔ پتّھر اور سیمنٹ کی عمارات کا مجموعہ ہوتا ہے لیکن خُوگرِ محسوسات انسان کے دل میں اس کی اہمیّت اس قدر پیوست اور محکم گیر ہوتی ہے کہ وُہ دُنیا کے کسی گوشے میں ہو اس کے رجحانات قلب و میلاناتِ نظر کی طنابیں غیر محسوس طور پر اس مرکز کے ساتھ یوں پیوستہ ہوں گی جس طرح فضا کی پہنائیوں میں گُم ہوجانے کے باوجود پرندے کی نگاہیں ایک لاسکی سلسلہ کی وساطت سے شاخِ آشیانہ سے مربوط رہتی ہیں۔

اقبالؒ فرماتے ہیں:۔

پرد در وسعتِ گردوں یگانہ
نگاہِ او بشاخِ آشیانہ

یہی معاملہ قومی جھنڈے کا ہے۔ اگرچہ وُہ کپڑے کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا ہوتا

ہے۔لیکن اس کی فضا کشائی اس قوم کی سربلندی کی علامت اور اس کی نگوں ساری اس قوم کی نگوں ساری کی دلیل ہوتی ہے۔جس قوم کا یہ جھنڈا ہو۔اس کپڑے کے چھوٹے سے ٹکڑے کے ساتھ عقیدت و احترام اور عظمت و رفعت کی ہزاروں داستانیں وابستہ ہوتی ہیں۔اس کی حفاظت و عظمت کے لئے کٹ مرنا شہادت کا اعلیٰ درجہ تصور کیا جاتا ہے۔عام قوموں کے جھنڈے تو ملک و نسب اور وطن و نسل کے نام پر بلند کئے جاتے ہیں۔لیکن ملّت اسلامیہ کا پرچم اسلام کا پرچم۔یہ جھنڈا "قرآنی فرمان کا جھنڈا" ہوتا ہے۔جو فضائے کائنات میں اس لئے لہراتا ہے کہ دُنیا میں کسی انسان کی بھی زندگی ناشگفتہ نہ رہ جائے۔دراصل یہ پرچم انسانوں کے لئے پیغامِ امن اور خوشحالی و خوشگواری کی ضمانت دے کر معیارِ فضیلت جوہر ذاتی کو قرار دیتا ہے ہاں ذکر مرکز کا کیا جا رہا تھا۔مرکز کا جذب و کشش افرادِ قوم کو اس طرح باہمدگر متمسک رکھتا ہے۔جس طرح اجرامِ فلکی اپنے اپنے محوری نظام کی کشش سے باوجود خلل مکانی ایک دُوسرے سے ملحق و متصل ہوتے ہیں۔مومنین کی زندگی کا شعار خُدا کی حاکمیت کا اعلان اور عملی نفاذ ہوتا ہے۔یہ قوت و سطوت کے بغیر ناممکن ہے۔اس لئے اسلام کی قوت کا مشہود مرکز بیت الحرام ٹھہرایا گیا لیکن اب مکّہ خاکِ جنیوا کو جمعیتِ آدم کا پیغام اسی صورت میں دے سکتا ہے کہ مسلمانانِ عالم عرب و عجم۔ایران و یمن اور ترک و شام کی تخصیص یعنی نسل و وطن کے امتیازات کے بتوں کو پاش پاش کر کے

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لیکر تا بخاکِ کاشغر

جب ملّتِ اسلامیہ اس انداز میں زندہ ملّت تسلیم کر لی جائے گی۔تو پھر ہم عالمی برادری کی طرف دُنیائے آدمیّت کو بلا سکیں گے۔پھر جمعیتِ اقوام کے بجائے جمعیتِ آدم کا قرآنی فلسفہ دُنیا قبول و منظور کرنے کے لئے مجبور ہو جائے گی۔ حکیم الامّت رحؒ کے ارشاد کے مطابق

مکّہ نے دیا خاکِ جنیوا کو یہ پیغام
جمعیّتِ اقوام کہ جمعیّتِ آدم؟

مسلمانانِ عالم کی ہم آہنگی و یک رنگی ہی وہ قوت ہے۔ جو مکہ کو نوعِ انسانی کے لئے امن و سلامتی کا زندہ مرکز اور سکون و راحت کا ضامن بنا سکتی ہے۔ لیکن اگر ایسا نہ ہُوا تو خاکم بدہن پھر ہمارا عرب و عجم اور ترک و ایرانی ہونا کل کو ذلیل و خوار اور آج کی منظم یہودی قوم میں یہ حوصلہ پیدا کر دے گا کہ وُہ اس مرکزِ ملّت پر قابض ہونے کے لئے حملہ آور ہونے کے اقدامات کرے۔ اس لئے نہایت ضروری ہے کہ ہم جس قدر جلدی من و تو کا فرق مٹا کر ایک اُمّت (بنیان مرصوص) بن جائیں تاکہ کمینہ خصلت یہودیوں کو اس ارتکاب کا یارا نہ ہو۔ حالاتِ حاضرہ کے پیشِ نظر

شنیدم آنچہ از پاکانِ اُمّت
تُرا با شوخیٔ رندانہ گفتم

مرکزِ ملّت کے متعلق سُورۂ آلِ عمران میں ہے:۔

إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّ هُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ ۚ فِيْهِ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِيْمَ ۚ وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ط (۳/۹۶-۹۵)

بلاشبہ، پہلا گھر جو نوعِ انسانی کے لئے حکومتِ الٰہیہ کا مرکز بنایا گیا وُہ یہی ہے جو مکّہ میں ہے۔ برکت والا اور تمام انسانوں کے لئے سرچشمۂ ہدایت۔ اس میں دینِ حق کی روشن نشانیاں ہیں۔ ازاں جُملہ مقامِ ابراہیم ہے یعنی ابراہیم کے کھڑے ہونے اور عبادت کرنے کی جگہ، جو اس وقت سے لے کر آج تک بغیر کسی شک و شبہ کے مشہور و معین رہی ہے۔

غور کیجئے کہ آفتابِ جہانگیر (قرآن کریم) انسانیت کو کس قدر بلند مقام پر لے جاتا ہے۔ آتشِ وطن و نسل اور نارِ حرص و آز کے بھڑکتے شعلوں سے جان بچانے کے لئے انسان للچائی ہُوئی نگاہوں سے چاروں طرف دیکھتا ہے۔ کہ انسانی خیالوں کی انساں سوز آگ سے کہیں پناہ مل جائے لیکن اس کی نگاہیں مایوس و ناکام ہو کر کاشانۂ چشم میں واپس لوٹ آتی ہیں افسوس جس اُمّت کو خُدائے انسانیت نے انسانوں کی رہنمائی و حفاظت کے لئے خیرِ اُمّۃ کہہ کر دنیا میں بھیجا تھا۔ دُنیا کی امامت

جس کے لئے مقدر کر دی گئی وہ آج چھوٹی چھوٹی مفاد پرستیوں کی وجہ سے اسلام کے انسانیت ساز پیغام کو ذاتی آراء سے کثیف کر رہی ہے۔ اور خود گروہوں اور فرقوں، قبیلوں اور پارٹیوں میں بٹی ہوئی ہے اور اس نے بھی صنمکدہ دل میں نسل و وطن کے بت نصب کر رکھے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ خالق کون و مکان نے تو کعبہ کو قیام انسانیت بلکہ نظام انسانیت کی قیام گاہ کہا ہے کہ:-

جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيٰمًا لِّلنَّاسِ (۵/۹۷)

اللہ نے کعبہ کو کہ حرمت کا گھر کہا ہے سب نوعِ انسانی کے لئے (امن) قیام کا ذریعہ ٹھہرایا ہے۔

الحمدللہ جس مرکز انسانیت سے گری ہوئی انسانیت (ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ) کو پھر سے قیام کی سعادت نصیب ہوئی تھی اس مرکز کے محافظوں نے اسے "قیام انسانیت" کا مرکز بنانے کے بجائے "مقدس مقام" بنا لیا۔ اور زندہ خدا کے زندگی بخش پیغام کے لئے اس زندہ مرکز سے وہ کام نہ لیا جو اس کی غایت ہے۔ جَعَلْنٰهَا قِيٰمًا لِّلنَّاسِ)

کاش اب بھی ملتِ اسلامیہ اس مرکز قیام انسانیت کی مرکزی حیثیت کی اہمیت کو محسوس کرے۔ اللہ نے اس مرکز کو بلد امین کہا ہے:-

وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ ۙ (۹۵/۳)

مکہ قیام انسانیت کا مرکز۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ الَّذِيْ جَعَلْنٰهُ لِلنَّاسِ سَوَآءَ ۨ الْعَاكِفُ فِيْهِ وَالْبَادِ ؕ وَمَنْ يُّرِدْ فِيْهِ بِاِلْحَادٍۢ بِظُلْمٍ نُّذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ۧ (۲۲/۲۵)

"جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی، اور جو اللہ کی راہ سے لوگوں کو روکتے ہیں، نیز مسجد حرام سے جسے ہم نے بلا امتیاز انسانوں کے لئے مرکز ٹھہرایا ہے۔ خواہ وہاں کے رہنے والے ہوں یا باہر سے آنے والے، تو انہیں یاد رکھنا چاہیئے کہ ہم انہیں اور ہر آدمی کو جو اس میں از راہ ظلم حق سے منحرف ہونا چاہے گا، عذاب دردناک کا مزہ چکھائیں گے۔"

ہر وہ انسان جو اس مرکز امن و سلامتی کو اپنا مامن اور پناہ گاہ مان لے۔ اس کے حصار عافیت میں آجائے۔ اسی کو مسلم کہا گیا ہے:-

إِنَّمَآ أُمِرْتُ أَنْ أَعْبُدَ رَبَّ هَٰذِهِ الْبَلْدَةِ الَّذِي حَرَّمَهَا وَلَهُ كُلُّ شَيْءٍ وَّأُمِرْتُ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْمُسْلِمِينَ ۝ (۲۷/۹۱)

اے پیغمبر! اعلان کردو، مجھے یہی حکم دیا گیا ہے کہ میں اس شہر کے پروردگار کی عبودیت محکومیت و اطاعت اختیار کروں جس نے اسے عظمت و حرمت بخشی ہے۔ اور جو تمام چیزوں کا مالک و مختار ہے اور (نیز) حکم دیا گیا ہے کہ میں مسلم لوگوں میں سے ہو جاؤں (جن کا شعار اطاعت اور فرماں پذیری میں خدا کے آگے جھک جانا ہے)

آج انسانیت انسانوں کے ہاتھوں اس لئے ذلیل و خوار ہے کہ انسان نے خالق حقیقی کے عطا کردہ ضابطہ حیات سے منہ موڑ کر نسل و وطن کے بتوں کی پرستش شروع کر رکھی ہے۔ دین اسلام بے رنگ انسانیت کے قیام کا داعی ہے۔ ایسی انسانیت جو امتیازات رنگ و بو سے منزہ اور وطن و نسل کے فرق و اختلاف سے پاک ہو۔

قرون اولی میں ایک خدا۔ ایک رسول۔ ایک قانون اور ایک امت ایک مرکز کو ماننے والے فرزندان ملت نے زمین کے چپے چپے پر اسلام کا پرچم لہرایا اور معزز و محترم ٹھہرائے گئے۔ بقول شاعر

زمیں کے چپے چپے پر اڑا اسلام کا پرچم
یہ ان گنتی کے چند لوگوں کی شان استقامت تھی

آج بھی اس زندہ خدا (حیّ و قیّوم) کا دین ہے۔ جس پر زبانی دعوی نے مسلمانوں کو ذلیل و رسوا کر رکھا ہے۔ ہاں اگر آج کا مسلمان بھی وطن و نسل کے اغلال و سلاسل کو توڑنے کے لئے حکیم الامت ؒ کے قرآن کی روشنی میں بیان فرمودہ نظریۂ پاکستان کو دنیا کے اطراف و اکناف میں پھیلانے کی ذمہ داری قبول کر لے۔ تو یہ امت دوبارہ قرآن کے درخشندہ و رخشندہ نظام حیات

کی بدولت از سرِ نو قیامِ انسانیت کی دعویدار بن سکتی ہے۔ لیکن قرآن کا حیات بخش نظامِ جہانگیری کے لئے چشمِ نگراں اسی وقت عطا کرے گا۔ جب موجودہ مسلمان زمانے کے اُبھرتے تقاضوں کو محسوس کر کے اس کا حل قرآن سے طلب تلاش کریں۔ اور عملی طور پر دُکھی انسانیت کے درد کا درماں بننے کے لئے پرچمِ اسلام لے کر اُٹھ کھڑے ہوں۔ قانونِ قدرت چشمِ بیدار اسی صورت میں مرحمت کرتا ہے۔ جب مسلمان قرآن کی مستقل اقدار کو عملی طور پر اپنا لیں۔ اگر ہم ایسا کر پائیں گے تو ہم بنی نوع انسان کے نگراں (شہید) اور ہمارا مرکزِ ملت ہمارے اعمال کا نگراں ہو گا۔

ملّی ہستی کا تشخص کب ہو گا؟ جب ہم حقیقی معنوں میں ملّتِ اسلامیہ بن جائیں گے۔ ایسی ملّت جس کے متعلق حکیم الامتؒ کا ارشاد ہے:۔

چیست ملّت ایکہ گوئی لا الہ

با ہزاراں چشم بودن یک نگاہ

ظاہر ہے کہ اس قسم کی ہم آہنگی و یک رنگی کے بغیر نہ مرکز مضبوط ہو سکتا ہے۔ اور نہ ہی نظامِ انسانیت اور قیامِ انسانیت کے لئے ہم کچھ کر سکتے ہیں۔ زندہ مرکز تو وُہ ہوتا ہے۔ کہ دُنیا کی تمام زندہ قومیں اس کی وقعت و اہمیّت اور وزن محسوس کریں۔ یہ مرکز دُنیا میں عدل و انصاف کے لئے میزان ٹھہرے اور مقاصدِ فطرت کا عیار سمجھا جائے۔ یہ نہیں کہ زمزم کا پانی ڈبوں میں بند کر کے لایا جائے کہ اسے مُردوں کے کفن پر چھڑکا جا سکے۔

ملّتِ اسلامیہ کا اجتماعِ عالم (حج) اس لئے نہیں کہ اس عظیم ملّی اجتماع کے بعد بھی ملّت سکراتِ موت کی ہچکیاں لے اور اگر حسّاس قلوب، حج کی اہمیّت کو اُجاگر کرنے کی سعی کریں اور مریضِ ملّت کے درد کا درماں تلاش کریں۔ تو کفر سازی کے تمام کارخانے حرکت میں آ جائیں۔

یاد رکھیئے مرکز کی صحت کا راز، حج کی اہمیّت سمجھنے اور تصورِ ملّت کو مسلمانانِ عالم کو سمجھانے میں ہے۔ کیونکہ

حرم جز قبلۂ قلب و نظر نیست      طوافِ اُو طوافِ بام و در نیست

میانِ ما و بیت اللہ رمزیست
کہ جبرئیل امین راہم خبرنیست

جب تک ہر مسلمان کے رگ و ریشہ میں تصورِ ملت نہیں سماتا اور وحدتِ اذکار کے بعد وحدتِ کردار پیدا نہیں ہوتی۔ سفینۂ ملت موجوں کی زد میں رہے گا۔ اور دُنیائے انسانیت کی قیادت کبھی نصیب نہیں ہوگی اب ہم جس عالم میں ہیں۔ اس میں توتوحید پرستی کے دعویٰ باطل اَور حضور اقدس و اعظمؐ کی ختم المرسلینی پر ایمان کا اظہار بے معنی۔ جسدِ ملت کو قلب متحرک کی طرح حرکت میں لانے کے لیئے ضروری ہے کہ حکیم الامت علامہ اقبالؒ کے انسانیت ساز نظریہ پاکستان کو جہانِ آدمیت میں عام کیا جائے۔ اس کے لیئے مضبوط مرکز کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ کیونکہ

قوموں کے لیئے موت ہے مرکز سے جُدائی
ہو صاحبِ مرکز تو خودی کیا ہے خدائی

## نواں باب

# نیشنلزم

اس باب میں تمام نظامہائے حیات نیشنلزم، جمہوریت، اشتراکیت، سوشلزم، آمریت، ملوکیت اور بادشاہت غرضیکہ ان تمام ازموں کی جو انسانی عقل و غرض نے تراشے ہیں۔ قدرے تفصیل سے تشریح کرنے کے بعد آیندہ باب میں قرآنی نظام کے چند بنیادی اصول پیش کیے جائیں گے۔ اس باب کی ابتدا جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے۔ نیشنلزم سے کی جاتی ہے۔

قوم (NATION) کے جامع تصوّر کی تعریف مشکل ہے۔ انگریزی لفظ نیشن کا مادہ لاطینی لفظ (NATUS) ہے۔ جس کے معنی "پیدائش" ہیں۔ لہٰذا ابتداءً نیشن کا لفظ ایک نسل کے لوگوں کے لئے بولا جاتا تھا (چنانچہ اب بھی بعض ممالک میں قوم کی تشکیل، نسلی امتیاز ہی سے ہوتی ہے۔ لیکن سیاسیاتِ حاضرہ میں نیشن کا مفہوم اس ابتدائی تصوّر سے وسیع ہو گیا ہے۔ اور اس سے بالعموم مُراد ہوتی ہے۔ ایک خطّۂ زمین میں بسنے والے انسانوں سے جو ایک حکومت کے تابع رہیں (واضح رہے کہ یہ مفہوم بھی جامع نہیں) عمومی ہے اور نیشنلزم (وطنیت) سے مفہوم ہے ان لوگوں کی وجوہ جامعیت۔ نیشنلزم کے لئے بالعموم دو شرائط لاینفک سمجھی جاتی ہیں۔ ایک "باہمگی" (GREGARIOUSNESS) اور دُوسرے "جذبۂ بے ہمگی" (EXCLUSIVENESS) ثانی الذکر جذبہ سے مقصود یہ ہے کہ ایک نیشن اپنے آپ کو خود مختار تصوّر کرتی ہے۔ اور کسی اور نیشن کے فرد کو نہ اپنے اندر شامل کرتی ہے۔ اور نہ اسے حق دیتی ہے کہ وہ ان کے معاملات میں دخل اندازی کرے تا آنکہ وہ اپنی قومیت (NATIANALITY) نہ بدل دے۔ اسی اتحادِ قومی کا نام نیشنلزم ہے۔ جس کی بنیاد خون رنگ اور نسل و

وطن ہوتا ہے۔ اس امتیازِ رنگ و خون سے انسانیت ٹکڑے ٹکڑے ہو کر رہ جاتی ہے۔ محض رنگ و خون کے اختلاف اور قوم و وطن کے فرق کی وجہ سے ایک انسان دوسرے انسان کا دشمن بن جاتا ہے۔ اب تو یورپ بھی جو نیشنلزم کو اپنے صدیوں کے تدبّر کی معراج اور انسانیت کے لئے آیۂ رحمت تصور کئے چلا آرہا تھا۔ اب وہاں کے مدبرین و مفکرین بھی شدت سے یہ محسوس کر رہے ہیں۔ کہ نیشنلزم کا آتشیں سیلاب جو اس طرح تیزی سے بہہ رہا ہے۔ اگر اس کی روک تھام نہ کی گئی تو یہ پوری دُنیائے انسانیت کو جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دے گا۔ وہ اس نظریۂ حیات کے بھیانک نتائج اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ لیکن ان کی بے بسی کا یہ عالم ہے کہ :-

نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے

یہ صرف اس لئے ہے کہ ان کے سامنے حیاتِ انسانی کے لئے وہ مستقل اقدارِ زندگی نہیں ہیں جو خالقِ ارض و سمٰوٰت نے تمدنی اُمور کے لئے انسان کو قرآن کی وساطت سے عطا کی ہیں۔ قومیت کی تشکیل میں سب سے مؤثر جذبہ نفرت کا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ دُنیا میں بڑی بڑی قوموں میں وجۂ مخاصمت اسی جذبۂ نفرت کی پیدا کردہ ہے۔ ظاہر ہے کہ جس چیز کی بنیاد باہمی نفرت پر ہو گی۔ اس کا لازمی نتیجہ جنگ اور خُوں ریزی ہو گا۔ جس کی وجہ سے انسانی خُون کی ارزانی ہو گی۔ نیشنلزم کے حامی یہ سمجھتے ہوں گے کہ اس نظریۂ زندگی کو اپنانے سے ان کے تصوّراتِ حیات میں چمک، دمک، صفائی، روشنی تابندگی، درخشندگی آگئی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ بواطن ان تصوّراتِ حیات میں ظلمت و تاریکی، تنگ نظری۔ تعصّب اور خود غرضی ظلم و فساد کی سیاہ چادروں میں لپٹی ہوئی ہے۔ جس نے انسانیت کو دریاؤں اور پہاڑوں کی غیر فطری حدّوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ اور انسان انسان میں ایک دُوسرے سے پیدائشی عداوت ہے۔ یہ ایک دُوسرے کے مفاد کے دشمن اور ایک دُوسرے کے خون کے پیاسے ہوتے ہیں۔ اس غیر انسانی تفریق و تقسیم کا نام نیشنلزم ہے۔ بقول اقبالؒ

غضب ہے کہ انساں نوعِ انساں کا شکاری ہے

یہ آپ کو معلوم ہو چکا ہے کہ "نظریۂ پاکستان" نظریۂ وطنیت، قومیت اور نسلیت کا حریف ہے۔ تحریکِ قیامِ پاکستان امتیازِ رنگ وخون اور اختلاف وطن ونسل کے خلاف صف آرائی تھی اور معرکۂ دین ووطن کے لئے ابنائے اسلام کے دلوں میں جو جذبے اور سینوں میں جو ولولے موجزن تھے وہ علامہ اقبالؒ کے افکار ونظریات اور احساسات وتخیلات کے پیدا کردہ تھے۔ لہٰذا اب ابتدا بھی ان کے فرمودات سے کی جاتی ہے۔

پروفیسر صوفی غلام مصطفےٰ تبسم کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:-

"میرا عقیدہ ہے کہ جو شخص اس وقت قرآنی نقطۂ نگاہ سے زمانۂ حال کے "جورس پروڈنس" پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر احکامِ قرآنیہ کی ابدیت کو ثابت کرے گا، وہی اسلام کا مجدّد ہوگا اور بنی نوعِ انسان کا سب سے بڑا خادم بھی وہی شخص ہوگا۔

اسی خط میں ذرا آگے چل کر:-

"میری ناقص رائے میں مذہب اسلام اس وقت گویا زمانے کی کسوٹی پر کسا جا رہا ہے۔ اور شاید تاریخِ اسلام میں ایسا وقت اس سے پہلے کبھی نہیں آیا۔"

اس خط میں بات نکھر کر سامنے آجاتی ہے۔ ڈاکٹر نکلسن کے نام لکھتے ہیں:-

"اسلام ہمیشہ رنگ ونسل کے عقیدے کا جو انسانیت کے نصب العین کی راہ میں سب سے بڑا سنگِ گراں ہے نہایت کامیاب حریف رہا ہے۔ رینان کا یہ خیال غلط ہے کہ سائنس اسلام کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ دراصل اسلام بلکہ کائناتِ انسانیت کا سب سے بڑا دشمن رنگ ونسل کا عقیدہ ہے۔ اور جو لوگ نوعِ انسانی سے محبت رکھتے ہیں ان کا فرض ہے کہ ابلیس کی اس اختراع کے خلاف علمِ جہاد بلند کر دیں۔ مَیں دیکھ رہا ہوں کہ قومیت کا عقیدہ جس کی بنیاد نسل یا جغرافیائی حدود وممالک پر ہے۔ دنیائے اسلام میں استیلا حاصل کر رہا ہے۔ اور مسلمان عالمگیر اخوت کے نصب العین کو نظر انداز کر کے اس عقیدے

کے فریب میں مبتلا ہو رہے ہیں۔ جو قومیت کو ملک و وطن کی حدود میں مقید رکھنے کی تعلیم دیتا ہے۔ اس لئے میں ایک مسلمان اور ہمدرد نوع کی حیثیت سے انہیں یہ یاد دلانا مناسب سمجھتا ہوں کہ ان کا حقیقی فرض سارے بنی آدم کی نشو و ارتقاء ہے اور حدود و ملک کی بنیاد پر قبائل اور اقوام کی تنظیم حیاتِ اجتماعی کی ترقی اور تربیت کا ایک وقتی اور عارضی پہلو ہے۔ اگر اسے یہی حیثیت دی جائے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن میں اس چیز کا مخالف ہوں کہ اسے انسانی قوت و عمل کا مظہر اتم قرار دیا جائے۔ کیونکہ تنہا یہی جماعت میرے مقاصد کے لئے موزوں واقع ہوئی ہے۔ مسٹر ڈکنسن کا یہ خیال بھی تسامح سے خالی نہیں کہ اسلامی تعلیمات کی رُوح کسی خاص گروہ سے مختص ہے۔ اسلام تو کائناتِ انسانیت کے اتحادِ عمومی کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ان کے تمام جزوی اختلاف سے قطع نظر کر لیتا ہے اور کہتا ہے کہ

تَعَالَوْا اِلٰی کَلِمَۃٍ سَوَاءٍ بَیْنَنَا وَبَیْنَکُمْ

میرے خیال میں مسٹر ڈکنسن کا ذہن ابھی تک یورپ والوں کے اس قدیم عقیدے سے آزاد نہیں ہوا کہ اسلام سفاکی اور خوں ریزی کا درس دیتا ہے۔ دراصل خدا کی ارضی بادشاہت صرف مسلمانوں کے لئے مخصوص نہیں بلکہ تمام انسان اس میں داخل ہو سکتے ہیں۔ بشرطیکہ وُہ نسل اور قومیت کے بُتوں کی پرستش ترک کر دیں اور ایک دوسرے کی شخصیت کو تسلیم کر لیں۔

فرماتے ہیں:۔

"مجھے اس حقیقت سے انکار نہیں کہ مسلمان بھی دُوسری قوموں کی طرح جنگ کرتے رہے ہیں۔ اُنہوں نے بھی فتوحات کی ہیں۔ مجھے اس امر کا بھی اعتراف ہے کہ ان کے بعض قافلہ سالار ذاتی خواہشات کو دین و مذہب کے لباس میں جلوہ گر کرتے رہے ہیں۔ لیکن مجھے پُوری طرح یقین ہے کہ کشور کشائی اور ملک گیری ابتداً اسلام کے مقاصد

میں داخل نہیں تھی۔"

رقمطراز ہیں :-

"میری فارسی نظموں کا مقصود اسلام کی وکالت نہیں - بلکہ میری قوت طلب و جستجو تو صرف اس چیز پر مرکوز رہی ہے کہ ایک جدید معاشری نظام تلاش کیا جائے اور عقلاً یہ ناممکن معلوم ہوتا ہے کہ اس کوشش میں ایک ایسے معاشری نظام سے قطع نظر کر لیا جائے۔ جس کا مقصد وحید ذات پات، رتبہ و درجہ۔ رنگ و نسل کے تمام امتیازات کو مٹا دینا ہے۔ اسلام دنیوی معاملات کے باب میں نہایت ژرف نگاہ ہے اور پھر انسان میں بے نفسی اور دنیوی لذائذ و نعم کے ایثار کا جذبہ بھی پیدا کرتا ہے۔ اور جن معاملات کا تقاضا یہی ہے کہ اپنے ہمسایوں کے بارے میں اسی قسم کا طریقہ اختیار کیا جائے۔

یورپ اس گنج گرانمایہ سے محروم ہے اور یہ متاع اُسے ہمارے ہی فیض صحبت سے حاصل ہو سکتی ہے۔"

ارشاد فرماتے ہیں :-

"عہد جدید کا ایک مسلمان اہلِ علم جب ان مسائل کو مذہبی تجربات اور افکار کی روشنی میں بیان کرتا ہے۔ جن کا مبدا اور سرچشمہ قرآن مجید ہے تو اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ جدید افکار کو قدیم لباس میں پیش کیا جا رہا ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ پرانے حقائق کو جدید افکار کی روشنی میں بیان کیا گیا ہے۔ بدقسمتی سے اہلِ مغرب اسلامی فلسفے کی تعلیم سے ناآشنائے محض ہیں - اے کاش مجھے اس قدر فرصت ہوتی کہ میں اس موضوع پر ایک مبسوط کتاب لکھ کر مغربی فلسفیوں کو اس حقیقت سے روشناس کر دیتا کہ دنیا کی مختلف قوموں کے فلسفیانہ خیالات ایک دوسرے سے کس قدر مشابہ ہیں۔"

(اقبالنامہ مکاتیب اقبال حصہ اوّل صفحہ ۴۵۷ تا ۴۷۴)

نوٹ :- اس خط پر شیخ صاحب نے تاریخ اور سن درج نہیں کیا۔ (مؤلف)

محولہ بالا خطوط آپ کی نظر سے گذرے۔ ان سے آپ نے اندازہ فرما لیا ہوگا کہ حکیم الامتؒ نیشنلزم کو کائناتِ انسانیت کا کس قدر مخالف اور انسانیت کے اتحادِ عمومی کا کس درجہ دشمن سمجھتے ہیں۔ آپ نے دیکھ لیا کہ علامہ اسے ابلیس کی اختراع قرار دیتے ہیں۔ علمائے تاریخ عالمِ انسانی سے یہ حقیقت

## نیشنلزم ابلیس کی اختراع

مخفی نہیں کہ یہ تصوّر یورپ نے اقوام عالم کو دیا۔ اس میں فرنگی شاطروں کا یہ مذموم مقصد بھی پنہاں تھا کہ مسلمانوں کی وحدتِ ملّی کو پارہ پارہ کیا جائے کیونکہ دانائے فرنگ یہ سمجھتے تھے کہ مسلمانوں میں جب تک تصوّرِ ملّت باقی رہے گا ان کی ہم آہنگی و یک نگہی انہیں یورپ و ایشیا میں آسانی سے آگے نہیں بڑھنے دے گی۔ لہٰذا فرنگ نے نہایت زیرکی و ہشیاری اور عیاری و مکّاری سے مسلمانانِ عالم میں نظریۂ وطنیت کی اشاعت کی جسے ان کی زوال پذیر ذہنیت سادہ لوحی اور قرآنی نظریات سے بیگانگی نے قبول کرنے پر آمادہ کر دیا اور یہ ملک و نسب اور وطن کے نام پر تفریق و انتشار کا شکار ہو گئے۔ بقول اقبالؒ

حکمتِ مغرب سے ملّت کی یہ کیفیت ہوئی
جس طرح سونے کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے گاز

اس منظم و مؤثر پروپیگنڈا سے مسلمانانِ ہند بھی محفوظ نہ رہے۔ قرآن شناس اقبالؒ اور متأثرین اقبالؒ نے اس باطل تحریک کی مخالفت کی۔ مہاتما گاندھی نے ہندو مفاد کو ملحوظ رکھ کر ہندوستان میں وطنی تحریک کا آغاز کیا۔ افسوس کہ یہاں کے "مفسّرِ قرآن" اور "شیخ الحدیث" کہلانے والے اس طلسم سامری کا شکار ہو گئے۔ واردھا کی مہاتما نے اپنی پرارتھنا اور اُپدیشوں میں ایسے خیالات کا عام طور پر اظہار کیا کہ ہندوستان میں رہنے کی وجہ سے تمام ہندو، مسلمان، سکھ اور عیسائی ایک متحدہ قوم ہیں۔ اور عالمگیر سچائیاں تمام مذاہب میں یکساں ہیں۔ آپ کبھی یہ فرماتے کہ میں ہندو بھی ہوں اور مسلمان بھی، سکھ بھی ہوں اور عیسائی بھی۔ گاندھی کی دلی خواہش تھی کہ کوئی

---

لہ تفصیلی واقفیت کے لئے میری کتاب تحریک پاکستان اور نیشنلسٹ علماء دیکھئے۔

نامور مولانا قرآن کی تفسیر ان کے مقصد و منشاء کے مطابق اس طرز پر کریں۔ کہ دین الحق، الاسلام کو ہندومت اور دیگر مسخ شدہ مذاہب کی صف میں لا کھڑا کریں۔ تاکہ مسلمانوں کی عظیم ملّت کو متحدہ قومیّت کے جال میں پھانسا جا سکے۔ گاندھی کی اس آرزو کی تکمیل کے لئے ایسی تفسیر لکھنے کا بیڑا "امام الہند" ابوالکلام نے اٹھایا اور فلسفۂ گاندھوی کو قرآن کی تفسیر میں سمو دیا۔ وہ ابوالکلام جو دورِ الہلال میں کلمۂ توحید کی اصل و اساس پر مسلمانوں کے علیحدہ تشخّص کے علمبردار تھے۔ اب انہوں نے گاندھی کے ایماء پر قرآن کی یہ گنگا جمنی تفسیر لکھی اور وارد دھائی فلسفہ کی تشہیر اور نشر و اشاعت کے داعیِ اوّل بنے اور دورِ الہلال کا خدا پرست ابوالکلام اب وطن پرست۔ قومیّت پرست بن کر رہ گیا۔

امام الہند نے اپنے ہمفکر و ہمخیال عالمانِ زنّارپوش کو جمع کیا۔ اور نظریۂ پاکستان کے علمبرداروں پر واردھائی فوج کے مقدمۃ الجیش کی حیثیت سے یلغار کر دی۔ اس معرکہ کا افسوسناک و المناک پہلو یہ ہے کہ خود اہلِ مغرب کے نظریۂ وطنیت سے متأثر ہوئے۔ نیشنلزم کو اپنے ایمان کی بنیاد قرار دیا لیکن طعنہ قائدینِ تحریکِ پاکستان کو مغرب زدگی کا دیتے رہے۔ خود لُردِ مغرب کے مکر و فن کا شکار ہوئے۔ لیکن پرچمِ توحید بلند کرنے والوں کو فرنگ زدہ کہہ کر محض شکل و صورت کی نمائش سے سوادِ اعظم کو گمراہ کرنے کی کوشش میں مصروف رہے۔

حکیم الامتؒ فرماتے ہیں :-

لُردِ مغرب آں سراپا مکر و فن
اہلِ دین را داد تعلیمِ وطن

"امام الہند" نے گاندھی کی اوّلین و آخرین خواہش کی تکمیل کے لئے سوراجی اسلام تراشا اور وطن و نسل کی بناء پر قوم کی ترتیب و تشکیل کے جواز کے لئے تفسیر لکھی۔

شیخِ ملّت با حدیثِ دلنشیں
بر مرادِ او کند تفسیرِ دین

مندر و مسجد کے محکم اتحاد کے بعد اس واردھائی نظریہ کا آغاز ہوا۔ آپ جانتے

ہیں کہ فلسفۂ گاندھوی کی اصل واساس "اندر کی روشنی" تھی۔ گاندھی کا پیش کردہ فلسفہ دینِ اسلام کا حریف تھا۔ اس باطل نظریہ کو فروغ دینے کے لیے نیشنلسٹ علماء نے قرآن و گیتا کو ایک قرار دیا۔ مہاتما کا مقصد وحید دین اسلام کی فوقیت عظمت و محکمیت اور برتری کو ختم کرنا تھا۔ ہندو مت میں تو یہ جان نہ تھی کہ وہ عصرِ حاضر کے تقاضاؤں اور مسائلِ انسانی کا تسلی بخش جواب دے سکے۔ گاندھی کو یہ فکر گھن کی طرح کھا رہا تھا کہ پڑھے لکھے ہندو نوجوان یا اسلام کی گود میں چلے جائیں گے یا اشتراکیت ان کی جولان گاہ ہوگی۔ زندگی کے ٹھوس حقائق (مسائلِ حیات) کا حل ہندوازم سے دریافت کریں گے۔ تو نوجوان ہندو معقول جواب نہ پا کر بدظن ہو جائیں گے۔ لہٰذا "ضدی مسیتا" کو اس کے مرکز و محور سے ہٹانے اور ہندو مسلم کو ایک ہی صف میں کھڑے کرنے کے لیے گاندھی کی یہ کوشش کامیاب رہی کہ قرآن کے مفسر کے قلم سے قرآن کی ایسی تشریحات و تفسیرات منظرِ عام پر آئیں جن سے یہ باور کیا جانے لگا کہ گیتا اور قرآن میں کوئی فرق نہیں۔ زمانے کی آنکھ نے دیکھا کہ یہ کام دورِ الہلال کے توحید پرست اور متحدہ قومیت کے وطن پرست آزاد نے کیا اور ہم نوائی "شیخ الحدیث" نے کی۔

شیخ در عشقِ بتاں اسلام باخت
رشتۂ تسبیح از زنار ساخت (اقبالؒ)

جب مہاتما گاندھی اپنی ساحرانہ چال میں کامیاب ہو گیا اور اُسے یقین ہو گیا۔ کہ اب توحید پرست مسلمانوں کو نظریۂ متحدہ قومیت اور وطنیت کے طلسم آمیز خیال کا گرویدہ بنایا جا سکے گا۔ تو گاندھی اپنی اس کامیابی پر خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے۔ وُہ فرطِ مسرت سے جھومتے اور ناچتے ہوئے کہہ رہے تھے ؎

ترے بھی صنم خانے میرے بھی صنم خانے
ترے بھی صنم خاکی میرے بھی صنم خاکی

کبھی کبھی وُہ بلند آواز سے پکارتے اے توحید پرست ہونے کے دعویدار و

جس طرح مجھے مٹی اور پتھر کے بنے ہوئے اپنے دیوی دیوتا (بت) عزیز ہیں اسی طرح اب آپ کے لئے خاکِ وطن کا ہر ذرّہ دیوتا ہے۔ اب ہم ایک ہی صف میں کھڑے ہیں۔ مَیں بُت پرست ہوں تم وطن پرست۔ اب ہم دونوں ہی خاک کے ذرّوں کے سامنے سربسجود ہیں۔ یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ اب آپ کے "امام الہند" مفسّرِ قرآن نے میرے دعوے کی دلیل میں یہ سند پیش کر دی ہے۔ کہ تمام مذاہب سچے ہیں اور عالمگیر سچائیاں تمام مذاہب میں یکساں ہیں۔

اسے ملّتِ اسلامیہ کی بد قسمتی کہیئے کہ بہت سے سادہ لوح مخلصین جو دورِ الہلال کے ابوالکلام سے متأثر ہوئے اور جنہوں نے شیخ دیو بند سے رشتۂ عقیدت استوار کر رکھا تھا۔ ملّت سے کٹ کر ہندو کانگریس کے ہمنوا اور گاندھی کے پیروکار بن گئے۔

افسوس اس حقیقت پر ہے کہ قیام پاکستان کے بعد بھی پاکستان میں رہتے ہوئے ان عالمانِ زنّار پوش کی معنوی اولاد متأثرین اقبالؒ کی مخالفت پہلو بدل بدل کر اس لئے کر رہی ہے کہ اُنہوں نے وارد ھائی نبوّت کے ان پرستاروں۔ سوراجی اسلام کے ان علمبرداروں اور اسلام کے ہندوؤں پر ملّی عدالت میں یہ دعویٰ دائر کر رکھا ہے کہ ان اسلام ناشناسوں نے اس وقت ملّت اسلامیہ کے ساتھ کھلی بے وفائی اور غدّاری کی۔ اسلام اور مسلمانوں کو بدنام کیا اور اتحاد ملّی کو نقصانِ عظیم پہنچایا۔

جن لوگوں نے حقیقی سرچشمہ ہدایت (قرآن عزیز) کی ہدایت و رہنمائی میں اقبالؒ کی صُحبتِ فیض سے فیضیاب ہو کر اقبالؒ کی ہدایت و رہنمائی میں علمی و فکری سطح پر نیشنلسٹ علماء کے نظریات کا ابطال کیا اور حکیم الامّتؒ کے نظریۂ پاکستان کی تائید و حمایت اور تبلیغ و اشاعت میں اپنی پوری زندگی صرف کر دی۔ آج ان کے اسلام کو کہا جاتا ہے کہ "یہ نہ سوختنی ہے نہ فروختنی"؟؟

ہمیں اس حقیقت کو قبول و منظور کرنے میں کوئی تأمّل نہیں۔ واقعی یہ اسلام سوختنی اس لئے نہیں کہ دین زندہ حقائق کا نام ہے۔ اسلام کی زندہ حقیقتوں کو آتشِ باطل جلا نہیں سکتی۔ یہ نظامِ حیات تمام ادیانِ باطلہ خواہ وہ نیشنلزم ہو یا

کوئی آورازم پر غالب آکر رہے گا۔ اور حضور فروختنی اس لیئے نہیں کہ تاریخ تحریک پاکستان کی زندہ شہادتیں اس صداقت پر شاہد ہیں کہ واردھائی مہان تماں کے چرنوں میں کونسے علماء اور کونسا اسلام (سوراجی اسلام) جھکا اور نہایت ارزاں قیمت پر واردھا کی منڈی میں فروخت ہوا۔

قومے فروختند چہ ارزاں فروختند

**ابوالکلام کے عقیدت مند** ابوالکلام مرحوم کے عقیدت مندوں نے پاکستان میں کئی بار یہ سعی فرمائی ہے کہ ان کی عظمتوں کے بُت نونہالانِ پاکستان کے قلب وذہن میں نصب کریں۔ انہیں یقین رکھنا چاہیئے کہ ملّت پاکستانیہ کا جب تک ایک بھی غیور وجیور فرزند باقی ہے۔ ان لوگوں کی عظمت و بزرگی کے ترانے فضائے پاکستان میں نہیں سُنے جائیں گے۔ جنہوں نے تادمِ زیست تحریکِ حصولِ پاکستان کی مخالفت کی تھی۔ ان کا نظریہ سراسر خلافِ اسلام تھا اگر واردھائی فلسفہ کے علمبرداروں کی عزّت وعقیدت پیشِ نظر ہے تو پھر قادیانی نبوّت کی مخالفت آپ کو کیسے زیب دیتی ہے؟ باطل باطل ہے۔ خواہ اس کا لباس ولبادہ اور قدوقامت کیسی ہی کیوں نہ ہو۔ باطل نظریہ حیات لاکھ بھیس بدل کر آئے باطل ہے۔ حق باطل سے کسی قیمت پر مفاہمت نہیں کر سکتا

باطل دوئی پسند ہے حق لاشریک ہے
شرکت میانۂ حق وباطل نہ کر قبول

**لمحہ فکریہ** ہم ملّی غیرت اور تاریخی حقایق کے روشن میناروں کی بلندیوں پر کھڑے ہوکر یہ عرض کرنے میں اپنے کو حق بجانب سمجھتے ہیں۔ کہ جو لوگ مخالفینِ تحریکِ پاکستان کے اسلامی نظریات (خواہ وہ نیشنلسٹ اسلام ہو یا موڈودی اسلام) پاکستان میں عام دیکھنا چاہتے ہیں ان کی عقل وبصیرت اور خلوص ودیانت پر اعتبار واعتماد کرنا مشکل ہے۔ ایسے لوگ جنہوں نے اسلام کے مقدّس نام پر قیام پاکستان کی مخالفت کی اور تاریخ پاکستان ان مخالفین کا شمار صفِ اوّل میں کرتی ہو ان کی سیاسی فراست اور علمی وفکری صلاحیت پر

اعتماد کرنا پاکستان کے ساتھ کہاں کی دوستی ہے؟

آپ کو حق حاصل ہے آپ حکومت پاکستان کے کسی سربراہ سے اختلاف کریں اور اُمورِ سیاست میں اپنی اپروچ کو دُرست خیال کریں لیکن یہ حق آپ کو ملّی اخلاق کہاں تک دیتا ہے کہ حضرت قائداعظمؒ کے صفِ اوّل کے دُشمنوں کو ملّی مسائل کے حل کے لیئے آگے لا لاکر اپنی لاچاری و نااہلیت کا ثبوت فراہم کریں؟ ملّی جرائم ہمیشہ ناقابل معافی قرار دیئے گئے ہیں۔

وُہ مخالفِ تحریک پاکستان جس نے آج تک حضورِ ملّت ایک جُملہ بھی اس اعتراف میں نہ کہا ہو کہ میرا ماضی داغدار ہے۔ میں نے تحریکِ قیامِ پاکستان کی قیادت کی مخالفت کر کے فاش غلطی کی تھی۔ مَیں اپنے کو ملّی عدالت میں بطور مُجرم پیش کرتا ہُوں۔ میری خطائیں معاف کی جائیں۔ آیندہ اگر میرے اقدامات ملّی مفادات کے خلاف ہوں تو میری کسی ایسی بات پر عمل نہ کیا جائے۔ لیکن کیا کیا جائے اقتدار پسندی کا بڑے بڑے با اُصول بے اُصول بنے اور بنتے چلے جا رہے ہیں۔ ان لوگوں نے کوئی ملّی معیار باقی نہ رکھا جو غیرتِ ملّی کا پہلا تقاضا تھا۔ کاش ایسے لوگوں سے سیاسی تعاون کرنے والوں کو حق سے وُہ چشمِ بیدار عطا ہوتی جس سے یہ ان کے دلوں میں مضمر بد ارادوں کو دیکھ سکتے۔ ہاں ایسے حضرات جو اپنے ماضی پر نادم و شرمندہ ہیں۔ ان کے لئے ہمارے دل فرطِ احترام سے لبریز ہیں۔

اپنے دلوں کو ٹٹولیئے۔ ہوس پرستی اور غرض مندی کے ان بتوں کو پاش پاش کیجئے۔ جو آپ کو مخالفینِ تحریکِ قیامِ پاکستان کے آستانوں تک لے گئی۔ تمیز حق و باطل ہر ذی ہوش کا فرض ہے۔ خیال فرمائیے کہ جن لوگوں کا علم و اسلام، عقل و بصیرت اور دینداری اس آڑے اور کٹھن وقت میں فرزندانِ ملّت کے کام نہ آئی جبکہ ان سمجھانے والے اقبالؒ و جناحؒ تھے۔ تو اب ان کی ذہانت و فراست کو قبول کر لینا کہاں کی دانائی ہے۔ جانثارانِ تحریک پاکستان کی قلبی کیفیت اور ایمانی حالت تو یہی ہے۔ اور انشاء اللہ رہے گی۔

زمانہ کہنہ بتاں را ہزار بار آراست
من از حرم نگذشتم کہ پختہ بنیاد است

مہاجرین نے تو گھر ہی اس لئے چھوڑے تھے کہ وطن پرستی خدا کے ساتھ شرک ہے۔ اقبالؒ و جناحؒ کے جانثاروں نے (نیشنلزم) کو انسانیت کے لئے ہلاکت آفریں تصور قرار دیا تھا۔ اگر کچھ لوگ اس دور میں اس حقیقت گوئی پر حیران ہیں تو ان کی خدمت میں یہی عرض کیا جا سکتا ہے کہ

می ندانی عشق و مستی از کجاست؟
ایں شعاعِ آفتاب مصطفےؐ است

## دانائے انسانیت

خدا اس دانائے رازِ انسانیت کے مرقد پر نُورِ توحید کی ضیا پاشیاں کرتا رہے جس نے مسلمانانِ ہند کو وار دھائی فلسفہ کے گمراہ کُن نظریات سے محفوظ ہی نہیں کیا بلکہ ایک ٹھوس نظریہ حیات قرآنِ عزیز کی روشنی میں سمجھا کر مسلمانوں کی ملّی انفرادیت کو باقی رکھا۔ اسی کے افکار و تخیلات کا کرشمہ ہے۔ کہ دُنیا کے نقشہ پر ایک ایسی برادری عالمِ وجود میں آئی۔ جس کی اساس و اصل کلمہ توحید ہے۔

یہ رازدارانِ مدّوجزرِ اُمتاں اب عالمگیری مسجد کے سائے میں اپنے فکر کی انجام پذیری دیکھ کر ربّ العالمین کی العالمینی اور حضور اقدس و اعظم کی رحمۃ للعالمینیؐ کے حضور جھک جھک کر ان کے دربار عالیہ میں دُعائیں کر رہا ہے۔ کہ خدایا پاکستان کو ان ارواح خبیثہ سے پاک رکھ جو معرکۂ دین و وطن میں جعفرانِ ایں زماں کی شکل میں ملّت کی دشمن بنیں۔ ایسی ناپاک رُوحیں جن کو دوزخ کی آگ بھی قبول کرنے کے لئے تیار نہیں کہ کہیں وُہ ناپاک نہ ہو جائے۔ حکیم الامتؒ کی زبان میں

یک شرر بر صادق و جعفر نزد
بر سرِ ما مشتِ خاکستر نزد
گفت دوزخ را خس و خاشاک بہ
شعلۂ من زیں دو کافر پاک بہ!

جعفرانِ آں زماں ہوں یا ایں زماں۔ کردار کے لحاظ سے دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ ان دو شخصیتوں سے آتشِ دوزخ بھی اپنے آپ کو پاک دیکھنا چاہتی ہے

عالمانِ زنّار پوش کے کرداران کی برہمو سماجی ذہنیت اور سوراجی اسلام سے فرزندِ ملّت کو یوں آگاہ کرتے ہیں۔ علّامہ فرماتے ہیں :-

دیدۂ آں عالمِ زنّار پوش؟
ایسا عالمِ زنّار پوش کہ

گاہ او را با کلیسا ساز باز — گاہ پیش دیریاں اندر نیاز
دینِ او آئین او سوداگری است — عنتری اندر لباسِ حیدری است

ظاہر او از غمِ دین درد مند
باطنش چوں دیریاں زنّار بند

علّامہؒ لکھتے ہیں کہ ایسی ارواحِ رذیلہ اور ایسے غدّارانِ ملّت ہمیشہ سے ملّت کشی کرتے چلے آئے ہیں :-

جعفر اندر ہر بدن ملّت کُش است — ایں مسلمانے کہن ملّت کُش است!
خند خنداں است و باکس یار نیست — مار اگر خنداں شود جز مار نیست!
ملّتے را ہر کجا غارت گرے است — اصلِ او از صادقے یا جعفرے است

الاماں از رُوحِ جعفر الاماں
الاماں از جعفرانِ ایں زماں!

## ہم ایک جنگ لڑ رہے تھے

یہ کہنا بھی کہ ہم ایک جنگ لڑ رہے تھے۔ اس میں ہمیں شکست ہُوئی اور مسلم لیگ جیت گئی۔ اس جُملہ سے بھی تو صفائی قلب کی غمازی نہیں ہوتی۔ یہ اعتراف تو ایسا ہے۔ گویا دو متحارب قوتیں تھیں جو دو مختلف نظریہ ہائے حیات کے لئے برسرِ پیکار تھیں۔ اس میں ایک فتح یاب ہُوئی دُوسری شکست کھا گئی۔ اس فرمان سے تو یہی مفہوم اخذ کیا جا سکتا ہے کہ حق و باطل میں جنگ تھی۔ معرکہ دین و وطن بپا تھا۔ مسلم لیگ والے جیت گئے۔ اعترافِ حق کا یہ کوئی مستحسن طریقہ نہیں۔

## آزادی

تحریکِ قیامِ پاکستان کے صفِ اوّل کے مخالفین کی عزّت و عظمت اور احترام و عقیدت کے نشان اس مملکت میں گاڑھنے والے جو

مملکت ان کی ہزاروں مخالفتوں کے باوجود وجود میں آئی۔ یہ رُعب جماتے پھرتے ہیں کہ ان کے مداحین نے جنگِ آزادی میں سخت مصائب و آلام کا سامنا کیا ہے۔ ان کی ان لازوال قربانیوں کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ یہ جنگِ آزادی کے "ہیروز" ہیں۔

ہمیں اس اعترافِ حقیقت سے مجالِ انکار نہیں۔ لیکن آزادی کے مفہومات و مطالب اپنے اپنے نظریہ کے مطابق مختلف ہوتے ہیں۔ آزادی کا مفہوم جو ایک مُنکرِ خُدا کے نزدیک ہے وہ ایک مومن کے نزدیک نہیں۔ ابلیس نے بھی اپنے ربّ کے حکم کی خلاف ورزی کی اور اپنی آزادی و عظمت کا اعلان کیا۔ اسی طرح ابوجہل و ابولہب نے بھی خُدا کے آخری رسولؐ کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا۔ اور اپنی کامیابی و کامرانی کے لئے اپنے معبودانِ باطل لات و عزّیٰ سے التجائیں کیں۔

اسی طرح کفر و اسلام۔ حق و باطل میں برسوں جنگ ٹھنی رہی۔ حضورِ اقدس و اعظم۔ سالارِ انسانیتؐ نے سترہ غزّوات لڑے۔ ظاہر ہے کفار کے نزدیک جو مفہومِ آزادی تھا مومنین کے ہاں اس سے مختلف تصوّرِ آزادی تھا مومنین نظامِ باطل سے انسانیت کو آزاد کرانے کے لئے جنگ لڑتے تھے۔ ورگرنہ ان کا مقصد نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی تھا مسلمان کے نزدیک تصوّرِ آزادی کفر کی زنجیروں سے آزاد ہو کر خدا کے دامنِ توحید میں آباد ہونا ہے۔ لیکن کافر اپنے ذہن کے تراشے ہوئے۔ خُداؤں کی بندگی میں حُرّیت و آزادی محسوس کرتا ہے۔ غرضیکہ اسی طرح آج تک معرکۂ کفر و دین بپا ہے۔

نہ ستیزہ گاہ جہاں نئی نہ حریف پنجہ فگن نئے
وُہی فطرت اسدؔ اللّٰہی وُہی مرحبی وہی عنتری

یہی کیفیّت معرکۂ دین و وطن (جنگِ پاکستان) میں تھی۔ فرزندانِ توحید پرچمِ توحید کے نیچے جمع ہو کر اپنے دین (نظامِ حیات) کے مطابق وطن و نسل کے امتیازات ختم کر کے، زندگی بسر کرنا چاہتے تھے۔ وُہ ہندوستان میں ایک خطۂ ارض چاہتے تھے جہاں عملاً اس نظام کو متشکل کیا جا سکے۔ مسلم لیگ کے

خلاف ہندو کانگریس اور اس کے معاونین نیشنلسٹ علماء وطن پرستی کو جزوِ ایمان بناکر ہندوستان کی تقسیم کی مخالفت کر رہے تھے۔ جنگِ آزادی دونوں محاذوں پر لڑی جارہی تھی لیکن مقاصد جدا جدا تھے۔ اسلام کے نزدیک آزادی کا مفہوم قطعاً یہ نہیں کہ کوئی قوم فرنگی سفید فام کی غلامی سے چھڑا کر سیاہ رنگ ہندو کی غلامی میں دے دی جائے۔ اسلام تو پوری انسانیت کو انسانوں کی غلامی سے نجات دلاکر قوانینِ خداوندی کی محکومی سکھاتا ہے۔

جیساکہ بار بار عرض کیا جاچکا ہے۔ گاندھی نے مسلمانانِ ہند کو ہندو اکثریت کا غلام بنانے کے لئے اپنے اس فریب کو جمہوری لباس پہنا رکھا تھا۔ لیکن نظریۂ پاکستان کے حاملین کا یہ دعویٰ تھا کہ مسلمان کا آقا و مولا صرف اس کا خالقِ حقیقی ہے۔ یہ نہیں کہ سفید فام آقا کے بجائے سیاہ فام تبدیل کرلیا جائے۔

ہر جنگِ آزادی کا ایک مفہوم ہوتا ہے۔ صاف ظاہر ہے جو جنگِ آزادی قیامِ اسلام کے لئے لڑی گئی خدا کی نگاہ میں وہی حقیقی جنگِ آزادی تھی۔ لیکن جو جنگِ آزادی وطن کو آزاد کرانے اور وطن کی دیوی کے چرنوں میں بیٹھ کر پوجا پاٹ کی تصویریں اُتروانے کے لئے لڑی گئی اس کا مفہوم اسلام کے تصوّرِ آزادی سے قطعاً مختلف تھا۔

ہمیں اُن علمائے کرام کا احترام ہے۔ جنہوں نے دین کے قیام کے لئے مختلف اوقات میں مختلف تحریکات اُٹھائیں۔ ان کا مقصد یقیناً اسلام کی سرفرازی و سربلندی تھا۔ لیکن جو جدّوجہد کفر کی تقویت کا ساماں بنی اور جس کا مقصد متحدہ قومیّت کا جواز اور نظریۂ وطنیت کی تائید تھا۔ ایسی جنگِ آزادی کے ہیروز ان کی صف میں کھڑے نہیں کئے جا سکتے۔ جنہوں نے دین و ملت کی سرفرازی اور عظمت و شوکت کے لئے جنگ لڑی۔ کیونکہ ہر جنگِ آزادی کے سپاہیوں کے تصوّرِ آزادی اور مطلب و مقصد اور مفہوم و معنی میں بنیادی فرق ہے۔ اس لئے کفر نوازوں کو اسلام شناسوں کے روبرو کیسے لایا جا سکے۔ ہمیں معاف کیجیے۔ جس طرح روس میں زارِ روس کے بُت نصب نہیں کئے

جا سکتے اور چین میں سرمایہ دارانہ نظریات پھیلانے کی اجازت نہیں اور امریکہ میں کمیونزم کے اثرات پھیلانے والوں پر کڑی نگاہ رکھی جاتی ہے۔ عین اسی طرح اگر پاکستان کے اربابِ اختیار و اقتدار گاندھوی فلسفہ کے پرستاروں اور نادمِ زندگی نظریہ پاکستان کی شدید مخالفت کرنے والوں کو پاکستان میں عزّت و عظمت کا مقام نہ دیں تو یہ انصاف و عقل کے خلاف نہیں ہے۔

مکّہ کا ابوجہل ہو اور اس کے حواری
ہندوستان کا گاندھی ہو اور اس کے حواری

جو مکّہ میں حضورِ اقدس و اعظم کے خلاف صف آرا ہوئے اور جو معرکہ دین و وطن میں قائداعظم کے خلاف برسرِ پیکار رہے نہ ابوجہل کے ساتھیوں کو وہ مقامِ بلند دیا گیا جو حضور کے رفقا کو حاصل ہوا اور نہ ہی گاندھی کے باطل فلسفہ کے حامیوں کو پاکستان میں وہ عزّت و احترام ملنا چاہیئے۔ جو نظریہ پاکستان کے حامیوں کو۔ جو معرکہ دین و وطن میں فرزندانِ توحید کے خلاف صف آرا ہوئے۔ وہ ملّتِ اسلامیہ کے "ہیروز" نہیں ہیں۔

جس طرح قرآن حق و باطل کے درمیان خطِ امتیاز کھینچتا ہے۔ اُسی طرح یہ ان قوتوں۔ ان طاقتوں اور ان قائدوں کے فرق و اختلاف کو بھی واضح کرتا ہے۔ جو معرکہ حق و باطل میں ایک دُوسرے کے خلاف صف آرا ہوتے ہیں۔

یورپ کے تراشے ہوئے سب سے بڑے خُدا وطن کی پُوجا کرنے والے نیشنلسٹ اور خُدائے محمّد الرّسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے دین کے قیام کے لئے جدّ و جہد کرنے والے توحید پرستوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے گو وطن پرست وطن کی آزادی کے لئے مرنے والے کو شہید بھی کہتے ہیں لیکن اسلام کی میزان میں شہادت کا درجہ و رُتبہ اُس کے لئے ہے جو صرف قیامِ اسلام اور حفاظتِ اسلام کے لئے جان دے کیونکہ

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن
نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی

اسلام کا سپاہی جہاں گیری کی ہوس سے پاک ہوتا ہے۔ اس کے نزدیک جنگِ آزادی سے مُراد نوعِ انسان کو انسانوں کی غلامی سے نجات دلانا وطن و نسل کی زنجیروں اور حسب و نسب کے اغلال و سلاسل سے آزاد کرا کر خُدا کے حضور جُھکانا ہوتا ہے۔ اس کا مقصد ایک ایسے معاشرہ کی تشکیل ہوتا ہے کہ

کردہ ام اندر مقاماتش نگاہ
لاسلاطین لا کلیسا لا الٰہ

یہ خُدا کے بندوں کو قوانینِ خُداوندی کا پابند بنانے کے لئے جنگ لڑتا ہے۔ اس میں انسانیت کی بھلائی مقصود ہوتی ہے۔ اس طرح انسانیت احکامِ الٰہی کی پابند ہو کر ہزار سجدوں سے نجات حاصل کر لیتی ہے۔ اب یہ حقیقت سامنے آ گئی کہ گاندھی کی اقتداء میں نمازِ سیاست ادا کرنے والوں نے جو جنگِ آزادی لڑی وہ ان اسلام کے سپاہیوں سے قطعاً مختلف تھی جنہوں نے قیامِ دین کے لئے جنگ پاکستان لڑی۔

## مسلمان کے نزدیک آزادی کا مفہوم

رسُول اللہ نے نظریۂ حیات کے اختلاف پر قریش کے خلاف علمِ جہاد بلند کیا۔ پھر آپ نے ایران، عراق۔ شام و فارس کی آزاد قوموں کو خطوط لکھے کہ وُہ اسلام قبول کریں یا لڑائی کے لئے تیار ہو جائیں تو کیا حضورؐ کا مقصد ان کو محکوم بنانا تھا۔ ہرگز نہیں ایسا کرنا تو تذلیلِ انسانیت کی علامت ہوتا۔ نہیں حضورؐ انسانوں کو انسانوں کی غلامی سے آزاد کرانے کے لئے مبعوث ہُوئے تھے۔ اسلام کا تصوّرِ آزادی تو یہ ہے کہ اگر ایک سفید فام انگریز ہمارے ہاں آ کر قوانینِ خداوندی کے مطابق نظامِ مملکت قائم کر دے تو قرآن کے نقطۂ نظر سے یہ عین انسانی آزادی ہو گی۔ اور اگر ہم میں سے ہی ہونے والا حاکم قوانینِ خُداوندی کی بجائے انسانوں کے وضع کردہ قانونِ حیات کے مطابق حکمرانی کرے تو اسلامی نقطہ نظر سے یہ مسلمانوں کی آزادی نہیں غلامی ہو گی۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ نیشنلسٹ علماء نے جنگِ آزادی

میں قید و بند کے مصائب برداشت کیے۔ یہ ممکن ہے کہ انہوں نے اپنے تصورِ آزادی کے لئے ایسا کیا ہو لیکن ایک مسلمان کے نزدیک آزادی کا مفہوم قطعاً یہ نہیں۔

یہ تو صاف ظاہر ہے کہ اگر آزادی سے مُراد کسی قوم کی آزادی ہوتا۔ تو حضورؐ اپنی ہی آزاد قوم کے خلاف کیوں جنگ آرا ہوتے۔ اس سے یہ حقیقت صاف طور پر نکھر کر سامنے آجاتی ہے کہ اسلام نے مسلمان کو آزادی کا جو مفہوم دیا ہے۔ اس سے مُراد انسانوں کی غلامی سے نجات اور قوانین خداوندی کا اتباع ہے۔

آخر میں ایک بات عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ چونکہ مملکتِ پاکستان ایک نظریاتی مملکت ہے اور یہ اسلام کے نام پر معرضِ وجُود میں آئی ہے اور یہ ظاہر ہے کہ یہ اسلام کا حصار اور دین کے قیام کی تجربہ گاہ ہے اس لئے اس مملکت کے چپّہ چپّہ کی حفاظت کے لئے شہادت گہ الفت میں قدم رکھنے والے دین کی میزان میں یقیناً شہید قرار پائیں گے۔ "نظریۂ پاکستان" میں صرف نظریۂ ہی پیش کرنے کا خیال تھا لیکن یہ محض اس لئے لکھنا پڑا کہ پاکستان میں مخالفینِ تحریکِ قیامِ پاکستان کے لئے بعض حلقوں میں عزّت و عقیدت کے جذبات بھڑکنے سُلگنے لگ جاتے ہیں۔ یہ لوگ زبان و قلم سے نوخیز نسل کے ذہنوں اور دلوں کو مسموم کرنے کی جسارتیں کرتے ہیں اس لئے اس کی ذرا کھل کر وضاحت کر دی تاکہ حق قبول کرنے والے طبائع اصل حقیقت کو پالیں۔ نیشنلزم کے ضمن میں معرکۂ دین و وطن کی قدرے تفصیل سے عکاسی کر دی۔ اس کتاب کے پچھلے صفحات میں مفکّرینِ مغرب کی آرا بھی پیش کی ہیں۔ جن سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اب یورپ کے انسانیت دوست محقّقین بھی نیشنلزم کے انسانیت سوز نظریۂ کے متعلق کیا رائے رکھتے ہیں۔ اس موضوع (نیشنلزم) کا اختتام بھی حکیم الامّتؒ کے اس فرمان پر کیا جاتا ہے:۔

ان تازہ خُداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وُہ مذہب کا کفن ہے

## دسواں باب

# ملوکیت اور جمہوریت

ملوکیت (MONARCHY) جس کی تین قسمیں ہیں:-

(الف) استبداد (DESPOTISM) جس میں رعایا کو غلام تصور کیا جاتا ہے۔

(ب) تاج سے وفاداری (ROYAL MONARCHY) جس میں بادشاہ، قوانین وضوابط کی رُو سے حکومت کرتا ہے۔

(ج) قہرمانیت (TYRANNY) جس میں حکومت بادشاہ کی مفاد پرستیوں کے لیئے ہوتی ہے۔ اس میں افراد کے ارادے اور خواہشات، ان کی انفرادیت اور تشخص سب بادشاہ کی آرزوؤں۔ اُمنگوں۔ مقصدوں اور تمنّاؤں۔ خواہشوں اور ضرورتوں کے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہیں۔ اس میں رعایا (افراد) زندہ اس لئے رہتے ہیں کہ بادشاہ کو زندہ رکھا جائے۔ اس میں لوگ خُون پسینہ اس لئے بہاتے ہیں۔ کہ بادشاہ کی ضرورتوں کو پُورا کیا جائے۔ اس نظام میں علم ودانش اور فکرونظر بادشاہ کی خواہشوں کے غلام ہوتے ہیں۔ بادشاہ کی حرص وہوس کی تکمیل ان لوگوں کا مقصدِ حیات ہوتا ہے۔ یہ بادشاہ کی راتوں کو ستاروں اور مہتابوں سے روشن کرنے کے لیئے اپنی زندگی کی تاریک راتوں کو تاریک تر بنا لیتے ہیں۔ اور بادشاہ کے ایّامِ حیات کو سنوارنے اور نکھارنے کے لئے اپنی رگِ حیات کا سُرخ خُون صرف کرتے ہیں۔ یہی قہرمانی استبدادی ظالمانہ نظام ہے۔ جو مختلف روپوں میں آج تک نادار وناچار۔ کمزور وضعیف اور سادہ و مجبور انسانوں کو مختلف لبادوں میں فریب دیئے پھرتا ہے۔ اور انسانیت کو کسی فضا میں کوئی گوشۂ عافیت میسّر نہیں آتا۔ ہر رنگ میں زیردستوں کی وہی کم نصیبی اور بالادستوں کی وہی فریب کاری۔ قوت وسرمایہ کی کرشمہ سازیوں سے مسحور ومرعوب انسان زندگی کی حقیقی لطافتوں سے محروم ہوچکا

ہے۔ اور ہر طرف سے یہ صدائے دردناک اور یہ فغانِ جگر سوز کانوں میں آ رہی ہے کہ

کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ
دُنیا ہے تری منتظرِ روزِ مکافات

آج بھی "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" کا اصول دُنیائے آدمیت میں کار فرما دکار کُشا ہے۔ لبادے بیسیوں تبدیل کئے گئے۔ لیکن استبدادی رُوح وُہی ہے۔

ہمارے ہاں، ملوکیت سے مُراد موروثی بادشاہت لی جاتی ہے۔ یعنی باپ کے بعد بیٹے کا تخت نشین ہونا۔ یہی وجہ ہے کہ مروّجہ تاریخ پر اعتماد کرنے والے یہ کہتے ہیں کہ حضرت معاویہؓ نے اپنے بیٹے کو ولی عہد مقرر کر کے ملوکیت کا آغاز کیا۔ دُنیا کے عالمِ تصوّر کے مطابق بھی، ایک فرد کی حکومت کو پہلے ملوکیت یا شخصی اقتدار (MONARCHY OR AUTOCRACY) کہتے تھے۔ لیکن نظامِ حکومت جمہوری ہو یا شخصی، اگر اس کی اساس خُدا کی کتاب نہیں۔ اسلام کی میزان میں ملوکیت ہے۔ اس کے برعکس جس نظام کی بنیاد، ضابطۂ خُداوندی پر ہے۔ وہ عین اسلام ہے۔ اسے خلافت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

خلافت بر مقامِ ما گواہی است
حرام است آنچہ بر ما پادشاہی است
ملوکیت ہمہ مکر است و نیرنگ
خلافت حفظِ ناموسِ الٰہی است

یہی شخصی اقتدار (فردِ واحد) کی حکومت جسے آج کل آمریت (DICTATORSHIP) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس میں بھی وُہی قہرمانیت ہے۔ جو بادشاہت اور دورِ ملوکیت میں تھی۔ آج بھی وُہی آثارِ ملوکیت ہیں۔ جنہوں نے انسانوں کے سروں میں سودائے سروری پیدا کر رکھا ہے۔ کہ

انہیں دُوسرے انسانوں پر حکومت کرنے کا پیدائشی حق ہے۔ جلالِ پادشاہی ہو یا جمہوری تماشا دونوں ظلم و ستم اور جور و استبداد کے مظہر ہیں۔ قوت کا وُہی سحرِ قدیم ہے۔ جو ہر زمانہ کے لباس فریب میں انسانیت کو دھوکہ دینے کے لئے مختلف انداز میں جلوہ گر ہے۔ اقبالؒ ملوکیت و اشتراکیت کو یزداں ناشناس، آدم فریب کہتے ہیں۔

ہر دو را جاں ناصبور و ناشکیب
ہر دو یزداں ناشناس آدم فریب

ان حق ناشناس نظاموں میں علم و حکمت سے کیا کیا کام لئے جاتے ہیں۔

یہ علم، یہ حکمت، یہ تدبّر، یہ حکومت!
پیتے ہیں لہو، دیتے ہیں تعلیمِ مساوات!

آج بھی:۔

خلقِ خُدا کی گھات میں رند و فقیہ و میر و پیر
تیرے جہاں میں ہے وُہی گردشِ صبح و شام ابھی!
تیرے امیر مال مست، تیرے فقیر حال مست
بندہ ہے کُوچہ گرد ابھی خواجہ بلند بام ابھی!

ہمارے دَور کے عظیم مفکّرِ قرآن نے عُمر بھر کے غور و فکر کے بعد اس حقیقت کو کس قدر واشگاف الفاظ میں پیش کیا ہے۔ اور اس کشتۂ سلطانی، ملائی و پیری کے سامنے زوالِ آدمیّت کی نشاندہی کر کے رکھ دی۔ حکیم الامّتؒ فرماتے ہیں:۔

غالباں غرق اند در عیش و طرب
کارِ مغلوباں شمارِ روز و شب
چار مرگ اندر پئے ایں دیر میر
سُود خوار و والی و مُلّا و پیر

وُہ قوّت جو انسانوں کو اپنا غلام و مطیع رکھنا چاہتی ہے۔ اُس کے کے نام کتنے ہی مختلف کیوں نہ رکھ لیئے جائیں اس میں رُوح ایک ہی کارفرما

ہے - یہ قوّت انسان کی آئینہ ضمیری کو ختم کرکے رکھ دیتی ہے۔ فسادِ آدمیّت کے دراصل یہی تین دائرے ہیں - ملوکیت، مذہبی پیشوائیت، اور سرمایہ داری - یہ ہر ایک قوّت دُوسری قوّت کا سہارا بنتی ہے - اور انہی قوتوں کے ہاتھوں آئینۂ انسانیت دھندلا ہو جاتا ہے -

باقی نہ رہی تیری وُہ آئینہ ضمیری
اَے کشتۂ سلطانی و ملائی و پیری

لیکن اقبالؒ اس سارے طوفانِ بلا میں انسانیت کو گھری دیکھتے ہیں - ان کی چشمِ حقیقت بین جو بادشاہت، ملوکیت، جمہوریت اور آمریت میں رُوحِ استبداد و ناانصافی ہی کی کارفرمائی دیکھ کر (کیونکہ ان تمام نظامہائے حیات کا بنیادی مرکز اور اُصولی محور انسانوں کی انسانوں پر حکومت ہے) وُہ یُوں گویا ہوتے ہیں :-

کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے
پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اُٹھا دو

## شیخانِ حرم ہوں یا پیرانِ کلیسا

THEORY OF DIVINE RIGHTS
انسان کی ابتدائی زندگی میں پروہتوں (PRIESTS) کو بہت بلند مقام حاصل تھا - وہ ما فوق الفطرت قوتوں کے حامل اور دیوتاؤں کی اولاد یا اُن کے نائب تصوّر کیے جاتے تھے - ہر شخص ان سے ڈرتا اور کانپتا تھا اور ان کے حکم کی خلاف ورزی کا تصوّر بھی نہیں کر سکتا تھا - رفتہ رفتہ پروہتوں کے انہی اختیارات نے اجتماعی شکل اختیار کر لی، اور اور یہ سمجھ لیا گیا کہ انہیں دیگر انسانوں پر حکومت کا حق حاصل ہے - یہ تھی الوہیاتی اختیارات کے تصوّر کی ابتدا - عیسائیت نے اس تصوّر سے بڑا فائدہ اُٹھایا اور پادریوں نے نمایندگانِ خُداوندی کی حیثیت سے باضابطہ حکومت شروع کر دی - بادشاہوں نے دیکھا کہ لوگوں سے اطاعت کرانے کا یہ طریق بہت آسان اور کامیاب ہے - اس لئے کہ اس میں جسموں کے بجائے دلوں پر فرمانروائی ہوتی ہے - جس کے لئے نہ فوج کی ضرورت پڑتی ہے نہ پولیس کی - چنانچہ اُنہوں نے

نیابتِ خداوندی کا دعویٰ کر دیا اور رفتہ رفتہ یہ تسلیم کرا لیا کہ بادشاہ زمین پر خدا کا سایہ "ظل اللہ" اور "ایشور کا اوتار" ہوتا ہے۔ خدائی اختیارات کا یہ تصور ان بتانِ آذری کی زمینی خدائی کی مملکت کے استحکام کا موجب بن گیا مسلمانوں کے زوال پذیر دور سے لے کر آج تک پیرانِ حرم نے بھی باہمی سمجھوتہ سے سادہ لوح مسلمانوں کے دل و دماغ پر حکومت ہے۔ حالانکہ اسلام میں

حکمراں ہے اک وُہی باقی بتانِ آذری (اقبالؒ)

پاپائیت (ملّائی و پیری) بھی اک رازِ ملوکانہ ہے۔ اس طریق سے مذہبی اجارہ داروں نے اپنی برتری و بالائی کو برقرار رکھا۔ پیرانِ کلیسا ہوں یا شیخانِ حرم دونوں نے انسانوں کے جذباتِ عقیدت کو اپنی ہوس پرستیوں اور کامرانیوں کے لیئے استعمال کیا۔ میرے نزدیک بادشاہت، پاپائیت، آمریت حتیٰ کہ جمہوریت یہ سب ملوکیت کے مختلف نام ہیں۔ اس لیئے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ ملوکیت و آمریت کی ان صورتوں کو اس قدر بے نقاب کروں کہ ملوکیت و بادشاہت کے تصورِ پارینہ سے لے کر معصومانِ یورپ کے عطا کردہ تازہ تصورات تک نمایاں ہو کر آپ کے سامنے آجائیں۔ جو لوگ ہوسِ اقتدار پرستی اور زر اندوزی کو ہزار پردوں میں چھپا کر "خدمتِ انسانیت" کا نعرہ لگا کر آدمیت کا فلاحی گھر تعمیر کرنے کے لیئے بیچارے اپنے خونِ جگر کو صرف کر رہے ہیں آپ پردۂ تہذیب میں غارتگری اور آدم کشی کے اس مذموم پروگرام کے پھندوں میں گرفتار نہ ہو جائیں۔ ان حسین و دلکش پردوں کو چاک کرنا اپنا فرض خیال کرتا ہوں کیونکہ ملوکیت ہو یا جمہوریت اس میں ایک فرد اور لمٹیڈ کمپنی دونوں کا مقصد سلب و نہب ہوتا ہے۔ ان میں انسانی محکومی کا بنیادی تصور ایک ہی ہے۔ ایک حکمراں ہو یا حکمرانوں کی ٹولی کاروبارِ سلطنت میں رُوح ایک ہی کارفرما ہوتی ہے۔ مسولینی اپنے مشرقی اور مغربی حریفوں سے مخاطب ہو کر یوں کہتا ہے۔

کیا زمانے سے نرالا ہے مسولینی کا جُرم؟
بے محل بگڑا ہے معصومانِ یورپ کا مزاج
مَیں پھٹکتا ہُوں تو چھلنی کو بُرا لگتا ہے کیوں
ہیں سبھی تہذیب کے اوزار! تو چھلنی میں چھاج!

دیکھئے یہ تصورِ ملوکیت کو کس طرح بے نقاب کرتا ہے۔

میرے سودائے ملوکیت کو ٹھکراتے ہو تم — تم نے کیا توڑے نہیں کمزور قوموں کے زجاج؟

یہ عجائب شعبدے کس کی ملوکیت کے ہیں — راجدھانی ہے، مگر باقی نہ راجہ ہے نہ راج

آل سیزر چوب نَے کی آبیاری میں رہے

اور تم دُنیا کے بنجر بھی نہ چھوڑو بے خراج!

تہذیب کے دعویدارو:-

تم نے لوٹے بے نوا صحرا نشینوں کے خیام

تم نے لوٹی کشتِ دہقاں! تم نے لوٹے تخت و تاج!

مجھے ظالم کہنے والو سُنو:-

پردۂ تہذیب میں غارت گری آدم کُشی

کل روا رکھی تھی تم نے، مَیں روا رکھتا ہوں آج

لیکن فطرت آشنا، قرآن فہم، اقبالؒ موروثی بادشاہت (انسانوں کو حاکم اور محکوم کے طبقات میں تقسیم کرنے والوں کو تقدیر کی گہرائیوں کا راز یُوں سمجھاتا ہے کہ:-

فطرت کو گوارا نہیں سلطانیٔ جاوید

ہر چند کہ یہ شعبدہ بازی ہے دل آویز

فرنگی کرشمہ سازوں نے جب دیکھا کہ آدم اب ذرا خود شناس و خُود نگر ہو گیا ہے۔ اب اس کے لئے یہ گوارا کرنا ممکن نہیں کہ کسی موروثی بادشاہت، یا قہرمانی آمریت کا محکوم و غلام بننا پسند کرے تو اُنہوں نے (اس) فریب کو جمہوری قبا پہنا دی۔ اور نظامِ جمہوریت کو آیۂ رحمت اور انسانیت سازی کا ضامن قرار دیا۔ یہ ایک نہایت باریک چال تھی اس طرح جمہوری قبا میں دیوِ استبداد ناچنے لگا۔ رُوحِ سلطانی کو برقرار رکھنے کی یہ نہایت فریب کارانہ اسکیم تھی لہٰذا جن غریبوں کے مقدّر میں ازل سے انسانوں کے سامنے سجدہ ریز ہونا تھا یہ زیرو بیست۔ زار و زبوں حال فاقہ مست انسان اس ابلیست کا شکار ہو گئے۔ اس طرح جمہور کے ابلیسوں نے اپنے

اغراض و مقاصد کی تکمیل کے لئے ان کو اپنا آلۂ کار بنایا اور یہ اپنی کامرانیوں کی اس چال میں کامیاب ہو گئے اور اس طریق سے اُنھوں نے اپنے مخصوص مفادات کو محفوظ کر لیا۔ اس طرح مفاد پرستوں کے مخصوص گروہ نے زمامِ اقتدار اپنے ہاتھ میں لی اور عوام کی رگِ حیات کا خُون ان کے اغراض کی موٹروں میں پٹرول بن کر جلتا رہا۔ اب آپ جمہوریت کی مختلف شکلوں کو دیکھئے!

---

## گیارہواں باب

# جمہوریت

**۱۔ قبائلی حکومت** مملکت کے ابتدائی تصوّرات یہ ہیں۔ کہ ابتدائی دَور میں منتشر انسانوں نے سوچا کہ انہیں مل جل کر رہنا چاہیئے۔ چونکہ انسان مدنی الطبع واقع ہُوا ہے۔ لہٰذا انہوں نے قبائلی زندگی اختیار کی۔ اس طریق سے خاندان کا مورث اعلیٰ قبیلہ کا بزرگ واجب الاحترام سمجھا جاتا تھا۔ آپس کے تنازعات و معاملات میں اس کے فیصلے سب کے لیئے موجبِ اطاعت تصوّر کیئے جاتے تھے۔ اس طرزِ حکومت کو قبائلی حکومت کہا جاتا تھا۔

**۲۔ مادری حکومت** (MATRIARCHAL) بعض قبائل مرد کی جگہ سب سے بزرگ عورت کو یہ بلند ترین مقام دیتے تھے۔ اس کے فیصلے واجب الاتباع تھے۔ یہ بھی خاندانی مملکت کا تصوّر تھا۔

**۳۔ نظریۂ قوت** کسی قوم یا قبیلہ میں جو شخص جسمانی طور پر سب سے زیادہ طاقتور ہوتا وُہ دُوسروں کو دبا کر اپنی فرمانروائی قائم کر لیتا۔ غور سے دیکھا جائے تو آج بھی قوت کے اسلوب و انداز اور ذرائع و اسباب بدلے ہیں۔ اُصول آجتک یہی رہا ہے کہ "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" یہی اُصول پانچ ہزار سال پہلے تھا۔ یہی اب۔ جہاں یہ کہا جاتا ہے کہ ہمارے ہاں یہ اُصول نہیں وہاں دھوکہ دینے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس کا نام ذہنی استیلا (تغلب) ہے۔ جسے برخالٹ (POWER - THOUGHT) کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے۔

**۴۔ نظریۂ میثاق** (THEORY OF CONTRACT) یعنی یہ نظریہ کہ

مختلف افراد باہمی رضامندی سے یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ ہم سب مل کر ایک اجتماعی نظام قائم کریں۔ افراد کے یہ فرائض و واجبات ہوں گے اور یہ مملکت کے۔ یہ نظریۂ یونانِ قدیم کے وقت سے چلا آرہا تھا لیکن اٹھارہویں صدی میں یورپ میں ہابز (HOBBES) لاک (LOCKE) اور روسو (ROUSSEAU) نے خاص طور پر فروغ دیا۔ موجودہ ڈیماکریسی کی بنیاد اسی نظریہ پر ہے "لوگوں کی حکومت باہمی رضامندی سے"۔

**جمہوریت** (DEMOCRACY) عوام کی حکومت۔
جمہوری اندازِ حکومت کی بھی بہت سی قسمیں ہیں۔ مثلاً:۔

۱۔ وحدانی (UNITARY) جس میں تمام مملکت ایک وحدت تصوّر کی جاتی ہے۔

۲۔ وفاقی (FEDERAL) جس میں مملکت کی مختلف وحدتیں (UNITS) اپنے اپنے ہاں خود مختار ہوتی ہیں لیکن سب کا مرکز ایک ہوتا ہے۔ اور اقتدار اعلیٰ (SOVEREIGNTY) مرکز ہی کو حاصل ہوتا ہے۔ پھر ان سے ہر اسلوبِ حکومت یا تو پارلیمانی ہوگا یا غیر پارلیمانی۔

پارلیمانی اندازِ حکومت میں ہیئت اجرائیہ (EXECUTIVE) لیجسلیچر کے ماتحت نہیں ہوتی۔ بلکہ ایک مدّتِ معیّنہ کے لئے (جس کا تعلق دستورِ مملکت کی رُو سے ہوتا ہے) قائم رہتی ہے۔ انہی میں سے ایک انداز صدارتی حکومت (PRESIDENTIAL FORM OF GOVERNMENT) کا ہے۔ جس میں ایک مدّت معیّنہ کے لئے صدرِ حکومت کو تمام اختیارات تفویض کر دئے جاتے ہیں اور لیجسلیچر کا اس پر کوئی اقتدار نہیں ہوتا۔

عصرِ حاضر میں، جمہوری اندازِ حکومت کے برعکس، آمرانہ حکومتیں بھی قائم ہونے لگی ہیں۔ اس اسلوبِ حکومت کو آمریت یا ڈکٹیٹر شپ کہتے ہیں۔ ان دونوں میں آمر ایک فرد کی حیثیت و صورت میں حکمرانی کرتا ہے۔ اور جمہوریت میں افراد کا ایک مخصوص گروہ۔ رُوح ایک ہی جلوہ گر ہے۔ انسانوں پر انسانوں کی حکومت۔

## جمہوری اندازِ حکومت

جمہوری اندازِ حکومت وُہ نظام ہے۔ جس تک یورپ مدّت العمر کے تجارب کے بعد پہنچا ہے۔ اس نظام کو آیۂ رحمت، اس کے مویدین کو حق و صداقت کے شاہد اور انسانیت کی فلاح و بہبود کے علمبردار، اور اس کی مخالفت کرنے والوں کو مُجرِمِ انسانیت، اور دشمنِ خُدا سمجھا جاتا ہے۔ اس کو انسانی ذہن کے سامنے کچھ اس طریق سے پیش کیا جاتا ہے۔ گویا اس اندازِ حکومت کو آسمانی سند حاصل ہے۔

اب ہمیں تو دیکھنا یہ ہے کہ فی الواقع یہ نظامِ حکومت انسانی مسائلِ حیات کا صحیح حل اور اس کے درد کا درماں ہے یا نہیں۔

ڈیماکریسی کی بنیاد حسب ذیل معروضات پر ہوتی ہے :۔

۱۔ کہا یہ جاتا ہے کہ اس میں تمیزِ بندہ و آقا مٹ جاتی ہے اور یہ فسادِ آدمیت ختم ہو جاتا ہے۔ اس میں حاکم و محکوم کا تصوّر باقی نہیں رہتا۔ اس میں "عوام کی حکومت، عوام کے مفاد کی خاطر، عوام کی وساطت سے" کا اُصول کارفرما ہوتا ہے۔

۲۔ عوام کا منشا۔ ان کے نمایندگان کے ذریعے معلوم ہو سکتا ہے۔

۳۔ کسی چیز کے صحیح اور غلط ہونے کا معیار ان نمایندگان کی کثرت رائے پر ہوتا ہے۔

۴۔ اقلیت کو اکثریت کے فیصلے تسلیم کرنے پڑتے ہیں۔

اب آپ دیکھئے جن مفکّرینِ مغرب کی نگاہ اس طرزِ حکومت کے عیوب و نقائص تک پہنچی ہے۔ وُہ جمہوریت کے متعلق کیا رائے رکھتے ہیں۔

کچھ عرصہ ہُوا لندن یونیورسٹی کے پروفیسر (ALFRED COBBAN) نے (THE CRISIS OF CIVILISATION) کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی۔ وُہ اس میں موجُودہ تہذیبِ مغرب کے زوال پر بحث کرتا ہوا لکھتا ہے

## الفریڈ کوبن کی تنقید

کہ مغرب کی تباہی کا ایک بڑا سبب ان کا اندازِ جمہوریت ہے۔ چنانچہ وُہ اس ضمن میں کہتا ہے :۔

"ہم اپنی دلیل کو دو فقروں میں سمیٹ دیتے ہیں۔ ڈیماکریسی کا اُصول یہ بتایا جاتا ہے۔ کہ اس میں اقتدارِ اعلیٰ عوام کو حاصل ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ عمومی منشاء (GENERAL WILL) اپنا مستقل وجُود رکھتا ہے۔ اس نظریہ کو صحیح تسلیم کرنے کا منطقی نتیجہ آمریت ہے۔ تاریخ شروع سے آخر تک یہی بتاتی ہے۔"

پروفیسر کوبن کا مطلب یہ ہے کہ اگر یہ تسلیم کیا جائے کہ عمومی منشاء اپنا الگ وجُود رکھتا ہے۔ تو پھر اس عمومی منشاء کا مظہر، کثرت آراء ہی کیوں قرار دیا جائے؟ اگر عوام کسی ایک شخص پر اعتماد کر لیں تو اس "فردِ واحد" کو اس عمومی منشاء کا ذریعۂ تعبیر کیوں نہ مان لیا جائے۔ پروفیسر مذکور کا دعویٰ یہ ہے کہ تاریخ ہمیں بتاتی ہے۔ کہ عمومی منشاء کا نظریہ آخرالامر، ڈکٹیٹر شپ پر منتج ہوتا ہے۔

اس کے بعد پروفیسر کوبن لکھتا ہے:-

"اقتدارِ اعلیٰ لفظی طور پر بڑا بلند آہنگ تصوّر ہے لیکن اس کا مفہوم صرف اسی صورت میں سمجھ میں آسکتا ہے۔ جب ہم یہ دیکھیں کہ روزمرّہ کی زبان میں اس کا مطلب کیا ہے۔ "اقتدارِ اعلیٰ" سے مفہوم "اختیاراتِ مطلقہ" ہے۔ یعنی بلا حدود وقیود حکومت، خواہ ایسی حکومت ایک فرد کی ہو یا ایک جماعت کی۔ اس لئے "اقتدارِ اعلیٰ" کے نظریہ کو محض ایک نظری سوال سمجھ کر نظر انداز نہیں کر دینا چاہیئے۔ آج اس مفروضہ کو حقیقت ثابتہ تسلیم کر لیا جاتا ہے کہ قوم کو "اقتدارِ اعلیٰ"، حاصل ہے۔ اور اس کے بعد بحث صرف اس مسئلہ کے متعلق رہ جاتی ہے کہ اختیارات کسی فردِ واحد کے ہاتھ میں ہونے چاہئیں یا کسی نمایندہ جماعت کے ہاتھ میں۔ لیکن ہمیں غور کرنا چاہیئے۔ کہ "اقتدارِ اعلیٰ" کا تصوّر صحیح بھی ہے؟ یہ ہے اصل مسئلہ۔ یعنی یہ سوال کہ آیا قانون کا سرچشمہ عوام ہی کا منشاء ہے (خواہ اُس کی تعبیر ایک فرد کے ذریعے ہو یا ایک جماعت کے ذریعے) یا اس کے علاوہ کوئی اور سرچشمہ ہے۔
(P. 58)

یعنی پروفیسر کوبن کے نزدیک اصل سوال یہ نہیں کہ قانون کی تدوین کا حق کسی ایک فرد کو ہے یا کسی نمایندہ اسمبلی کو۔ اصل سوال یہ ہے کہ کیا انسانوں کو یہ حق حاصل بھی ہے کہ وہ بلا حدود و قیود قوانین وضع کریں اور جس بات کو خود صحیح سمجھیں اُسے اختیار کرلیں اور جسے غلط سمجھیں اسے رَدّ کریں۔

پروفیسر مذکورہ آگے چل کر لکھتا ہے :۔

"انسانوں کو یہ حق حاصل ہی نہیں۔ تمام قوانین اپنی اصل کے اعتبار سے پہلے سے مدوّن شدہ ہیں۔ انسانوں کو فقط ان قوانین کو نافذ کرنا ہے۔ ان اُصولی قوانین کا سرچشمہ، پروفیسر کوبن کے نزدیک قانونِ فطرت ہے۔"

آپ نے دیکھ لیا کہ پروفیسر کوبن کے نزدیک، وہ بنیاد ہی غلط ہے۔ جس پر ڈیماکریسی کی عمارت استوار ہے۔ انسانوں کو اُصولی قوانین وضع کرنے کا اختیار ہی نہیں۔ اور حق، حق رہتا ہے خواہ اس کی تائید میں ایک ہاتھ بھی نہ اُٹھے اور باطل، باطل ہوتا ہے۔ خواہ اسے سو فیصدی تائید حاصل ہو جائے۔

## دیگر مختلف مدبّرین کے خیالات

نظامِ جمہوریت کے متعلق مشہور اطالوی مدبّر میزینی (MAZZINI) لکھتا ہے کہ :۔

اس میں شبہ نہیں کہ عام رائے دہندگی کا اُصول بہت اچھی چیز ہے۔ یہی وہ قانونی طریق کار ہے جس سے ایک قوم تباہی کے مسلسل خطرات سے محفوظ رہ کر اپنی حکومت آپ قائم رکھ سکتی ہے۔ لیکن ایسی قوم جس میں وحدتِ عقاید نہ ہو جمہوریت اس سے زیادہ اور کیا کر سکتی ہے کہ وہ اکثریت کے مفاد کی نمایندگی کرے اور اقلیّت کو مغلوب رکھے۔ ہم یا تو خدا کے بندے بن سکتے ہیں یا انسان کے۔ وہ ایک انسان ہو (ملوکیت) یا زیادہ (جمہوریت) بات ایک ہی ہے۔ اگر انسانوں کے اُوپر کوئی اقتدارِ اعلیٰ نہ ہو تو پھر کونسی چیز ایسی رہ جاتی ہے اور جو ہمیں طاقتور افراد کے تغلب سے محفوظ رکھ سکے؟ اگر ہمارے پاس کوئی ایسا مقدّس اور ناقابلِ تغیّر

قانون نہ ہو جو انسانوں کا وضع کردہ نہ ہو، تو ہمارے پاس کونسی میزان رہ جاتی ہے۔ جس سے ہم یہ پرکھ سکیں کہ فلاں کام یا فیصلہ عدل پر مبنی ہے یا نہیں۔ خدا کے علاوہ جو بھی حکومت قائم ہو اس میں نتائج کی حقیقت ایک ہی رہتی ہے۔ خواہ اس کا نام بونا پارٹ رکھ لیں یا انقلاب (REVOLUTION) اگر خدا درمیان نہ رہے تو اپنے زمانۂ سطوت میں ہر ایک مستبد بن جائے گا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یاد رکھیے جب تک کوئی حکومت خدا کے قوانین کے مطابق نہیں چلتی، اس کا کوئی حق مسلّم نہیں۔ حکومت تو منشائے خداوندی کی ترویج و تنفیذ کے لئے ہے اگر وہ اپنے اس فریضہ کی سرانجام دہی سے قاصر ہے تو تمہارا یہ حق نہیں بلکہ فریضہ ہے کہ ایسی حکومت کو بدل ڈالو۔

(QUOTED BY GRIFFITH IN - INTERPRETTERS OF MAN P.P. 46-47)

یہ انیسویں صدی میں لکھا گیا تھا اور آج فرانس کا مفکر رینی گون (RENE GUENON) لکھتا ہے:-

## فرانس کا مفکر رینی گون

اگر لفظ جمہوریت (DEMOCRACY) کی تعریف یہ ہے کہ لوگ خود اپنی حکومت آپ قائم کریں۔ تو یہ ایک ایسی چیز کا بیان ہے جس کا وجود ناممکنات سے ہے۔ اور جو کبھی پہلے وجود میں آئی ہے اور نہ آج کہیں موجود ہے۔ ایسا کہنا ہی جمع النقیضین ہے کہ ایک ہی قوم ایک وقت میں حاکم بھی ہو اور محکوم بھی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ حاکم اور محکوم کا تعلق دو الگ عناصر کے وجود کا متقاضی ہے۔ اگر حاکم نہیں تو محکوم بھی نہیں۔ ہماری موجودہ دنیا میں جو لوگ کسی نہ کسی طرح قوت اور اقتدار حاصل کر لیتے ہیں ان کی سب سے بڑی قابلیت یہ ہوتی ہے کہ وہ لوگوں میں یہ عقیدہ قائم کر دیں کہ (ان پر کوئی حاکم نہیں بلکہ) وہ خود اپنے آپ پر حاکم ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ عام رائے دہندگی کا اصول اس فریب دہی کی خاطر وضع کیا گیا ہے (اس اصول کی

رُوسے) سمجھا یہ جاتا ہے کہ قانون اکثریت کی مرضی سے وضع ہوتا ہے اور اس حقیقت کو نظرانداز کر دیا جاتا ہے کہ اکثریت کی یہ مرضی ایک ایسی شئے ہے جسے نہایت آسانی سے ایک خاص رُخ پر بھی لگایا جا سکتا ہے۔ اور بدلا بھی جا سکتا ہے

THE CRISIS OF THE MODERN WORLD)
(P.P. 106)

## ڈین انج (DEAN INGE)

اپنی کتاب (THE FALL OF IDOLS) میں ڈیماکریسی کے خلاف مختلف مفکرین اور مدبرین کے اقوال نقل کرتا ہے۔

ایک اقتباس :-

"آزاد لوگ جنگ کے زیادہ متمنی ہوتے ہیں اور جمہوریتیں، مطلق العنان بادشاہوں سے بھی زیادہ اپنے جذبات کی غلام (MIRABEAW)

ایک اور :-

جمہوریت، فطری طور پر تو اپنے آپ کو مثالی نظام محسوس کر سکتی ہے لیکن عملی طور پر یہ ایک ناممکن نظریہ ہے (IRVING BABBIT)

اور خود انج کے الفاظ ہیں :-

"ایک مکمل جمہوریت بھی اس حد تک جمہوری نہیں بن سکتی جس حد تک نظریۂ جمہوریت اسے جمہوری بناتا ہے" (P. 110)

مینکن (H. J. MENCKEN) اپنی کتاب (TREATISE ON RIGHT AND WRONG) میں لکھتا ہے :-

"تمام ناکامیوں میں سب سے بڑی ناکامی خود انسان کی ہے۔ اس انسان کی جو سب سے زیادہ مدنی الطبع حیوان اور سب سے زیادہ عقلمند ہے۔ اور وہ ناکامی یہ ہے کہ یہ اپنے لئے آج تک کوئی ایسا نظام وضع نہیں کر سکا جسے دُور سے بھی، اچھی حکومت کہا جا سکے۔ اس نے اس باب میں بڑی بڑی کوششیں کی ہیں۔ بہت سی ایسی، جو فی الواقعہ محیر العقول ہیں اور بہت

سی ایسی جو بڑی جرأت آزما تھیں۔ لیکن جب ان کی عملاً تنفیذ کا وقت آیا تو نتیجہ حسرت ویاس کے سوا کچھ نہ تھا اس کا سبب یہ تھا کہ نظری طور پر حکومت اس کے سوا کچھ نہیں کہ یہ افرادِ مملکت کی ضروریات مہیا کرنے کا ذریعہ ہے۔ اور اربابِ حکومت، پبلک کے خدام ہیں۔ لیکن در حقیقت حکومت کا فریضہ پبلک کی خدمت نہیں بلکہ سلب و نہب ہوتا ہے

اس باب میں مختلف اسالیبِ حکومت میں سے زیادہ ناکام، نظام جمہوریت رہا ہے۔ جمہوری نظام کے اربابِ حل و عقد خوب جانتے ہیں کہ حکومت کی بنیاد معقولیت پر ہونی چاہیئے لیکن ان کا جذبہ محرکہ کبھی معقولیت پسند نہیں ہوتا۔ ان کا کام یہ ہوتا ہے کہ جو عنصر بھی باہر سے زیادہ دباؤ ڈال سکے، اس کا ساتھ دیا جائے۔ چنانچہ اس ہتھکنڈے سے، وہ ان لوگوں کے توسط سے جو فی الحقیقت پبلک کے دشمن ہوتے ہیں۔ غیر مختتم عرصہ تک برسر اقتدار رہتے ہیں (P.23)

## اقوامِ متحدہ کی تحقیقاتی کمیٹی

۱۹۴۷ء میں اقوام متحدہ کی ثقافتی مجلس (UNESCO) نے ایک تحقیقاتی کمیٹی اس غرض سے مقرر کی کہ وہ جمہوری اندازِ حکومت کے متعلق سائنٹیفک انداز سے چھان بین کرے۔ اس کمیٹی نے دنیا بھر کے مفکرین و مدبرین سے جمہوریت کے متعلق مقالات حاصل کئے اور انہیں ایک کتابی شکل میں شائع کر دیا۔ اس کا نام ہے (DEMOCRACY IN A WORLD OF TENSION)

اس کمیٹی نے سب سے پہلے یہ سوال پیش کیا تھا کہ جمہوریت (DEMOCRACY) کا مفہوم کیا ہے؟ جوابات کی اکثریت میں اعتراف کیا گیا ہے کہ یہ لفظ بالکل مبہم (AMBIGUOUS) ہے۔ آجتک اس کا مفہوم ہی متعین نہیں ہو سکا۔ چنانچہ اس کے بعد ان مقالہ نگاروں نے اس لفظ کے وہ معنی اور تعبیرات لکھی ہیں (جو مختلف اطراف و جوانب سے آجتک پیش کی جاتی رہی ہیں۔ ان کی حالت یہ ہے کہ ایک تعبیر سے دوسری تعبیر اور ایک مفہوم سے دوسرا مفہوم نہیں ملتا۔ یعنی کثرتِ تعبیر سے جمہوریت کا مفہوم زیادہ الجھ گیا ہے۔ بعض نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ

"دورِ حاضر میں سب سے مہمل لفظ جمہوریت ہے"۔ اس کے بعد یہ سوال سامنے آتا ہے۔ کہ کیا اکثریت کا فیصلہ ہمیشہ درست ہوتا ہے اور اس کے خلاف احتجاج کرنا، جمہوریت کے خلاف ہے؟ اس کے جواب میں کہا گیا ہے کہ "یہ سمجھنا غلط ہے کہ اکثریت کا فیصلہ غلطی سے پاک ہوتا ہے۔ وہ غلط بھی ہو سکتا ہے اس لئے اقلیت کو حق حاصل ہے کہ وہ اکثریت کے فیصلے کے خلاف ایجی ٹیشن کرے اور اکثریت کے سابقہ فیصلے کو بدلوا دے"۔

یہ ہے "جمہوریت" کے متعلق دورِ حاضر کے مفکرین و مدبرین کی فکری کاوشوں کا حاصل۔ حقیقت یہ ہے کہ نظری اعتبار سے یہ کتنا ہی خوش آیند اور جاذبِ نگاہ کیوں نہ ہو، عملاً جمہوری نظام کسی صورت میں "جمہوری" نہیں ہو سکتا۔ اس کی بنیادی غلطی یہ ہے کہ اس میں تصور کر لیا جاتا ہے کہ اس میں حاکم و محکوم کی تمیز مٹ جاتی ہے۔ مثلاً انتخابات کے وقت میں ایک شخص کے حق میں ووٹ دیتا ہوں۔ اس ووٹ سے مقصد کیا ہوتا ہے؟ یہی کہ ان دو یا دو سے زیادہ امیدواروں میں سے (جو انتخاب کے لئے مقابلہ کر رہے ہیں) میرے نزدیک فلاں شخص بہتر ہے۔ میرے اس فیصلے سے نہ تو وہ شخص پوری قوم میں سے بہترین فرد بن سکتا ہے اور نہ ہی اس کا یہ مطلب ہے کہ وہ ہر معاملہ میں میرے منشأ کی تعبیر کر سکتا ہے۔ اسمبلی میں کوئی مسئلہ پیش ہوتا ہے اور وہ اس کے حق میں رائے دیتا ہے۔ اس سے یہ کیسے لازم آ گیا کہ اس نے اس باب میں میری رائے کا اظہار کیا ہے۔ ممکن ہے میری رائے اس کی رائے کے خلاف ہو۔ لہٰذا منتخب شدہ ممبران کے متعلق یہ کہنا کہ ہر مسئلہ میں ان کی رائے، درحقیقت ان لوگوں کی رائے ہے جنہوں نے اس کے حق میں ووٹ دیا تھا، انسانی فکر و آراء کے متعلق بڑی خود فریبی ہے۔ جمہوری نظام کی دوسری خرابی یہ ہے کہ اس میں اقلیت کو اکثریت کا محکوم ہونا پڑتا ہے۔ حالانکہ کسی اصول کے ماتحت یہ درست نہیں کہ کسی جگہ کی اکثریت کو یہ حق دیا جائے کہ وہ جو جی میں آئے کرے۔ اقلیت کو ان کا یہ فیصلہ بہرحال ماننا پڑے گا۔ اور اس فیصلے کو بدلوانے کی آئینی شکل ایک ہی ہو گی اور وہ یہ کہ اقلیت کسی نہ کسی طرح اکثریت میں تبدیل ہو جائے۔ اور تیسری خرابی (جو سب سے بڑی خرابی ہے) یہ ہے کہ اس نظام میں حق و باطل کے لئے کوئی مستقل، خارجی اور مطلق معیار نہیں ہوتا۔ بلکہ حق وہ ہوتا ہے جسے

اکیاون حق کہہ دیں اور باطل وہ جس کی تائید میں صرف انچاس[۴۹] ہاتھ اٹھیں۔ ایسے فیصلوں کی رُو سے سوال یہ نہیں ہوتا کہ (مثلاً) شراب فی ذاتہ اچھی ہے یا بُری۔ اگر ایک مرتبہ (امریکہ کی پارلیمان کی) کثرت رائے سے شراب کی ممانعت کا فیصلہ کر دیا تو وہ ممنوع قرار پا گئی اور اس کا استعمال جُرم۔ اور دُوسری مرتبہ زیادہ ہاتھ اس کی تائید میں اُٹھ گئے تو وہی شراب جو کل تک ہزار خرابیوں کا باعث تھی، آبِ حیات بن گئی۔ اس سے آپ نے اندازہ لگا لیا ہوگا۔ کہ جمہوری نظام میں مستقل اقدار کا تصوّر نہیں رہتا اور چونکہ اخلاقیات کا دارو مدار ہی مستقل اقدار کے تصوّر پر ہے اس لئے سیاست اخلاقیات سے الگ رہتی ہے۔

محولا بالا اقتباسات سے آپ نے اندازہ فرما لیا ہوگا کہ اب مغربی مفکرین و مدبّرین بھی "جمہوریت" کو کس قدر غلط نظامِ حیات سمجھ رہے ہیں۔ اب آپ دیکھیں گے

## جمہوریت اقبالؒ کی نظر میں

کہ علاّمہ اقبالؒ جمہوری نظام کے متعلق کیا رائے رکھتے ہیں۔ یُوں تو آپ نے متعدّد جگہ جمہوریت کے متعلق اپنے نظریہ کی وضاحت کی ہے لیکن ارمغانِ حجاز کی اُردو نظموں میں آپ نے "ابلیس کی مجلس شوریٰ" کے عنوان سے جو نظم لکھی ہے اس میں ملوکیت و جمہوریت کو آپ نے ایک تصویر کے دو رُخ کہہ کر پیش کیا ہے۔ اس میں ابلیس کے مشیروں کی زبان سے جمہوریت کی تعریف و وضاحت کرائی ہے۔ اس نظم میں آپ نے اپنے اس دعوے کو ثابت کیا ہے کہ وہ تمام ادیانِ عالم (نظامہائے حیات) جن کی بُنیاد و اصل انسانی عقل و غرض ہے۔ یہ انسانی ذہن نے مفاداتِ خویش کے تحفّظ کے لئے تراشے ہیں۔ اور ان کی اساس مکروفریب اور خداع و دجل پر ہے۔ اور جمہور کے ابلیس اربابِ سیاست مکروفریب ہی سے سادہ لوح لوگوں کو دھوکہ دے کر اپنے مقاصد پُورے کرتے ہیں۔ ابلیس اپنی مجلسِ مشاورت میں خطبۂ افتتاحیہ یُوں پیش کرتا ہے:۔

مَیں نے دکھلایا فرنگی کو ملوکیت کا خواب
مَیں نے توڑا مسجد و دیر و کلیسا کا فسوں
مَیں نے ناداروں کو سکھلایا سبق تقدیر کا
مَیں نے منعم کو دیا سرمایہ داری کا جنوں!
کون کر سکتا ہے اس کی آتشِ سوزاں کو سرد
جس کے ہنگاموں میں ہو ابلیس کا سوزِ دروں

اس کے بعد ابلیس کا مشیرِ اوّل ملوکیت کے ابلیسی نظام کی محکمیت پر اپنی تعریر کی یوں ابتدا کرتا ہے :۔

اس میں کیا شک ہے کہ محکم ہے یہ ابلیسی نظام
پختہ تر اس سے ہوئے خُوئے غلامی میں عوام
ہے ازل سے ان غریبوں کے مقدر میں سجُود
ان کی فطرتؔ[1] کا تقاضا ہے نمازِ بے قیام

پھر وُہ کہتا ہے کہ ملوکیت کی زنجیروں اور غلامی کے شکنجوں سے رہائی پانے کے لئے اوّل تو غلامی کے خُوگر انسانوں کے دل میں کہیں کوئی آرزُو پیدا ہی نہیں ہوتی اور اگر کہیں پیدا ہوتی بھی ہے تو وُہ مر جاتی ہے۔ اور یا پھر وُہ ایک آرزُوِ خام ہوتی ہے اس لئے حرّیت و آزادی کا یہ جذبۂ خام خوشگوار نتائج پیدا نہیں کر سکتا۔ ایسے خام جذبے کو نمایندگانِ ملوکیت نہایت آسانی سے ختم کر دیتے ہیں۔ کیونکہ ملوکیت، پیشوائیت اور ملائیت کو بھی اپنا ہمنوا بنا لیتی ہے۔ اس طرح شیخانِ حرم، خطیبانِ مساجد اور پیرانِ کلیسیا بادشاہ کو ظل اللہ کہہ کر اس کی اطاعت و غلامی کو ثواب ٹھہراتے ہیں۔ اس طریق سے یہ عوام کو تو بادشاہوں کے غلام بناتے ہیں اور خود ان کی بارگاہوں سے خلعت و انعامات اور اعزازات و خطابات حاصل کرتے ہیں۔ مشیرِ اوّل اپنے خیالات کو یُوں ادا کرتا ہے:۔

آرزُو اوّل تو پیدا ہو نہیں سکتی نہیں
ہو کہیں پیدا تو مر جاتی ہے یا رہتی ہے خام!
یہ ہماری سعیٔ پیہم کی کرامت ہے کہ آج
صُوفی و مُلّا ملوکیت کے بندے ہیں تمام!

یہ اپنی اس کامیابی پر نازاں ہو کر کہتا ہے کہ ہماری سعیٔ پیہم اور کوششِ مسلسل سے پیرانِ حرم اور مُلّائے کرام اس نظامِ باطل (ملوکیت) کے حامی ہیں۔ پہلا مشیر اپنی تقریر ختم کرتا ہے تو دُوسرا مشیر مشیرِ اوّل سے کہتا ہے کہ آپ بڑے اطمینانِ

---

[1] انساں کی کوئی فطرت نہیں ہوتی۔ غلط تصوّراتِ زندگی کی آگ حرّیت و آزادی کے شجرِ حیات کو جھلس کر رکھ دیتی ہے۔

تسلّی سے فرما رہے ہیں۔ کہ ملوکیت کا ابلیسی نظام نہایت مضبوط و محکم تر ہے لیکن جناب والا کو "سلطانیِ جمہور" کے شور و غوغا کے متعلق بھی کچھ علم اور خبر ہے؟ میرے تو ان نعروں سے کان پھٹے جاتے ہیں۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ ہر سینے میں اک صبحِ قیامت نمودار ہے۔ اور محسوس کرتا ہوں کہ یہ غوغائے جمہور ہمارے ابلیسی نظام (ملوکیت) کو بیخ و بنیاد سے اکھاڑ دے گا۔ میرے خیال میں تو یہ تازہ فتنہ نظامِ ملوکیت کو ختم کر کے رکھ دے گا۔

دُوسرا مشیر سوال پُوچھتا ہے:۔

خیر ہے سلطانیِ جمہور کا غوغا کہ شر؟
تو جہاں کے تازہ فتنوں سے نہیں ہے باخبر!

پہلا مشیر اس کی سادہ لوحی۔ ناواقفیت پر تمسخر و استہزا کی خفیف ہنسی ہنستا ہے۔ اور ایک دانائے راز اور جہاں بین کی حیثیت سے اس کے سوال کا اب ان لفظوں میں یوں دیتا ہے۔

ہوں، مگر میری جہاں بینی بتاتی ہے مجھے
جو ملوکیت کا اک پردہ ہو کیا اس سے خطر

مشیرِ اوّل اپنے دُوسرے ساتھی سے کہتا ہے اے میرے بھولے بھالے رفیقِ کار۔ یہ تو ہم نے خود ہی شاہی کو جمہوری لباس پہنایا ہے۔ کیونکہ اب آدم ذرا خود شناس اور خود نگر ہو گیا ہے۔ اب انساں کے لئے یہ گوارا نہیں رہے گا۔ کہ نسلی بعد نسلاً ایک ہی خاندان کو موروثی شہنشاہیت عطا کر رکھے۔ اور خود اس شاہی خاندان کی غلامی پر قانع رہے۔ اس لئے یہ ملوکیت کا لباسِ فریب ہے۔ جس کو جمہوریت کہا جاتا ہے۔ آپ بے فکر رہیں اس نظامِ جمہوریت میں بھی وہی رُوحِ شہریاری کارفرما ہے جو ملوکیت میں۔ یہ تو ہماری عقلِ فریب ساز کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے۔ جس سے ہم نے خود شناس و خود نگر انساں کو حسین فریب دیا ہے۔ آپ کو اس حقیقت کو سمجھ لینا چاہیئے۔ کہ

کاروبارِ شہریاری کی حقیقت اور ہے
یہ وُجودِ میرِ سلطاں، پر نہیں ہے منحصر

پہلا مشیر اپنے رفیقِ کار سے کہتا ہے کہ اس نظامِ جمہوریت میں بھی وہی چھینا جھپٹی اور تغلب واستبداد کی رُوح کارفرما ہے۔ میرے حقیقت ناشناس رفیقِ راہ

مجلسِ ملّت ہو یا پرویز کا دربار ہو
ہے وُہ سلطاں غیر کی کھیتی پہ ہو جس کی نظر

نمایندگانِ جمہور ہوں یا فردِ واحد کی حکمرانی۔ غیر کی محنت کے ثمرات جو اپنے اقتدار و مفادات کے تحفّظ کے لئے وسائل پیداوار مُلک کو اپنی کامرانیوں اور ہوس گیری کے لئے صرف کرتا ہے۔ اس کے ارادوں میں رُوحِ سلطانی برقرار ہے۔ پہلا مشیر دُوسرے سے کہتا ہے۔ کہ تُو نے ابالیسِ جمہور کی قلبی کیفیات کا اندازہ نہیں لگایا ان کے مذموم ارادوں کو نہیں بھانپا۔ تو نے مغرب کے جمہوی نظام کی کارفرمائی نہیں دیکھی؟

تو نے کیا دیکھا نہیں مغرب کا جمہوی نظام
چہرہ روشن، اندرُوں چنگیز سے تاریک تر

اس نظام کی ظاہری چمک دمک اور آب و تاب آنکھوں کو خیرہ کرتی ہے اور اس کے مسحور کُن نعرے فریبِ عقل کا سبب بنتے ہیں۔ اس تہذیبِ نَو کا یہ فرمانِ جدید (جمہوریت) انہی انسانیت کُش جراثیم سے بھرپُور ہے جو شہنشاہیت کے نظام میں پائے جاتے ہیں۔

اب تیسرا مشیر اشتراکیت کے آتشیں سیلاب سے گھبرا کر کہتا ہے۔ خیر آپ کے فرمان کے مطابق جمہوریت میں تو رُوحِ سلطانی باقی ہے اور اسے

## اشتراکیت کا آتشیں سیلاب

اس نظامِ زندگی سے کوئی ضعف نہیں پہنچا لیکن اس یہودی (مارکس) کی شرارت کا آپ کے پاس کیا جواب ہے؟ یہ کلیمِ بے تجلّی یہ مسیحِ بے صلیب اور یہ پیغمبرِ بے جبرئیل، لیکن جس کے پاس ایک ایسا فلسفۂ حیات ہے جو شہنشاہیت و سرمایہ داری کا قلع قمع کر کے رکھ دے گا۔ اس ظالم کے فلسفۂ زندگی نے مشرق و مغرب کے محکوموں میں لہرِ بیداری پیدا کر دی ہے۔ اس نے دیر و کلیسیا کا وہ طلسم

توڑ کر رکھ دیا ہے جو ہمارے ابلیسی نظامِ ملوکیت و جمہوریت کی محکمیت کا معین و مددگار تھا۔ اس انقلابی نے محکوموں کے سینوں میں وہ آتشِ حریت سلگا دی ہے جس کی حرارت سے غلامی کے تمام بندھن اور محکومی کی آہنی زنجیریں پگھل کر رہ گئے ہیں۔ اب تو میرے دوست محکوموں نے اپنے آقاؤں کے فرمانروائی کے خیموں کی طنابیں توڑ کر انہیں قصرِ ملوکیت سے نکل جانے کا الٹی میٹم دے دیا ہے۔ اور بندوں کی طبیعت کا یہ فساد اس قدر بڑھ گیا ہے کہ اب آقاؤں کی خیریت نظر نہیں آتی۔

**چوتھا مشیر** چوتھا مشیر ابلیس مشیرِ سوئم سے کہتا ہے کہ آپ کو معلوم نہیں کہ ہم نے روحتہ الکبریٰ کے ایوانوں میں اس کا توڑ پیدا کر دیا ہے۔ ہم نے آلِ سیزر کو پھر سیزر کا خواب دکھلایا ہے۔ آپ مطمئن رہیئے۔

**تیسرا مشیر** تیسرا مشیر اس معاملہ میں اپنی رائے پیش کرتے ہوئے کہتا ہے کہ میں تو اس یہودی (مارکس) کی عاقبت بینی کا کچھ قائل نہیں ہوں جس نے فرنگی سیاست کے پردوں کو اٹھا کر اسے بے نقاب کر دیا ہے۔ اس ناعاقبت اندیش کو چاہیئے تھا کہ وہ فریب کے ان پردوں کو نہ سرکاتا۔

**پانچواں مشیر** اب پانچواں مشیر بصد ادب و احترام ابلیس کو مخاطب کر کے مستفسرانہ لہجے میں عرض گزار ہوتا ہے۔ اے میرے مرشدِ اوّلین و آخریں۔ آپ سے بڑھ کر تو فطرتِ آدم کا وہ بھی محرم نہیں ہے۔ جو سادہ لوح بندوں میں پروردگار کے نام سے مشہور ہے۔

اے میرے آقا اور میرے استادِ ازل یہ ٹھیک ہے کہ ساحرانِ فرنگ اور اربابِ سیاست آپ کے مرید ہیں لیکن اب مجھے ان کی ہشیاری و چالاکی، مکاری و عیاری اور فریب سازی پر اعتماد و بھروسہ نہیں رہا۔ مجھے تو اس یہودی فتنہ گر کے ہاتھوں ہر قبائے زر اور ہر ردائے کلیسیا تار تار ہوتی نظر آتی ہے۔ اب زیر و بالا۔ پست و بلند اور ادنیٰ و اعلیٰ میں کوئی تمیز و فرق نہیں رہا۔ اب شاہی اور گدائی کی تمیز مٹ رہی ہے۔ اس کی انقلابی جدّ و جہد سے ملوکیت۔

مذہبی پیشوائیت اور نظامِ سرمایہ داری کی ان زنجیروں کے ٹکڑے ہو رہے ہیں۔ جن میں ہم آج تک مخلوقِ خدا کو جکڑے ہوئے تھے میرے آقا

مجھ کو تو یہ دُنیا نظر آتی ہے دگرگوں
معلوم نہیں دیکھتی ہے تری نظر کیا؟

میرے مُرشد ہر سینے میں اک صُبحِ قیامت نمودار ہے۔ یہ جہانِ افرنگ۔ یہ سفید آقاؤں کی فرمانروائی اور ساحرانِ فرنگ کی طلسم ریزیاں اب ختم ہونے کو ہیں۔ اس فتنۂ فردا سے مجھے کوہسار و مرغزار لرزتے اور نظامِ ابلیسی کے قصرِ حکومت کے در و دیوار کانپتے نظر آرہے ہیں۔ پانچواں مشیر آخر میں اپنی حتمی رائے پیش کرتا ہے کہ میرے واجب الاحترام آقا! وہ مملکتِ شیطانی جس میں آپ کا نظامِ ابلیست کارفرما تھا۔ جس میں آپ کی قیادت و سیادت کا سکّہ رواں دواں تھا اس کے در و بام پر خوفِ اشتراکیت کا لرزہ طاری ہے اور ان کو تہ و بالا ہوتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔

**ابلیس** ابلیس اپنے مشیروں کا اعتماد و یقین یوں متزلزل ہوتا دیکھ کر اور ان میں اضطراب و اضطرار کے اثرات پا کر ان کے گرے ہوئے حوصلے بلند کرنے کے لئے ایک معرکۃ الآرا خطاب میں کہتا ہے۔

آپ کو معلوم ہے کہ اس جہانِ رنگ و بُو میں میرا کتنا تصرّف ہے۔ آپ کو مایوس و بے دل نہیں ہونا چاہیئے۔ آپ مجھ پر پہلے کی طرح اعتماد و یقین رکھے آپ دیکھیں گے کہ مَیں اپنی تدبیر سے کس طرح اس یہودی فتنہ گر کے پیچھے اماماِن سیاست۔ شیخانِ حرم اور پیرانِ کلیسیا کو یہ کہہ کر لگا دُوں گا۔ کہ یہ منکرِ خُدا ہے۔ تم مجھے کیا سمجھتے ہو۔ مَیں سرمایہ داری کے اس دشمن کے خلاف اقوامِ یورپ کو بھڑکاؤں گا۔ دُنیائے شرق و غرب یہ تماشا دیکھے گی۔ کہ میرے اشاروں پر مارکسزم کی کس قدر مخالفت ہوتی ہے۔ اور جو نادان نظامِ ملوکیت و جمہوریت کو کارگاہ شیشہ سمجھتا ہے وہ میری ابلیسی تہذیب کے ان جام و سبو کو توڑ کر تو دیکھے۔ مَیں اس کا کیا حشر کرتا ہوں۔ آپ کیا سمجھتے ہیں کہ جن گریبانوں کو مری ابلیسی قوت نے چاک چاک کیا ہے مزدکی

منطق انہیں رفو کر سکتی ہے؟ ہرگز نہیں۔ یہ پریشاں روزگار، آشفتہ مغز، آشفتہ مُو اشتراکی کوچہ گرد میرے ابلیسی نظام (ملوکیت و جمہوریت) کی محکمیّت کو کوئی گزند نہیں پہنچا سکتے۔ لیکن میرے صاحبو! میرے رفیقانِ کار۔ میرے ہم قدموں۔ میری منزل کے ساتھیو۔ مجھے اور میرے ابلیسی نظام کو اگر کوئی خطرہ درپیش ہے تو ملّتِ اسلامیہ سے ہے جس میں اب تک بھی شرارِ زندگی باقی ہے۔ افرادِ اُمّت کا سینہ اب بھی زندہ آرزوؤں، تابندہ اُمیدوں بےتاب جذبوں اور پُرجوش ولولوں سے لبریز ہے۔ اس میں خال خال اب بھی ہیں جو محمّد عربی صلّی اللہ علیہ وسلّم کے لائے ہوئے نظامِ حیات پر دل و جان سے یقین رکھتے ہیں اور اسے نافذ دیکھنے کے لئے اشکِ سحرگاہی کے ساتھ خُدا کے حضور عجز والحاح سے سرِ عبودیت جُھکا کر دُعائیں مانگتے ہیں۔

اب بھی اس غفلت زدہ، اور خوابیدہ اُمّت میں۔ جس میں عشق کی آگ بُجھی ہوئی ہے اور یہ مسلمان راکھ کا ڈھیر نظر آتا ہے۔ اس کی خاکستر میں وہ کُفر سوز شرارے باقی ہیں جو میرے خرمنِ باطل کو جلا کر بھسم کر دیں گے۔ یہ کل ہی کی تو بات ہے کہ اقبالؒ نے نظریۂ پاکستان پیش کر کے ان میں احساسِ زیاں پیدا کر دیا ہے اور مشاقّترینِ اقبالؒ قرآنی نظام کے نفاذ کے لئے دُنیا سے انسانیت کو ہموار اور مسلمانوں کے ذہنوں اور دماغوں (قلوب واذہان) کی نشو و نما کر رہے ہیں۔ اس میں اب تک ایسے صاحبانِ یقین موجود ہیں۔ جن کا ایمان یہ ہے کہ :-

دینِ خُداوندی تمام ادیانِ عالم (نظامہائے حیات) پر غالب آکر رہے گا۔ منکرینِ حق سر پیٹ لیں ایسا ہو کر رہے گا۔

اَے میرے ساتھیو! مجھے اگر کوئی فکر دامن گیر ہے تو یہ کہ لاکے بعد الاضروری ہے۔ جو بھی صاحبِ فکر مزاجِ روزگار سے واقف اور زمانے کے تقاضوں سے آشنا ہے۔ وُہ جانتا ہے کہ یہ مزدکیت فتنۂ فردا نہیں اسلام ہے۔ ان میں اقبالؒ جیسا قُرآن شناس۔ اسلام فہم مفکّر پیدا ہو چکا ہے۔ جس نے انہیں یہ رازِ حقیقت واشگاف الفاظ میں سمجھا دیا ہے کہ اگر بالشیوزم

میں خلاؑ کا تصور شامل کر دیا جائے۔ تو یہ عین اسلام ہو جاتا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اب یہ اُمّتِ حاملِ قرآن نہیں رہی اور ابھی سرمایہ پرستی اس بندۂ مومن کا دین ہے۔ یہ بھی جانتا ہوں کہ مشرق ابھی طلسمِ فرنگ کی تاریکیوں میں گھرا ہوا ہے۔ لیکن عصرِ رواں کے اُبھرتے تقاضاؤں سے مجھے خوف ہے کہ ان پر کہیں شرعِ پیغمبر آشکارا نہ ہو جائے۔ اس کے بعد میری کوئی ابلیسی چال کارگر نہیں ہو گی۔ میں تو مرا جا رہا ہوں۔ اقبالؒ نظریاتی اور علمی سطح تک تو انہیں منزلِ حیات تک لے ہی آیا ہے اور عمل کے لئے "نظریۂ پاکستان" ایسا فلسفۂ حیات دے دیا ہے کہ چاروں طرف ملّتِ اسلامیہ میں یہ نظریاتی پھیلاؤ بڑھ رہا ہے۔ اور اقبالؒ کے ہمنوا پیدا ہو رہے ہیں۔

اسی ضمن میں حکیم الامتؒ کا ایک خط جو ماسٹر محمد عبداللہ چغتائی کے نام ہے۔ اس کا اندراج ضروری سمجھتا ہوں۔ جو اس ذہنی انقلاب کی تائید کرتا ہے:۔

"دنیائے اسلام میں ایک ذہنی انقلاب کے آثار پیدا ہیں۔ مگر یہ قومیں ابھی تک اپنی سیاسی اور اقتصادی مشکلات میں اُلجھی ہوئی ہیں۔ ان مشکلات کے خاتمے پر ذہنی انقلاب کا آغاز یقینی ہے اور اس وقت تک اُمید ہے کہ ایسے آدمی پیدا ہو جائیں گے۔ جو اس انقلاب کی صحیح راہنمائی کر سکیں گے۔" مکاتیبِ اقبالؒ حصّہ دوئم صفحہ ۳۴۸
مرتّبہ شیخ عطاءاللہ صاحب

چشمِ تقاضا دیکھ رہی ہے۔ کہ اب اقبالؒ کے ہم عناں پیدا ہو رہے ہیں۔ مسلمانوں میں نظامِ خداوندی کے چرچے عام ہیں۔ اور ابلیسی نظام دم توڑ رہا ہے۔ کیونکہ دینِ الحق (قرآن عزیز) ہی وہ حقیقی نظامِ زندگی ہے جو

موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لئے
نے کوئی فغفور و خاقاں، نے فقیرِ رہ نشیں

---

لہ اس کی تشریح کتاب کے کسی اور مقام پر آپ کو ملے گی۔ (مؤلف)

کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک صاف
منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں

ابلیس کو خوف تو یہ ہے کہ اقبالؒ کی ساحرآرائی اور آیندہ نگاری سے مسلمان کے سامنے الارض للّٰہ الحکم للّٰہ کا تصورِ قرآنی پھر سے اُبھر کر آگیا ہے۔

اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب
بادشاہوں کی نہیں اللہ کی ہے یہ زمیں

یوں ابلیس اس کشمکش حق و باطل اور چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی کی اس ستیزہ کاری سے لرزاں و ترساں ہے۔ لیکن باطل کے ٹمٹماتے چراغ کی طرح جس کا تیل ختم ہو گیا ہو اور بجھنے کو ہو اپنے ساتھیوں کو مایوسی کے دریا سے نکال لینے کے لئے ان کی کشتیِ یاس کو مکر و فریب کے چپّو لگاتا ہے۔ انہیں دلاسا دیتا ہے۔ کہ اس عالم میں بھی ہمیں گھبرانا نہیں چاہیئے۔ کیونکہ باطل ہمیشہ حق سے ستیزہ کار رہے گا۔ ہمیں اپنے حوصلوں کو بلند رکھنا چاہیئے۔ ہیں مسلمانوں کی اس ذہنی بیداری سے زیادہ ہراساں نہیں ہُوں۔ ہمیں کوشش کرنی چاہیئے۔ کہ چشمِ عالم سے نظریۂ پاکستان پوشیدہ رہے

چشمِ عالم سے رہے پوشیدہ یہ آئین تو خوب
یہ غنیمت ہے کہ خود مومن ہے محرومِ یقین

یہ تو ہمارے لئے غنیمت ہے کہ خود مسلمان نظریۂ پاکستان سے ناآشنا ہیں۔ اے میرے مشیرو! اس اُمّت کی اکثریت اس نظامِ قرآنی کے قیام سے محرومِ یقین ہے۔ اور کچھ اسلامی نظام کے قیام کے دعویدار اسلامی نظام اور نظامِ اسلام کی آڑ میں میرے ہی نظامِ سرمایہ داری کی تائید و حمایت کر رہے ہیں۔ آپ نے دیکھا نہیں کہ یہ افرادِ ملّت کو علم و عمل کی غلط سمتوں کی طرف کس طرح لیے جا رہے ہیں۔ میرے رفیقو! کیا یہ بہتر نہیں کہ مسلمان کو روایات کا غلام بنا دیا جائے اور جو انہیں حق و باطل میں امتیاز و فرق کی تلقین کرے۔ اُسے منکرِ روایات کہہ کر بدنام کیا جائے۔ کیا یہ بہتر نہیں کہ اس خُدا اندیش

کی زندگی کی تاریک رات روشن نہ ہو۔ کتاب اللہ کی ایسی ایسی تاویلات میں اُسے اُلجھایا جائے کہ یہ سرمایہ دارانہ نظام کو عین اسلام سمجھے اور قرآن کے نظامِ ربوبیت کو سُنّتِ رسولؐ کے خلاف کہے۔ ابلیس اپنے مشیروں سے کہتا ہے کہ اگر اسے تفسیرات و تاویلات اور روایات و خرافات کی تاریکیوں میں گم کردیا جائے اسے دُور از کار مسائل میں اُلجھا دیا جائے اور زندگی کے لئے مجدّدیت، مہدویت اور مسیحیت کے تصوّر پر ان کے ایمان کو پختہ تر کردیا جائے تو یہ عقیدوں کے متعلق مناظرے اور مذاکرے تو کرتا رہے گا۔ لیکن عمل سے فارغ ہوکر انتظارِ مہدی و عیسےٰ میں گوشوں۔ زاویوں اور حجروں میں بیٹھا ہُوا دُوسروں کو بھی بے عمل بنا دے گا۔ کیا اس کے علاوہ الٰہیات کے ترشے ہُوئے لات و منات اس کے لئے کافی نہیں ہیں؟ یہ لفظی موشگافیوں کے لئے دن رات ایک کرے گا۔ میرے مشیرو! بتلاؤ کیا یہ اسکیم۔ یہ پروگرام ہمارے نظامِ ابلیسی کی بقا کا ضامن نہیں ہے۔ بس میرا آخری حکم یہ ہے کہ

تم اسے بیگانہ رکھو عالمِ کردار سے
تا بساطِ زندگی میں اس کے سب مہرے ہوں مات

اور یاد رکھو:۔

خیر اسی میں ہے قیامت تک رہے مومن غلام
چھوڑ کر اوروں کی خاطر یہ جہانِ بے ثبات

لیکن خیال رکھنا کہیں اقبالؒ کے اشعار[1] جو جوئے حیات کی طرح مُردہ دلوں کو سیراب کرتے چلے جاتے ہیں۔ اس کی نظروں کے سامنے نہ آجائیں۔ کیونکہ

ہے وُہی شعر و تصوّف اس کے حق میں خُوب تر
جو چُھپا دے اس کی آنکھوں سے تماشائے حیات

بس سَو بات کی ایک بات:۔

---

[1] اگر اچھی بات شعر میں کہی جائے تو اسلام اس کا مخالف نہیں اور اگر لچّر اور پوچ بات نثر میں کہی جائے تو بُری ہے۔ قرآن جس چیز کو شاعری کہتا ہے وُہ وُہ لغویات اور بیہودہ گوئی ہے جس سے اخلاق بگڑتے اور انسانی ذات کی نشوونما رُکتی ہے۔ (مؤلف)

مست رکھو ذکر و فکرِ صبحگاہی میں اسے
پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے

آپ نے دیکھ لیا کہ اقبالؒ ملوکیت، جمہوریت وغیرہ سب کو ابلیسی نظام قرار دیتا ہے۔ اس کے نزدیک صرف حق دین الحق۔ انسانیت کی شگفتگی کے لئے آدمیّت کی نشوو نما کے لئے حقیقی نظام صرف الاسلام ہے۔ نظامِ جمہوریت کی فریب کاریوں کا پردہ علامہؒ نے کئی مقامات پر چاک کیا ہے۔ میں یہاں چند اشعار پر ہی اکتفا کروں گا۔

ابلیس خُدا کے دربار میں عرض گزار ہوتا ہے کہ آپ نے تو مجھے آگ سے ایک ابلیس بنا کر دُنیا میں بھیجا تھا۔ میں نے خاک سے کئی ہزار ابلیس بنا دئے ہیں۔ اب کُرّہ ارض پر آخر میری کیا ضرورت ہے۔

جمہور کے ابلیس ہیں اربابِ سیاست
باقی نہیں اب میری ضرورت تہِ افلاک!

میرے خُدا:۔

تیری حریف ہے یارب سیاستِ افرنگ
مگر ہیں اس کے پُجاری فقط امیر و رئیس
بنایا ایک ہی ابلیس آگ سے تو نے!
بنائے خاک سے اس نے دو صد ہزار ابلیس

دُوسرے مقام پر:۔

جمہوریت اک طرزِ حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

اور:۔

گریز از طرزِ جمہوری غلامِ پختہ کارے شو
کہ از مغزِ دو صد خر فکرِ انسانی نمے آید

یہ اشعار آپ کی نظروں سے گزرے ہونگے۔ میرے نزدیک جس طرح سوشلزم کی اصطلاح مغرب نے ہمیں دی ہے۔ اور یہ ایک نظامِ حیات ہے۔ اسی طرح

"جمہوریت" کا نظام بھی مغرب کا تراشیدہ ہے۔ جب (بقول مودودی صاحب) اسلامی کے اضافے سے (اسلامی سوشلزم) سوشلزم کو مسلمان نہیں کیا جا سکتا۔ اسی لفظ اسلامی کے اضافے سے جمہوریت (اسلامی جمہوریت) کو کیسے مسلمان بنایا جا سکتا ہے؟ اقبالؒ کی فراستِ ایمانی نے اس عظیم فتنہ کو بھانپا اور ببانگ دہل مسلمانوں کو للکار کر کہا کہ اس مقدس فریب میں مت آؤ:-

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیوِ استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے کہ آزادی کی ہے نیلم پری؟

اقبالؒ کے نزدیک نظام جمہوری ہو یا شخصی، جس نظام کی اساس و اصل قرآنِ عزیز نہیں وہ نظام باطل ہے۔ لکھنے کو تو اس باب میں بہت کچھ مزید لکھا جا سکتا ہے۔ لیکن اس خیال سے کہ محولہ بالا سطور سے بات پوری طرح نکھر کر وضاحت سے سامنے آگئی ہے مزید لکھنا ضروری نہیں سمجھتا۔ لہٰذا اب جمہوریت کا ذکر ختم کیا جاتا ہے۔ سوشلزم کا موضوع شروع ہوتا ہے۔ آپ نے دیکھ لیا جمہوریت کا نعرہ بھی غیر از نوائے قیصری اور کچھ نہیں ؂

## بارہواں باب

# سوشلزم

سوشلزم (CAPITALISM) نظامِ سرمایہ داری کے خلاف برسرِ پیکار ایک نظامِ حیات ہے۔ جو اپنی متشدّد شکل میں، کمیونزم بن جاتا ہے یہ عقلِ محض کی ایک مخلصانہ پہنچ ہے۔ یہ انسانی معیشت کا مسئلہ حل کرنے کی ایک انسانی کوشش ہے۔ یہ ایک تہذیب ناتمام ہے جو سرمایہ دار اور مزدور کی باہمی کشمکش اور کشیدگی کو مٹانے کے لئے اُبھری۔

اس نظام کے علمبردار اپنے پہلو میں دلِ دردآگیں اور اپنے سینے میں مزدور و مقہور کا درد و غم رکھتے تھے۔ ان کی ہمدردیاں مزدوروں اور کسانوں۔ غریبوں اور قلاشوں کے ساتھ تھیں۔ اُنہوں نے یہ معاشی نظام (ECONOMIC SYSTEM) ایک مکمّل فلسفۂ حیات کے ساتھ ان مجبور و مقہور انسانوں کے سامنے پیش کیا جو ہوسِ سرمایہ اندوزی کے آلۂ کار بنے ہوئے تھے۔ اس نظام کے داعیوں نے ایک سیاسی اور ذہنی تاریخ مرتب کی۔ اس لئے اس نظام کو ایک تاریخی قوت کہا جا سکتا ہے۔ جس کا انسانی تاریخ کی معاشی کش مکش اور طبقاتی تصادمات و نزاعات میں بہت بڑا دخل ہے۔ اس نظام کی اصل و بنیاد عداوت اور اس میں جذبۂ محرکہ نفرت تھا۔ اس لئے اس ضابطۂ زندگی کو بھی مجبور و مقہور اور مزدور اور کسان کے مصائب اور مسائلِ انسانی کا حل قرار نہیں دیا جا سکتا۔ تفصیل آپ کو کمیونزم (اشتراکیت) کے موضوع میں ملے گی۔ سوشلزم کے متعلق اقبالؒ کی رائے ملاحظہ فرمائیں:۔

### آلِ احمد سرور کے نام ایک خط

آلِ احمد سرور کے نام ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"میرے نزدیک فاشزم، کمیونزم، یا زمانۂ حال کے اور ازم کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ میرے عقیدے کی رُو سے صرف اسلام ہی ایک حقیقت ہے جو بنی نوع انسان کے لئے ہر نقطہ نگاہ سے موجبِ نجات ہوسکتی ہے میرے کلام پر ناقدانہ نظر ڈالنے سے پہلے حقائق اسلامیہ کا مطالعہ ضروری ہے اگر آپ پُورے غور اور توجّہ سے یہ مطالعہ کریں تو ممکن ہے کہ آپ انہیں نتائج تک پہنچیں، جن تک مَیں پہنچا ہوں۔"

(مکاتیب اقبالؒ حصّہ دوئم ۱۲ر مارچ ۱۹۳۷ء)

دُوسرا خط:۔

## خواجہ غلام السیّدین کے نام

یہ خط خواجہ غلام السیّدین ڈائریکٹر آف پبلک انسٹرکشنز جموّں وکشمیر سابق پرنسپل ٹریننگ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے نام لکھتے ہیں۔ جس میں رقمطراز ہیں:۔

"سوشلزم کے معترف ہر جگہ رُوحانیات کے مذہب کے مخالف ہیں اور اس کو افیون تصوّر کرتے ہیں۔ لفظ افیون اس ضمن میں سب سے پہلے کارل مارکس نے استعمال کیا تھا، میں مسلمان ہوں اور انشاء اللہ مسلمان مروں گا۔ میرے نزدیک تاریخِ انسانی کی مادی تعبیر سراسر غلط ہے۔ رُوحانیت کا میں قائل ہوں مگر رُوحانیت کے قرآنی مفہوم کا جس کی تشریح میں نے ان تحریروں میں جا بجا کی ہے۔ اور سب سے بڑھ کر اس فارسی مثنوی میں جو عنقریب آپ کو ملے گی۔ جو رُوحانیت میرے نزدیک مغضب ہے۔ یعنی افیونی خواص رکھتی ہے اس کی تردید مَیں نے جا بجا کی ہے۔ باقی رہا سوشلزم، سو اسلام خود ایک قسم کا سوشلزم ہے۔ جس سے مسلمان سوسائٹی نے آج تک بہت کم فائدہ اُٹھایا ہے۔ والسّلام۔"

مکاتیب اقبالؒ حصّہ اوّل
(مرتبہ شیخ عطا اللہ ایم۔اے۔ صفحہ ۳۱۸ و ۳۱۹)

مَیں اس مقام پر ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری سمجھتا ہوں۔ اقبالؒ نے

"سوا اسلام خود ایک قسم کا سوشلزم" لکھا ہے۔ اسی طرح ایک دوسری جگہ کہا ہے۔ کہ اگر بالشیوزم (اشتراکیت) میں خدا کے تصوّر کو شامل کر لیا جائے تو یہ عین اسلام ہو جاتا ہے۔ میرے خیال میں مسٹر بروہی کا اقبالؒ و قرآن کا مطالعہ اتنا نہیں اور نہ ہی ان کی نگاہ میں اس قدر گہرائی ہے کہ وہ اس لطیف و باریک نقطۂ فکر کو سمجھ سکتے۔ وہ حکیم الامتؒ کے ان جملوں کی حقیقی روح کو سمجھنے میں پوری طرح قاصر رہے ہیں۔ اور اقبالؒ کا صحیح مفہوم اخذ کرنے میں ناکام۔ علامہؒ کا نقطۂ نگاہ کیا ہے۔ اسے بیدار آنکھیں، جن میں حجازی نورِ بصیرت ہو۔ وہی دیکھ سکتی ہیں۔ آپ بھی قرآنی فراست سے مفکّرِ قرآن کے اس نکتۂ باریک کو سمجھنے کی سعی فرمائیں۔

## اشتراکیت + خدا

سے آپ کی مراد یہ ہے کہ اگر سوشلزم یا کمیونزم کے "معاشی نظام" کو قرآن کے فلسفۂ حیات کے تابع کر دیا جائے تو یہ عین اسلام ہو جاتا ہے۔ جن لوگوں کے نزدیک خدا کا تصوّر یہ ہے کہ ایک ہستی جس کی پوجا و پرستش کی جائے وہ حضرت علامہؒ کا مقصد سمجھنے سے یقیناً قاصر رہے ہیں۔ اور رہیں گے۔ ہاں جو یہ یقین رکھتے ہیں کہ یہاں آپ کی مراد خدا کا عطا کردہ نظامِ زندگی ہے تو ظاہر ہے۔ کہ جہاں تک سوشلزم اور اشتراکیت کے معاشی نظام کا تعلق ہے یہ قرآن کے معاشی نظام سے ہم آہنگ ہے۔ اس بالشیوزم کے معاشی نظام کو دینِ خداوندی کے ماتحت لا کر نافذ کر دیا جائے تو یہ عین درست ہے۔ جن اصحاب نے حکیم الامتؒ کے فرمودات کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ آپ تصوّرِ ملکیت کے مخالف اور تصوّرِ امانت کے حامی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے نزدیک مزدکیت فتنۂ فردا نہیں، دینِ خداوندی کے ماتحت آ جانے سے "اسلام" بن جاتی ہے۔ مسٹر بروہی نے اپنے زعم میں اس نکتہ آفرینی سے مودودی صاحب کے مسلک کو تقویت پہنچانے اور نوخیز نسل کے ذہن میں سرمایہ داری کا تخم کاشت کرنے کی سعی لاحاصل کی ہے۔ ان کی اس بے علمی کے اظہار نے ان کی ذہانت و فطانت کے متعلق بھی فہمیدہ لوگوں کے دل و دماغ سے وہ خیال نکال دیا۔ جو اس سے قبل تھا۔ کیونکہ مودودی صاحب

دیگر اہم مسائل زندگی کی طرح مسئلہ ملکیت پر بھی سینکڑوں قلابازیاں کھا چکے ہیں (کبھی مسئلہ ملکیتِ زمین لکھا، اور کبھی یہ نعرہ لگایا کہ دولت سمٹ سمٹا کر چند گھرانوں میں جمع ہو چکی ہے) یہی ذہنیت ان کے متأثرین کی ہے اس لئے ہم بروہی صاحب کو قابلِ معافی سمجھتے ہیں اس میں ان کا قصور کیا ہے؟ مودودی صاحب کے نزدیک جو جمہوریت کبھی اسلام کے لئے زہر تھی۔ آج تریاق بنی ہوئی ہے۔ کیا عرض کیا جائے اب تو اپنی بے اصولیوں کو چھپانے کے لئے ان کا دستِ گستاخ حضورؐ کے رفقاء (والذین معہ) کے دامنِ عظمت کو تار تار کرنے سے بھی نہیں رکا۔ انہوں نے نہایت مکاری سے سادہ لوح مسلمانوں کو اس فریب میں مبتلا کرنے کی سعیٔ ناپاک کی ہے۔ کہ دیکھو میری دینی قلابازیوں اور ہوسِ اقتدار کے لئے بے اصولیوں ہی کو نہ دیکھو (قلم اجازت نہیں دیتا مجبوراً لکھ رہا ہوں) مجھ سے زیادہ ہوس میں اندھے اور بے اصول تو حضورؐ کے تربیت دادہ تھے۔ ... ... ... (نعوذ باللہ)

مَیں اُن سے زیادہ بے اصول تو نہیں ہوں۔ جن لوگوں کے متعلق خدائے بزرگ و برتر نے مہر تصدیق ثبت کی ہے کہ میں ان سے خوش ہو گیا ہوں اور وہ مجھ سے۔ مودودی اس مہر تصدیق کو اپنے دستِ گستاخ سے توڑتے ہیں۔

قارئین کرام! اندازہ فرمائیے کہ اگر خدا نا انصافوں سے بھی خوش ہو سکتا ہے اور حضور اقدس و اعظم ختم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کے تربیت دادہ چار آدمی بھی آدمیت اور عدل و انصاف کی میزان میں پورے نہیں اترتے تو کیا قصرِ اسلام کی کوئی دیوار بھی باقی رہ سکتی ہے؟ ایک ایسا رسولؐ جو چار آدمیوں کی ذہنیت بھی ٹھکانے سے نہ کر سکا ہو وہ ختم المرسلین اور رحمۃ للعالمین ہو سکتا ہے؟ اس مقام پر مودودی کی اسلام ناشناسی اور ہوسِ اقتدار کی یہ بدترین مثال پیش کرنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ جن کے امام و امیر اور پیر و مرشد کی یہ کیفیت ہو۔ وہ اقبالؒ کے نورِ بصیرت سے کس طرح ضیائے شعور حاصل کر سکتے ہیں۔ یہاں ایک بات اور بھی عرض کرنا ہے کہ (بتانِ عجم) کے یہ پجاری جو دشمنانِ اسلام کی پھیلائی ہوئی روایات کو سینے سے لگائے پھرتے ہیں۔ کیا ان کا یہ دعویٰ قرآن کریم کی روشنی میں سراسر باطل نہیں کہ شاگردانِ رسولؐ آپس میں لڑتے ہیں۔ جبکہ

فرمانِ خداوندی یہ ہے کہ محمد الرسول اللہ والذین معہ (اور ان کے رفقا) آپس میں رحیم اور کفار کے لئے سخت گیر تھے۔ لیکن ان اوندھے دماغوں اور ٹیڑھی کھوپریوں کا کیا علاج کیا جائے جو قرآن کے واضح۔ بین اور روشن و اٹل فیصلوں کے باوجود بھی اپنے تحفظ کے لیے صحابہ کرامؓ کی شان میں اس قدر گستاخ ہو گئے ہیں کہ اب شرم و حیا بھی ایسے "مفکران اسلام" سے منہ چھپائے پھر رہی ہے۔ محولا بالا سطور میں نے مودودی کی ذہنی کیفیت کو بے نقاب کرنے کے لئے لکھی ہیں۔ اب اصل موضوع کی طرف آتا ہوں۔

دراصل حقیقت یہ ہے۔ کہ سرمایہ دارانہ نظام کے استحکام و بقا کے لئے ہاتھ پاؤں مارنے والے حضرات اس قسم کی بعید از حقیقت باتیں کر رہے ہیں ورنہ اگر چشم بصیرت اور قرآنی فراست سے دیکھا جائے۔ تو حکیم الامتؒ کا فرمان صاف۔ واضح اور غیر مبہم ہے۔

## اسلامی سوشلزم کے حامیوں سے

اس ضمن میں اسلامی سوشلزم کے داعیوں سے بھی کچھ عرض کرنا ہے۔

عزیزانِ من! اگر آپ پاکستان میں ایک ہموار و متوازن معاشرہ قائم کرنے کے لئے یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ ملکی وسائل سب ضرورت مندوں کے لئے یکساں طور پر کھلے ہوں۔ اور اسلامی سوشلزم سے آپ کی مراد دراصل اسلام کا معاشی نظام ہے۔ تو آپ کو اس اصطلاح میں قدرے تبدیلی کرنا ہوگی۔ کیونکہ یہاں ازم کا لفظ آئے گا۔ اس سے مراد پورے کا پورا فلسفہ حیات ہوگا۔ یقیناً سوشلزم کا پورا نظام قرآن کے نظام حیات سے متخالف و متصادم نظام ہے۔ جیسا کہ عام طور پر کہا جاتا ہے اور آپ اس دعوٰی میں سچے ہیں تو آپ اسے یا تو قرآنک سوشل آرڈر کہیں یا آپ کو اسے اسلامک سوشل آرڈر کہنا چاہیئے۔ جب آپ اسلامی سوشلزم کہتے ہیں۔ تو نظام سرمایہ داری کے ایجنٹوں کو غلط فہمیاں پھیلانے کا موقع ملتا ہے۔ ویسے آپ کی یہ مخلصانہ نہج صحت مند ہے۔ جس کی تائید قائداعظمؒ کا مندرجہ ذیل فرمان کرتا ہے:۔

**قائداعظمؒ کا فرمان** خطبۂ آل انڈیا مسلم لیگ اپریل ۱۹۴۳ء۔ آپ نے خطبہ صدارت میں فرمایا تھا:۔

Here I should like to give a warning to the landlords and capitalists who have flourished at our expense by system which is so vicious, which is so wicked and which makes them so selfish that it is difficult to reason with them. (Tremendous applause). The exploitation of the masses has gone into their blood. They have forgotten the lesson of Islam. Greed and selfishness have made these subordinate to the interests of others in order to fatten themselves. It is true we are not in Power today. You go any where to the country-side. I have visited villages. There are millions and millions of our People who hardly get one meal a day. Is this civilisation? Is this the aim of Pakistan? (Cries of no, no.) Do you visualise that millions have been exploited and can not get one meal a day! If that is the idea of Pakistan I would not have it. (Cheers) If they are wise they will have to adjust themselves to the new modern conditions of life. If they dont God help them; we shall not help them. (Hear, hear renewed cheers and applause).

اُردو ترجمہ:۔

"اس مقام پر میں زمینداروں اور سرمایہ داروں کو متنبہ کرنا چاہتا ہوں وہ ایک: ایسے فتنہ انگیز ابلیسی نظام کی رُو سے جو انسان کو ایسا بدمست کر دیتا ہے۔ کہ وہ کسی معقول بات سننے کے لئے آمادہ ہی نہیں ہوتا، عوام کے گاڑھے پسینے کی کمائی پر رنگ رلیاں مناتے ہیں۔ عوام کی محنت کو غصب کر لینے کا جذبہ ان کے رگ و پے میں سرایت کر چکا ہے، میں اکثر دیہات میں گیا ہوں۔ وہاں میں نے دیکھا ہے۔ کہ لاکھوں خدا کے بندے ہیں جنہیں ایک وقت بھی پیٹ بھر کر روٹی نہیں ملتی۔ کیا اسی کا نام تہذیب ہے؟ کیا یہی پاکستان کا مقصد ہے؟ اگر پاکستان سے یہی مقصود ہے تو میں ایسے پاکستان سے باز آیا۔ اگر ان سرمایہ داروں کے دماغ میں ہوش کی ذراسی رمق باقی ہے تو انہیں زمانے کے بدلے ہوئے تقاضوں کے ساتھ چلنا ہوگا۔ اگر انہوں نے ایسا نہ کیا تو ان کا خدا حافظ! ہم ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔"

آپ نے دیکھا کہ قائداعظمؒ مسلمانوں کو اسلام کا بھولا ہوا سبق یاد دلا رہے ہیں۔ وہ اس حقیقت کو پیش کر رہے ہیں۔ کہ اسلامی نظامِ حیات تمام انسانوں کے رزق کی ذمہ داری اپنے ذمہ لیتا ہے۔ آپ یقیناً پاکستان میں ایک خوشحال و خوشگوار معاشرہ متشکل کرنے کے متمنی تھے۔

## مولانا ابوالکلام مرحوم اور سوشلزم

"ہندوستانی مسلم سیاست پر ایک نظر" مشہور نیشنلسٹ ڈاکٹر محمد اشرف مرحوم کی تصنیف ہے۔ اس میں مصنف نے سالارِ انسانیت حضور اقدس داعظم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی سے لے کر صحابہ کرامؓ اور بزرگانِ اسلام پر تنقید کرتے کرتے ہوئے یہ ثابت کرنے کی ناپاک کوشش کی ہے کہ انہوں نے ذاتی اقتدار اور جاہ طلبی کے لئے اسلام کا نام استعمال کیا ہے۔ حقیقت میں اسلام کوئی ایسا نظریۂ حیات نہیں جسے دورِ جدید میں بطور نظام قبول کیا جا سکے۔ جہاں مصنف نے اقبالؒ کو ہدفِ تنقید بنایا ہے وہاں راشٹرپتی ابوالکلام کے دورِ متحدہ قومیت کے خیالات کو

سراہا ہے۔ اس کتاب میں شیخ احمد سرہندیؒ۔ نظام الدین اولیاؒ۔ شاہ ولی اللہؒ اور مولانا عبیداللہ سندھیؒ کو بھی ہدفِ ملامت قرار دے کر یہ کوشش کی ہے کہ سوشلزم کا پلڑا اسلام سے بھاری دکھایا جائے۔

یہ کتاب جو مارچ ۱۹۶۳ء میں بھارت سے شائع ہوئی۔ مجھے "تحریک پاکستان اور نیشنلسٹ علماء" کی اشاعت کے بعد ملی۔ اگر اس وقت ملتی تو زیادہ موزوں ہوتا بہرحال اس کتاب میں ڈاکٹر اشرف مرحوم نے جو کچھ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کے متعلق لکھا ہے۔ اپنی پہلی کتاب میں دیئے گئے حوالہ جات کی تائید میں یہ تحریر پیش کر رہا ہوں۔ قارئین کرام اس کے بعد خود دیکھ لیں گے۔ کہ مذکورہ بالا کتاب "تحریکِ پاکستان اور نیشنلسٹ علماءؒ" میں دیئے گئے حوالہ جات کس قدر صحیح اور درست تھے۔

ڈاکٹر اشرف لکھتے ہیں :۔

"مولانا ابوالکلام آزاد کی زندگی بھی دراصل اتحادِ اسلام بلکہ احیائے دین کی تحریک کی کہانی ہے۔ اور اس مکتبِ خیال میں انہیں امام الہند کا منصب حاصل ہے۔ البتہ یہ نہیں کہ مولانا نے اتحادِ اسلام یا خلافت عثمانی کے عقیدہ کو مقبول عام بنایا۔ بلکہ مسلمان عالمانِ دین کے حلقوں کے اندر مذہبی نظریوں کے پردہ میں سامراج دشمن عمل کی تحریص دلائی جس کی بدولت بالآخر خلافت اور سوراج کی انقلاب پرور تحریک نے جنم لیا۔ ۱۹۲۰ء تک مولانا کی تصانیف بالعموم اسی پیام کی حامل ہیں وہ الہلال اور البلاغ جیسے جریدے ہوں یا تذکرہ اور ترجمان القرآن۔ مولانا کا مسلسل اور مرتب نظریہ یہی ہے۔

اسے غور سے پڑھیئے :۔

"البتہ ۱۹۲۰ء سے یعنی جب مولانا گوشۂ عافیت کو خیرباد کہہ کر عوامی تحریک میں شریک ہوئے تو اُن کی آنکھیں کُھلیں کہ احیاء اسلام کے جملہ نظریئے فرسودہ اور غیر حقیقی ہیں۔ چنانچہ نہرو کمیٹی کی بحثوں میں مولانا نے محمد علی یا مسٹر جناح کی حمایت کی بجائے پنڈت موتی لال نہرو اور سوراج پارٹی کے سیکولر نظریوں کی تائید کی۔ بلکہ صدر کانگریس کی حیثیت

سے جب ۱۹۴۰ء میں خطبہ دیا تو نہایت دیانت داری کے ساتھ اپنے ان ہم مذہبوں کے اعتراض کا جواب بھی جواہر لعل کی تعلیم کے مطابق جو ایک اسلامی حکومت اور قرآنی سیاست کے خواب دیکھ رہے تھے، فرمایا کہ ان دوستوں کو جنہوں نے ۱۹۱۲ء میں میری دعوت قبول کی تھی۔ مگر جن سے مجھے آج اختلاف ہے، ملامت نہیں کرتا۔ البتہ یہ ضرور ذہن نشین کرانا چاہتا ہوں کہ

"ہمیں زندگی کی ٹھوس حقیقتوں پر اپنے فیصلوں کی دیواریں تعمیر کرنی ہیں۔ ایسی دیواریں روز بنائی اور ڈھائی نہیں جاتیں ۔۔ ۔۔ ۔۔ میرے لئے ممکن نہیں کہ اپنے یقین سے لڑوں ۔۔ ۔۔ ۔۔ میں مجبور ہوں کہ اپنے مشاہدہ کو نہ جھٹلاؤں۔"

آگے چل کر ڈاکٹر اشرف کہتے ہیں:-

"میں اسے اپنی خوش نصیبی سمجھتا ہوں کہ کانگرس کی صدارت کے پہلے سال میں یعنی گرفتاری اور نظر بندی سے پہلے) میں مولانا ابوالکلام کا سیکرٹری رہا، اور میں نے جب مولانا کو بہت قریب سے دیکھا تو انہیں اتنا وسیع النظر پایا کہ وہ سوشلزم کے نظام کو صحت مند سمجھنے لگے تھے۔ مولانا نے "انگارے" کے لکھنے والوں کو بھی سراہا۔ حالانکہ اس زمانہ میں اس کے مصنفین پر کفر والحاد کے فتوے صادر ہو چکے تھے۔ بالآخر جب مولانا کی وفات کے بعد ان کی خود نوشت سوانح حیات شائع ہوئی تو دیکھنے والوں کو حیرانی ہوئی کہ مولانا نے اس دستاویز میں تحریکِ احیائے دین سے اپنی وابستگی کا ذکر تک نہیں کیا۔ یہی انداز مولانا کی اس سے ماقبل تصنیف غبارِ خاطر کا بھی ہے۔ مولانا کی زندگی سے یہ سبق ضرور لیا جا سکتا ہے۔ کہ حالاتِ حاضرہ میں دین کے سیاسی تصورات "مسجد ضرار" تو بن سکتی ہے۔ لیکن کوئی صحت مند سیاسی اور سماجی نظام قائم نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ اعلان آزادی کے بعد مولانا آزاد کے مشورہ پر جمعیت العلماء ہند نے سیاست سے اپنی دست برداری کا اعلان کر دیا۔"

مندرجہ بالا اقتباسات "انڈیا ونس فریڈم" کے صفحہ ۲۲۷ کی حرف بحرف تائید

ملتی ہے۔ جس میں ابوالکلام (مرحوم) کی اسلام سے مایوسی و بیزاری کا کھلا اعلان پایا جاتا ہے۔ اگر اس کے بعد بھی توحید پرستی کے دعویدار اس اسلام سے مایوس و بیزار ابوالکلام کو رحمۃ اللہ علیہ کہنے پر مُصر ہیں۔ تو اس میں میرا قصور کیا ہے۔

چونکہ راوی ثقہ است اس لئے ڈاکٹر اشرف کی تحریر کا حوالہ دیا گیا ہے اس سے صاف طور پر واضح ہوتا ہے۔ کہ مولانا زندہ خدا کے زندہ جاوید دین سے مایوس ہوکر انسانی ذہن کے تراشیدہ دین (نظام حیات) سوشلزم کے حامی ہو گئے تھے اس لحاظ ہی سے ہمارے نزدیک مولانا آزاد مرحوم کا انجام بخیر نہیں ہوا۔ جسے عام زبان میں خاتمہ بالایمان کہتے ہیں۔ ہاں اگر پہلی خدمتِ اسلام کو معیار ٹھہرایا جا سکتا ہے تو پھر مرزا غلام احمد قادیانی اور مولانا ابوالکلام آزاد کو ترازو کے برابر پلڑوں میں رکھنا پڑے گا۔ کیونکہ ابتدائی دَور میں اُنہوں نے بھی تو آریوں اور عیسائیوں کے ساتھ کئی مناظرے۔ مجادلے اسلام کی برتری ثابت کرنے کے لئے کئے تھے۔

## سوشلزم، اشتراکیت اور جمہوریت میاں بشیر احمد کی نگاہ میں۔

آپ پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے صدر بھی رہے ہیں۔ میاں صاحب کا شمار مسلم لیگ کے صفِ اوّل کے زعماء میں ہوتا رہا ہے۔ آپ نے ایک مضمون "مدینہ بجنور" کی دعوت "پر مسلمان کیا کریں"۔ ۱۷ر فروری ۱۹۳۹ء کو لکھا تھا جس کا ایک اقتباس جو زیر نظر کتاب کے موضوع سے متعلق ہے۔ نذرِ قارئین کیا جاتا ہے۔ جس سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ کہ جانثارانِ تحریک پاکستان کے ذہن میں پاکستان کے نقوش و خطوط کیا تھے اور یہ حضرات نظریۂ پاکستان سے کیا مُراد لیتے تھے۔

ملاحظہ فرمایئے:۔

"سچ پوچھو تو اسلام کے نام لیوا کو نہ جمہوریت کی ضرورت ہے۔ نہ اشتراکیت کی، نہ فسطائیت کی احتیاج ہے نہ قومیت کی۔ اسلام کے سادہ فلسفہ نے ہمیں وُہ نعمت دی ہے جو دُنیا کا کوئی فلسفہ ہمیں نہیں دے سکتا۔ اسلام نے رُوحانی تعلیم کی تکمیل کا اعلان کرکے وحی اور پیغمبری کا خاتمہ کیا اور اس طرح ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نوعِ انسانی کی باگ ڈور عقل کے ہاتھ میں دے دی۔

اسلام نے صرف پتھر کے بتوں ہی کو نہیں توڑا، بلکہ پرانے خیالات۔ پرانے رسم ورواج غرض ہر پرانی چیز کی بزرگی کو بت سمجھ کر پاش پاش کر دیا۔ کیونکہ یہ سب نام نہاد بزرگیاں انسانی نفس کی ترقی کے راستہ میں پتھر بن کر حائل تھیں، انہوں نے انسانی روح کو پتھرا دیا تھا۔ آج اشتراکیت' اشتراکیت کے شور سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ حالانکہ اگر کبھی اشتراکیت صحیح طور پر عمل میں آئی۔ تو وہ اسلام کی پہلی صدی تھی۔ لیکن آج ہمارے سوشلسٹ کو لینن اور اسٹالن کے سوا دنیا کی اس عظیم تاریخ کے ایک باب کا بھی علم نہیں۔ اس سلسلہ میں اس نے روس اور یورپ سے مذہب کے خلاف نعرہ سنا اور بے سوچے سمجھے اسے ہندوستان میں دہرانے لگا۔ اگر آپ اس سے پوچھیں گے۔ کہ بتلاؤ تو سہی اسلام کے عروج وزوال کی داستان کیا ہے۔ خلافتِ راشدہ کے زمانہ کے بعد اس نے کیا کیا کروٹیں بدلیں اور کیوں؟ تو یہ بغلیں جھانکنے لگے گا۔ اسی جہل کا نتیجہ ہے کہ سوشلسٹ اور نیشنلسٹ کے نزدیک نہ اسلام کا کوئی معاشی نظریہ ہے، نہ معاشرتی پروگرام، اور اگر ہے تو دقیانوسی ہونے کی وجہ سے حرف ترک کر دینے کے قابل۔" (مسلمان کیا کریں صفحہ ۴۰)

---

## تیرھواں باب

# اشتراکیت (کمیونزم)

فکرِ انسانی نے، مسائل زندگی کو سمجھنے اور سلجھانے میں بہت تگ و تاز کی ہے۔ یہ طبیعیات، اخلاقیات اور سیاسیات کی وادیوں میں سرگرداں پھرا۔ اس نے معاشیات کو ضروریاتِ انسانی کے پیمانوں سے ناپا۔ زندگی کے جن جن گوشوں پر اس کی نگاہ گئی اور اس کے عقل و شعور نے جو کچھ صحیح و درست سمجھا اس نے انسانی زندگی کو خوشگوار بنانے کے لئے اسے عملی طور پر آزمایا۔ انسانیت کے ہمدرد و بہی خواہ مفکّرین نے ہمیشہ یہی کوشش کی کہ ایسا معاشرہ قائم کیا جائے جس میں شر، آگ کی چنگاریوں کی طرح نہ اُڑتا پھرے۔ جس سے انسان کا خرمنِ امن جل کر راکھ سیاہ ہو جائے۔ مفکّرین و مصلحین نے ہمیشہ ہمیشہ یہی چاہا کہ انسان کو امن و طمانیت نصیب ہو۔ انسان عقلِ محض کے ذریعہ مسائلِ حیات کا حل تلاش کرنے میں کس حد تک کامیاب ہوا۔ اس وقت یہ ہمارا موضوع نہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ عصرِ رواں میں معاشی مسئلہ نے نمایاں اہمیت حاصل کر لی ہے۔ اس اہمیت کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جا سکتا ہے کہ عصرِ حاضر کو کہا ہی معاشیات کا زمانہ (AGE OF ECONOMICS) جاتا ہے۔ آج زندگی کے متعلق ہر شئے کو معاشی پیمانہ سے ناپا جاتا ہے۔ یہی وہ دیوتا ہے جس کی ہر جگہ پرستش کی جاتی ہے۔ افراد کی عزّت و تکریم کی میزان یہی ہے۔ اور اقوام کی قوت و اقتدار کا معیار ہے تو یہی۔ آج اخلاق، فلسفہ، سائنس، سیاست سب اسی کے تابع نظر آتے ہیں۔ آج جو کچھ معاشی طور پر حق ہے۔ وہی اخلاقی طور پر بھی حق ہے۔ آج زیر و بالا کی اہمیت کا اندازہ کرنے کی میزان اور حق و باطل کو ماپنے کا پیمانہ یہی ہے۔ اور خیر و شر کو پرکھنے کی کسوٹی بھی یہی رہ گئی ہے۔ عقلِ تنہا نے غربت و افلاس کی وجہ سے لاغر و نحیف اور احتیاج و بھوک کی وجہ سے انسانی پژمردہ

چہروں کا کیا علاج تجویز کیا اور اس نے ان کی پژمردگیوں اور افسردگیوں کو چہرہ کی شگفتگیاں اور شادابیاں بنانے کے لئے معاشی مسائل کو کس طرح حل کرنے کی کوشش کی۔ اس باب میں یہی عرض کرنا ہے۔

## روٹی کے مسائل

جب سے انسان نے آنکھ کھولی روٹی اسی وقت سے اس کے ساتھ لگی ہوئی ہے۔ لیکن اس نے ایک مسئلہ (PROBLEM) کی حیثیت کب سے اختیار کی؟ علم معاشیات اس مسئلہ کی تاریخ اور اس کے حل کی تدابیر کا نام ہے۔

## قدیم ترین ادوار

قدیم تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ عہد قدیم میں انسانوں کی آبادیاں ان خطوں میں ہوتی تھیں جہاں آب و ہوا گرم ہو اور پانی کی زیادتی ہو تاکہ ان طبعی اسباب کی وجہ سے پیداوار بکثرت ہو۔ کیونکہ اس زمانہ میں آبادی کم اور پیداوار زیادہ تھی اس لئے اس وقت روٹی کا مسئلہ پیدا ہی نہیں ہوا۔ جب انسانی زندگی کے قدم ذرا آگے بڑھے اور اس نے خدا کی وسیع و عریض زمین پر پھیلنا شروع کیا تو بالادست قوموں نے کمزور انسانوں کو اپنا غلام بنانا شروع کر دیا۔ یہ غلام ان کے ہاں مزدوروں کا کام کرتے تھے۔ اس لئے اس زمانہ میں مزدوری (LABOUR) بھی انسانی تمدن کا کوئی مسئلہ نہ تھا لہٰذا انسانی تاریخ کے ابتدائی دور میں معاشی اقدار پر غور و فکر کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مزدور چونکہ غلام اور اہل حرفہ تھے اس لئے ان پیشوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ البتہ زراعت کی قدر تھی۔ دست کار کا مقام معاشرے میں سب سے نیچے تھا۔ قدیم ترین ادوار کے متعلق اشارات ہی پر اکتفا کیا جا سکتا ہے۔ البتہ یونانی معاشرے کے متعلق اس سے زیادہ متعین طور پر گفتگو ہو سکتی ہے۔ کیونکہ اس دور کے مفکرین کی کتابیں ہمارے پاس موجود ہیں۔

## افلاطون کا معاشی تصور

افلاطون (PLATO) اپنی کتاب (REPUBLIC) میں لکھتا ہے:۔

"جہاں تک میں دیکھ سکا ہوں مملکت نوع انسانی کی ضرورت کی وجہ سے وجود میں آتی ہے۔ دنیا میں کوئی فرد خود مکتفی نہیں۔ ہم میں سے ہر ایک کی متعدد

ضروریات ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔ لہٰذا مختلف اور متعدد ضروریات سے تنوع اور اختلاف ظاہر ہے اس لئے ضروری ہے کہ ان کو بہم پہنچانے والے بھی متعدد اور متنوع ہوں ایک شخص اپنی ضرورت کے لئے دوسرے کا محتاج اسی طرح دوسرا اپنی کسی اور ضرورت کے لئے تیسرے کا دست نگر۔ جب اس قسم کے تمام افراد یک جا جمع ہو جائیں تو وہ ایک مملکت بن جاتی ہے اس کے نزدیک تقسیم عمل کا اصول عین فطرت کے مطابق ہے۔ افلاطون اپنی مثالی ریاست کو مختلف طبقات میں تقسیم کرتا ہے۔ جہاں تک "ملکیت" کا تعلق ہے۔ افلاطون اپنی مثالی ریاست کو مختلف طبقات میں تقسیم کرتا ہے جہاں تک "ملکیت" کا تعلق ہے۔ افلاطون کا نظریہ یہ تھا کہ:-

تم اپنے آپ کو اور اپنی املاک کو اپنی ذاتی ملکیت مت تصور کرو یہ سب کچھ تمہارے خاندان کی مشترکہ ملکیت ہے۔ تمہارے موجودہ خاندان ہی کی نہیں بلکہ ماضی میں گذرے ہوئے اور مستقبل میں آنے والے خاندان کی بھی۔ لیکن خاندان اور اس کی املاک بھی اس کی ذاتی ملکیت نہیں۔ یہ سب مملکت کی ملکیت ہیں۔ لہٰذا میں جس اصول پر قوانین وضع کروں گا وہ یہ ہے کہ کونسی چیز مملکت اور اس کے بعد خاندان کے اجتماعی مفاد کے حق میں جاتی ہے۔ فرد کے احساسات ان دونوں کے تابع رہنے چاہئیں"۔

عملاً افلاطون ہر فرد کو زمین کا ایک ٹکڑا دینے کے حق میں تھا جسے اس کی موت کے بعد اس کے بڑے بیٹے کی تحویل میں دے دیا جائے۔ اگر بیٹا نہ ہو تو داماد یا جسے اس نے اپنا متبنٰی بنالیا ہو۔ یعنی وہ صرف ایک وارث کا قائل تھا۔ افلاطون کے پیش نظر انتہائی درجہ کی کمیونزم بلکہ مزدکیت تھی۔ جس میں املاک وجائداد کے علاوہ بیویاں اور اولاد بھی سب کی مشترکہ تھیں۔ لیکن یہ کمیونزم صرف دو بالائی طبقوں نگران، اور محافظین تک محدود تھی۔ نیچے کے طبقوں کا اس میں کوئی حصہ نہ تھا۔

افلاطون کہتا تھا کہ امارت وغربت دونوں میں آرٹ کا انحطاط ہوتا ہے۔ امارت میں اس لئے کہ کاریگر سہل انگار ہو جاتا ہے۔ اور غربت میں ندرت کاری کے لئے اس غریب کے پاس سامان ہی موجود نہیں ہوتا۔ اس دلیل کی بنا پر افلاطون کا نظریہ یہ

تھا کہ نہ تو قوم میں دولت کی افراط ہو اور نہ ہی افلاس۔

**ارسطو** اس کے بعد ہمارے سامنے ارسطو آتا ہے۔ وہ بھی مملکت کو فرد اور خاندان دونوں پر فائق قرار دیتا ہے۔ ارسطو مملکت کو کل اور افراد اور خاندان کو اس کے اجزا کہتا ہے۔ یہ عورتوں اور بچوں کے اشتراک کا سرے سے مخالف تھا۔ زمین کے متعلق اس کا نظریہ یہ تھا:۔

۱۔ زمین کے متعین رقبے مختلف افراد کو دے دیئے جائیں۔ لیکن ان کی پیداوار کو تمام افراد کی ضروریات کے لئے جمع کر لیا جائے۔

۲۔ زمین مشترکہ تحویل میں رہے اور اس میں کھیتی باڑی بھی مشترکہ طور پر کی جائے۔ لیکن پھر بھی اس کی پیداوار کو مختلف افراد میں بانٹ دیا جائے۔

۳۔ زمین بھی سب کی مشترکہ اور اس کی پیداوار بھی سب کی مشترکہ۔

ارسطو کا نظریہ یہ ہے کہ تمام اشیاء کا مبادلہ ایک متعین معیار کے مطابق ہونا چاہیئے اور وہ معیار ہے، انسان کی ضروریات۔ جس چیز کی طلب زیادہ ہو۔ یعنی (DEMAND) اس کی قیمت بھی زیادہ ہونی چاہیئے۔ اشیاء کے تبادلہ کے لئے وہ جنسی تبادلہ (BARTER SYSTEM) کے بجائے، سکوں (CURRENCY) کے ذریعہ تبادلہ کے زیادہ حق میں ہے۔ لیکن سُود کو ظلم قرار دیتا ہے۔ ارسطو کا نظریہ ہے کہ افلاس سے جرائم اور بغاوت پیدا ہوتے ہیں۔

اس زمانے میں معاشیات نے ایک باقاعدہ شعبۂ علم کی حیثیت اختیار نہیں کی تھی۔ اس نے ایک الگ شعبۂ علم کی حیثیت، یورپ میں سولہویں صدی عیسوی میں اختیار کی۔

**مرکنٹلزم** اس زمانے کا پہلا معاشی نظام مرکنٹلزم ہے۔ اسے ایک معاشی نظریہ کی حیثیت سے سب سے پہلے اٹلی کے ایک صاحب قلم (SERRA) سیرا نے ۱۶۰۳ عیسوی میں پیش کیا اور یہ اٹھارہویں صدی کے آخر تک رائج رہا۔ یہ نظام سرِیانے جس وقت لوگوں کے سامنے رکھا اس وقت لوتھر کی اصلاحِ کلیسا کی تحریک کے بعد ہیومن ازم کا دور دورہ تھا۔ یہ فرد کی زیادہ سے زیادہ آزادی کا قائل تھا۔ اور حکومت کو بہت کم حق دیتا تھا کہ وہ افراد کی آزادی میں

مخل ہو۔ وُہ معاشی ترقی کے ذریعے مملکت کو زیادہ سے زیادہ طاقت وَر بنانے کا حامی تھا۔ اس کے نزدیک اس کا طریقہ یہ تھا کہ ممالکِ غیر کے ساتھ زیادہ سے زیادہ تجارت کی جائے۔ تاکہ ان کی دولت اپنے ملک میں آتی جائے اور یہ دولت اپنے ملک میں قیمتی دھاتوں (سونے، چاندی وغیرہ) کی شکل میں جمع رہے۔

اس معاشی نظام پر "ہیومن ازم" کے فلسفہ کا بڑا اثر تھا۔ یہ فلسفہ انسان کی مادی ضروریات کو بڑی اہمیت دیتا ہے۔ اس کا تصوّر یہ ہے۔ کہ ذاتی مفاد (SELF-INTEREST) کے علاوہ اور کوئی جذبہ نہیں جو انسان کو کسی کام پر آمادہ کر سکے۔ مفادِ خویش اور کم از کم ایثار، وُہ اُصول ہے۔ جو انسانی زندگی کی راہنمائی کرتا ہے (HOBBES) اس بارے میں لکھتا ہے۔ کہ "انسان جو کچھ کرتا ہے۔ اپنے مفاد کے لئے کرتا ہے"۔ اور (FORTREY) کہتا ہے۔ کہ "انسان کا جذبۂ محرکہ اس کے مفادات ہوتے ہیں، نہ کہ دلائل۔ فائدے کی اُمید وُہ کشش ہے جس کا مقابلہ کوئی اور چیز نہیں کر سکتی"۔ ہابز تو یہاں تک بھی کہہ گیا ہے۔ کہ انسان کو حیوانات پر شرف ہی یہ حاصل ہے کہ اس کے ہاں "ذاتی ملکیت" کا تصوّر ہے اور یہی وُہ چیز ہے جو اس کے لئے فخر و مباہات کا موجب بنتی ہے۔

تصریحاتِ بالا سے آپ نے دیکھ لیا کہ یورپ میں جس معاشی نظام کی نمود ہوئی اس کی بنیادیں مادیت (MATERIALISM) پر تھیں۔ یہی بنیادیں آہستہ آہستہ نظامِ سرمایہ پرستی (CAPITALISM) کی عمارت میں متشکل ہوتی گئیں۔ جس میں ہر فرد کے سامنے اپنا مفاد ہوتا ہے۔ چنانچہ اسی جذبے کے ماتحت مرکنٹلزم میں سُود کی حمایت کی گئی تھی۔

**فزیو کریسی** | اٹھارویں صدی کے وسط میں مرکنٹلزم کے خلاف شدید ردّ عمل شروع ہُوا۔ فرانس کے مفکّرین نے فزیو کریسی کے نام سے ایک متضاد معاشی نظام پیش کیا۔ "فطرت کی حکمرانی"۔ ان کا نظریہ یہ تھا کہ انسان اگر قوانینِ فطرت کا اتباع کر لے تو وُہ اپنا بلند ترین مقام حاصل کر سکتا ہے اُنہوں نے مرکنٹلزم کے خلاف زراعت کو بنیادی حیثیت دی اور نیشنلزم کی جگہ انٹرنیشنلزم (بین الاقوامیت) کا تصوّر پیش کیا۔ اکنامکس کو ایک باقاعدہ سائنس کی حیثیت

سے پیش کرنے کا سہرا انہی مفکرین کے سر ہے۔ ان کا نظریہ یہ تھا کہ انسانوں کے معاشرتی نظام (SOCIAL ORDER) کی تشکیل انسانوں کا کام نہیں۔ یہ اس خلاقِ فطرت کا کام ہے جس نے کائنات میں طبعی نظام پیدا کر رکھا ہے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ انسان اسی طرح قوانین فطرت کا پابند ہے جس طرح طبعی قوانین کی پابندی سے فطرت کا توازن قائم ہے۔ جو معاشرہ قوانین فطرت کے مطابق متشکل ہوگا وہی انسانیت کی فوز و فلاح کا موجب ہوگا۔ فرد کے حقوق کے یہ بڑے مؤید تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ افراد کے باہمی تعاون پر بڑا زور دیتے تھے (DUE SNAY) کے الفاظ میں "عدل سے مفہوم یہ ہے کہ انسان عقل کی روشنی میں فیصلہ کرے کہ اس کا حصہ کتنا ہے۔ اور دوسرے کا کتنا۔" ان کا عقیدہ یہ بھی تھا کہ فرد کو حکومت کے حدود و ضوابط سے بڑھ کر فطرت کے آئین کی پابندی کرنی چاہیئے۔ زراعت ان کے نزدیک سب سے معزز کام تھا (RICHARD CANTILLON) کے الفاظ ہیں:-

"زمین وہ سرچشمہ ہے جس سے تمام دولت پیدا ہوتی ہے اور محنت وہ قوت ہے جو اس دولت کو زمین سے پیدا کرتی ہے۔"

ان میں (ANNE ROBERT JACQUES TURGOT 1727-1781) کو ایک خاص مقام حاصل ہے اور اس کی کتاب (FORMATION AND DISTRIBUTION OF WEALTH) میں اس نظام کے خد و خال کو وضاحت و صراحت سے بیان کیا گیا ہے۔ خلاصہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے:-

## ترگاٹ کا نظریہ

۱۔ اگر زمین کی تقسیم اس طرح ہو کہ ہر شخص کے پاس صرف اتنی زمین ہو جس سے اس کی اپنی ضروریاتِ زندگی پوری ہو سکیں اور اس سے زائد کچھ نہ بچے تو اس سے ظاہر ہے کہ ایسے حالات میں کوئی شخص کسی دوسرے کا کوئی کام کرنے پر آمادہ نہ ہوگا۔ نہ ہی کسی کے پاس اپنی ضروریات سے زائد کچھ ہوگا جس سے وہ کسی دوسرے کو اُجرت پر مزدور رکھے۔

۲۔ اگر زمین کی تقسیم مذکورہ بالا طریقہ کے مطابق ہوتی بھی، تو یہ صورت حالات بھی زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکتی۔ اس لئے کہ ہر شخص کی ضروریات اس کی

اپنی زمین سے حاصل نہ ہو سکتیں۔ اگر وہ گیہوں بوتا تو کپڑوں سے محروم رہ جاتا اور اگر کپاس کی کاشت کرتا تو اسے روٹی نہ ملتی۔ علاوہ بریں زمین جس شکل میں چیزوں کو پیدا کرتی ہے۔ وہ اس شکل میں انسانوں کی ضروریات کو پورا نہیں کر سکتیں۔ انسان کپاس جسم کے گرد نہیں لپیٹ سکتا۔ اس کا کپڑا بنانا پڑتا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ اگر کاشت کار کپڑا بھی خود ہی بُننا شروع کر دے تو زمین دھری کی دھری رہ جائے گی۔ اس وقت کے تحت معاشرہ کو تقسیم عمل کا طریقہ اختیار کرنا پڑا۔ اور یہیں سے افرادِ معاشرہ مختلف گروہوں میں بٹ گئے۔ ایک کاشت کاروں کا گروہ۔ ایک صنعت و حرفت والوں کا گروہ۔ ایک گروہ ان کا جن کے پاس نہ زمین تھی۔ اور نہ ہی وہ کوئی پیشہ جانتے تھے۔ ان کے پاس صرف جسمانی محنت تھی۔ جسے دوسروں کو دے سکتے تھے یہ مزدوروں کا گروہ تھا۔

۳۔ اس نظام میں ہر چند مختلف افراد کی ضروریات ایک دوسرے سے وابستہ تھیں لیکن یہ ظاہر ہے کہ کاشت کار کی حیثیت سب سے فائق تھی۔ مثلاً اگر موچی جوتا نہ بنائے تو اس سے کاشت کار کو کچھ دقت تو ضرور ہو گی۔ لیکن اس کا کام نہیں رکے گا۔ لیکن اگر کاشت کار غلہ پیدا کرنا بند کر دے۔ تو سارے معاشرے کے کاروبار ختم ہو جائیں۔ نہ کسی کو کھانے کو ملے نہ زندگی کی گاڑی آگے چلے۔ علاوہ بریں کاشت کار کے علاوہ جس قدر پیشے ہیں ان میں محنت کے معاوضے کا تصفیہ فریقین کی رضامندی سے ہوتا ہے اور اس کا انحصار خریدنے اور بیچنے والے کی ضرورت پر ہے۔ لیکن کاشت کار کی پوزیشن اس سے مختلف ہے۔ فطرت اس سے سودا بازی نہیں کرتی کہ اگر کاشت کار کی ضرورت زیادہ ہے تو اس کی محنت میں سے کچھ دبا لے۔ اور غلہ کم اگائے اور اگر اس کی ضرورت ایسی سخت نہیں تو پھر فصل زیادہ اگائے۔ زمین ہمیشہ اس کی محنت کا معاوضہ دیتی ہے۔ اور یہی فاضلہ پیدا وار ہے (یعنی اس کی ضرورت سے زیادہ پیداوار) جس سے تمام معاشرے کا کاروبار چلتا ہے۔ بنا بریں ملک کی حقیقی دولت پیدا وار کرنے والا کاشت کار ہے۔

۴۔ لیکن یہاں تک تو اُن کاشت کاروں کا ذکر ہے جو اپنی زمین کی کاشت آپ کرتے ہیں۔ جیسا کہ شروع میں کہا گیا ہے کہ زمین کی تقسیم اس طرح نہیں ہوئی کہ ہر شخص کو اس کی ضرورت کے مطابق ہی زمین ملے۔ مختلف اسباب کی بنا پر مختلف لوگوں نے اپنی ضروریات سے زیادہ زمینیں سنبھال لیں اور ان سے پیداوار اتنی زیادہ ہوئی کہ ان کی تمام ضروریات پُوری ہونے کے بعد بھی ان کے پاس کچھ نہ کچھ بچ رہا۔ اس فاضلہ دولت سے انہوں نے محنت کرنے والوں کی محنت خریدی اور ان سے اپنی زمین کاشت کروانا شروع کر دی۔ اس سے زمین کی ملکیت کا تصور پیدا ہو گیا۔ یعنی زمین کا مالک وُہ قرار پا گیا۔ جس نے مزدور کو اُجرت پر ملازم رکھا۔

۵۔ ایسا بھی ہُوا کہ بعض ناگہانی حادثات کی وجہ سے زمین کے مالکوں کو نقصان ہو گیا۔ اس کو پُورا کرنے کے لئے اُنہوں نے اپنی زمین کا کچھ حصّہ کسی دوسرے کی طرف منتقل کر دیا اور اس سے معاوضہ لے لیا۔ اس طرح زمین بھی خرید و فروخت کی چیز قرار پا گئی۔ حالانکہ فطرت نے اسے اس مقصد کے لئے پیدا ہی نہیں کیا تھا۔ اس طرح معاشرے میں تین طبقے پیدا ہو گئے۔ ایک طبقہ کاشت کاروں کا جو زمین سے دولت پیدا کرتے تھے۔ ایک صنعت و حرفت والوں کا جو زمین کی پیداوار کے معاوضہ میں ضروریات کی چیزیں بہم پہنچاتے تھے۔ تیسرا طبقہ مالکوں کا اس طبقہ کو کام کچھ نہیں کرنا پڑتا تھا اور ان کی ضروریات حقِ مالکانہ کے عوض کاشت کار ہم پہنچاتے تھے۔

۶۔ ان حالات میں معاشرہ تین طبقوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ طبقۂ اوّل کاشتکاروں کا طبقہ۔ یہ محنت کرتا ہے اور اپنی محنت سے کہیں زیادہ پیدا کر کے معاشرے کے حوالے کر دیتا ہے۔ اس میں سے اسے تو صرف اس کی محنت کا معاوضہ ملتا ہے اور باقی سب کچھ زمین کا مالک لے جاتا ہے۔ یہ دوسرا طبقہ جو محنت کچھ نہیں کرتا اور پیداوار کا زیادہ سے زیادہ حصّہ سنبھال لیتا ہے۔ کاشت کار کی ضرورت فطری ہے کیونکہ فطرت بغیر محنت کے زمین سے کچھ پیدا نہیں کرتی۔ زمین کے مالک کو بھی کاشت کار کی ضرورت ہے۔ کیونکہ اس کی محنت کے بغیر اسے

بھی کچھ مل نہیں سکتا لیکن مالکان زمین کا طبقہ بالکل غیر فطری ہے۔ ان کی نہ تو فطرت
کو ضرورت ہے نہ کاشت کار کو تیسرا طبقہ صنعت کاروں کا ہے۔ یہ محنت کرتا ہے
اور اس کا معاوضہ معاشرے سے لے لیتا ہے۔ معاشرے کو کچھ پیدا کر کے نہیں
دیتا، صرف پیدا شدہ سے بنا کر دیتا ہے۔ اس لئے یہ طبقہ بھی زمین کے مالکوں
کی طرح "بانجھ طبقہ ہے"۔

۷۔ لیکن ابھی ایک اور "بانجھ طبقہ" کا ذکر باقی ہے۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ معاشرہ میں مختلف لوگوں کی ضروریات مختلف ہوتی ہیں اور ان
کی یہ ضروریات اشیاء کے باہمی تبادلے سے پوری ہوتی ہیں۔ ایک شخص کے پاس گیہوں ہے
اسے تیل کی ضرورت ہے۔ اور ایک کے پاس تیل ہے گیہوں نہیں۔ یہ دونوں تبادلۂ
اجناس سے اپنی ضروریات پوری کر سکتے ہیں۔ لیکن ایک ایسا آدمی جس کے پاس گیہوں
خود موجود ہے اور اس صورت میں تبادلہ کی ضرورت پیدا نہیں ہوتی۔ اب اس صورت
میں کیا کیا جائے؟ اس دشواری کے حل کے لئے، زرِ مبادلہ کے وضع کرنے کی ضرورت پڑی۔
قدیم اقوام نے سونے چاندی جیسی کمیاب (اور اسی لئے قیمتی) دھاتوں کو بطور معیار
تبادلہ اختیار کیا اور اس طرح "روپیہ" کا وجود عمل میں آگیا۔ یہ ایک ایسی جنس قرار پائی
جس سے سب کچھ خریدا جا سکتا تھا۔ اور جو رکھے رہنے سے کبھی خراب بھی نہیں ہو
سکتی تھی لہٰذا ان جمع شدہ دھاتوں کے ٹکڑوں نے مستقل سرمایہ کی شکل اختیار کر لی۔
کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ ایک صنعت کار کے پاس خام مسالہ نہیں رہتا تھا۔
جس سے وہ ضرورت کی چیزیں تیار کر سکے۔ اس مقصد کے لئے وہ کسی ہمسایہ سے دھاتوں
کے یہ سکّے عارضی استعمال کے لئے لے لیتا اور اپنا کام چلا کر واپس کر دیتا۔ لیکن رفتہ رفتہ
ان سکّوں کے مالکوں نے سوچا کہ انہیں یونہی مفت میں استعمال (USE) کے لئے کیوں
دیا جائے؟ چنانچہ انہوں نے اس کا معاوضہ لینا شروع کر دیا۔ اس کا نام سود یا
(USURY) تھا۔ یعنی دھات کے ٹکڑوں کے عارضی استعمال کا معاوضہ۔ یہ لوگ جو
اس طرح دوسروں سے معاوضہ وصول کرتے تھے۔ تیسری قسم کا "بانجھ طبقہ" پیدا کرنے کے
ذمہ دار تھے۔

یہ ہے مختصر الفاظ میں نرگاٹ کا نظریہ کہ دولت کا اصل سرچشمہ زمین ہے اور اس

سے دولت پیدا کرنے والا کاشت کار۔ ساری دُنیا کی مشینری اس پیداوار کے سر پر چلتی ہے جو کاشت کار کی ضرورت سے زیادہ زمین سے نکلتی ہے۔ یہ نظریہ (PHYSIOCRATS) کے تصوّر کی صحیح صحیح ترجمانی کرتا ہے۔

ممکن ہے یہ معاشی نظریہ اور زیادہ پھیلتا لیکن اس زمانہ میں سکاٹ لینڈ میں ایک ایسا معاشی مفکّر پیدا ہُوا جو ان تمام مفکّرین پر چھا گیا۔ اس کا نام ہے

**ADAM SMITH**

(ADAM SMITH 1723 - 1790) جس کی کتاب (THE WEALTH OF NATIONS) کے متعلق اس وقت تک تسلیم کیا جاتا ہے کہ معاشیات پر اس سے بہترین اور اہم کتاب ابھی تک نہیں لکھی گئی۔ اس کتاب کے لکھنے سے پہلے کچھ عرصہ اسمتھ فرانس میں رہا۔ یہ (DAVID HUME) سے کافی متأثر ہوا۔ خود ہیوم نے بھی اس کتاب کا بڑی گرمجوشی سے استقبال کیا تھا۔ اس کتاب کے پانچ ایڈیشن اسمتھ کی زندگی میں شائع ہو چکے تھے۔ اس کے بعد یورپ کی قریب قریب ہر زبان میں اس کے تراجم شائع ہو چکے ہیں۔ یہ کتاب نظامِ سرمایہ داری کی بائبل ہے۔ اسمتھ کا بنیادی نظریہ یہ تھا۔ کہ دولت کی اصل محنت (LABOUR) ہے۔ لہٰذا دولت کا سرچشمہ زمین نہیں۔ صنعت کاری ہے۔ یہی وہ تخم تھا جس سے مغرب کے کارخانہ داری نظام کا درخت اُگا اور رفتہ رفتہ ساری دُنیا پر چھا گیا۔ یہ نظریہ بنیادی طور پر فزیوکریسی سے مختلف تھا۔ اسمتھ کا کہنا یہ ہے کہ تمام حیوانات میں انسان ہی ہے جو اپنی ضروریات کی چیزوں کا ایک دوسرے سے تبادلہ کرتا ہے

**کارخانہ داری نظام**

لہٰذا جو قوم ایسی چیزیں تیار کرے، جن سے دوسرے انسانوں کی ضروریات بڑھتی جائیں۔ اس قوم کے پاس دُوسروں کی زیادہ سے زیادہ دولت کھنچی چلی آئے گی۔ یہ سُود کو جائز قرار دیتا ہے البتہ یہ کہتا ہے کہ اس کی شرح حکومت کو مقرر کرنا چاہیئے۔ چونکہ یہ انفرادی مفاد کا حامی ہے۔ اس لئے پرائیویٹ پراپرٹی (ذاتی ملکیت) پر کسی قسم کی پابندی عائد کرنے کے حق میں نہیں اور ان اُمور میں حکومت کو دخل اندازی کا حق نہیں دیتا۔ صرف مالک اور مزدُور کے جھگڑوں میں حکومت کی مداخلت ضروری سمجھتا ہے۔ اسمتھ کا نظریہ، عقیدہ اور نظام خالصتہً مادہ پرستانہ ہے۔ اس کے سامنے کوئی اخلاقی تصوّر نہیں۔ نہ ہی زندگی

کا کوئی بلند مقصد۔ وہ اس خطرے کو ضرور محسوس کرتا ہے کہ اس نظام میں مفادات کا تصادم ضرور ہوگا۔ لیکن یہ کہہ کر مطمئن ہو جاتا ہے کہ سرمایہ دار طبقہ مفادِ خویش کے تحفظ کے لئے اس مسئلہ کا حل خود ہی دریافت کر لیا کرے گا۔

اسمتھ کے متبعین میں سے بنتھیم (JEREMY BONTHAM) مالتھوس (THOMAS) ROBERT MALTHUS، 1677-1823) اور ڈیوڈ DAVID (RICARDO، 1772-1823) زیادہ مشہور ہیں۔

**بنتھیم** | اپنے اُصول افادیت (PRINCIPLE OF UTILITY) کے لئے زیادہ مشہور ہے۔ بنتھیم کہتا ہے کہ انسان کی خوشی کا معیار اس کی دولت ہے۔ اور ہر فرد کی اپنی خوشی اور مسرّت، زندگی کا مقصود ہے۔ ملّت محض ایک فرضی نام ہے۔ اصل حیثیت افراد ہی کی ہے۔ افراد کی خوشی کے مجموعہ کا نام، ملّت کی خوشی ہے۔ لہٰذا جس معاشرہ میں زیادہ سے زیادہ افراد کے پاس زیادہ سے زیادہ دولت ہوگی اس معاشرے کو کامیاب معاشرہ کہا جا سکے گا۔ وہ حکومت کو افراد کے معاملے میں دخل انداز ہونے کا حق نہیں دیتا۔ افراد حصولِ مفاد میں، جس قدر باہمی مقابلہ کرنا چاہیں کریں۔ جس قدر دولت سمیٹنا چاہیں، سمیٹیں۔ وہ حکومت کو سُود کی شرح مقرر کرنے کی بھی اجازت نہیں دیتا۔ اس کے نزدیک یہ بھی فرد کی خوشی میں مزاحمت پیدا کرنے کے مترادف ہے۔ بنتھیم نے "فلسفۂ فطرت" کو اسمتھ سے بھی زیادہ نقصان پہنچایا۔ اور اس نے انسانی نگاہ کو فرد کی ذاتی اور یکسر مادی مسرّتوں پر مرکوز کر دیا۔ یہی اس کا "بڑا کارنامہ" ہے۔ جس کے لئے اس کا شمار مغرب کے مشاہیر میں ہوتا ہے۔

**مالتھوس** | مالتھوس اُصول آبادی (PRINCIPLE OF POPULATION) کے لئے مشہور ہے۔ انسانی آبادی کا اس تیزی سے بڑھتے جانا وہ خطرہ ہے۔ جو مالتھوس کے اعصاب پر بُری طرح سوار ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جس رفتار سے دُنیا کی آبادی بڑھ رہی ہے۔ اس نسبت سے زمین کی پیداوار نہیں بڑھ رہی۔ لہٰذا اگر یہ صورتِ حالات اسی طرح رہی تو وہ دن دُور نہیں جب نوعِ انسانی کا درخت اپنے پھلوں کے بوجھ سے گر کر ٹوٹ جائے گا۔ اور انسانیت تباہ ہو جائے گی۔ اس کے نزدیک جنسیاتی کشش کا خاتمہ نہیں کیا جا سکتا اور جب تک یہ کشش موجود ہے، آبادی

کا سلسلہ رُک نہیں سکتا۔ اس کی یہ کتاب ۱۸۹۸ء میں بغیر نام کے شائع ہوئی اور تھوڑے ہی دنوں میں سارے ملک میں گرما گرم بحث کا موضوع بن گئی۔ اس کے خلاف اس قدر اعتراضات ہوئے کہ اس نے جواب کے لئے مختلف ممالک کا سفر کیا اور وہاں سے شادی، اولاد، سامانِ زیست وغیرہ کے متعلق بہت سا مواد اکٹھا کیا۔ چنانچہ جب ۱۹۰۳ء میں اس کا دُوسرا ایڈیشن شائع ہُوا تو یہ پہلے ایڈیشن کے حجم سے چار گنا زیادہ تھا۔ یہ ایڈیشن درحقیقت ایک بالکل نئی تصنیف کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس دفعہ اس پر مالتھوس کا نام بھی درج تھا۔

مالتھوس کہتا ہے کہ انسان کو اس خطرۂ عظیم سے بچانے کے لئے آبادی پر روک تھام عائد کی جائے۔ اس کے لئے وُہ دو قسم کے موانعات (CHECKS) تجویز کرتا ہے۔ ایک تو یہ کہ لوگ اس خطرہ کے پیشِ نظر خود بطیبِ خاطر جنسی تعلقات سے رُک جائیں۔ اور دُوسرے وُہ حوادث جو قُدرت کی طرف سے پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ مثلاً قحط، زلزلے، سیلاب وغیرہ یا وُہ مصائب جو ہم اپنے اُوپر آپ لے آتے ہیں مثلاً جنگ وغیرہ۔

**ریکارڈو** مالتھوس کے بعد ریکارڈو آتا ہے۔ یہ یہُودی النسل تھا جس کے آباؤ اجداد ہالینڈ کے رہنے والے تھے۔ اسے معاشیات کا نیوٹن کہا جاتا ہے اس کی کتاب THE PRINCIPLES OF POLITICAL THEORY AND TASCATION مغرب کے معاشی نظام میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اس کا بنیادی نظریہ یہ تھا کہ زمین کی پیداوار تین حصّوں میں تقسیم کرنی چاہیئے۔ ایک حصّہ زمین کے مالک کا۔ جسے زمین کا کرایہ (RENT) کہنا چاہیئے۔ دوسرا حصّہ اس سرمایہ دار کا جو زراعت میں روپیہ لگائے۔ اس کا نام اس کی اصطلاح میں نفع (PROFIT) تھا۔ اور تیسرا حصّہ مزدُور کا جو اس میں کاشت کاری کرے۔ اس کا نام اجرت (WAGES) تھا۔ مزدُور کے متعلق اس کا نظریہ یہ تھا کہ

"مزدُور کی فطری اُجرت صرف اس قدر ہے۔ جس سے وُہ زندہ رہ سکے اور اپنی نسل کو اس طرح باقی رکھ سکے کہ وہ نہ تو کم ہونے پائے اور نہ زیادہ"

یہ سرمایہ دار اور مزدُور کی کشمکش قانونِ فطرت کا تقاضا قرار دیتا تھا۔ ریکارڈو

کا معاشی نظریہ خالص مادہ پرستانہ تھا اور یہی وہ معاشی مفکّر تھا جس نے معاشیات کو اخلاقیات اور سیاسیات سے الگ کرکے ایک جداگانہ سائنس (ECONOMICS) کی حیثیت دی تھی۔ کارل مارکس اس کے نظریات سے بہت متأثر تھا۔

**SISMONDI**

کلاسیکل اکنامکس کے خلاف سب سے مؤثر آواز فرانسیسی مصنّف اور مورّخ سسمانڈی نے اُٹھائی (SISMONDI-1773-1842) یہ اسمتھ کو اپنا امام تسلیم کرتا تھا لیکن اس نے اس کے معاشی نظریہ پر بہت سے اضافے کئے ہیں۔ مالتھوس اور ریکارڈو وغیرہ پر بھی بڑی کڑی تنقید کی۔ اس کا نظریہ یہ تھا کہ قوم کی اجتماعی آسائش اور مسرّت کو زیادہ سے زیادہ بڑھانا چاہیئے۔ اور یہ اسی صُورت میں ہوسکتا ہے کہ ہر شخص کو یقین ہو کہ وُہ محنت کے ذریعہ دیانتدارانہ زندگی بسر کرسکتا ہے۔ بہ ہیئتِ مجموعی اس کی ہمدردیاں مزدوُروں کے ساتھ تھیں۔ لیکن اس حد تک نہیں جس حد تک سوشلزم جاتی ہے۔ یہ ملک کی معاشی زندگی پر اجتماعی کنٹرول کا حامی تھا۔ اس کا معاشی نظریہ اخلاقیات پر مبنی تھا، جس کا محرک جذبۂ انسانی ہمدردی تھا۔

اب یورپ میں صنعتی انقلاب اور سرمایہ داری کے نظام کی وجہ سے حالات میں ایک تغیّر پیدا ہو رہا تھا۔ اس نظام کے تباہ کن اثرات آہستہ آہستہ سامنے آنے شروع ہو گئے تھے۔ لوگوں میں غربت اور افلاس دن بدن بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ مزدوُر اور سرمایہ دار کے تعلّقات میں کشیدگی پیدا ہو رہی تھی۔ طبقاتی تنازعات کے امکانات زیادہ ہوتے چلے جا رہے تھے۔ اس صُورتِ حالات نے ان مفکّرین کو جو سینے میں دلِ درد آگیں رکھتے تھے بہت متأثر کیا۔ یہ مفکّرین جارحانہ کارروائیوں سے نہیں بلکہ تعلیم و تلقین اور اخلاقی اپیلوں سے طبقہ بالا میں تبدیلی کے لئے کوشاں تھے۔ ان میں سے سب سے پہلے ہمارے سامنے (SAINT SIMON-1760-1825) آتا ہے۔ یہ

**سائمن**

مزدوُروں کے طبقہ کا حامی تھا۔ یہ ان کی جسمانی اور تعلیمی حالت میں خوشگوار تبدیلی کا خواہاں تھا۔ اس کا نظریہ یہ تھا کہ معاشرے کی از سرِ نو تنظیم کی جائے کہ اس میں تمام افراد کام کریں۔ کوئی شخص بھی بے کار بیٹھ کر دوسروں کی محنت پر زندگی بسر نہ کرے۔ اس کے متبعین اس حد تک بھی آگے بڑھ گئے تھے کہ وہ چاہتے تھے۔

کہ سرمایہ دار طبقہ مٹ جائے۔ وراثت کو ختم کر دیا جائے اور مزدوروں میں زیادہ سے زیادہ اجتماعیت اور اشتراکیت کا جذبہ پیدا کیا جائے ان میں نمایاں شخصیت اوین (ROBERT OWEN - 1771-1858) کی تھی۔

**رابرٹ اوین**

اس کی معاشی فکر کا بنیادی اصول یہ تھا کہ انسان اپنے ماحول کی پیداوار ہوتا ہے۔ وہ اپنا کیریکٹر خود نہیں بناتا اس کا معاشرہ اس کا کیریکٹر بنا کر دیتا ہے۔ اوین ایک نظری مفکّر نہ تھا، بلکہ ایک عملی مصلح تھا۔ اس نے گلاسکو کے قریب، نیو لینارک کی بستی میں ایک کارخانہ خریدا جس میں مزدوروں کے علاوہ بہت سے بچے بھی کام کرتے تھے۔ اس نے بچوں کو اس جانکاہ مشقت سے نجات دلائی۔ مزدوروں کے لئے عمدہ رہائش گاہیں بنوائیں۔ مدرسے کھولے، ان کی حفظانِ صحت کا انتظام کیا۔ اس کا کہنا تھا کہ سرمایہ دار کے لئے پانچ فی صدی منافع کافی ہے۔ بس سے زیادہ سب کا سب مزدوروں کی بہبودی پر صرف ہونا چاہیئے۔ یہ تجربہ مزدوروں کے حق میں تو بہت اچھا ثابت ہوا۔ لیکن سرمایہ دار طبقہ نے اوین کا ساتھ چھوڑ دیا وہ اُسے اور یہ انہیں پاگل کہتا تھا۔ اس کے بعد اوین نے مذہب کی بھی مخالفت شروع کر دی۔ وہ کہتا تھا کہ مذہب کا عقیدہ ہے کہ انسان اپنے اعمال کا آپ ذمّہ دار ہے۔ حالانکہ یہ حقیقت کے خلاف ہے۔ اس کے اعمال کا ذمّہ دار وُہ معاشرہ ہے۔ جس کی وہ پیداوار ہے۔ اس کے دوستوں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ یہ اپنی دھن کا پکّا تھا۔ اُس نے مزدوروں کی اصلاح کا کام جاری رکھا۔ مارکس اس کے بنیادی نظریہ سے بہت متأثر تھا کہ انسان اپنے ماحول کی پیداوار ہوتا ہے۔ (COLE) کے الفاظ ہیں۔ جس نے اوین کے سوانحِ حیات لکھے ہیں۔ "اگرچہ اس وقت اشتراکیین کے نزدیک یہ تصوّر مارکس کا پیدا کردہ ہے۔ لیکن درحقیقت اس کا مصنّف اوین ہے۔" لہٰذا مارکس کی مادی تعبیر کا سہرا اوین کے سر ہے۔ یہ نظریہ بھی اوین ہی کا ہے۔ کہ انسان کی ترقی کے راستے میں تین بڑے بڑے موانع ہیں۔ ذاتی جائیداد، مذہب اور شادی۔ اس کا خیال تھا کہ صحیح اشتراکی زندگی میں ان تینوں کو مٹا دینا ہوگا۔ اس سے آپ نے اندازہ لگا لیا ہوگا۔ کہ مارکس کی اشتراکیت کس حد تک اوین کی مرہونِ منّت ہے۔

**لوئی بلاں** اسی قسم کا ایک اشتراکی ریفارمر (LOUIS BLANCE) تھا۔ یہ فرانس کا انقلابی ریفارمر تھا۔ اس کا نظریہ یہ تھا کہ مملکت کے ہر فرد کے لئے کام مہیا کرنا حکومت کا فریضہ ہے اور مزدوروں کو ان کی محنت کے مطابق ہی معاوضہ نہیں ملنا چاہیئے۔ بلکہ اتنا زیادہ ملنا چاہیئے جس سے ان کی تمام ضروریات زندگی پوری ہو جائیں۔

**پرادھن** اسی جماعت کا ایک ممتاز فرد پرادھن (PROUDHAN-1809-1868) تھا۔ یہ درحقیقت مارکسی اشتراکیت کا طائرِ پیش رس تھا۔ اس کا عقیدہ یہ تھا کہ جائیداد خالص چوری ہے اور جائیدادوں کے مالک سب چور ہیں۔ وہ کہتا تھا کہ جائیداد بنتی اس طرح ہے کہ دوسرے لوگ محنت کرتے ہیں اور اس کے ماحصل کو کوئی اور لے اُڑتا ہے۔ زمین کے متعلق اس کا نظریہ یہ تھا کہ یہ فطرت کا عطیہ ہے جس پر مملکت کا کوئی حق نہیں۔ نہ ہی اسے بٹائی اور کرایہ پر دیا جا سکتا ہے۔ اس سے صرف انسان کی ضروریات پوری کی جا سکتی ہیں۔

**کارل مارکس 1818-1883** یہ تھے وہ اشتراکیین جنہوں نے مارکس کے لئے زمین ہموار کی۔ کارل مارکس، یہودی النسل، جرمنی باشندہ تھا۔ برلن یونیورسٹی میں یہ ہیگل کے فلسفہ سے متاثر ہوا۔ اور یہی اس کے معاشی فکر کی بنیاد بنا۔ شروع شروع میں اس نے جرمنی کے بعض رسائل میں لکھنا شروع کیا لیکن جب وہاں فضا سازگار نظر نہ آئی۔ تو یہ پیرس چلا آیا۔ وہاں اس کی ملاقات انجلز (FREDRICK ENGLES) سے ہوئی جو اس کی معاشی فکر کا بہت بڑا ستون ثابت ہوا۔ وہیں یہ پرادھن (PROUDHAN) سے بھی ملا۔ اور اس کے نظریات سے بہت متاثر ہوا۔ جب اس نے پیرس میں اپنے خیالات کی نشر و اشاعت شروع کی تو جرمنی کی حکومت کے ایماء پر اسے ۱۸۴۵ء میں وہاں سے نکال دیا گیا۔ اس طرح یہ برسلز آ گیا۔ اس مقام پر اس کی ملاقات (LEAGUE OF THE JUST) کے نمائندوں سے ہوئی۔ یہ ایک انقلابی جماعت تھی جو لندن میں اپنا کنونشن منعقد کرنا چاہتی تھی۔ انہوں نے مارکس اور انجلز سے کہا کہ وہ ان کے لئے ایک منشور مرتب کر دیں اور اس طرح وہ مشہور منشور وجود میں آیا جسے (COMMUNIST MANIFESTO)

کہتے ہیں۔ اور جو مارکسی اشتراکیت کا عروۃ الوثقیٰ ہے۔ ۱۸۴۹ء میں مارکس خود بھی لندن چلا گیا۔ ۱۸۶۷ء میں اس کی مشہور کتاب سرمایہ (CAPITAL) شائع ہوئی۔ جس نے معاشی فکر کی دنیا میں انقلاب پیدا کر دیا۔ ہمارے نزدیک عصرِ حاضر میں یہ نظامِ حیات ہے۔ جو دین کی شکل میں دین الحق (الاسلام) کے سامنے آیا ہے۔ مارکسزم موجودہ زمانے کا بڑا کتا ہُوا موضوع ہے۔ اس کے مخالف و موافق بہت کچھ لکھا اور کہا جا چکا ہے۔ نظامِ سرمایہ داری کے ستائے ہوئے لوگ اسے محض اقتصادی نظام سمجھ کر قبول کئے جا رہے ہیں۔ قبل اس کے کہ ہم مارکسزم کا مطالعہ کریں اور اس کے معاشی فکر کو سمجھنے کی کوشش کریں، ایک بنیادی حقیقت کی وضاحت ضروری ہے کہ ایک تو ہے۔ وُہ معاشی نظام (ECONOMIC SYSTEM) جو اشتراکیت کے نام سے بالخصوص رُوس اور چین میں تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ رائج ہے۔ ایک ہے وہ فلسفۂ حیات جس کی بنیادوں پر یہ معاشی نظام قائم ہوا ہے۔ عموماً دیکھا یہ گیا ہے کہ اشتراکی نظام پر بحث کرتے ہوئے ان دونوں کو خلط ملط کر دیا جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے بحث کسی صحیح نتیجہ تک نہیں پہنچ سکتی۔ لہٰذا آیندہ سطور میں جو کچھ آپ کے سامنے آئے گا۔ ان دونوں کے فرق کو سامنے رکھیئے گا۔ مارکس کا فلسفہ سمجھنے کے لئے ہیگل کے فلسفہ اضداد کے تمہیدی خطوط کو سامنے لانا ضروری ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر مارکس کا نظریہ اچھی طرح ذہن نشین نہیں ہو سکے گا۔ ہیگل (HEGAL) کے فلسفہ کے خطوط یہ ہیں کہ:۔

## ہیگل کا فلسفہ

۱۔ تمام کائنات ایک مسلسل تغیّر کا نام ہے۔ یہاں کوئی شئے جامد (STATICS) نہیں۔ ہر شئے میں ہر آن تبدیلی واقع ہوتی رہتی ہے۔

۲۔ اشیاء درحقیقت تصوّرات (IDEAS) کا مظہر ہیں۔ لہٰذا یہ کائنات دُنیائے تصوّرات (WORLD OF IDEAS) ہے۔

۳۔ جو کچھ اشیاء کے متعلق اُوپر کہا گیا ہے وُہ درحقیقت تصوّرات کے متعلق ہے۔ یعنی یہاں کوئی تصوّر اپنی مکمّل حالت میں نہیں۔ ہر تصوّر نا تمام ہے۔ اس لئے ہر آن تغیّرات واقع ہوتے رہتے ہیں۔

۴۔ زمانۂ سلف میں اشیاء اور تصوّرات کو جامد تسلیم کیا جاتا تھا اس لئے ان

کے متعلق منطق (FORMAL LOGIC) کی رُو سے گفتگو کی جاتی تھی۔ اس اندازِ منطق میں صغریٰ اور کبریٰ دونوں مستقل ہوتے تھے اور اس سے مستقل نتیجہ مُرتّب کر لیا جاتا تھا۔ لیکن اس حقیقت کے پیشِ نظر کہ یہاں کوئی شے مستقل اور اور جامد ہے ہی نہیں، یہ اسلوبِ منطق بالکل بیکار ہو جاتا ہے۔ اس کی جگہ اب ایک نیا منطق آنا چاہیئے۔ اس منطق کا نام ہیگل کی اصطلاح میں جدلیت (DIALECTIC) ہے۔ اس میں صغریٰ کی جگہ (THESIS) کبریٰ کی جگہ (ANTITHESIS) اور نتیجۂ متخرجہ کی جگہ (SYNTHESIS) کی اصطلاحات استعمال ہوتی ہیں۔

۵۔ ایک تصوّر (IDEA) اپنی ناتمام حالت میں سامنے آتا ہے۔ اسے (THESIS) کہتے ہیں۔ لیکن اس کی "ناتمامیت" کو پُورا کرنے کے لئے اس میں سے ایک دُوسرا تصوّر، وجُود کوش ہوتا ہے۔ جو پہلے تصوّر کی ضد ہوتا ہے۔ اسے (ANTITHESIS) کہا جاتا ہے۔ ان دونوں تصوّرات کی کی باہمی کش مکش (جنگ و جدل) سے ایک تیسرا تصوّر پیدا ہوتا ہے جسے (SYNTHESIS) کہتے ہیں۔ یہ جدید تصوّر، پہلے دونوں تصوّرات سے متمیز ہوتا ہے۔ اس میں دونوں تصوّرات کے محاسن موجود ہوتے ہیں۔ اور اس لحاظ سے اس کا مقام اُن سے بلند ہوتا ہے۔ لیکن یہ تصوّر بھی ناتمام ہوتا ہے۔

اب یہ ناتمام تصوّر پھر ایک نیا (THESIS) بن جاتا ہے۔ اس میں سے ایک (ANTITHESIS) پیدا ہوتا ہے۔ اب یہ دونوں باہمی جدل و پیکار سے ایک نئے (SYNTHESIS) کی تخلیق کا موجب بن جاتے ہیں۔ کائنات میں ارتقاء اسی عمل سے جاری وساری ہے۔ اضداد کی کش مکش سے ارتقاء۔

آپ نے دیکھ لیا کہ اس طرح ایک تہذیب ناتمام سے ایک نئی تہذیب اُبھرتی ہے۔ جو پہلی کی ضد ہوتی ہے۔ پھر ان دونوں کی باہمی کش مکش سے ایک تیسری تہذیب منصّۂ شہود پر آتی ہے۔ جو پہلی دونوں تہذیبوں کے مذمومات کو

الگ کر کے ان کے محاسن کو اپنے دامن میں لئے ہوتی ہے۔ پھر یہ نئی اور نا تمام تہذیب اسی جدل و پیکار کی اگلی کڑی بن جاتی ہے۔ یہ سلسلہ اسی طرح چلا آتا ہے۔ اور اسی طرح جاری رہے گا۔ تا آنکہ دُنیا پر وُہ آخری تہذیب چھا جائے گی۔ جو رُوحِ کائنات کی مکمل نمود کا پیکر ہوگی۔

یہ ہے ہیگل کے نظریہ کے مطابق شاہراہ زمانہ پر رُوحِ کائنات کی داستانِ سفر!
ہیگل نے کہا کہ دُنیا میں ایک تصوّر (IDEA) وجود میں آتا ہے وُہ بڑھتا، پھُولتا، پھلتا ہے۔ جب وُہ اپنے شباب پر پہنچ جاتا ہے تو اس میں سے اس کی ضدّ ایک اَور تصوّر پھُوٹتا ہے۔ وہ بھی اسی طرح پروان چڑھتا ہے، تو پھر ایک تیسرا تصوّر پیدا ہوتا ہے جو ان دونوں باہمدگر متصادم تصوّرات کے محاسن کو لئے اُبھرتا ہے۔ اس طرح یہ سلسلۂ تصوّرات آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ روحِ عنصر (SPIRIT OF THE AGE) اس عملِ پیہم کی محرک ہوتی ہے

مارکس، اسی مکتبِ فکر سے متعلق تھا، لیکن اُس نے کہا یہ تضاد و تغیّر تصوّرات میں نہیں بلکہ انسانی زندگی کے معاشی نظام میں رُونما ہوتا ہے اور تاریخی وجوب (HISTORICAL NECESSITY) اس کی قوتِ متحرکہ ہے۔

**ماؤزے تنگ**

ماؤزے تنگ بھی اُصولی طور پر اسی فلسفہ اضداد کا مویّد ہے۔ لیکن وُہ ہیگل بلکہ (مارکس سے بھی ایک حد تک) اختلاف رکھتا ہے۔ اس کا فلسفہ اس کے مجموعہ تحریرات (WORKS) میں مختلف میں بکھرا ہوا ہے اس کی اصل و اساس قانون اضداد (LAW OF CONTRADICTION) ہے۔ اس کے ماحصل کو ذیل کے الفاظ میں بیان کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ کائنات کی نشوونما کے سلسلہ میں شروع ہی سے دو تصوّرات شانہ بشانہ چلے آتے نظر آتے ہیں۔ جو ایک دُوسرے سے متضاد ہیں۔ ایک تصوّر وُہ ہے جسے عام طور پر ماورا الطبعیاتی (METAPHYSICAL) کہا جاتا ہے اَور دُوسرے کو مادی جدلیت (DIALECTIC MATERIALISM) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

۲۔ ماورا الطبعیاتی فلسفہ کی رُو سے سمجھا یہ جاتا ہے۔ کہ کائنات کی ہر شئے ایک

مستقل وجود رکھتی ہے۔ وہ دیگر اشیائے کائنات سے بالکل لاتعلق اور الگ تھلگ ہوتی ہے اور شروع سے آخر تک وہی شئے رہتی ہے۔ اس کی ذات میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔ وہ کچھ اور بن ہی نہیں سکتی۔ خارجی عناصر اس پر ضرور اثرانداز ہوتے ہیں لیکن اس کے صرف مظاہر میں تبدیلی آتی ہے۔ اس کی اصل و بنیاد میں تبدیلی نہیں ہوتی۔ یعنی اس کی تبدیلی کمیت کی (QUANTITATIVE) ہوتی ہے۔ کیفیت (QUALITATIVE) نہیں ہوتی۔ جن اشیاء میں کچھ پیدا کرنے کی صلاحیت ہے، وہ اپنے جیسی چیز ہی پیدا کر سکتی ہیں۔ جیسے آم کی گٹھلی سے آم پیدا ہو جاتا ہے اور بکری کا بچہ، آخر کار بکری بن سکتا ہے کچھ اور نہیں۔ لہٰذا کائنات میں تخلیق کا عمل، گردش دولابی (RAPITATION) سے زیادہ کچھ نہیں۔ یہی اُصول اشیائے کائنات میں کارفرما ہے اور یہی قانون، انسانی فکر و تصوّرات کی دُنیا میں۔ اصل کے اعتبار سے تبدیلی نہ اُن میں ہوتی ہے۔ نہ ان میں۔

۳۔ اس کے برعکس، جدلیاتی فلسفہ کی رُو سے کائناتی نشوونما کا تصوّر یہ ہے کہ

(ا) کائنات کی ہر شئے کے اندر شروع سے آخیر تک، ہمیشہ دو متضاد عناصر موجود ہوتے ہیں اور ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہتے ہیں۔ ان کے اس تصادم یا ٹکراؤ کی جہت سے اس فلسفہ کو جدلیاتی (DIALEETIC) کہا جاتا ہے۔

(ب) ان متضاد عناصر میں سے ایک وقت میں ایک عنصر غالب رہتا ہے اسے (PRINCIPAL) کہا جاتا ہے اور دُوسرا مغلوب جسے (SECONDARY) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یعنی ان میں سے ایک کا پلڑا بھاری رہتا ہے اور دوسرے کا ہلکا۔ بھاری یا غالب عنصر کی جو کیفیات ہوں، اُن کی نسبت سے وہ شئے متعارف ہوتی ہے۔

(ج) باہمی تصادم سے، کچھ وقت کے بعد، مغلوب عنصر، غالب ہو جاتا ہے۔ اور غالب عنصر، مغلوب۔ اور چونکہ ہر شئے کا تشخّص، غالب عنصر کی نسبت سے متعیّن ہوتا ہے۔ اس لئے اس تبدیلی سے وہ شئے خود ایک دُوسری شئے میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ شکل و صُورت کے اعتبار ہی سے نہیں بلکہ اصل و بنیاد

کی رُو سے بھی بالکل جدید شئے۔ اس قانون کو وحدتِ تضادات (UNITY OF OPPOSITES) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جوما زؤ ے تنگ کے نزدیک عالمگیر اور بنیادی قانونِ کائنات ہے۔

**ایک اہم استثناء** یہاں تک تو آپ نے دیکھ لیا کہ جدلیاتی فلسفہ کی رُو سے، اشیائے کائنات ہوں یا انسانی فکر و تصوّرات، ان میں کوئی بھی غیر متبدّل نہیں، ہر ایک تغیّر پذیر ہے۔ لیکن خود یہ قانون (LAW OF CONTRADICTION) جس کی رُو سے یہ تمام تغیّرات رُونما ہوتے رہتے ہیں. غیر متغیّر اور غیر متبدل۔

ثبات ایک تغیّر کو ہے زمانے میں

**ماؤزے تنگ کے اپنے الفاظ میں**

"یہ ایک عالمگیر صداقت ہے جو زمان و مکان کی حدود سے ماوراء ہے۔ اس میں کوئی استثناء نہیں ہو سکتی۔ یہ کائنات کا عمومی، ابدی اور غیر متبدل قانون ہے"

دُوسرے مقام پر ماؤزے تنگ نے اسے معروضی قانون OBJECTIVE LAW کہا ہے یعنی ایسا قانون جو نہ اشیائے کائنات کا پیدا کردہ ہے نہ ذہنِ انسانی کی تخلیق ہے۔ بلکہ موجود فی الخارج ہے۔ چونکہ یہ قانون، تمام کائنات میں جاری و ساری ہے۔ اس لئے اسے موجود فی الخارج کہا جائے گا۔ تو اس کا سرچشمہ لامحالہ کائنات (UNIVERSE) سے ماوراء قرار دیا جائے گا۔

ماؤزے تنگ نے انسانی فکر کے متعلق تو یہ کہا ہے۔ لیکن خود انسان کے متعلق اس نے بصراحت کچھ نہیں کہا۔ ایسا نظر آتا ہے کہ چونکہ اس کے نزدیک (بلکہ مادی تصوّرِ حیات کی رُو سے)، کائنات میں مادہ کے علاوہ کسی اور شئے کا وجود ہی نہیں اس لئے انسان کا شمار بھی اشیاء (THINGS) میں ہوتا ہے۔ اس لئے شاید اس کے متعلق جُداگانہ بحث کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ لہٰذا یوں سمجھنا چاہیئے کہ جو کچھ دیگر اشیاء کے ساتھ ہوتا ہے، وُہی کچھ انسان کے ساتھ بھی ہوتا ہے۔

اس فلسفہ کی رُو سے کہا یہ گیا ہے کہ:۔

۱۔ متضاد عناصر کے باہمی تصادم کا سلسلہ لامتناہی ہے۔

۲- اس تصادم کے سلسلہ میں ہر نئی شئے جو وجود میں آتی ہے پہلی شئے سے بہتر اور ارفع ہوتی ہے۔

۳- اس قانونِ ارتقاء میں رجعت (واپس لوٹنا) نہیں۔ آگے بڑھنا ہی ہے۔

یہاں سے ایک اہم سوال سامنے آتا ہے۔ جامد مادہ، اس طریقِ جدلیت کی رُو سے رفتہ رفتہ پیکرِ انسانی میں تبدیل ہو گیا۔ اس میں نئی چیز اس کی فکر اور شعور۔ بلکہ شعورِ خویش (SELF CONSCIOUSNESS) ہے۔ اس لحاظ سے یہ سابقہ کڑیوں سے بلند اور اعلیٰ ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ جدلیت کے لامتناہی سلسلہ کی رُو سے اس کے بعد کیا ہوگا؟ ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ موت کے بعد انسانی جسم، بے جان مادہ رہ جاتا ہے۔ جو کچھ عرصہ بعد منتشر (DECOMPOSE) ہو کر مختلف کیمیائی اجزا میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ لوہا، چونا، فاسفورس وغیرہ۔ اگر انسان اسی جسم کا نام تھا۔ تو اس کی یہ تبدیلی اسے آگے لے جانے کے بجائے جامد مادہ کی اسی پہلی کڑی میں لے گئی جہاں سے سلسلہ ارتقاء کی ابتدا ہوئی تھی۔ یہ ارتقا نہیں، رجعت ہے اور رجعت بھی ایسی کہ جدلیّت کی کش مکش نے جو منازل ہزارہا سال میں طے کئے تھے، موت کی ایک ضرب کاری نے ان سب کو خاک میں ملا کر رکھ دیا اور بات جہاں سے چلی تھی پھر وہیں پہنچ گئی۔ قرآن کی مثال میں بڑھیا نے جو سُوت دن بھر کی محنت سے کاتا تھا۔ شام کو خود اپنے ہی ہاتھوں سے تار تار کر کے رکھ دیا اور دوسرے دن وُہ پھر چرخہ لے کر بیٹھ گئی۔

ماؤ سے تنگ نے اپنے "اقوال" میں ایک جگہ کہا ہے کہ :-

"کمیونزم، تاریخِ انسانیت میں، مکمل ترین، ترقی پذیر، انقلابی اور معقول نظام ہے۔ یہ تصوّر فلسفۂ اضداد کے خلاف ہے۔ اس فلسفہ کی رُو سے کوئی شئے، کوئی تصوّر، کوئی نظام، کسی وقت بھی مکمل نہیں ہوتا۔ وُہ تغیر پذیر ہوتا ہے اور ہر آن بدلتا رہتا ہے۔ اور تغیرات کا عمل لامتناہی ہوتا ہے۔"

## کارل مارکس کا نظریہ

کارل مارکس نے نظریۂ اضداد اور فلسفۂ پیکار تو ہیگل سے لیا لیکن وہ ابھی دو قدم بھی اس کے ساتھ نہ چلا تھا کہ اس نے اپنا مستقل راستہ الگ تجویز کر لیا۔ مارکس نہ خدا کا قائل تھا، نہ رُوحِ کائنات

کا۔ وہ نہ تصورات کو مانتا تھا، نہ ان کی تکمیلی کوششوں کو۔ وہ انیسویں صدی کے میکانکی تصورِ حیات کا مکمل نمونہ تھا لہٰذا اس نے کہا کہ :-

(ا) اضداد کی جنگ و پیکار بجا و درست، لیکن یہ جنگ و جدل تصورات میں نہیں ہوتی۔ کیونکہ تصورات تو ذہنِ انسانی کی پیداوار ہیں۔ ان کا الگ مستقل وجود نہیں۔ کائنات میں مادی اشیاء ہی درحقیقت اپنا وجود رکھتی ہیں۔ اس لئے اصل جنگ و پیکار مادیت ہی کی دنیا میں ہنگامہ آرا ہے۔ مارکس کے الفاظ میں تصورات کیا ہیں؟ مادی دنیا کا وہ عکس جو انسان کے دل میں مرتسم ہوتا ہے اور جسے وہ ذہنی افکار کی راہوں سے پیش کرتا ہے۔

(ب) اس سے کہا گیا کہ اشیاء تو کہیں ایک دوسرے سے لڑتی نظر نہیں آتیں پھر یہ اشیاء میں جنگ و پیکار کا نظریہ کیا معنی رکھتا ہے؟ اس نے کہا کہ انسان کی دنیا میں اصل سوال روٹی کا ہے۔ اس لئے انسانی دنیا میں اشیاء سے مراد وسائلِ پیداوار (MEANS OF PRODUCTION) ہیں۔ جن لوگوں کے ہاتھوں میں وسائلِ پیداوار ہوتے ہیں۔ وہ ایک طبقہ (CLASS) بن جاتے ہیں۔ اور جن لوگوں کو وہ پیداوار کے لئے بطور وسائل و ذرائع استعمال کرتے ہیں۔ وہ دوسرا طبقہ بن جاتے ہیں۔ اب تصورات کی جگہ ان طبقات میں جنگ ہوتی ہے۔ ایک طبقہ اٹھتا ہے۔ اس کی ضد دوسرا طبقہ ہوتا ہے۔ ان دونوں میں کش مکش ہوتی ہے۔ اس کش مکش سے ایک تیسرا طبقہ وجود میں آجاتا ہے جو پہلے دونوں طبقوں کی خوبیاں اپنے اندر رکھتا ہے۔ لیکن چونکہ یہ بھی ناتمام ہوتا ہے۔ اس لئے یہ طبقہ پھر مزید جنگ و جدل کی پہلی کڑی بن جاتا ہے۔

(ج) انسان کی ساری تاریخ، اسی طبقاتی جنگ و جدل کی داستان ہے۔ ہمارے دور میں پہلا طبقہ سرمایہ داروں کا ہے۔ اور دوسرا طبقہ مزدوروں کا۔ ان دونوں کے باہمی جدل سے یہ سلسلۂ ارتقاء آگے بڑھے گا۔ تا آنکہ ایک دن ایسا آجائے گا۔ جب دنیا سے طبقاتی تفریق ختم ہو جائے گی۔ اور تمام انسان ایک ہی جماعت بن جائیں گے۔ اس دور کا نام اشتراکیت (COMMUNISM) ہوگا۔

آپ نے دیکھا ہے کہ وہ قوت جس کی بنا پر یہ تمام سلسلہ جنگ و پیکار جاری ہے۔ رُوحِ کائنات ہے۔ لیکن مارکس اسے تاریخی قوت (FORCE OF HISTORY) کے نام سے تعبیر کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسانی تاریخ، اسی معاشی کش مکش اور طبقاتی نزاع کی داستانِ خونین ہے۔ اسے تاریخ کی معاشی تعبیر (ECONOMIC INTERPRETATION OF HISTORY) کہا جاتا ہے۔

## منشورِ اشتراکیت

مارکس کے فلسفہ کے مبادیات آپ کے سامنے آ چکے ہیں۔ اسی فلسفہ کی بنیادوں پر اس نے تحریکِ اشتراکیت کی بنیاد رکھی۔ اس کا منشور مارکس اور انجلز کی مشترکہ کوشش کا نتیجہ ہے۔ انجلز اس منشور کے انگریزی ترجمہ میں جو ۱۸۸۸ء میں شائع ہوا لکھتا ہے:۔

تاریخ کے ہر دور میں، معاشی پیداوار اور تبادلہ طریق اور وہ معاشرتی نظام جو اس طریق پیداوار اور تبادلہ کا لازمی نتیجہ ہوتا ہے۔ وہ بنیادیں ہوتی ہیں، جن پر اس دور کی سیاسی اور ذہنی تاریخ کی عمارت استوار ہوتی ہے اور جن کی روشنی میں اس دور کی تاریخ کی صحیح تعبیر کی جا سکتی ہے۔ لہٰذا اس قبائلی زندگی کو چھوڑ کر جب زمین مشترکہ ہوتی تھی) انسانی تاریخ، طبقاتی جنگ کی تاریخ ہے۔ یعنی لوٹنے والوں اور لُٹنے والوں کے درمیان جنگ، حاکم اور محکوم کے مابین پیکار۔ یہ طبقاتی نزاعات سلسلۂ ارتقا کی کڑیاں ہیں جن میں اب وہ منزل آگئی ہے۔ جس میں مزدوروں کا مجبور اور مقہور طبقہ اپنے آپ کو سرمایہ داری کے پنجۂ آہنی سے نہیں چھڑا سکتا تا وقتیکہ تمام انسانی معاشرے کو ان درندوں کے مظالم سے نجات نہ دلائی جائے۔

اس کے بعد اشتراکی منشور شروع ہوتا ہے۔ جس کے پہلے صفحہ پر یہ عبارت ملتی ہے:۔

انسان نے اس وقت تک جتنے معاشرے قائم کئے ہیں۔ ان سب کی تاریخ، طبقاتی نزاع کی تاریخ ہے۔ غلام اور آقا، اُمرا و جمہور، سرمایہ دار اور مزدور ہمیشہ ایک دوسرے کے مخالف اور باہم برسرِ پیکار رہے ہیں۔ یہ لڑائی صدیوں سے یونہی مسلسل جاری ہے۔ کبھی اس کی آگ دھیمی پڑ جاتی ہے اور مخفی طور پر

اندر ہی اندر سُلگتی رہتی ہے۔ اور کبھی اس کے شعلے بھڑک اُٹھتے ہیں۔ پھر اس کا انجام یا تو یہ ہوتا ہے۔ کہ ایک انقلاب پُورے معاشرے کو بدل ڈالتا ہے یا پھر دونوں برسرِ پیکار طبقے مٹ جاتے ہیں۔

مارکس اپنی کتاب (THE POVERTY OF PHILOSOPHY) میں لکھتا ہے:۔

وسائلِ پیداوار کی تبدیلی سے انسانی معاشرے میں بھی تبدیلی آجاتی ہے۔ ہاتھ کی چکّی گاؤں کا سردار پیدا کرتی ہے۔ انجن سے چلنے والی چکّی صنعتی سرمایہ دار پیدا کرتی ہے۔ ... ... ... لہٰذا انسان کے تمام معاشرتی تصوّرات، معاشی تاریخ کی عبوری پیداوار ہیں۔

اشتراکی منشور میں مارکس لکھتا ہے :۔

میں تاریخ میں جس نظریہ کا اضافہ کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ :۔

(۱) انسانی طبقات، مادی پیداوار کے مختلف پہلوؤں سے وابستہ ہیں۔

(۲) طبقاتی نزاع کا فطری نتیجہ مزدوروں کی آمریت ہوگا، اور

(۳) یہ آمریت درحقیقت ایک عبوری دَور ہوگا جس کے بعد تمام طبقات کی تفریق مٹ جائے گی اور ایک آزاد اور ہموار معاشرے کا قیام عمل میں آجائے گی۔

ان تصریحات سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ مارکسی فلسفۂ اشتراکیت کی رُو سے، انسانی زندگی کا سارا مسئلہ فقط "روٹی" کا مسئلہ ہے انسان آب و گِل کی پیداوار ہے۔ روٹی کے آسرے پر جیتا ہے۔ اس کی تہذیب اس کا تمدن، اس کا معاشرہ۔ اس کے تمام ذہنی تصوّرات اور قلبی رجحانات، سب کے سب اس کے معاشی طرزِ زندگی کے ساتھ وابستہ ہیں۔ نہ کائنات میں کوئی غیر متبدل قوانین کارفرما ہیں، نہ مستقل اور مطلق اقدار ہیں، نہ کہیں خیر ہے نہ شر۔ انسان ایک حیوان ہے، جس کا مقصدِ زندگی کھانا کھا کر زندہ رہنا اور عمر طبعی کے بعد مر جانا ہے۔ بلکہ حیوان سے بھی بدتر۔ کیونکہ جنگل کے حیوانات کو اپنی خوراک کے لئے کبھی اس قدر تگ و تاز اور جدّ و جہد نہیں کرنی پڑتی۔

ہیگل کا ایک شاگرد (FEUERBACH) یہ اس دور کا متشدّد مادہ پرست تھا۔

اس لئے مارکس اور انجلز کا بڑا محبوب۔ اس کا قول ہے کہ جو کچھ انسان کھاتا ہے۔ اسی کا نام انسان ہے (MAN IS WHAT HE EATS) وہ اپنی کتاب (ESSENCE OF CHRISTIANITY) میں لکھتا ہے :-

انسان اور فطرت کے باہر کسی شے کا وجود نہیں۔ ہمارے مذہبی تصورات نے جن بلند ہستیوں کو پیدا کر رکھا ہے۔ وہ ہمارے ذہن کے تراشیدہ افسانے ہیں۔

اس سے ظاہر ہے کہ مارکس کے نشترِ تنقید کی پہلی زد، مذہب کی رگِ جان پر پڑی ہو گی (ایسا ہی ہوا تھا) چنانچہ وہ اپنی کتاب (CRITIQUE OF THE PHILOSOPHY OF LAW OF HEGEL) میں لکھتا ہے :-

مذہب انسانی ذہن کی پیداوار ہے، انسان مذہب کی پیداوار نہیں۔ مذہب سے وہی انسان وابستہ رہ سکتا ہے۔ جو یا تو ابھی تک اپنے مقامِ انسانیت سے بے خبر ہے یا جس نے اس مقام کو پا کر پھر سے اسے کھو دیا ہے۔ مذہب مظلوموں کی سسکیاں، ایک پتھر کی دنیا کا قلب اور ان حالات کی روح ہے جن میں روحانیت کا نام نہیں۔ مذہب کے فنا میں حقیقی انسانی مسرت کا راز پنہاں ہے اخلاقیات مذہب، مابعد الطبیعات اور دیگر تمام تصورات، سب کے سب، حقیقی آزادی کے دشمن ہیں۔ ان کی کوئی تاریخ نہیں۔ تاریخ صرف مادی انسان کی ہے۔

## مارکسزم کی خامیاں

۱۔ مارکسزم کی رُو سے دنیا میں طبقاتی جنگ و پیکار، یونہی ہنگامی طور پر جاری و ساری نہیں۔ بلکہ وہ ایک منظم، مربوط اور منطقی صورت میں چلی آ رہی ہے۔ ایک طبقہ پیدا ہوتا ہے۔ پھر اسی میں سے اس کی ضد پیدا ہو جاتی ہے۔ ان دونوں کی کشمکش سے ایک تیسرا طبقہ پیدا ہوتا ہے۔ جو پہلے دو طبقوں کی صفات اپنے اندر لئے ہوئے ہوتا ہے۔ اور ان کی خرابیاں پیچھے چھوڑ دیتا ہے۔ پھر یہ طبقہ آئندہ جدل و پیکار کی کڑی بن جاتا ہے۔ اس نظم و ضبط کے ساتھ یہ سلسلہ برابر چلا آ رہا ہے اور اس طرح انسان کا معاشی نظام اپنی ارتقائی منازل طے کرتا، ایک مثالی نصب العین کی طرف بڑھے جا رہا ہے۔

ظاہر ہے کہ اس قسم کے مربوط اور مرتب نظم و ضبط کے ساتھ کوئی تحریک نہیں چل سکتی۔ تاوقتیکہ اس کے پیچھے کوئی با اختیار، صاحبِ ارادہ قوت نہ ہو جو حوادثِ عالم کو

اس طرح ایک شاہراہ پر چلاتی جائے۔ لیکن مارکس کسی ایسی قوت کا قائل ہی نہیں جب اُسے پُوچھیے، کہ اس سلسلہ کے پیچھے قوتِ محرکہ کون سی ہے۔ تو اس کے جواب میں وہ کہتا ہے کہ یہ سب کچھ "تاریخ کی قوت" سے ہو رہا ہے۔ اب یہ ظاہر ہے کہ "تاریخ کی قوت" ایک نہایت مبہم اصطلاح ہے۔ تاریخ تو خود رفتارِ حوادث کا نام ہے۔ کبھی رفتار بھی اپنی قوت آپ ہو سکتی ہے؟ لہٰذا اس مفروضہ کی بنیاد ہی غلط ہے۔

۲ ۔ مارکس کے فلسفہ کی رُو سے طبقاتی نزاع کا یہ سلسلہ "تاریخ کی قوت" سے چلا آرہا ہے۔ اور اسی طرح چلا جائے گا۔ تا آنکہ یہ اس منزل تک نہ پہنچ جائے۔ جہاں طبقات کی کی تفریق باقی نہ رہے اور ایک لاجماعتی معاشرہ (CLASSLESS SOCIETY) کا قیام عمل میں آجائے۔ یہ ایک اٹل تحریک ہے جو نہ کسی کے روکے سے رُک سکتی ہے نہ کسی کے چلائے چل سکتی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ مارکس کے نزدیک اس تحریک کے چلانے یا آگے بڑھانے میں انسانی قوت ارادہ وعمل کا کوئی دخل نہیں بلکہ انسان "تاریخ کی قوت" کے سامنے بے بس اور مجبور ہے۔ لہٰذا مارکس اور اس کے متبعین مزدور طبقہ کو جگاتے اور اُکساتے ہیں کہ اُٹھو اور سرمایہ داروں کے ہاتھوں سے اقتدار چھین کر رزق کے سرچشموں پر خود قابض ہو جاؤ۔ اب سوال یہ ہے کہ جب یہ انقلاب تاریخ کی قوت سے خود بخود عمل میں آکر رہے گا تو اس کے قیام کے لئے اس قدر چیخ و پکار اور ایسی جدّوجہد کی ضرورت کیا ہے؟ "تاریخ کی قوت" اپنے پروگرام کے مطابق یہ سب کچھ خود بخود کر دے گی۔ اس میں انسانی ارادہ اور عمل کا کوئی دخل نہیں۔ یہ وہ سوال تھا جس نے خود مارکس کو بھی پریشان کر رکھا تھا۔ چنانچہ اس باب میں اس کے ہاں متضاد نظریے ملتے ہیں۔ وہ کہیں تو یہ کہتا ہے کہ انسان کے اعمال وافعال، مادی پیداوار پر فیصلہ کن اثر کرتے ہیں۔ اور کہیں یہ کہ انسان اپنی تاریخ آپ بناتا ہے۔ لیکن جن احوال وکوائف سے وہ اس تاریخ کو بناتا ہے ان کے انتخاب میں اس کے ارادہ کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ بلکہ صرف انہی کوائف سے بناتا ہے جو خود بخود اس کے سامنے موجود ہوتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ مارکس کے فلسفہ کی رُو سے انسان مجبورِ محض رہ جاتا ہے۔ لیکن اگر انسان مجبور ہے تو پھر اشتراکی انقلاب کے داعیان کے لئے بڑی مشکل کا سامنا ہو جاتا ہے۔ وہ لوگوں کو اس انقلاب کے لئے اُبھار ہی نہیں سکتے۔ اس لئے انہیں لامحالہ انسان

کو با اختیار ماننا پڑتا ہے۔ مارکس کا فلسفہ اپنے اس اندرونی تضاد کا کوئی حل پیش نہیں کر سکا۔

۳۔ اور آگے بڑھیئے۔ مارکس کے فلسفہ کی رُو سے جدل مادیت کا یہ سلسلۂ جنگ و پیکار جاری رہے گا۔ تا آنکہ ایک لاجماعتی معاشرے کا قیام عمل میں آجائے۔ ظاہر ہے کہ جب انسانی معاشرے میں طبقات کی تفریق باقی نہ رہے گی تو پھر نہ یہ نزاع باقی رہے گی۔ اور نہ ہی اس نزاع پر متفرع سلسلۂ ارتقاء۔ اب سوال یہ ہے کہ اس کے بعد کیا ہوگا؟

مارکس کے فلسفہ کی بنیاد اس اصول پر ہے کہ دُنیا میں کوئی شئے ایک حالت پر نہیں رہ سکتی۔ ہر شئے میں پیہم اور مسلسل تغیر واقع ہو رہا ہے۔ تو ظاہر ہے کہ معاشرہ کی وُہ لاجماعتی حالت جس پر موجودہ سلسلۂ جنگ و جدل منتج ہوگا۔ جامد نہیں رہ سکتی۔ اس میں بھی تغیر واقع ہوگا اور ضرور ہوگا۔ (مارکس کا فلسفہ یہی کہتا ہے) مارکس خود کہتا ہے۔ کہ "اس وقت سابقہ تاریخ کا خاتمہ ہو جائے گا اور نئی تاریخ کا ابتدا ہوگی"۔ لیکن سوال یہ ہے کہ "اس لاجماعتی دنیا" کی تاریخ کس قانون کی رُو سے مرتب ہوگی؟

اس باب میں مارکسزم کے متبعین کا جواب یہ ہے کہ:۔

"ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ تغیر کس قسم کا ہوگا؟ ممکن ہے اس وقت طبقاتی تفریق کو چھوڑ کر کسی اور بنیاد پر انسانی نزاع شروع ہو جائے، لیکن اس کے متعلق ہم کچھ نہیں جانتے"۔

(THE MEANING OF MARXISM - BY G.D.H. COLE P.275)

اوسپنسکی | اوسپنسکی مادی نظریۂ حیات پر تنقید کرتا ہوا لکھتا ہے:۔

"ہاں بہت اچھا! آخرالامر، ہر ایک انسان کو اچھی سے اچھی روٹی مل جائے گی۔ اور اس کی نگہداشت کے سامان بھی موجود ہوں گے۔ لیکن اس کے بعد پھر کیا؟ ہم فرض کئے لیتے ہیں۔ اگرچہ ایسا فرض کرنا ناممکنات میں سے ہے۔ کہ مادی کلچر انسان کو ایک قابلِ رشک مادی زندگی عطا کر دیتا ہے۔ مادی تہذیب بہار پر آجاتی ہے۔

لیکن اس کے بعد پھر کیا؟

اس کے بعد سائنس مزید انکشافات میں مصروف ہو جاتی ہے۔ مریخ کے ساتھ

سلسلۂ مواصلات قائم کرنے کے لئے مصنوعی مرکبات سے انسانی بچہ کی پیدائش کے لئے ایٹم میں محصور توانائی کو آزاد کرنے کے لئے تمام بیماریوں کے لئے ویکسین تیار کرنے کے لئے، انسان کی عمر طبعی کو ایک سو سال تک لے جانے کے لئے یا اس سے بھی زیادہ

لیکن اس کے بعد پھر کیا؟

کیا اس کے بعد انسان، زمین میں آرپار سوراخ کرنے میں مصروف ہو جائیں گے؟

لیکن اس کا کچھ مطلب؟ (TER TIUM ORG ANUM , P.278-279)

بعینہٖ یہی تنقید، مارکس کے "لاجماعتی معاشرہ" پر منطبق ہوتی ہے۔ موجودہ کشمکش کی انتہا، ایک لاجماعتی معاشرہ۔ لیکن اس کے بعد پھر کیا؟ عام مادیت تو کہہ سکتی ہے۔ کہ اس کے بعد جمود۔ یعنی جب انسان ایسا معاشرہ قائم کرلے جس میں تمام افراد مرفہ الحال ہوں تو یہ معاشرہ علیٰ حالہٖ قائم رکھا جائے۔ لیکن مارکسزم کی رُو سے کوئی شے علیٰ حالہٖ قائم رہ ہی نہیں سکتی۔ اُسے آیندہ جدل کی نئی کڑی بننا ہے۔ اس لئے اس مقام پر پہنچ کر مارکس ازم عجیب اُلجھن میں پھنس جاتی ہے جس سے نکلنے کی اسے کوئی راہ نہیں ملتی۔

تصریحات بالا سے آپ نے دیکھ لیا کہ مارکسزم کی بنیادمیں ایسی کمزوریاں ہیں۔ جن کی رُو سے یہ کبھی محکم فلسفۂ زندگی بن ہی نہیں سکتا۔ اصل میں مارکس نے اپنے مقصود کو فلسفیانہ رنگ دینے کی کوشش کی ہے۔ اس کا مقصود اس کے فلسفہ کا نتیجہ نہیں۔ ایسا نظر آتا ہے کہ وہ مزدوروں کی کس مپرسی کی حالت سے اس درجہ متاثر ہوا کہ اس کے دل میں سرمایہ داری کے خلاف انتقام کے شعلے بھڑک اُٹھے۔ اس نے جب معاشرہ کی حالت پر غور کیا تو عیسائیت جس نے دو ہزار برس سے غریبوں اور کمزوروں کو آسمانی بادشاہت کے حسین خوابوں میں اس درجہ مست کر رکھا تھا کہ سرمایہ داروں کے لئے اُن کی خون آشامی بڑی آسان ہوگئی تھی، اس لئے مارکس کے دل میں عیسائیت کے خلاف نفرت وانتقام کے جذبات مشتعل ہوگئے۔ وہ ہیگل کے فلسفۂ اضداد سے متاثر تھا۔ اس نے ان احساسات وتاثرات کو جذباتی رنگ کے بجائے فلسفیانہ انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی۔ عیسائیت چونکہ علم کی دشمن

**اس کی ذمہ دار عیسائیت ہے**

عقل کی دشمن سب سے بڑھ کر غریبوں اور کمزوروں کی دشمن جو توہم پرستی سکھاتی۔ علم و عقل کی تضحیک کرتی، دنیا اور اس کی خوشگواریوں سے متنفر بناتی۔ اور غریبوں کو اُن کی غریبی پر مبارک باد دیتی اور اس طرح عملاً نظامِ سرمایہ داری کے استحکام کا "خداوندی انتظام" کر دیتی ہے۔ [1]

برفو (ROBERT BRIFFAULT) اس باب میں لکھتا ہے:۔

عیسائیت کا جرم یہ ہے کہ اس نے اپنی ساری تاریخ میں ہمیشہ استبداد کا ساتھ دیا ہے اور اسے قوت بہم پہنچانے کا ذریعہ بنی ہے۔ سوائے اُن حالات کے، جہاں خود کلیسیا کا مفاد غریبوں کے مفاد کے ساتھ وابستہ ہو گیا تھا، اُس نے کبھی اپنا اثر و قوت کمزوروں کی آزادی اور مستبد قوتوں کے مظالم کی روک تھام میں صرف نہیں کیا۔ اس کے برعکس اُس نے ہمیشہ جور و ستم اور جبر و استبداد کی حمایت کی ہے۔

اس کے بعد برفو ہسپانیہ کے پروفیسر (DR. FALTA DE GRACIA) کے یہ الفاظ نقل کرتا ہے

"عیسائیت میں عدل کا تصور بھی اسی طرح نامانوس ہے جس طرح ذہنی دیانت کا۔ یہ اس کے تصورِ اخلاق سے یکسر باہر کی شے ہے۔

عیسائیت نے ان لوگوں سے تو شفقت و ہمدردی کا اظہار کیا ہے جن پر ظلم و ستم ہوں۔ لیکن خود ظلم و ستم سے ہمیشہ تسامح برتا ہے۔ اس نے لوگوں کو جو ظلم و استبداد کے بوجھ کے نیچے دبے ہوئے ہوں، جنہیں مصائب و شدائد کے ہجوم نے گھیر رکھا ہو، دعوت دی ہے اور انہیں آئینِ محبت کی

---

[1] جو کچھ عیسائیت کے متعلق کہا گیا ہے۔ وہ خود مسلمانوں کے اُس مذہب پر بھی صادق آتا ہے۔ جسے مُلّائیت پیش کرتی ہے۔ لیکن عیسائیت جو کچھ کرتی ہے۔ وہی اصل عیسائیت ہے۔ اس کے برعکس اسلام اس سے مختلف ہے۔ جو کچھ مُلّا پیش کرتا ہے۔ لہٰذا جو کچھ مارکس نے مذہب کے خلاف کہا ہے۔ وہ عیسائیت، مُلّائیت، برہمنیت پر تو صادق آتا ہے۔ لیکن اسلام اس سے بہت بلند ہے۔ (تفصیل اپنے مقام پر ملے گی)

تعلیم دی ہے۔ انہیں رحم و عفو کا سبق سکھایا ہے۔ انہیں خدا کی ربوبیت یاد دلائی ہے۔ لیکن مذہب و اخلاق کے اس طوفان میں، جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ، وہ اخلاقی ضوابط کی معراج کبریٰ ہے، عام انصاف اور دیانت کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ مسیح مقدس، جور و استبداد کے ستائے ہوئے مظلوم انسانوں کے درمیان، آسمان سے اُترتا ہوا فرشتہ دکھائی دیتا ہے۔ جو اُن کی طرف فارقلیط کا پیغام رحمت و شفقت پہنچاتا ہے۔ لیکن اس جور و استبداد کی علت معلوم کرنا اس کے دائرہ شعور سے باہر ہے۔ خیر و شر کا یہ تصوّر اس کے حیطۂ نگاہ سے خارج ہے۔ یہ ظلم و ستم اس کے نزدیک خدا کی طرف سے گناہگاروں کے لئے ابتلاٗ و آزمائش ہے۔ نظام عالم کا خاصہ ہے۔ اس حکومت کا فیصلہ ہے جو دنیا میں خدائی حقوق کی بنا پر قائم ہے۔

سینٹ ونسنٹ فرانس کے اس قید خانہ کا معائنہ کرتا ہے۔ جو دنیا میں جیتا جاگتا جہنم ہے۔ وہ وہاں محبت کا پیام عام کرتا ہے اور گناہگاروں کو توبہ کی تلقین کرتا ہے۔ لیکن وہ ظلم و استبداد جس پر اس جہنم کا قیام ہے اس کا اسے احساس تک بھی نہیں ہوتا۔ ظالموں کے پنجۂ ظلم و استبداد میں جکڑی ہوئی انسانیت کی چیخیں نکلتی رہیں۔ ان کی ہڈیاں چٹختی رہیں۔ وہ مٹ جائیں فنا ہو جائیں، عیسائیت کی روح انہیں جا کر تسلی دے گی، لیکن یہ اس کے حیطۂ تصوّر میں بھی نہیں آئے گا کہ اس ظلم و ستم کو کس طرح مٹایا جائے جس کی وجہ سے انسانیت ان مصائب کا شکار ہو رہی ہے۔ ان مظالم کے استیصال اور ان سے انسانوں کی نجات کی ذمہ داری کی طرف سے یہ بالکل آنکھ بند کئے رکھے گی عدل و انصاف اور حق و باطل کی طرف سے عیسائیت کی روح یکسر بے بس ہے یہ تصوّر اس کے نزدیک ایسا اجنبی ہے۔ جیسا صداقت کا تصور۔ وہ ہمیشہ عفو، برداشت، رحمدلی کا سبق پڑھاتی رہی لیکن عدل و انصاف کی اسے کبھی یاد تک نہ آئی۔"

(THE MAKING OF HUMANITY - PP. 232-233)

یہ ہے وہ عیسائیت جس کے خلاف ردّ عمل کا نام، مارکس کا فلسفہ ہے۔

**لینن** | لینن لکھتا ہے۔ سرمایہ داری کی غیر مرئی قوتوں نے ذہنِ انسانی میں ایک ڈر کی صورت پیدا کر دی ہے۔ جس سے ایک حاکمِ اعلیٰ کے تخیّل کی بنیاد پڑی۔ اسے انسان نے خدا کے نام سے پکارنا شروع کر دیا۔ سو جب تک خدا کا تخیل، ذہنِ انسانی سے فنا نہ کر دیا جائے۔ یہ لعنت کسی طرح دور نہیں ہو سکتی۔

(CF. HAMMER AND SICKLE MARK PATRICK)

ایک اور جگہ لکھتا ہے :۔

"مذہب لوگوں کے لئے افیون ہے۔" اس لئے مارکس ازم کی رُو سے دُنیا کے تمام مذہب اور کلیسا سرمایہ داری کے آلۂ کار ہیں، جن کے توسط سے مزدور جماعت کے حقوق کو پامال کیا جاتا ہے۔ اور انہیں فریب دیا جاتا ہے۔ لہٰذا نفسِ مذہب کے خلاف جنگ کرنا ہر اشتراکی کے لئے ضروری ہے۔ تا آنکہ دُنیا سے مذہب کا وجود ہی مٹ جائے۔"

(LALEOWR MONTHLY DECEMBER 1928)

میکیاوُلی نے لکھا تھا کہ حکمرانوں کو چاہیئے کہ وہ مذہب اور اخلاق کو اپنی قوت کے استحکام کے لئے بطور ذرائع استعمال کریں۔ مارکس نے کہا کہ مذہب اور اخلاق کا نام ہی صفحۂ ہستی سے مٹا دینا چاہیئے۔ کیونکہ ان ہی کے بل بوتے پر سرمایہ داری کا نظام قائم رہتا ہے۔ چنانچہ لینن اپنی تقریر میں نوجوانوں کو مخاطب کر کے کہتا ہے :۔

"ہم ان تمام اخلاقی حدود و شرائع کی مذمت کرتے ہیں۔ جو کسی ما فوق الفطرت عقیدہ کا نتیجہ ہوں۔ ہمارے خیال میں اخلاق کا نظریہ ہمیشہ جماعت کے مفاد کی جنگ کے ماتحت ہونا چاہیئے۔ ہر وہ حربہ جو قدیم غاصبانہ نظامِ معاشرت کے خلاف اور مزدوروں کی تنظیم کی تائید میں استعمال کرنا ضروری سمجھا جائے عین اخلاق ہے۔ اشتراکیین کا اخلاق و شریعت تو صرف اس قدر ہے کہ ڈکٹیٹر کی قوت و سطوت کا استحکام و استقلال کس صورت سے ہو سکتا ہے۔ اس کے خلاف جو کچھ ہے سب ناجائز ہے۔ چنانچہ جماعتی مفاد کی خاطر جرائم کا ارتکاب، دروغ بافی، فریب دہی، عین حق و صداقت ہے۔ نہیں! بلکہ معاندین کے خلاف کذب و افترا ہی بعض اوقات سب سے اہم حربے ہوتے ہیں۔"

(GANDHI AND LENIN-BY-A.F. MILLER)

یہ فریب دہی اور دروغ بافی، دشمنوں کے خلاف ہی نہیں، بلکہ عندالضرورت خود اپنی جماعت کے افراد سے بھی انہی حربوں سے کام لیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ (GOLLANCZ) اپنی کتاب (OUR THREATENED VALUES) میں لکھتا ہے کہ (DR. G. LUCKNZ) سے پوچھا گیا کہ اشتراکی جماعت کے لیڈروں کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ اپنی جماعت کے افراد سے بھی کذب و فریب دہی سے کام لیں؟ تو اس کے جواب میں اس نے کہا کہ:۔

اشتراکی اخلاق کی رُو سے یہ فریضہ سب سے اہم ہے کہ اسے تسلیم کیا جائے کہ عندالضرورت بد دیانتی اور بے ایمانی سے کام لیا جا سکتا ہے۔ یہ سب سے بڑی قربانی تھی جس کا ہم سے انقلاب نے مطالبہ کیا تھا۔"

اب رہا طریقِ کار، سو اس کے متعلق لینن اپنی کتاب (STATE AND REVOLUTION) میں لکھتا ہے:۔

سرمایہ داری نظامِ حکومت کی جگہ اشتراکی حکومت کا برسرِ اقتدار آجانا تشدد آمیز انقلاب کے بغیر ناممکن ہے۔"

اسی کتاب میں دوسری جگہ انجلز کے ایک مقالہ کا اقتباس دیتے ہوئے لینن لکھتا ہے:۔

انقلاب ایک ایسا عمل ہے۔ جس کی رُو سے آبادی کا ایک حصّہ دوسرے حصّہ پر اپنا اختیار و تسلّط، قوت و استیلاء، نوکِ شمشیر، گولیوں کی بوچھاڑ اور آتشیں گولوں کے دھماکوں سے زبردستی کراتا ہے۔"

ڈکٹیٹر شپ کے متعلق (STALINE) اپنی کتاب (LENINISM) میں خود لینن کے حوالہ سے لکھتا ہے کہ:۔

ڈکٹیٹر ایسی مختارِ عام ہستی کا نام ہے جس کا وجود قاطبۃً قوتوں کے ہجوم پر مبنی ہو۔ ایسی مطلق العنان ہستی جو کسی قانون اور کسی ضابطہ کی پابند نہ ہو۔ آئینی نظامِ حکومت کے علمبردار سن لیں اور خوب غور سے سن لیں کہ ڈکٹیٹر شپ کے معنی ہیں "قوت" غیر محدود اور قاہرہ قوت جو جبر و اکراہ پر مبنی ہو اور جسے آئین و دستور اور قانون و شریعت سے کچھ سروکار نہ ہو۔

## مارکس کا معاشی نظام

ہم نے شروع میں لکھا تھا کہ مارکس کا فلسفۂ اشتراکیت ایک چیز ہے اور دُوسری چیز ہے وہ معاشی نظام جس کے بنیادی خطوط مارکس نے متعین کئے اور جس پر آجکل رُوس میں تجربہ ہو رہا ہے۔ مارکس نے اس معاشی نظام کی بنیادیں اپنے فلسفہ پر رکھی ہیں اس لئے یہ نظام اس فلسفہ ہی کا برگ و بار کہلا سکتا ہے۔ لیکن اگر کوئی چاہے تو اس معاشی نظام کو اُس کے فلسفہ سے الگ بھی کر لیا جا سکتا ہے۔ یہ نظام کیا ہے؟ اس کے متعلق مارکس لکھتا ہے :-

"سرمایہ داروں نے جو ظلم و تشدّد برپا کر رکھا ہے اس کا واحد علاج یہ ہے کہ دُنیا سے جماعتی تفریق کو مٹا دیا جائے، عمرانی زندگی کے مصائب و آلام صرف جماعتی امتیازات کی بنا پر ہیں اور اس کا ازالہ مزدُوروں کی جماعت کا برسر اقتدار آکر، عالمگیر مساوات کا پیدا کرنا ... ... ... اس تحریک کا مقصد یہ ہے کہ دُنیا سے ذاتی ملکیت اور شخصی و انفرادی حقوق کے خیال کو فنا کر دیا جائے اور اس طرح جب مزدُوروں کی جماعت کو تسلّط حاصل ہو جائے تو تدریجاً سرمایہ داروں کے تمام املاک و خزائن پر قبضہ کر لیا جائے ... ... یہ مقاصد صرف اس طرح حاصل ہو سکتے ہیں کہ موجُودہ نظامِ معاشرت کو مسلح قوت کے ذریعہ تباہ و برباد کر دیا جائے۔"

یعنی سرمایہ داری اور غریبی کے امتیازات کو دُور کر کے معاشی یکسانیت و مساوات پیدا کرنا۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ وسائل پیداوار (رزق کے سرچشموں) کا افراد کی ملکیت میں دے دینا، انسانیت کے خلاف سب سے بڑا جرم ہے۔ انسانی معاشرہ کی تمام ناہمواریاں (جسے قرآن فساد کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے) اسی سے پیدا ہوتی ہیں۔ اور فساد کا لازمی نتیجہ (قرآن کے الفاظ میں) "یسفک الدماء" یعنی خُون ریزی ہے۔ برگساں کے الفاظ میں "جنگ کی بنیاد ملکیت کا تصوّر ہے"۔

(THE TWO SOHREES P. 973)

وسائلِ پیداوار میں سب سے اہم مقام زمین کو حاصل ہے۔ گالڈ کی تحقیق کی

رُو سے انسان کی ابتدائی قبائلی زندگی میں زمین افراد کی ملکیت میں نہیں ہوتی تھی:-

"یہ خیال کہ زمین کسی فرد کی ملکیت ہو سکتی ہے، ابتدائی ذہن انسانی میں قطعاً موجود نہیں تھا۔ یہ کہا جاتا ہے کہ قدیم زبان میں "ملکیت" کے لیے کوئی لفظ ہی نہ تھا۔ وہ صرف "تعلق" کا لفظ جانتے تھے۔ اُن کے نزدیک زمین افراد کی ملکیت میں نہیں ہوتی تھی۔ بلکہ تمتع کے لئے ہوتی تھی۔ جب کسی نے اُس سے فائدہ اُٹھالیا، وہ پھر قبیلہ کی ملکیت میں چلی گئی"۔

(MAN NATURE AND TIME P. 153)

**کمیونزم** ہمارے دَور کا اہم ترین موضوع ہے۔ جس کے موافق و مخالف بہت کچھ کہا اَور لکھا جا رہا ہے۔ کمیونزم کے فلسفہ کی کمزوریوں کے متعلق پچھلے صفحات میں کچھ اشارات کئے گئے ہیں۔ رہا اس کا معاشی نظام، تو دُشواری یہ ہے۔ کہ اس کی تائید میں جو لٹریچر شائع ہوتا ہے۔ اس نظام کے مخالفین اس کی صداقت کے متعلق بدظن رہتے ہیں۔ اشتراکیین اپنے اس مسلک کی پرستش مذہبی جنون کے ساتھ کرتے ہیں۔ لیکن مخالفین چونکہ نظام سرمایہ داری کے مؤیدین ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کی مخالفت بھی "مذہبی تعصب" پر محمول سمجھی جاتی ہے۔ لہٰذا اس معاشی نظام کے متعلق بحث و تحمیص بالعموم "مذہبی فرقوں کے مناظروں" کی حیثیت اختیار کر جاتی ہے سنہ ۱۹۵۰ء میں رُوسی نظام کے خلاف ایک کتاب (THE GOD THAT FAILED) کے نام سے شائع ہوئی تھی۔ اس کے مؤلف پانچ چھ اہلِ قلم ہیں۔ جو خود کمیونسٹ تھے۔ لیکن اب کمیونزم سے "تائب" ہو چکے ہیں۔ ہر چند اُنہوں نے کوشش کی ہے۔ کہ اس موضوع پر غیر جانبدارانہ (IM PARTIALLY) بحث کی جائے۔ لیکن بایں ہمہ اس میں جانبداری کا رنگ نظر آ رہا ہے۔ اس نظام کے متعلق ہم تفصیل سے گفتگو اس وقت کریں گے۔ جب "اسلام کا معاشی نظام" سامنے لائیں گے۔ اس وقت صرف ایک نقطہ کی طرف توجہ دلانا ضروری سمجھتے ہیں۔ جس کا تعلق اس نظام سے زیادہ، اس فلسفہ سے ہے جس پر اس نظام کی عمارت استوار ہے۔

نظامِ اشتراکیت کی بنیاد اس اُصول پر ہے کہ ہر شخص سے اس کی استعداد کے مطابق کام لیا جائے اور اس کی ضرورت کے مطابق اُسے معاوضہ دیا جائے۔

ایک شخص کے کام کی قیمت پانچ روپے ہے اور اس کی ضروریات سات روپے میں پوری ہوتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ شخص اس نظام میں بہت خوش رہے گا۔ لیکن ایک شخص کے کام کی قیمت سات روپے ہے۔ اور اس کی ضروریات دو روپے ہی میں پوری ہو جاتی ہیں۔ یہ دیکھتا ہے کہ اُسے دن بھر محنت کرنی پڑتی ہے اور شام کو اس کی کمائی میں سے پانچ روپے کسی اور کو دے دئیے جاتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ شخص اس نظام میں کیوں رہے؟ وُہ کیوں نہ سات کے سات روپے اپنی ذات پر خرچ کرے یا اگر اسے دو روپے روز ہی خرچ کرنے ہیں تو وُہ کیوں سارا دن محنت کرے۔ وُہ ایک دو گھنٹے کام کرے جس سے اُسے دو روپے کی یافت ہو جائے اور باقی وقت آرام کرے۔ بالفاظِ دیگر سوال یہ ہے کہ وہ کونسا جذبہ ہے۔ جس کے ماتحت یہ شخص اس قدر ایثار کرتا ہے اور اس میں اطمینان محسوس کرے؟

**جذبہ محرکہ**

واضح رہے کہ یہ شخص (فلسفۂ کمیونزم کی رُو سے) نہ اخلاقیات کا قائل ہے نہ خُدا پر ایمان رکھتا ہے، نہ اس کے نزدیک کوئی مستقل اقدار ہیں، نہ مادیت سے ماورار کوئی دُنیا۔ اس کے نزدیک ہر فرد کی زندگی اپنی اپنی ہے اور جسم کی پرورش، انسانی زندگی کا منتہیٰ۔ اس سے زیادہ نہ انسانی زندگی کے کوئی اور تقاضے ہیں، نہ ہی اس کے بعد آگے بڑھنے کا کوئی تصوّر۔ آپ موافق یا مخالف میلانات کو ایک طرف رکھ کر سوچئے کہ اس قسم کا تصوّرِ حیات رکھنے والے انسان کے لئے وہ کونسا جذبہ محرکہ (INCENTIVE) ہے۔ جس کی رُو سے وُہ اپنی زندگی پیہم مشقّت میں گزار دے اور اس کی محنت کا ماحصل دُوسروں کو دیتا چلا جائے؟ مقصد کے بغیر انسان کے لئے کام کرنا ناممکن ہے۔ اس انسان کے لئے دو روپے روز سے زیادہ کام کرنے کے لئے مقصد کیا ہے؟

آپ کہیں گے کہ نوعِ انسان سے ہمدردی انسان کا فطری جذبہ ہے اس کے تقاضے سے یہ ایثار وعمل میں آئے گا۔ لیکن یہ مفروضہ ہی غلط ہے۔ کہ نوعِ انسان کی ہمدردی انسان کی فطرت کا تقاضا ہے۔

اگر یہ انسانی فطرت کا تقاضا ہوتا تو دُنیا میں نظامِ سرمایہ داری کا وُجود ہی نہ ہوتا۔ اس کا وُجود ہی اس کی دلیل ہے کہ انسان خود غرض واقع ہوا ہے۔ آپ

کہیں گے کہ یہ تقاضا اس کی فطرت کا نہ سہی لیکن اس میں پیدا تو کیا جا سکتا ہے۔ لیکن سوال پھر یہی ہے کہ یہ تقاضا پیدا کس جذبہ کے ماتحت کیا جا سکتا ہے؟ جُوں جُوں آپ اس مسئلہ پر غور کرتے جائیں گے۔ اس نظام کی بنیادی کمزوری آپ پر بے نقاب ہوتی جائے گی۔ اس وقت جذبۂ محرکہ صرف سرمایہ داری کے خلاف منافرت اور جوشِ انتقام ہے۔ سوچئے کہ اس کے بعد کس جذبہ کے ماتحت آپ انسان کو آمادہ کر سکیں گے کہ وُہ پیداوار (PRODUCTION) کے لئے اپنی پُوری استعداد صرف کر دے جبکہ اس کی ذاتی ضروریات بہت کم محنت کرنے سے پُوری ہو جاتی ہیں۔

پھر سوچئے کہ جب ایسا معاشرہ قائم ہو جائے گا۔ جس میں ہر شخص کی ضروریاتِ زندگی پُوری ہوتی چلی جائیں گی تو اس کے بعد انسان کے سامنے مقصدِ حیات کیا رہ جائے گا؟ معاشرہ جو کام اس کے لئے تجویز کرے گا۔ وہ اس کام کو ایک مشین کی طرح کر دیا کرے گا۔ اور جو کچھ اسے معاشرہ کی طرف سے ملے گا۔ اُسے کھا کر زندہ رہے گا۔ بس یہ رہ جائے گی زندگی۔ تانگے کے گھوڑے کی طرح، صبح مالک نے گھاس دانہ کھلا کر تانگے میں جوت لیا۔ وُہ دن بھر لگام کے اشارے پر ادھر سے اُدھر تانگا کھینچتا رہا شام کو اپنے تھان پر آ کر گھاس کھا لی اور سو گیا۔

ہمارا مقصد یہ نہیں کہ معاشرہ کی ناہمواریاں دُور نہیں ہونی چاہئیں۔ یہ ناہمواریاں تو باعثِ ننگِ انسانیت ہیں۔ اُن کے دُور ہونے ہی میں انسانیت کی نشوونما کا راز پوشیدہ ہے۔ ہم کہنا یہ چاہتے ہیں کہ جس فلسفہ کی بنیادوں پر اُس معاشی نظام کی عمارت قائم کی گئی ہے۔ وُہ فلسفہ اس قدر نامحکم اور خلافِ حقیقت ہے کہ اس پر قائم کردہ نظامِ حیات کبھی نہیں چل سکتا۔ اب تک یہ نظام فقط جذبۂ منافرت اور انتقام کے زور سے چل رہا ہے۔ لیکن تخریبی جذبات کسی نظام کی محکم بنیاد نہیں بن سکتے۔ یہ ہے اشتراکی نظام کی اصل خرابی۔ اسلام کا معاشی نظام اس نظامِ ربوبیت کو قائم رکھنے اور آگے بڑھانے کے لئے کونسی قوتیں بیدار کرتا ہے۔ یہ اس وقت سامنے آئے گا جب آپ کے سامنے اسلام کے فلسفۂ حیات کو لایا جائے گا کہ

اَلَّذِیۡ یُؤۡتِیۡ مَالَہٗ یَتَزَکّٰی ۚ (۹۲/۱۸)

اس شخص کی ذات کی نشوونما ہوتی ہے جو اپنی چیزوں کو دوسروں کی نشوونما کے لئے دے دیتا ہے۔

**معیشت کا مسئلہ** معیشت کا مسئلہ گذشتہ دو اڑھائی ہزار سال سے مختلف مراحل سے گذرتا ہُوا ہمارے دَور میں اس مقام تک آپہنچا ہے۔ جہاں دو متضاد معاشی نظام ایک دُوسرے سے برسرِپیکار ہیں۔ ایک کا نام ہے نظامِ سرمایہ داری (CAPITALISM) اور اس کے مدّمقابل ہے نظامِ اشتراکیت۔ نظامِ سرمایہ داری کی بنیاد اس نظریہ پر ہے کہ افراد کو ذاتی ملکیت کا غیر محدُود حق حاصل ہے۔ یہ نظام عین فطرتِ انسانی کے مطابق ہے۔ اس لئے کہ مختلف اشیاء کو "میری" کہنا انسان کی فطرت کا بنیادی جذبہ ہے۔ اور "میری اشیاء" میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے (مسابقت) کا جذبہ، اس کی تمام توانائیوں کا محرک۔ سرمایہ داری اور کمیونزم کے تقابل میں کوئی دقت پیش نہیں آسکتی۔ اس لئے یہ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ لیکن ان میں جو قدرِ مشترک ہے۔ وُہ یہ کہ ان دونوں کی بنیاد مادہ پرستی (MATERIALISM) پر ہے۔ سرمایہ داری کی بنیاد ہی فلسفۂ مادیت پر رکھی گئی تھی۔ اس میں کسی مستقل قدر کا دخل ہی نہیں۔ ہر فرد کا اپنا اپنا مفاد، اور مختلف افراد میں تنازعہ للبقاء (STURGGLE FOR EXISTENCE) کے اندھے اُصول کی بنا پر مسابقت کی کش مکش۔ اشتراکیت خُدا کے وجُود کی قائل نہیں لیکن نظامِ سرمایہ داری اشتراکیت سے بھی بدتر ہے۔ اس لئے کہ اشتراکیت میں کھلے بندوں خُدا کا انکار ہے۔ لیکن سرمایہ داری کی حامل اقوام زبان سے خُدا کا اقرار کرتی ہیں لیکن اپنے نظام میں اس کا کوئی عمل دخل نہیں سمجھتیں۔ عملاً یہاں خُدا کا انکار بھی ہے لیکن فریب دہی کا موقع بھی۔ یہی وُہ فریب دہی ہے۔ جس کی بنا پر نظامِ سرمایہ داری تمام دُنیا کے "خُدا پرستوں" سے اپیل کرتا ہے کہ وُہ اشتراکیت کی مخالفت میں اس کا ساتھ دیں۔ لیکن چشمِ بیدار دیکھتی ہے کہ خُدا سے نہ اِنہیں کچھ واسطہ ہے نہ اُنہیں۔

یہ ہیں چکّی کے دو پاٹ جن میں انسانیت، محض روٹی کے مسئلے کی خاطر، بُری طرح پس رہی ہے۔ انسانیت کی تاریخ میں اس سے نازک دور شاید ہی کبھی آیا ہو۔ اور انسان کا عجزِ فہم اور افلاسِ تدبّر اس سے زیادہ بے نقاب شاید ہی کبھی ہُوا ہو۔ عقلِ انسانی کی اس درجہ بیچارگی و بے بسی ہی سے اب یہ توقع ہو رہی ہے۔ کہ انسانیت پھر پلٹا لے گی اور یہ سوچنے پر مجبُور ہو جائے گی۔ کہ کیا عقل کے علاوہ اور

ذریعہ بھی ہے جس سے ان مصائب کا حل مل سکتا ہے؟[1]

## اسلام کا معاشی نظام

اسلام جس فلسفۂ حیات پر اپنے معاشی نظام کی عمارت استوار کرتا ہے۔ اس کے معاشی نظام کے اصولی خدوخال یہ ہیں:-

۱- خدا نے سامانِ زیست تمام نوعِ انسان کی پرورش کے لئے بلا مزد و معاوضہ عطا کیا ہے۔ اس لئے ذرائع پیداوار پر کسی کی انفرادی ملکیت کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ ایسا کرنا خدا کے مقابلہ میں دوسرے خدا کھڑے کر دینے کے مترادف ہے۔

۲- چونکہ اصل مقصدِ حیات، انسانی ذات کی نشوونما ہے اور وہ اس طرح حاصل ہوتی ہے۔ کہ انسان دوسروں کی نشوونما کے لئے زیادہ سے زیادہ محنت کمائے۔ اپنی کمائی کے ماحصل میں سے اپنی بنیادی طبیعی ضروریات پوری کرنے کے بعد، باقی سب دوسروں کی نشوونما کے لئے دے دے۔ يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ (۲/۲۱۹) (یہ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہم کس قدر دوسروں کے لئے دے دیں۔ ان سے کہہ دو کہ جس قدر تمہاری ضروریات سے زائد ہے، سب کا سب، تاکہ اس سے اس کی ذات کی زیادہ نشوونما ہو جائے) حضرت علامہ اقبالؒ نے عصرِ رواں کے اُبھرتے تقاضاؤں کو بھانپ کر اپنی قرآنی بصیرت سے فرمایا تھا ؎

جو حرف قُلِ الْعَفْوَ میں پوشیدہ ہے اب تک
اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار (اقبالؒ)

جیسا کہ عرض کیا جا رہا تھا:-

اس عمل (PROCESS) کو ایتائے زکوٰۃ کہتے ہیں۔ ہمارے ہاں زکوٰۃ کا مفہوم صرف اس قدر رہ گیا ہے کہ سرمایہ دار جس قدر چاہے سمیٹتے چلے جائیں لیکن اس

---

[1] قرآن نے معاشی مسئلہ کا حل بھی بڑا آسان دیا ہے۔ اسلامی معاشرہ میں ہر فرد زیادہ سے زیادہ محنت کرتا ہے اور اس کے ماحصل میں سے زیادہ سے زیادہ دوسروں کی پرورش کے لئے دیتا ہے تاکہ اس کی ذات کی نشوونما ہوتی چلی جائے۔

میں سے اڑھائی فی صد خیرات کر دیں لیکن قرآن کی رُو سے اس کا مفہوم کچھ اور ہے زکوٰۃ کے معنی ہیں نشوونما (DEVELOPMENT) اور نشوونما یافتہ ذات (متقی) کو (DEVELOPED PERSONILATY) تکمیل یافتہ ذات۔ ارتقاً یافتہ ذات کہا جاتا ہے۔ اتیائے زکوٰۃ کے معنی ہیں۔ دُوسروں کی نشوونما کا سامان بہم پہنچانا۔ یہ اسلامی مملکت کا فریضہ ہے (۲۲/۴۱) اس میں ہر فرد زیادہ سے زیادہ محنت اس لئے کرتا ہے کہ اس کی اپنی ذات کی نشوونما دُوسروں کے لئے سامانِ نشوونما بہم پہنچانے میں مضمر ہے۔ بلکہ (اگر ایسا موقعہ آ پڑے) وُہ دُوسروں کی ضرورت کو اپنی ضرورت پر ترجیح دیتا ہے (۵۹/۹) وُہ یہ کچھ کسی سیاسی دباؤ۔ خارجی اثر یا سیاسی مصلحت کے ماتحت نہیں کرتا۔ یہ اس کی ذات کا تقاضا ہوتا ہے اس میں وُہ اپنا زیادہ سے زیادہ فائدہ دیکھتا ہے۔ اتیائے زکوٰۃ (یعنی زیادہ سے زیادہ دوسروں کی نشوونما کے لئے دئیے جانے) کا جذبہ محرکہ حیاتِ آخرت (مستقبل) پر ایمان کے علاوہ کچھ اور ہو نہیں سکتا (۱۴۱/۲) یہ صرف اسی تصوّرِ حیات کے ماتحت ممکن ہے کہ انسان زیادہ سے زیادہ کام کرے اور اپنی ضروریات سے زائد سب کچھ دُوسروں کی نشوونما کے لئے دے دے۔ (دُوسروں سے مُراد اپنی جماعت کے افراد نہیں، بلکہ پُوری نوعِ انسانی ہے، اس نظریۂ حیات کے مطابق جو قرآن کریم نے پیش کیا ہے جب اپنی ضروریات سے زاید دُوسروں کی نشوونما کے لئے دے دیا جائے گا۔ تو فاضلہ دولت (SURPLUS MONEY) جو نظامِ سرمایہ داری کی بنیاد ہے کسی کے پاس رہے ہی گی نہیں۔ نہ ہی جائیدادیں کھڑی کر کے کرایہ کی صُورت میں منافع (سُود) حاصل کیا جائے گا۔ نہ ہی روپیہ سمیٹنے کے لئے باہمی دوڑ (RACE) ہو گی۔ اس میں جو منافست (RACE) ہو گی، وُہ زیادہ سے زیادہ کام کر کے زیادہ سے زیادہ دُوسروں کی نشوونما کے لئے سامانِ زیست فراہم کرنے کے لئے ہو گی (۸۳/۲۶)

یہ ہے وُہ فلسفۂ حیات جس کی بنیادوں پر قرآن اپنے معاشی نظام کی عمارت استوار کرتا ہے۔ حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کی چشمِ جہاں بیں یہ دیکھ رہی تھی کہ جس فلسفۂ حیات (فلسفۂ جدلیت) میں قانونِ اضداد (LAW OF CONTRADICTION) کے علاوہ کسی قانون، کسی تصوّر، کسی نظام کو غیر متبدّل تسلیم نہیں کیا جاتا اور اس نظام

حیات میں کوئی مستقل اقدار نہیں ہیں۔ اس نظام کو پیش کرنے والا پیغمبرِ بے جبرئیل (مارکس) کا معاشی نظام انسانیت کو حقیقی مسرت نہیں دے سکے گا۔ بدیں وجہ آپ نے فرمایا تھا ؎

تیری کتابوں میں اے حکیمِ معاش رکھا ہی کیا ہے آخر
خطوطِ خمدار کی نمائش! مریز و کجدار کی نمائش!

یہ درست ہے کہ وہ اسرارِ حیات وہ رموز قرآنی جنہیں انساں کی ہوس نے آج تک چھپا کر رکھا تھا۔ وہ آج بتدریج کھلتے نظر آ رہے ہیں۔ نشترِ اشتراکیت نے سرمایہ داری کے فاسد مادہ کو جسدِ انسانیت سے الگ کرنے کے لئے جہانِ مغرب کے بتکدوں، کلیساؤں اور مدرسوں کے اس طلسمِ انسانیت سوز کو بے نقاب کر دیا ہے۔ جس کے پردے میں عقلِ عیار ہوسِ زر کی آن خون ریزیوں کو چھپاتی تھی۔ جو سرمایہ دار اپنی دولت کے اضافہ کے لئے اپنے خونی پنجوں سے محنت کشوں۔ مزدوروں اور مجبوروں کا خون نچوڑتا تھا۔ جاگیردار جو خونِ دہقان سے اپنے جسم کی تنومندی کے لئے شرابِ ارغوانی کشید کرتا تھا۔ اور کارخانہ دار محنت کشوں کی ہڈیوں کے گودا سے اپنی سیر و سیاحت اور عیش و طرب کی کاروں کے لئے (روغن) پٹرول مہیا کرتا تھا۔

اس مقام پر یہ حقیقت تسلیم کر لینے میں مجھے کوئی عذر نہیں کہ یہ عقل کی مخلصانہ آخری اپروچ ہے۔ جس کے ذریعہ سے اشتراکین نے جسدِ آدمیت کو سرمایہ داری کے جذام اور جبر و قہر کے سرسام سے نجات دلانے کی کوشش کی۔ چونکہ اس سرطان کے پھوڑے کا علاج عقلِ محض نہیں۔ وحیِ خداوندی (قرآن عزیز) ان کے سامنے نہ تھی۔ اس لئے انہوں نے جو عالمِ نو پیدا کرنے کے لئے تگ و تاز کی یہ بیمار انسانیت کا حتمی اور یقینی علاج نہیں۔ نظامِ سرمایہ داری میں بھی مجبور، مجبور ہو کر سرمایہ داروں کے لئے اپنا خون پسینہ ایک کرتا تھا اس نظامِ اشتراکیت میں بھی یہ خوف و ڈر کے مارے دوسروں کے لئے جان کھپاتا ہے۔ یہ اس لئے کہ اشتراکین کے ہاں کوئی ایسا جذبۂ محرکہ نظر نہیں آتا جس سے محنت کرنے والے کی قلب کی گہرائیوں سے کوئی جوشِ عمل ابھرے۔ جیساکہ اوپر کہا جا چکا ہے۔ اگر ہم کرۂ ارض کی تقدیر بدلنا چاہتے ہیں تو یہ انہی مستقل اقدارِ حیات (قرآنی پیمانوں) سے بدلی جا سکتی ہے۔ جو عمل کے لئے یہ جذبہ محرکہ پیش کرتے ہیں کہ کسی انسان کی نشو و نما ضروریات سے زاید دوسروں کو دینے میں ہوتی ہے۔

اقبالؒ "جاوید نامہ" میں "پیغام افغانی با ملّتِ روسیہ" میں کہتے ہیں ؎

منزل و مقصودِ قرآں دیگر است
رسم و آئین مسلماں دیگر است

اشتراکی نظام کی طرف یوں اشارہ کرتے ہیں ؎

خود طلسمِ قیصر و کسریٰ شکست
خود سرِ تختِ ملوکیت نشست
تا نہالِ سلطنت قوت گرفت
دینِ او نقش از ملوکیت گرفت

**مملکت کا فریضہ** قرآن کی رُو سے مملکت کا فریضہ یہ ہے کہ وہ تمام افرادِ معاشرہ کی بنیادی ضروریاتِ زندگی بہم پہنچائے اور اُن کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما کا سامان مہیا کرے۔ ظاہر ہے کہ مملکت اپنی اس عظیم ذمہ داری سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتی جب تک وسائلِ رزق اور ذرائع پیداوار مملکت کی تحویل میں نہ ہوں (یہ درحقیقت اسٹیٹ کی تحویل میں نہیں ہوں گے انہیں قوانینِ خداوندی کے مطابق صرف کرنے کے لئے اس معاشرہ کے ذمہ دار افراد کی تحویل میں دیا جائے گا) لہٰذا ان وسائل اور ذرائع پر (فرد یا جماعت) ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

**فلسفۂ جدلیت** فلسفۂ جدلیت کی رُو سے کسی نظام کو غیر متبدل تسلیم نہیں کیا جاتا۔ کیونکہ اس تصور کے مطابق

ثبات ایک تغیّر کو ہے زمانے میں

اس تصورِ حیات کی اساس و بنیاد اس پر ہے کہ قانونِ اضداد کی رُو سے ایک نظام ظہور میں آتا ہے۔ پھر اس میں اس کی ضد کھڑی ہو جاتی ہے اور دونوں میں تصادم شروع ہو جاتا ہے۔ کچھ وقت کے بعد وہ پہلا نظام مغلوب ہو جاتا ہے اور دوسرا غالب آ جاتا ہے۔ پہلے نظام کا دور دورہ ختم ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ دوسرے نظام کا عہد شروع ہو جاتا ہے۔ یہ گردشِ دولابی اسی طرح سے جاری چلی آ رہی ہے۔ اسی طرح جاری رہے گی۔ اس وقت اس گردش کی رُو سے سابقہ نظام

سرمایہ داری پر اس کی ضد (نظام سوشلزم) غالب آرہا ہے (اس کی اگلی منزل کمیونزم ہوگی) اب اسے محض اتفاق سمجھئے کہ ہم اس زمانے میں پیدا ہوئے جب اس نظام کے غلبہ کی باری ہے جو مزدوروں اور محنت کشوں کے لئے زیادہ نفع بخش ہے۔

اس میں نہ مارکس کی فکر کا کوئی دخل ہے، نہ لینن کی عملی کارفرمائی کا۔ نہ رُوس کا کوئی کمال ہے، نہ چین کا اعجاز۔ تاریخی وجوب (HISTORICAL NECESSITY) کی رُو سے ایسا ہونا تھا۔ ایسا ہو رہا ہے۔ اس کے بعد جب گردش کا دُوسرا رُخ آئے گا تو یہ نظام مٹ جائے گا اور اس کی ضد کوئی دُوسرا نظام لے لے گا۔ اس وقت رُوس اور چین تو ایک طرف، ساری دُنیا کے انسان مل کر بھی چاہیں کہ اس قسم کے عادلانہ معاشی نظام کو برقرار رکھیں۔ تو ایسا نہیں کر سکیں گے۔ اس وقت اگر نظام سرمایہ داری مٹ رہا ہے۔ تو اس لئے نہیں کہ وُہ نظام عدل و انصاف پر مبنی نہیں تھا۔ اس لئے کہ اس میں باقی رہنے کی صلاحیت نہیں تھی اور اس کی جگہ سوشلزم کا نظام برسرِ اقتدار آرہا ہے تو یہ بھی اس لئے نہیں کہ یہ نظام نوعِ انسان کے لئے زیادہ منفعت بخش ہے۔ یہ تو صرف اپنی اپنی باری کا سوال ہے۔ اُس کی باری ختم ہو رہی ہے۔ اس لئے وُہ جا رہا ہے۔ اس کی باری آرہی ہے۔ اس لئے یہ آرہا ہے۔ کل کو جب اس کی باری ختم ہو جائے گی تو یہ بھی چلا جائے گا۔ اور مزدوروں اور محنت کشوں۔ مجبوروں اور مقہوروں کی ہزار آہ و فغاں۔ کسانوں اور دہقانوں کی لاکھ سعی و کاوشں بھی اسے برقرار نہیں رکھ سکے گی۔

حقیقت یہ ہے کہ اس وقت دُنیا کے سامنے کمیونزم کا معاشی نظام پیش کیا جا رہا ہے اس کا فلسفہ نہیں۔ اس نظام کے متعلق بدلائل و شواہد بتایا جا رہا ہے کہ یہ سرمایہ دارانہ نظام کے مقابلہ میں انسانیت کے لئے آیۂ رحمت ہے (اور واقعہ بھی ہے) سوال یہ ہے کہ جب اس نظام کی باری ختم ہو جائے گی اور یہ اپنی مسند خالی کر رہا ہوگا۔ اور اس کی جگہ دُوسرا نظام لے رہا ہوگا۔ جو اس کی ضد ہوگا۔ تو اس وقت کمیونزم کے حامی دُنیا کو کیا کہیں گے؟ اس وقت ان کے تمام دلائل و شواہد) جو یہ موجُودہ نظام (کمیونزم) کے حق میں پیش کر رہے ہیں، سب باطل

قرار پا جائیں گے۔ اُس وقت انہیں بھی اُس آنے والے نظام کی حمایت کرنی ہوگی۔ ورنہ جو درگت اس وقت نظامِ سرمایہ داری کے حامیوں کی بن رہی ہے، وُہی کچھ ان کے ساتھ بھی ہوگا۔ اس لئے کہ نظامِ سرمایہ داری کے حامیوں کا قصور اتنا ہی ہے کہ وہ جدید نظام کا ساتھ نہیں دے رہے۔ جانے والے نظام کے ساتھ لپٹے ہوئے ہیں۔ اگر اُس وقت کمیونزم کے حامیوں نے اس جدید نظام کا ساتھ نہ دیا، تو وُہ بھی اسی جرم کے مرتکب قرار پائیں گے، جس جرم کی بنا پر اس وقت نظامِ سرمایہ داری کے حامیوں کو موردِ الزام قرار دیا جا رہا ہے۔

پھر یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ اس وقت ماوزے تنگ اپنی قوم کو کمیونزم کے معاشی نظام کی برکات کی بنا پر اس مقام تک لے آیا ہے۔ کل کو جب اس نظام کی باری ختم ہو جائے گی تو پھر اس قوم سے کیا کہا جائے گا اور ان کے لئے وجۂ جامعیت کیا چیز ہوگی؟

**فلسفۂ جبریت** اصل میں ماوزے تنگ کا فلسفۂ اضداد، فلسفۂ جبریت (DETERMINISM) ہی کی ایک شاخ ہے۔ جس کی رُو سے انسان کی حیثیت کائنات کی عظیم مشینری میں ایک بے بس پُرزے سے زیادہ کچھ نہیں، جو مشین کی حرکت کے ساتھ چلنے پر مجبور ہوتا ہے۔ یہ فلسفہ، یُونان کی فکرگاہوں سے اُبھرا اور انسانیت کو تباہ کرتا ہُوا مختلف بھیس بدل کر یہاں تک آ پہنچا ہے۔ یہی وُہ فلسفہ تھا جس سے متأثر ہو کر ہندوؤں نے تناسخ (آواگون) کا عقیدہ وضع کیا اور عیسائیت نے "اوّلین گناہ" (ORIGINAL SIN) کے کلنک کا ٹیکہ انسانیت کی پیشانی پر لگایا جو کسی کے دھونے دُھل نہیں سکتا۔ مغرب کے مفکّرین اور سائنس دانوں نے عیسائیت کو تو خیرباد کہہ دیا لیکن وُہ اس کے فلسفہ کے چکّر سے نہ نکل سکے۔ چنانچہ ان کی ہر تحقیق کا رُخ اسی طرف جاتا ہے۔ کہ انسان مجبورِ محض ہے۔ اسی سے ہیگل متأثر تھا اور یہی مارکس بیچارے کے اعصاب پر سوار رہا۔ اب وُہی تصوّر فلسفۂ اضداد کے رُوپ میں سامنے آیا ہے۔ جس میں نظام خود بخود بدلتے رہتے ہیں اور انسان ہر آنے والے نظام کا ساتھ دینے کے لئے مجبور ہوتا ہے۔ نہ اس کی بُرائیاں، کسی مروّجہ نظام کا کچھ بگاڑ سکتی ہیں۔ نہ اس کی اچھائیاں، اس کا کچھ سنوار سکتی ہیں۔

**اس کے برعکس** اس کے برعکس، قرآن یہ کہتا ہے۔ کہ ایک نظام فی ذاتہٖ اچھا

ہوتا ہے اور دُوسرا نظام فی ذاتہ خراب ہوتا ہے۔ جو اچھا ہوتا ہے۔ اس میں قائم رہنے کی صلاحیت ہوتی ہے، جو خراب ہوتا ہے وُہ باقی نہیں رہ سکتا۔ اچھے نظام کا معیار یہ ہے کہ

مَا يَنفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ ط ( ۱۳/۱۷ )

جو نظام تمام نوعِ انسان کے لئے نفع بخش ہوتا ہے۔ وُہی نظام اچھا ہوتا ہے اور اس میں باقی رہنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ اس کے برعکس إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُونَ ○ (۶/۱۳۵) جو نظام سلب و نہب اور ظلم و جور پر مبنی ہوگا اُسے کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی۔

چونکہ محو و ثبات کا یہ قانون غیر متبدل ہے۔ اس لئے اس کے خلاف ہو نہیں سکتا۔ بات ساری وقت (TIME) کی ہے۔ اگر انسانوں کی جماعت اس کے لئے اُٹھ کھڑی ہوگی، تو یہ ظلم پر مبنی نظام جلدی مٹ جائے گا۔ اگر ایسا نہ ہوا تو اس میں وقت لگ جائے گا۔ قرآن کریم نے اس کی ایک مثال بھی دی ہے۔ اس نے کہا ہے کہ نظامِ جاگیرداری (FEUDAL SYSTEM) جس میں زمین کے بےحد و نہایت رقبے افراد کی ملکیت میں چلے جاتے ہیں، ظلم پر مبنی نظام ہے۔ یہ مٹ کر رہے گا۔ خدا کے کائناتی قانون کی رُو سے ایسا بتدریج ہوگا۔

أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا نَأْتِي الْأَرْضَ نَنقُصُهَا مِنْ أَطْرَافِهَا ط
وَاللَّهُ يَحْكُمُ لَا مُعَقِّبَ لِحُكْمِهِ ط وَاللَّهُ سَرِيعُ الْحِسَابِ ○ (۱۳/۴۱)

کیا یہ لوگ اس حقیقت پر غور نہیں کرتے کہ ہم کس طرح زمین کے رقبوں کو جاگیرداروں کی ملکیت سے کم کرتے جا رہے ہیں۔ یہ خدا کے قانون کے مطابق ہو رہا ہے۔ جسے کوئی پلٹا نہیں سکتا۔ وُہ بہت جلد حساب کر دیتا ہے۔ لیکن اس کا ایک ایک دن تمہارے حساب و شمار سے ایک ایک ہزار سال کا ہوتا ہے۔

لیکن جب عہدِ نبی اکرمؐ میں جماعت مومنین اس قانون کو عملاً نافذ کرنے کے لئے اُٹھ کھڑی ہوئی تو وُہی انقلاب جسے اپنی رفتار سے ہزاروں سال میں جا کر مکمل ہونا تھا، چند سال کے عرصہ میں ظہور میں آ گیا۔ عہدِ نبی اکرمؐ میں، زمین کو بٹائی یا کرایہ پر دینے کی ممانعت کر دی گئی اور حضرت عمرؓ کے زمانے میں تمام زمین، نظامِ معاشرہ کی

تحویل میں آگئی۔ اس کے بعد جب اس جماعت کے جانشینوں نے اس قانونِ خداوندی سے اعراض برتا۔ تو اس قانون نے پھر اپنی کائناتی رفتار سے آگے چلنا شروع کر دیا اور اب یہ صدیوں کی مسافت طے کرنے کے بعد پھر عملاً متشکل ہوتا نظر آرہا ہے۔ یہی مثال دُوسرے غلط نظامہائے حیات پر بھی صادق آتی ہے۔

یہ ہے قرآن کا پیش کردہ قانونِ محو و ثبات۔ یہ تاریخی وجوب کی اندھی قوت کی پیدا کردہ گردش دولابی نہیں۔ اس میں اُصول یہ ہے کہ لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ ط (۸/۴۲) جو مٹتا ہے۔ وُہ بھی دلیل و بُرہان کی رُو سے مٹتا ہے۔ جو زندہ رہتا ہے۔ وُہ بھی دلیل و بُرہان کی رُو سے زندہ رہتا ہے۔ اور وُہ دلیل و بُرہان یہ ہے کہ

مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ ط (۱۳/۱۷)

زندہ وُہ رہتا ہے۔ جو نوعِ انسان کے لئے منفعت بخش ہو۔

اس نقطۂ خیال سے بھی آپ دیکھئے کہ جدلیت کے فلسفہ اور قرآنی فلسفہ میں سے کس میں اس کی صلاحیت ہے کہ وُہ ایسے نظام کو قائم کر سکے۔ اور باقی رکھ سکے۔ جو انسانیت کے لئے نفع بخش ہو۔

**اہم حقیقتیں** نظامِ کائنات پر غور کرنے سے چند ایک اہم حقیقتیں ہمارے سامنے آتی ہیں۔ مثلاً:۔

۱۔ صفحۂ ارض پر زندگی کی نمود سے پہلے ہی سامانِ زیست موجود تھا اور موجود چلا آرہا ہے۔ زندگی خواہ اوّلین جرثومہ کی شکل میں ہو اور خواہ بلند ترین حیوانی پیکر میں، جن اشیاء پر اس کے قیام و بقا کا انحصار ہے۔ پانی، روشنی، حرارت، ہوا، خوراک وغیرہ۔ وُہ سب کچھ ساتھ موجود رہتا ہے۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ سلسلہ یونہی اتفاقاً وجود میں نہیں آگیا۔ یہ کسی سوچی سمجھی اسکیم کے ماتحت کارفرما ہے اور سراسر حکمت پر مبنی۔

۲۔ یہ سامانِ زیست ان اشیاء کا خود پیدا کردہ نہیں، کسی اور کا عطا کردہ ہے۔ یعنی جس نے انہیں زندگی دی ہے۔ اس نے سامانِ زندگی بھی پیدا کر دیا ہے۔ قرآن کے الفاظ میں:۔

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا - (۱۱/۶)
زمین پر کوئی ذی حیات ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری خدا پر نہیں -
حکیم الامتؒ کے الفاظ ہیں :-

اَلْاَرْضُ لِلّٰهِ

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون؟ — کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب؟
کون لایا کھینچ کر پچھم سے بادِ سازگار؟ — خاک یہ کس کی ہے؟ کس کا ہے یہ نورِ آفتاب؟
کس نے بھر دی موتیوں سے خوشۂ گندم کی جیب؟ — موسموں کو کس نے سکھلائی ہے خوئے انقلاب

دِہ خدایا! یہ زمین تری نہیں، تیری نہیں!
تیرے آبا کی نہیں تیری نہیں میری نہیں!

۳ - اقبالؒ کے نزدیک زمین صرف اللہ کی ملکیت ہے۔ صفحہ ارض پر کوئی شئے (انسان کے علاوہ) ایسی نہیں جو سامانِ زیست کو انفرادی ملکیت میں لے بیٹھے۔ وہ صرف اس سے اپنی ضرورت پوری کرتی ہے۔ وَكَاَيِّنْ مِّنْ دَآبَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا اَللّٰهُ يَرْزُقُهَا وَاِيَّاكُمْ (۲۹/۶۰)۔ ذرا سوچو تو سہی کہ کتنے ذی حیات ہیں جو اپنا رزق اپنی پیٹھ پر لادے لادے پھرتے ہیں۔ سامانِ زیست مائدۂ ارض پر تمہارے لئے اور ان کے لئے بکھرا پڑا ہے۔
ان میں سے جو ذی حیات رزق کا ذخیرہ بھی کرتے ہیں (مثلاً چیونٹیاں یا شہد کی مکھیاں وغیرہ)، تو وہ بھی ان سب کی اجتماعی ضرورت کے لئے ہوتا ہے۔ انفرادی ملکیت کا سوال وہاں بھی نہیں ہوتا۔

۴ - انسانوں کے لئے بھی اسی انداز کی زندگی بسر کرنا منشائے فطرت تھا۔ اسے قرآن (قصہ آدم کے تمثیلی رنگ میں) اس زمین پر جنّت کی زندگی سے تعبیر کرتا ہے۔ یعنی وہ زندگی جس میں کیفیت یہ ہو کہ :-
اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى ۝ وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى ۝ (۲۰/۱۱۸)
اس میں تجھے نہ بھوکے رہنے کا غم ستائے نہ پیاس پریشان کرے نہ اس میں

لباس کے لئے متفکر ہونا پڑے، نہ مکان کے لئے سرگرداں۔
اس میں کیفیت یہ ہونی چاہیئے کہ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا (۲/۳۵) جہاں کسی کو ضرورت ہو، پیٹ بھر کر کھانے کو مل جائے۔ ذرائع رزق ہر ایک کے لئے یکساں طور پر کھلے ہوں۔ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيْنَ ٥ (۴۱/۱۰)
اقبالؒ کے الفاظ میں :۔

حق زمین را جز متاع ما نگفت
این متاع بے بہا مفت است و مفت
باطن اَلْاَرْضُ لِلّٰهِ ظاہر است
ہر کہ این ظاہر نہ بیند کافر است

۵۔ لیکن انسان کی مفاد پرستیوں نے، سامانِ زیست پر انفرادی ملکیت کا تصور پیدا کر کے اس جنّت کو جہنم میں تبدیل کر دیا۔ اس پستی کو قرآن نے ہبوطِ آدم سے تعبیر کیا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر فرد، دوسرے کا دشمن ہو گیا (وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ) ۔ (۲/۳۶)
اب مقصودِ فطرت یہ ہے کہ انسانی دنیا میں پھر سے وہی جنّتی زندگی کا نقشہ قائم ہو جائے اور اس طرح جنّت سے نکلا ہوا آدم پھر سے جنّت کو پالے گا۔ خدا کا کائناتی قانون، اسی نقشہ کو قائم کرنے کے لئے سرگرمِ عمل ہے۔ لیکن جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، اس کی رفتار ہمارے حساب و شمار کے مطابق، بہت سست ہے اس کا ایک ایک دن ہزار ہزار سال کا ہے۔
اس رفتار کو تیز کرنے کے لئے آسمانی دعوتِ انقلاب کے داعی حضرات انبیاء کرام وقتاً فوقتاً آتے رہے۔ وہ اپنے حلقۂ اثر میں اس نقشہ کو قائم کرتے۔ یعنی سامانِ زیست کو تمام افرادِ انسانیہ کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے عام کر دیتے (اسے نظامِ ربوبیت کہا جاتا ہے)۔ لیکن ان کے بعد مفاد پرست گروہ پھر آگے بڑھ آتا اور اس نقشہ کو اُلٹ کر پھر سے معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا کرتا۔ یہ کچھ ایسے لوگوں کی مدد سے ہوتا، جو مقدس لبادوں میں ملبوس ہو کر عوام سے کہتے کہ منشاءِ خداوندی یہی ہے۔ انہیں مذہبی پیشوا کہا جاتا ہے۔

آخری مرتبہ وُہ جنّتی معاشرۂ خُدا کے آخری نبی، محمّد رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے ہاتھوں متشکّل ہُوا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد، مفاد پرست گروہ ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت کی شکل میں پھر آگے بڑھ آیا۔ اُنہوں نے باطل کا نظامِ سرمایہ داری قائم کر دیا اور خُدا کا کائناتی قانون پھر سے اپنی رفتار سے آگے بڑھنے لگا۔

اب نبوّت کا سلسلہ ختم ہو گیا تھا۔ اس لئے اب اس جنّتِ ارضی کی تشکیل کی دو صُورتیں تھیں:۔

(ا) جس اُمّت (خیرِ اُمّۃ) کو اس آخری نبیؐ کے پیغام (قُرآن) کا وارث قرار دیا گیا تھا۔ وُہ اس نظام کو اپنے دست و بازُو سے قائم کرتی اور باقی رکھتی۔ اور اگر وُہ ایسا نہ کرتی۔ تو

(ب) زمانے کے تقاضے انسان کو ایسا کرنے پر مجبُور کر دیتے۔ اس شکل میں دُشواری یہ ہوتی ہے۔ کہ یہ نظام بیک جست اپنی منزّہ صُورت میں سامنے نہیں آسکتا۔ ابتداءً بڑی دھندلی سی شکل میں نمودار ہوتا ہے۔ اور پھر تجرباتی طریق سے بتدریج اپنی منزّہ شکل تک پہنچتا ہے۔

ہم (وارثین کتاب اللہ) نے اپنا فریضہ ادا نہ کیا، تو اس انقلاب نے دُوسری شکل اختیار کر لی۔ عصرِ حاضر میں اس کی پہلی نمود مارکس کی فکر میں سامنے آتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مارکس کے سینے میں قلبِ حسّاس تھا، جو مظلوم و مقہور انسانوں کی حرماں نصیبی پر۔ جن پر بالادست انسانوں کی چیرہ دستیوں نے رزق کے دروازے بند کر دئے تھے، خُون کے آنسو روتا تھا۔ وُہ چاہتا تھا کہ کسی طرح ان کے دُکھ دُور ہو جائیں۔ وحی کی حقیقی روشنی (قرآنی تعلیم) اس کے سامنے نہیں تھی۔ اس کے سامنے عیسائیت تھی جو لفظاً انسانیت کے دُکھوں پر آنسو بہانے کی مدّعی ہونے کے باوجُود، عملاً اس نقشہ کو قائم رکھنے کا موجب تھی۔ جس سے یہ تمام دُکھ وجُود میں آتے ہیں۔ جب آپ خُدا پرستی کے لئے دُنیا کو تیاگ دینے یا اُسے قابلِ نفرت سمجھنے کو اوّلین شرط قرار دے دیں اور مظلوموں کے دُکھ دُور کرنے کے لئے عدل کے بجائے رحم کی بھیک مانگیں۔ تو مستبد قوتیں دندناتی پھریں گی۔ انہیں ظلم و ستم سے روکنے والا کوئی نہیں ہوگا۔ مارکس نے اس حقیقتِ حال پر غور کیا تو اس نتیجہ پر پہنچا کہ ان چیرہ

دستیوں کا بنیادی سبب مذہب کا تصور ہے۔ اس لئے اس نے مذہب کو انسانیت کا اوّلین دشمن قرار دے دیا۔ اگر اس کے سامنے "مذہب" کے بجائے "دین" (قرآن کریم) ہوتا تو وہ کبھی اس نتیجہ پر نہ پہنچتا۔

رُوس میں بھی، اسی عیسائیت کا دور دورہ تھا۔ اس لئے لینن بھی خدا کے متعلق اسی نتیجہ پر پہنچا کہ اس کا تصور، مفاد پرستوں کا پیدا کردہ ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جب خدا پر ایمان نہ رہے۔ تو انسانی ذات، وحی، حیاتِ آخرت پر ایمان خود بخود ختم ہو جاتا ہے۔

چین میں مذہب کے سلسلہ میں حالات اس سے بھی بدتر تھے وہاں ایک چھوڑ، تین تین قدیم مذاہب مروّج تھے۔ اور تینوں توہم پرستی کے مظاہر، کنفیوشس ازم، کی تعلیم خالصتہً اسلاف پرستی تھی۔ جس میں جمود و تقلید سب سے بڑی نیکی اور تغیّر و اصلاح کا تصور سب سے بڑا گناہ تصور کیا جاتا ہے۔ بعینہٖ اسی طرح جس طرح ہمارے ہاں مذہبی پیشوائیت تقلید کو عین دین بنا کر پیش کرتی اور ہر تغیّر اور جدّت کو جہنم کے عذاب کا مستوجب قرار دیتی ہے، طاؤ ازم، گیان دھیان میں مست رہ کر دُنیا تیاگ دینے کی تعلیم دیتا تھا۔ بُدھ مت اس سے بھی چار قدم آگے تھا۔ اس میں منتہائے زندگی نروان حاصل کرنا ہے۔ جس سے مُراد اپنے آپ کو قاطبتہً فنا کر دینا ہوتا ہے۔ ماؤزے تنگ کے سامنے یہ مذاہب تھے۔ اس لئے اس کا ردِّعمل ظاہر ہے۔ اس نے فکری طور پر ہیگل، بلکہ مارکس سے بھی اختلاف کیا لیکن مذہب کے خلاف اس کی شدّت ان سے بھی زیادہ بڑھ گئی۔ ایسا ہونا بھی چاہیئے تھا۔ اتنا بڑا انقلابی ذہن جمود و تعطّل کے اس جذام کو کیسے گوارا کر لیتا؟ لیکن چونکہ دین اس کے سامنے بھی نہیں تھا، اس لئے اُس نے بھی اپنے فلسفہ کی بُنیاد اپنے قیاسات ہی پر رکھی۔ وُہ اس کے سوا کر بھی کیا سکتا تھا۔

یہ ہے وُہ فلسفہ جس کا اجمالی تعارف ہم نے شروع میں کر لیا تھا اور جس کی بنیادوں پر، وُہ اتنے عظیم معاشی نظام کی عمارت استوار کرنا چاہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس فلسفہ کی بُنیادوں پر یہ عمارت قائم نہیں رہ سکتی۔ جب چین میں السابقون الاوّلون (PIONEERS) کی موجودہ نسل ختم ہو جائے گی تو پھر (آیندہ نسل کے لئے) اتنی بڑی قُربانیوں کے لئے کوئی جذبۂ محرکہ نہیں رہے گا۔ اور چینی انقلاب بھی اسی تحریف

(MECHANISM) پر مجبور ہو جائے گا۔ جس کا طعنہ وُہ اس وقت رُوس کو دے رہا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ پہلے رُوس اور اس کے بعد چین کی ان انقلابی جماعتوں نے کائناتی قانون کی تائید کے لئے ہاتھ اُٹھا کر، اس کی رفتار میں تیزی پیدا کر دی ہے۔ لیکن چونکہ ان کے انقلاب کی اساس و بنیاد محکم نہیں، اس لئے یہ انقلاب ایک ہنگامی حادثہ بن کر رہ جائے گا۔ اور اس کے بعد، اگر کائناتی قانون نے اپنے حساب سے "ایک دن" کی مزید "تاریخ ڈال دی" تو انسانیت کو صدیوں تک پھر سرمایہ داری کے آہنی شکنجہ میں جکڑے رہنا پڑے گا۔ لیکن اگر اس وقت اس معاشی انقلاب کو قرآن کی اساسِ محکم مل جائے تو پھر نظامِ سرمایہ داری سر نہیں اُٹھا سکے گا۔ اور جنت سے نکلا ہُوا آدم، اپنے فردوسِ گم گشتہ کو پھر سے پالے گا۔ اقبالؒ نے نیٹشے کے فکر کی بلندی اور اس کی بنیاد کی پستی کو دیکھ کر کہا تھا ؎

اگر ہوتا وُہ مجذوب فرنگی اس زمانے میں
تو اقبال اس کو سمجھاتا مقامِ کبریا کیا ہے؟

لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس "مجذوب فرنگی" سے کہیں زیادہ ضرورت آج اس "سالکِ چینی" کو مقامِ کبریا سے آگاہ کرنے کی ہے۔ یہ اس لئے کہ مقامِ کبریا کے راستے میں جو خاردار جھاڑیاں دامن گیر ہوتی ہیں، چین نے انہیں راستے سے الگ کر دیا ہے ——— وہاں بادشاہی، مذہبی پیشوائیت، اور سرمایہ داری کی قوتیں ختم ہو چکی ہیں۔ اور یہی وُہ خاردار جھاڑیاں ہیں جو انسان کو "خدا" تک پہنچنے نہیں دیتیں۔ یہ وُہ حصّہ لَا ہے۔ جسے طے کئے بغیر انسان اِلَّا اللّٰہ تک پہنچ نہیں سکتا۔ چین ان منفی منازل کو طے کر لینے کے بعد، دین کی منزل اِلَّا کی سرحد پر کھڑا ہے۔ اگر اس وقت اُسے اس مقام کی نشان دہی کر دی جائے اور وُہ اس راستے کو اختیار کرے، تو صرف چین ہی نہیں، عالمگیر انسانیت اُس جہنّم سے بچ سکتی ہے جس میں اُسے بصورتِ دیگر نمعلوم کتنے عرصہ تک اور مُبتلائے مصائب رہنا پڑے۔ اور اس سے نکالنے کے لئے خُدا جانے اسے کتنی خُون کی ندیاں پیرنی، اور آگ کے دریا عبُور کرنے پڑیں۔ مسلم ممالک میں سے اس وقت کوئی بھی اس کے لئے آمادہ نظر نہیں آتا، کہ وُہ قرآن کے انقلابی پروگرام کو اپنے ہاں عملاً متشکل کر دے۔ یہ ممالک ابھی حصّہ لَا ہی سے نہیں نکلے،

حصہ الّا تک کیسے پہنچ سکیں گے۔ پاکستان کا تصور پیش کرتے ہوئے علامہ اقبالؒ نے کہا تھا، کہ اس سے اسلام اس ٹھپّے کو مٹا سکے گا، جسے عربی ملوکیت نے اس پر ثبت کر دیا تھا۔"

حقیقت یہ ہے کہ اس وقت تاریخ نے ہمیں ایک عجیب مقام پر لا کھڑا کر دیا ہے ایک طرف مغربی جمہوریتیں ہیں۔ جن کا نظام سرمایہ دارانہ ہے۔ لیکن وہ عیسائی یا یہودی ہونے کی جہت سے، اپنے آپ کو خدا پرست کہتی ہیں لیکن قرآنِ کریم اس قسم کی خدا پرستی کو خدا پر ایمان قرار ہی نہیں دیتا۔ خدا پر ایمان کے معنی یہ نہیں کہ آپ اپنے ذہن کے تراشیدہ (یا اپنے مذہب کے پیش کردہ) خدا کے تصور کے مطابق مانیں۔ خدا پر ایمان کے معنی یہ ہیں کہ آپ خدا کے اس تصور پر ایمان رکھیں جو تصور اس نے خود اپنے متعلق دیا ہے۔ اور وہ تصور قرآن کے علاوہ اور کہیں نہیں مل سکتا۔ یہی وجہ تھی کہ قرآنِ کریم نے اہلِ کتاب سے بھی یہ مطالبہ کیا تھا کہ وہ خدا پر ایمان لائیں۔ لہٰذا قرآنی نقطۂ نگاہ سے، نہ اہلِ مغرب خدا پرست ہیں اور نہ ہی ان کا نظام، قرآنی نظام کے مماثل ہے۔ بلکہ وہ اس کی ضد ہے۔ ان کی طرف سے یہ نعرہ کہ:۔

"دنیا کے خدا پرستو! آؤ اور اشتراکیت کے خدا فراموش نظام کے خلاف متحدہ محاذ بناؤ۔"

محض ایک سیاسی نعرہ ہے جو مسلم اقوام کو اپنے دامِ تزویر میں پھنسانے کے لئے وضع کیا گیا ہے۔ دوسری طرف کمیونزم ہے۔ جس کا معاشی نظام تو قرآنی نظام کے مماثل ہے۔ لیکن اس کا فلسفۂ حیات قرآنی فلسفۂ زندگی کی نقیض ہے۔ اس لئے وہ بھی قرآنی نقطۂ نگاہ سے، مسلمان کے لئے قابلِ قبول نہیں ہو سکتی۔ واضح رہے۔ کہ جس طرح قرآن اپنے نظام کو فلسفۂ حیات سے الگ نہیں کرتا، اسی طرح کمیونزم بھی اپنے معاشی نظام کو اپنے فلسفۂ زندگی سے جدا نہیں کرتی۔ کمیونسٹ کے لئے ضروری ہے کہ وہ کمیونزم کے فلسفۂ حیات اور اس پر متفرع معاشی نظام کو ایک وحدت کی طرح تسلیم کرے۔ یہ وجہ ہے جو میں کہا کرتا ہوں کہ نہ ایک کمیونسٹ مسلمان ہو سکتا ہے اور نہ ایک مسلمان کمیونسٹ۔

تیسری طرف ہم مسلمان ہیں جن کے ہاں قرآنِ کریم کے الفاظ تو بے شک محفوظ

ہیں لیکن عملاً نہ ہمارا نظام قرآنی ہے، نہ فلسفۂ زندگی قرآنی۔ ہم بھی درحقیقت اسی مقام پر ہیں جس مقام پر مغرب کے اہلِ کتاب ہیں۔ اس فرق کے ساتھ کہ ان پاس خدا کی راہ نمائی اپنی اصل شکل میں موجود نہیں اور ہمارے پاس وہ (غلافوں میں لپٹی ہوئی) محفوظ رکھی ہے۔

ان حالات کے پیشِ نظر علامہ اقبالؒ نے جو کہا تھا کہ اگر اشتراکیت کے ساتھ خدا کو شامل کر لیا جائے تو وہ اسلام کے مماثل ہو جاتی ہے۔ تو یہ فارمولا کاروانِ انسانیت کے لئے منزلِ مقصود کی صحیح نشان دہی کرتا ہے۔ لیکن (جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے) اس کے لئے مسلم ممالک ابھی آمادہ نہیں۔ وہ اس تصوّرِ حیات سے ہنوز بہت دور ہیں، لیکن دینِ خداوندی پر کسی خاص قوم کی اجارہ داری نہیں کہ وہ اسے چلانا چاہے تو وہ چل سکے۔ اور اگر وہ اسے قصّہ پارینہ بنا بیٹھے تو دین بے بس و مجبور بیٹھا، اس کا منہ تکتا رہے۔ یہ تمام نوعِ انسانی کی مشترکہ وراثت ہے۔ دنیا کی جو قوم بھی اسے اپنانا چاہے، دین اسی کا ہو جاتا ہے۔ وہ ہر مخاطب قوم سے کہتا ہے کہ دین کا نقشہ تمہارے سامنے آ چکا ہے۔ فَاِنْ تَوَلَّوا ...... يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ۔ اگر تم اسے اپنانا چاہتے ہو تو ھو الّمراد۔ لیکن اگر تم اس سے روگردانی کرنا چاہتے ہو تو خدا تمہاری جگہ کوئی اور قوم لے آئے گا۔ جو اسے اپنا لے گی۔ وَلَا تَضُرُّوْهُ شَيْئًا (۱۱/۵۷) اور تم اس کا کچھ بھی بگاڑ نہ سکو گے۔ دین ایک خاص فلسفۂ حیات کے مطابق نظامِ زندگی متشکل کرنے کا نام ہے۔ جو قوم بھی ایسا کرنا چاہے دین لپک کر اسے سینے سے لگا لے گا۔

اُٹھا لے جو بڑھا کر ہاتھ میں بادہ اسی کا ہے

آخر میں میں[1] اتنا واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ سابقہ صفحات میں ماوزے تنگ کی فکر پر جو تنقید کی گئی ہے۔ تو اس سے اس کی تنقیص مقصود نہیں۔ قرآنِ کریم عقلِ انسانی کا مقام بہت بلند قرار دیتا ہے۔ اور اس سے کام لینے کی بڑی تاکید کرتا ہے۔ اس لئے جو شخص بھی عقل و فکر سے کام لے کر زندگی کے مسائل سلجھانے کی کوشش کرے گا، وہ ہمارے

---

[1] تیرھویں باب "اشتراکیت" کے لئے قریباً تمام مواد پرویز صاحب کی کتاب "انسان نے کیا سوچا؟" اور طلوعِ اسلام جنوری ۱۹۶۷ء کے مقالے "ماوزے تنگ اور قرآن" سے لیا گیا ہے۔ (مؤلف)

نزدیک مستحقِ تحسین وستائش ہے۔ لیکن (وہ کہتا یہ ہے کہ) جس طرح (مثلاً) انسانی نگاہ کی ایک حد ہے۔ جس سے آگے کی چیز اسے نظر نہیں آسکتی۔ اسی طرح عقلِ انسانی کی بھی ایک حد ہے جس سے آگے وُہ جا نہیں سکتی۔ وحی کی راہنمائی، ایک دُوربین ہے جس سے عقلِ انسانی کی آنکھ اپنی عام حد سے بہت آگے کی چیزیں دیکھ سکتی ہے۔ ماوزے تنگ (یا دیگر مفکّرین) کی حدِّ نگاہ یقیناً عام انسانوں سے زیادہ وسیع ہے لیکن ہم چاہتے ہیں کہ اسے وحی کی راہ نمائی کی دُوربین ملجائے تاکہ وُہ راستے کے ان مقامات کو یقین کی آنکھ سے دیکھ سکے۔ جسے اس وقت وہ محض قیاس کی لکڑی سے ٹٹولتا ہے۔ اس لئے غلطی کھا جاتا ہے۔ ہم اگر اس وقت اس سے زیادہ دُور کی چیزیں دیکھ سکتے ہیں۔ تو اس میں ہماری آنکھ کا کوئی کمال نہیں۔ یہ اس دُوربین کی خوبی ہے یہ دُوربین اگر اس مفکّر کے ہاتھ میں دے دی جائے۔ تو وُہ ہم سے بہت زیادہ آگے دیکھ سکے گا۔ اس لئے خود بھی راستے کے خطرات سے محفوظ رہے گا۔ اور کاروانِ انسانیت کو بھی بحفاظت اس کی منزل تک لے جا سکے گا۔ یہ ہے میری آرزو کا مقصود اور میری سعی وکاوش کا مطلوب۔

یارب! ایں آرزوئے من چہ خُوش است

---

## چودھواں باب

# نشانِ منزل

## موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لئے

مخلوق خداوندی میں سے انسان سب سے زیادہ مدنی الطبع واقع ہوا ہے۔ یہ آپس میں مل جل کر رہنے کے لئے مجبور ہے۔ اس نے اس مقصد کے لئے ہر دور کی شعوری سطح کے مطابق معاشرہ تشکیل کیا ہے اور اجتماعی زندگی کو ہموار و پاکیزہ رکھنے کے لئے ایسے قواعد و ضوابط وضع کئے ہیں جن پر عمل پیرائی سے اس کی تمدنی زندگی سکون و راحت کا گہوارہ ہو۔ اس نے آزادی کا جو مفہوم سمجھا اسے برقرار رکھنے کے لئے اپنا خون بہایا اور اس کے لئے بڑی بڑی لڑائیاں لڑی ہیں۔ اس نے آزادی کی دیوی کے مجسّمے نصب کئے اور ان کی پرستش کی۔ دنیا کی کوئی قوم نہیں جس نے آزادی کی شان میں حمد و ستائش کے نغمے نہ گائے ہوں اور اس کے قدموں میں اپنی شردھا (عقیدت) کے پھول نہ چڑھائے ہوں۔

انسان کی ساری تمدنی زندگی حصول و استحکام آزادی کی کش مکش کی تاریخ ہے۔ حضور اقدس و اعظم جب مدینہ تشریف لائے، دیکھا کہ وہاں یہودی عاشورہ کا (محرم کا) روزہ رکھتے ہیں۔ آپ نے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ اس روز یہ فرعون کی غلامی سے آزاد ہوئے تھے۔ اس لئے انہوں نے اس دن کی یاد کو تازہ کرنے کے لئے اس دن روزہ رکھنے کا فیصلہ کیا ہوا ہے۔ آپ نے صحابہؓ (والذین معہ) سے فرمایا کہ تم بھی اس دن کا روزہ رکھ کر ان کے جشنِ مسرت میں شرکت کرو۔ اس لئے کہ کسی قوم کی آزادی صرف اس قوم کے لئے وجہِ شادمانی و مسرت نہیں ہوتی۔ اسے دنیا کے ہر انسان کے لئے وجہِ مسرت ہونا چاہیئے۔ کیونکہ آزادی ایک فرد کی ہو یا ایک قوم کی بہرحال موجبِ طمانیت و مسرت ہوتی ہے۔

## تصوّرِ آزادی

دُنیا ابھی تک تصوّرِ آزادی تک ہی پہنچ سکی ہے اور ابھی انسانیت کی آزادی سے آشنا نہیں ہوئی۔ لیکن آپ سوچیئے کہ اگر کوئی ایسا دن ہو جس میں نوعِ انسان کو پروانۂ آزادی ملا ہو تو کیا وُہ دن ایسا نہیں کہ جسے ایک فرد یا ایک قوم یا ایک ملک ہی نہیں بلکہ عالمِ انسانیت عالمگیر جشنِ مُسرّت کے طور پر مناۓ؟ ایسا دن جس میں فروغِ آدمیّت اور ارتقاۓ انسانیت کے لیۓ ان درخشاں و تابناک حیات بخش قوانینِ خُداوندی کو منشورِ آزادی کے طور پر دُنیاۓ انسانیت کے سامنے پیش کرنے کے لیۓ سالارِ انسانیتؐ کو رحمۃ للعالمینؐ بنا کر بھیجا ہو۔ افسوس کہ نوعِ انساں ابھی اس حقیقت سے واقف نہیں، اور اگر اسے یہ پتہ ہو کہ اسے کس دن منشورِ آزادی ملا تو کیا اُس دن کو دُنیا کے انسان بلا لحاظ قومیّت، رنگ و بُو، حسب و نسب، بطور جشنِ آزادی نہ منائیں؟

لیکن جب ہم نے جو اس منشورِ آزادی کے نگران و محافظ (خیرِ اُمّۃً) ہونے کے مدّعی ہیں۔ انہیں بتایا ہی نہیں کہ وُہ منشور کیا ہے۔ اور اس کی رُو سے کس قسم کی آزادی حاصل ہوتی ہے۔ انہیں کیا بتلانا ہم ہیں سے کتنے ہیں جنہیں خود معلوم ہو کہ وہ منشورِ آزادی کیا ہے اور عالمِ انسانیت کو اس کے لیۓ کیوں سپاس گزار ہونا چاہیئے۔

## اسلامی نظام

اسلامی نظام نہایت سیدھے سادھے اُصولوں پر قائم ہے اور آئینہ فطرت کی طرح صاف و شفاف ہے۔ اس میں کہیں کثافت نہیں۔ ابہام نہیں۔ جھول نہیں۔ سلوٹ نہیں۔ ٹیڑھ نہیں۔ ما ترٰی فی خلق الرّحمٰن من تفٰوُت جن چیزوں کے اندازے خُدا نے مقرّر کر دیۓ ہیں۔ ان میں کہیں نقص و تفاوت نہیں ہوا کرتا۔ فارجع البصر ھل ترٰی من فطور جدھر جی چاہے نگاہ اُٹھا کر دیکھ لیجیۓ۔ کہیں کسی گوشے اور کسی کونے میں فطور نظر نہیں آۓ گا۔ مسلمانوں میں جس قدر اُلجھاؤ اور پیچیدگیاں، زندگی میں جتنی دُشواریاں اور پریشانیاں جس قدر اختلافات و نزاعات جتنی فرقہ بندیاں اور گروہ سازیاں ہیں سب ہماری اپنی پیدا کردہ ہیں۔

میرے ساقی نے عطا کی ہے مۓ بے دُرد و صاف
رنگ جو کچھ دیکھتے ہو میرے پیمانے کا ہے

اس نظام میں کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ وُہ دُوسرے انسانوں پر حکومت

کرے۔ اسی اصل الاصول میں احترامِ آدمیت اور انسانی مساوات کا راز پوشیدہ ہے۔ اس میں اطاعت صرف قوانینِ خداوندی کی ہو سکتی ہے۔ اس میں حکومت کا حق صرف احکم الحاکمین کے ضابطۂ قوانین کو ہے۔ اس میں کوئی شریک و سہیم نہیں۔ وَلَا یُشْرِكُ فِیْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا (کہف)

اس میں سرداری و سروری اسی ذاتِ بے ہمتا کے لئے ہے۔ یہ ذاتِ خداوندی ہی کے لئے سزاوار ہے کہ وہ حاکمیت کا دعویٰ کرے۔ یہ اُسی کو زیب دیتا ہے کہ جس کا قانون اشیائے کائنات میں جاری و ساری ہے۔ انسانوں پر اسی کے قانون کی حکمرانی ہو کیونکہ

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آذری

حکومت کا یہ اصول کس طرح نوعِ انسانی کو داخلی اور خارجی کش مکش سے نجات دلا کر حریت و آزادی کی صحیح فضا پیدا کر دیتا ہے۔ جس میں انسانیت بڑھتی، پھولتی اور پھیلتی ہے۔ اسلام میں حکومت کا حق صرف خدا کو حاصل ہے اور کسی کو نہیں۔

## محکومی اور غلامی سے نجات

قرآن نے نوع انسان کو غلامی سے کس طرح چھڑایا۔ نبی اکرمؐ نے محکومی اور غلامی کی زنجیروں کو توڑنے کے لئے انسانوں کی کس طرح تربیت کی۔ قرآن کریم ہمیں بتاتا ہے کہ میرِ قافلۂ انسانیتؐ کو دنیا میں اس لئے بھیجا کہ

وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِیْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ (۷/۱۵۷)

تاکہ وہ ان زنجیروں کو توڑ دے جن میں نوعِ انسان جکڑے ہوئے چلی آ رہی تھی۔ اور ان سلوں کو اُتار پھینکے۔ جن کے بوجھ تلے انسان دب رہا تھا۔ یعنی نبی اکرمؐ دنیا میں اس لئے تشریف لائے تھے کہ عالمگیر انسانیت کو غلامی اور محکومی سے نجات دلا کر صحیح آزادی عطا کریں۔

یہاں یہ سوال اُبھرتا ہے کہ جس وقت آپ تشریف لائے اُس وقت دنیا کی بیشتر قومیں آزاد تھیں اور ساری دنیا کی اقوام اپنی اپنی آزادی کی تقاریب

منافی ہیں۔

قارئین کرام! نظریہ پاکستان میں آزادی کی جو صورت پنہاں ہے اسے چشمِ انسان نے ابھی دیکھا ہی نہیں۔ آزادی کا جو مفہوم قرآنِ کریم نے پیش کیا ہے۔ اس تصورِ آزادی کو انسان نے ابھی سمجھا ہی نہیں۔

## آزادی کا تصور کیا ہے؟

آزادی کسے کہتے ہیں۔ آزادی کا تصور کیا ہے؟ اقوامِ عالم غلامی آزادی کا کیا تصور رکھتی ہیں۔ یہی ہے ناکہ اگر ایک ملک یا ایک قوم محکوم ہے اسے غلام کہا جاتا ہے اور اگر کسی ملک میں کسی قوم کی اپنی حکومت ہو تو اسے آزاد کہا جاتا ہے۔ آپ یہی کہیں گے کہ اگر ایک قوم جس کے حصارِ ملت کی بنا اتحادِ وطن ہے وہ دوسری کسی قوم کے تسلط سے آزاد ہے۔ تو اسے آزاد کہنا چاہیئے۔ یا اگر ایک ملک کسی دوسرے ملک کے تابع فرمان نہ رہے تو یہ کہا جاتا ہے۔ کہ فلاں ملک آزاد ہو گیا لیکن میزانِ خداوندی (قرآن عزیز) اس تصورِ آزادی کو صحیح تصورِ آزادی قرار نہیں دیتی۔ قرآن کے نزدیک آزادی کا معیار اپنوں اور غیروں کی حکومت ہی نہیں۔ آزادی سے مفہوم یہ ہے کہ انسان اپنے قلب و نگاہ میں آزاد ہو۔ وہ آزادی کو اپنے دل کی گہرائیوں میں محسوس کرے۔ کوئی فرد کسی دوسرے فرد کا محتاج نہ ہو۔

کس نباشد در جہاں محتاجِ کس
نکتۂ شرعِ مبین ایں است و بس (اقبالؒ)

یہ آزادی اس وقت دنیا کی کسی قوم کو حاصل نہ تھی۔ بلکہ مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ یہ آزادی تو انسان کو آج بھی حاصل نہیں جبکہ ساری دنیا میں آزادی کا ڈھنڈورا پیٹا جا رہا ہے۔ ہاں میں کہنا چاہتا ہوں کہ حضورؐ کا ظہورِ قدوسی اس عالم میں ہوا تھا۔ جس وقت بڑی بڑی عظیم الشان سلطنتیں تھیں جنہیں (انسانوں کے معیار کے مطابق)، اپنے اپنے ہاں مکمل آزادی تھی۔ لیکن کیا وہ واقعی آزادی کی متاعِ گراں بہا سے بہرہ یاب تھیں۔

## رومن سلطنت

ان میں سب سے بڑی سلطنت بازنطینی (رومن) تھی جو عیسائیت کی علمبردار تھی۔ آج عیسائیوں کا یہ دعویٰ ہے

کہ اُنہوں نے دُنیا کو آزادی کا سبق دیا ہے۔ لیکن دیکھئے کہ خود عالمِ عیسائیت کی کیفیّت کیا ہے۔

عیسائیت کا بنیادی عقیدہ ہے۔ کہ ہر انسانی بچّہ، اپنے اوّلین ماں باپ (آدم و حوّا) کے گناہ کا بوجھ اپنی پیٹھ پر لادے دُنیا میں آتا ہے۔ اس کے بعد پھر یہ اس کے بس میں ہی نہیں ہوتا کہ وُہ اس بوجھ کو کسی طرح اُتار پھینکے بجز اس کے وُہ حضرت مسیح (علیہ السّلام) کے صلیبی کفّارہ پر ایمان لائے۔ کیا آپ ان انسانوں کو جنہیں ہر وقت یہ احساس رہتا ہے کہ ہماری کمر پر گناہوں کا ایسا پشتارہ ہے۔ جسے ہم کسی طرح اُتار ہی نہیں سکتے، آزاد انسان کہہ سکتے ہیں ؟

کیا ایسا بے کس و بے بس، مجبُور اور مقہور انسان، جو اس قدر انسانیت کُش بوجھ کے نیچے دب رہا ہو، اور پھر اس میں اتنی مقدرت بھی نہ ہو کہ اس بوجھ کو اُتار پھینکے دُنیا میں سر اُٹھا کر چلنے کے قابل ہو سکتا ہے ؟ کیا اُسے کبھی بھی قلبی آزادی کی حقیقی مسرّت نصیب ہو سکتی ہے ؟ یہ ہے وُہ محکم زنجیریں جن میں اس قدر عظیم عیسائی مملکت کا ہر فرد جکڑے ہوئے تھا اور اب تک جکڑے ہوئے ہے۔

## مغرب کے مفکّرین

فکرِ مغرب نے اب عیسائیت چھوڑ خُدا تک کے وُجود سے انکار کر دیا ہے۔ لیکن اس عقیدہ کے نقوش اُن کے دل کی گہرائیوں میں اب تک پیوست ہیں کہ انسان مجبُور ہے۔ ان کی ہر تحقیق کا ملخّص یہ ملتا ہے کہ انسان مجبُورِ محض ہے۔ اُن کے علمائے الحیات (BIOLOGISTS) نے یہ بتایا کہ انسانی بچّہ اپنی سیرت و کردار کے تمام بنیادی خطوط اپنے باپ کے نطفہ سے متوارث لیتا ہے۔ اور انہیں مٹانے پر اس کا کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ لہٰذا پیدائش کے اعتبار سے ہر بچّہ مجبُور ہے۔

## محقّقین علم الانسان

(ANTHROPOLOGISTS) آگے بڑھے اور دُنیا کو یہ بتایا کہ عہدِ قدیم سے لے کر اس وقت تک انسان کی سینکڑوں نسلوں میں جو عقاید، تصوّرات، رسُوم و مناسک متوارث چلے آرہے ہیں، ہر انسانی بچّہ ان کا مرکّب ہوتا ہے اور اسے یہ قُدرت حاصل ہی نہیں ہوتی کہ ان اثرات کو محو کر سکے۔

**عُلمائے عُمرانیات** علمائے عمرانیت (SOCIOLOGISTS) آئے اور یہ اعلان کیا کہ انسانی بچہ جس ماحول میں سانس لیتا ہے۔ اس کا کریکٹر اس کے گہرے اور انمٹ نقوش کا مجموعہ ہوتا ہے۔ انسان اپنے ابتدائی ماحول کی زنجیروں سے آزاد نہیں ہو سکتا۔

**عُلمائے نفسیات** (PSYCHOLOGISTS) نے مسکرا کر کہا کہ صاحب! آپ یہ کیا کر رہے ہیں۔ جس چیز کو آپ انسان کا اختیار و ارادہ اور فکر و شعور بتا رہے ہیں، وُہ کوئی شئے ہی نہیں۔ انسان کی ہر فکر اور ہر ارادہ کو ایک اور ہی قوت کنٹرول کر رہی ہے جسے اس کا نفس لاشعور (UNCONSCIOUS MIND) کہا جاتا ہے۔ یہ وُہ جن ہے۔ جو کسی کے قابو میں ہی نہیں آسکتا۔ نہ اس کے بنانے میں کسی کا اختیار ہے۔ نہ اس کی خلاف ورزی کا کسی کو یارا۔

انسان کا ہر عمل اور ارادہ اس کے نفس لاشعور کی نمود کا نام ہے۔ لہٰذا جسے آپ انسان کا با اختیار شعور کہتے ہیں وُہ فریبِ تخیّل کے سوا کچھ نہیں۔

**عُلمائے اقتصادیات** (ECONOMISTS) آئے اور اُنہوں نے یہ نظریہ پیش کیا کہ انسان اپنے زمانے کے معاشی نظام کی پیداوار ہوتا ہے۔ جس قسم کا یہ نظام اسی قسم کا اس دَور کا انسان۔ جب پُوچھا گیا کہ معاشی نظام کس کا قائم کردہ ہوتا ہے۔ تو جواب ملا یہ تاریخی وجوب (HISTORICAL NECESSITY) کا پیدا کردہ ہوتا ہے۔ جس کے بدلنے پر انسان قادر نہیں۔

**قُرآن کا انداز** عیسائیت کے اس عقیدے سے معمور فضا میں قُرآن کریم آیا اور اس نے پُوری قوت اور شدّت سے اعلان کیا کہ یہ غلط ہے۔ کہ انسانی بچہ گناہوں کی کوئی آلائش اپنے ساتھ لے کر دُنیا میں آتا ہے۔ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِىٓ اٰدَمَ (۱۷/۷۰) حقیقت اس کے برعکس ہے۔ اور وہ یہ کہ ہم نے ہر انسانی بچّے کو واجب التکریم پیدا کیا ہے۔ یہ ہمارے قانونِ مکافات کے خلاف ہے کہ گناہ کسی کا ہو اور اس کی سزا کسی اور کو ملے۔

أَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ أُخْرٰى ۝ (۵۳/۳۸)
کوئی بوجھ اُٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اُٹھاتا۔

پھر جس ضابطہ قوانین وضوابط کو تمام انسانوں کے لئے اور تمام زمانوں کے لئے نظامِ زندگی بننا ہو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ انسانی زندگی کے تقاضوں کی تسکین کا سامان اپنے اندر رکھے۔ دین کے معنی ہی وہ نظامِ حیات ہیں۔ جو انسانی زندگی کے تمام گوشوں کو محیط ہے۔ یہ زمان و مکان سے بلند اور اس میں انسانی زندگی کے بنیادی اُصولوں کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔

## اپنی اپنی انفرادیت

قرآنِ کریم کی رُو سے ہر فرد اپنی اپنی انفرادیت رکھتا ہے۔ اور انفرادیت کا فطری تقاضا اور بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ ہر فرد اپنے عمل کا آپ ذمہ دار ہو لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ (۲/۲۸۶) یہاں کا اٹل قانون ہے۔ یعنی جو شخص قانون سے سرکش و سرتابی برتے گا۔ نقصان اسی کا ہوگا۔ جو قانون کے مطابق قدم اُٹھائے گا فائدہ اسی کا ہوگا۔

اس میں شبہ نہیں کہ وراثت، ماحول، تعلیم و تربیت کے اثرات انسان پر مُرتّب ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن اس کے اندر ایک ایسی محکم قوت رکھی گئی ہے۔ جو ان تمام اثرات کو مٹا سکتی ہے۔ اس قوت کو اس نے الوہیاتی توانائی۔ رُوحِ خداوندی (DIVINE ENERGY) کہہ کر پکارا ہے۔ اسی کو انسانی ذات (HUMAN PERSONALITY) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جس کی قوتیں حدود فراموش اور جس کے ممکنات قیود نا آشنا ہیں۔ یہی وہ قوت ہے۔ جس سے انسان مجبوری کی ہر زنجیر کو توڑ کر صاحب اختیار و ارادہ ہستی بن جاتا ہے۔

## ایران کی تہذیب

اب یہاں پر ایران کی تہذیب کے متعلق کچھ عرض کیا جائے گا۔ یہ عرب کی دوسری طرف قدیم وعظیم سلطنت تھی۔ زمانہ نزولِ قرآن میں ایران میں قدیم مجوسی مذہب کی وہ شکل کارفرما تھی، جسے زرتشت کے پیروؤں نے اپنا رکھا تھا۔ اس کی رُو سے نیکی اور بدی کے دو الگ الگ خدا اہرمن و یزداں تھے۔ اہرمنی (ابلیسی) قوت خدا (یزداں) کی قوت کا برابر کا جوڑ تھی۔ انسان بیچارے کی اس کے سامنے کیا ہستی تھی۔ ایک مجوسیت پر ہی

کیا منحصر ہے خیر و شر (GOOD AND EVIL) کے مسئلہ نے ہر جگہ اور ہر زمانے میں انسانی فکر کو بُری طرح وقفِ اضطراب رکھا ہے۔ اور ابلیسی قوت (EVIL) کے مقابلہ میں انسان کو ہمیشہ بے بس ولاچار تصور کیا گیا ہے۔ شر کی قوت وُہ فولادی زنجیر ہے جس کا توڑ انسان کے بس کی بات نہیں سمجھا گیا۔ قرآن آیا اور اس نے ابلیس کو للکار کر کہا کہ یاد رکھو!

اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْھِمْ سُلْطَانٌ (۱۷/۶۵)

میرے بندوں پر تو کبھی غلبہ حاصل نہیں کر سکتا۔

غور فرمائیے کہ قرآن نے ایک ہی جھٹکے میں ابلیسی قوت (اہرمن) کی اس قدر مہیب زنجیر کے ٹکڑے ٹکڑے کر دئے۔ اور انسان کو کتنی عظیم قوتوں کا مالک قرار دے دیا۔

**تقدیر** مجوسیت کا دُوسرا بنیادی عقیدہ بخت یا تقدیر کا تھا۔ اس عقیدہ کی رُو سے سمجھا یہ جاتا تھا کہ ہر انسان کی قسمت پہلے سے لکھی ہوتی ہے۔ اور کسی انسان کو اس کا اختیار نہیں ہوتا کہ وُہ تقدیر کے لکھے کو مٹا سکے۔ یا اس میں کسی قسم کا ردّو بدل کر سکے۔ اس طرح انسان کا ہر ارادہ اور ہر عمل جبر کی زنجیروں میں جکڑا ہوتا ہے۔ اور وُہ زندانِ تقدیر کی حیثیت سے، تقدیر کے قاضی کے فیصلے کے مطابق، اس دُنیا کے جیل خانے میں ایک مجبور و مقہور قیدی کی طرح سزا بھگتنے کے لئے آتا ہے۔ قرآن آیا اس نے اعلان کیا کہ انسان زندانِ تقدیر نہیں۔ یہ خود تقدیرِ یزدان ہے۔ یہ اپنی تقدیر خود اپنے ہاتھوں سے بناتا ہے۔ اس نوشتۂ تقدیر کے بوجھ تلے دبے ہوئے سر بزانو انسان کو جھنجھوڑ کر کہا کہ تم سے کس نے کہہ دیا کہ تم اپنے اختیار و ارادہ سے کچھ نہیں کر سکتے۔

اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ (۴۱/۴)

تم آزاد پیدا کئے گئے ہو۔ اس لئے تم اپنے اختیار و ارادہ سے جو جی میں آئے کرو۔ تمہاری مشیت ہیں۔ اور تو اور — ہم بھی دخل نہیں دیں گے۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِھِمْ (۱۳/۱)

خُدا کسی قوم کی حالت کو نہیں بدلتا جب تک وُہ قوم خود اپنی حالت کو نہ بدلے

بقول اقبالؒ :-

جنّت تری پنہاں ہے ترے خُونِ جگر میں

انسانی دُنیا میں زمامِ کار، خود انسان کے ہاتھ میں ہے۔ وُہ جس قسم کی جی چاہے اپنی تقدیر بنا سکتا ہے۔

آپ نے دیکھا کہ قرآن نے تقدیرِ یزداں کا شکوہ کرنے والے انسان کو کس طرح آزادی کی فضائے بسیط میں اذنِ بال کشائی دیا ہے۔ کیا صحیح آزادی یہ ہے یا وُہ جو اُسے ایران کی کامل آزاد مملکت میں حاصل تھی؟

## ہندوستان کی تہذیب

ایران کے بعد ہندوستان کی تہذیب ہمارے سامنے آتی ہے۔ اس دیش کا انسان محض نظری اعتبار سے ہی نہیں، معاشرہ میں عملی اعتبار سے بھی اس قسم کی غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہُوا تھا۔ یہاں انسانوں کو پیدائش کی رُو سے چار ورنوں (ذاتوں) میں تقسیم کر رکھا تھا۔ برہمن، کشتری، ویش اور شودر۔ براہمن دل و دماغ پر حکومت کرنے والے، اور کھشتری جسم پر حکومت کرنے والے۔ ویش محنت و مشقت سے سامانِ زیست پیدا کرنے والے شودر ان سب کی خدمت کرنے والے۔

اگر شودر کا سایہ کسی اُونچی ذات کے ہندو پر پڑ جائے تو شودر کی کھال کھنچوا دی جاتی تھی۔ ہندوستان میں شودروں کے لئے گزرنے کے راستے الگ مقرر تھے اور ان راستوں پر چلتے وقت شودر (فائر انجن کی طرح) مسلسل گھنٹی بجاتا تھا۔ کہ اُونچی ذات کے ہندو دُور ہی سے سمجھ لیں کہ شودر آ رہا ہے۔

اس خطرہ کے پیش نظر کہ کہیں شودروں کے دل میں یہ خیال نہ آ جائے کہ اُن سے اس قدر ذلّت آمیز سلوک کیوں کیا جاتا ہے۔ یہ عقیدہ وضع کر رکھا تھا کہ یہ سب ان کے پچھلے جنم کے کرموں (اعمال) کا نتیجہ ہے۔ یعنی وہ جنم جس کے متعلق انہیں کچھ یاد نہیں۔ اور وُہ کرم جس کا انہیں احساس تک نہیں کہ وہ کیا تھے۔ یُوں ان کے ناکردہ گناہوں کی سزا ملتی تھی اور پھر سزا بھی ایسی جس میں کسی قسم

کی تخفیف نہیں ہو سکتی۔

قرآنِ کریم نے آکر کہا کہ یہ عقیدہ یکسر باطل ہے کہ اس جنم سے پہلے انسان کا اَور جنم بھی تھا۔ انسان کا یہ پہلا جنم ہے۔ اس سے پہلے وُہ کوئی قابلِ ذکر شئے نہیں تھا (۷۶/۱) حتیٰ کہ اُسے زندگی تک حاصل نہیں تھی۔ کُنْتُمْ اَمْوَاتًا (۲/۲۸) انسان ماضی کا بوجھ اپنی گردن پر لے کر نہیں آتا۔ وُہ دُنیا میں اپنا مستقبل (آخرت کی زندگی) بنانے کے لئے آتا ہے۔ آپ نے دیکھا! کہ قرآنِ عزیز نے جنم کے چکّر کے بندھنوں میں جکڑے ہُوئے انسان کو کس طرح آزادی عطا فرما دی!

**یہُودیت** ہندوؤں کی طرح یہُودیوں کا بھی عقیدہ تھا کہ نجات و سعادت صرف اس کے لئے ہے جو بنی اسرائیل کے گھرانے میں پیدا ہو۔ اس نسلی حد بندیوں کے باہر کے انسان، جہنّم کے کندے ہیں اور کسی طرح اپنی حالت کو نہیں بدل سکتے۔ پھر ہندُوؤں کی طرح، ان کے ہاں بھی یہ عقیدہ تھا کہ انسان سے اگر کسی وقت کوئی غلطی ہو جائے تو وہ معاف نہیں ہو سکتی۔ "معاف" کے معنی یہ ہیں۔ کہ وُہ کچھ بھی کرے، اس کا اثر کسی طرح مٹ ہی نہیں سکتا۔

یہ حقیقت ہے کہ لغزش کا امکان ہر انسان سے ہے۔ اب سوچیے کہ جس انسان سے کوئی لغزش سرزد ہو جائے۔ جب اس سے یہ کہا جائے کہ بس اب تم ہمیشہ کے لئے راندہ درگاہ ہو گئے ہو۔ تو اس پر کس قدر مایوسی چھا جائے گی۔ مایُوسی ہزار خرابیوں کا باعث اور لاکھ تباہیوں کا سرچشمہ ہوتی ہے۔ مایُوس انسان کے سامنے نہ کوئی زندگی کا مقصد رہتا ہے۔ نہ اس کے دل میں جینے کی آرزو باقی۔ یہ ہیں وُہ خیالات جو مایُوس انسان کے دل سے اُبھرتے ہیں۔ سائیکلوجی کے طالب علم جانتے ہیں کہ مایُوسی (FRUSTRATION) کا نفسیاتی نتیجہ سرکشی (AGGRESSION) ہوتا ہے۔ قرآنِ کریم نے ابلیس اور شیطان کو ایک ہی سکّہ کے دو رُخ بتایا ہے۔ عربی زبان کی رُو سے ابلیس کے معنے ناامید ہیں۔ اور شیطان کے معنی سرکش۔ یعنی مجبُوری کا پہلا نتیجہ مایُوسی ہوتا ہے۔ اور اس کا فطری ردّعمل سرکشی ——! قرآنِ کریم نے یاس و ناامیدی کی ان تاریکیوں میں ڈوبے ہُوئے اور خود اپنی نظروں میں گرے ہُوئے انسان کو بازو سے پکڑ کر اُٹھایا

اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ کہ کیوں گھبراتے ہو۔ کیوں خوف کھاتے ہو؟ تم سے لغزش سرزد ہو گئی ہے تو اس سے تم ہمیشہ کے لئے راندۂ درگاہ نہیں ہو گئے۔ تمہارا مرض لاعلاج نہیں۔ اس کا علاج ہو سکتا ہے۔ تمہارے زخم کا اندمال ہو سکتا ہے۔ تم اپنی لغزش سے جو نقصان اُٹھا چکے ہو اس نقصان کی تلافی ہو سکتی ہے۔ قُلْ — يَا عِبَادِيَ الَّذِينَ أَسْرَفُوا عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا مِن رَّحْمَةِ اللَّهِ۔

اَے رسُول! ہمارے ان بندوں سے جو سہو وخطا سے اپنے آپ پر زیادتی کر بیٹھے ہیں کہہ دو کہ وُہ ہماری رحمت سے نااُمید نہ ہوں۔ إِنَّ اللَّهَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيعًا۔ خدا کے قانونِ مکافات میں اس کی بھی گنجائش ہے کہ انسانی لغزشوں سے جو نقصانات وارد ہو جائیں ان کی تلافی ہو سکے۔ إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ (۳۹/۵۳) لغزشوں کے نقصاں رساں نتائج سے تمہاری حفاظت بھی ہو سکتی ہے اور ان سے تمہاری ذات کی نشوونما میں جو کمی واقع ہو گئی ہے اُسے پُورا کرنے کا سامان بھی مِل سکتا ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ تم ایسے تعمیری کام کرو۔ جو تمہاری اس لغزش کے تخریبی نتیجہ پر غالب آجائیں۔ إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ (۱۱/۱۱۴)۔ یہاں کا اُصول ہے۔ یعنی تعمیری کام تخریبی اُمور کے نتائج کو مٹا دیتے ہیں۔ لَا تَقْنَطُوا کی خوشخبریاں دینے والی جس آیت کو ابھی ابھی بیان کیا ہے۔ اس میں ایک ایسا لطیف وجمیل نکتہ ہے۔ جس کی طرف اشارہ کئے بغیر آگے بڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔

آپ کا بچہ امتحان میں پاس ہو کر گھر آئے تو آپ دُور ہی سے اُسے "آؤ میرے بیٹے" کہہ کر پکارتے ہیں۔ لپک کر اُٹھاتے اور گلے سے لگاتے ہیں۔ لیکن اگر آپ کا بچہ امتحان میں فیل ہو جائے۔ وُہ ندامت سے سر جُھکائے، افسردہ و پژمردہ آہستہ آہستہ چلا آرہا ہو، اور آپ اُسے مُحبّت بھرے انداز سے، آؤ میرے بیٹے کہہ کر پکاریں تو اس سے اس کی قلبی کیفیت بدل جائے گی۔ مذکورہ صدر آیت کا مقام یہ ہے۔ کہ انسان سے لغزش سرزد ہو گئی ہے۔ وُہ نگاہیں جُھکائے نادم وشرمسار آہستہ آہستہ چلا آرہا ہے۔ اور خُدا اسے پکار کر کہتا ہے۔ يَا عِبَادِيَ — اَے میرے بندے! تم دھتکارے ہُوئے انسان نہیں ہو۔ اس قدر غمگین وافسردہ خاطر کیوں ہو؟ آگے بڑھو۔ ہم تمہیں گلے سے لگاتے ہیں۔ اس مقام پر میرے بندو!

کہنا کتنی بڑی شفقت و رافت کا آئینہ دار ہے۔ نیکوکار کو تو ہر ایک "میرا" کہتا ہے خطاکار کو "میرا" کہنا خدا ہی کا حصّہ ہے۔

نشہ پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے
مزہ تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی

عیسائی اعتراض کیا کرتے ہیں کہ مسلمانوں کا خدا بڑا ہی (معاذ اللہ) خوفناک ڈراؤنا ہے۔ اس میں رافت اور ہمدردی کا نرم گوشہ کوئی نہیں۔ ان سے کوئی پوچھے کہ جو خدا "لغزش خوردہ" گرے ہوئے انسان کو آغوشِ خاک سے اٹھاکر یوں گلے لگا لیتا ہے۔ وہ خوف و ڈر کا مرکز ہے یا رافت و محبت کا محور! اتنا ضرور ہے کہ یہ خدا انسان کو گلے سے لگا کر اس کے کان میں یہ نہیں کہتا کہ "میں نے اپنے بیٹے کو صلیب پر چڑھا کر اس کے خون کو تمہارے گناہوں کا کفارہ بنا دیا ہے۔ اس لئے اب تم جو جی میں آئے کرو"۔ وہ اس انسان کو گلے سے لگا کر اس سے کہتا ہے کہ تم مایوس کیوں ہو گئے۔ تمہارے اندر اتنی بڑی قوتیں مضمر ہیں کہ تم اپنی لغزش کا بڑی آسانی سے ازالہ کر سکتے ہو۔ اٹھو اور اپنے حسنِ عمل سے اپنے زخموں پر مرہم لگاؤ۔ یہی وہ حقیقت ہے۔ جسے اجاگر کرنے کے لئے قرآنِ کریم نے دوسرے مقام پر کہا ہے کہ خدا کی رحمت سے کبھی ناامید نہ ہو۔ ناامیدی کفر و انکار ہے ($\frac{12}{87}$) خدا نے انسان کو لامحدود قوتوں کا پیکر بنایا ہے۔ لیکن جب وہ کسی مقام پر شکست کھا کر، مایوس بیٹھ جاتا ہے۔ تو وہ عملاً اقرار کرتا ہے۔ کہ مجھ میں اس ناکامی پر غلبہ پانے کی ہمت نہیں۔ حالانکہ دنیا میں کوئی ایسے موانعات نہیں جن پر انسان قابو نہ پا سکتا ہو۔ لہٰذا انسان کا مایوس ہو کر بیٹھ جانا، خود اس کی اپنی ذات کی امکانی قوتوں سے انکار (یعنی کفر) ہے۔ قرآن کریم گرے ہوئے انسان کو اس کی اپنی امکانی قوتوں سے آگاہ کرتا اور اس کے دل میں اس کی مضمر صلاحیتوں کے شعور کو بیدار کرتا ہے۔ اس کا اپنی ذات کے ان ممکنات سے انکار و کفر ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے۔ جسے اقبالؒ نے ان حسین الفاظ میں بیان کیا ہے ؎

شاخِ نہال سدرۂ خار و خس چمن مشو
منکرِ او اگر شدی، منکرِ خویشتن مشو

بلکہ اس سے بھی واضح تر الفاظ میں کہ

منکرِ حق نزدِ مُلّا کافر است
مُنکرِ خود نزدِ من کافر تر است

سوچیئے قارئین کرام! قرآن کریم، مایوس و مجبور انسان کو آزادی کی کن بلندیوں پر لے جاتا ہے۔

## فطرت کی قوتوں کی غلامی

اس وقت تک ان نظری اور اعتقادی زنجیروں کا ذکر تھا جن میں انسان جکڑا ہوا تھا۔ اب ذرا محسوس کائنات کی طرف آئیے۔ زمانہ نزولِ قرآن سے پہلے انسان کی یہ کیفیت تھی کہ وہ فطرت کی ہر طاقت کو اپنا حریف سمجھتا اور اس سے ڈرا سہما ہوا رہتا، اور جیسا کہ ہر ڈرنے والے بزدل کا خاصہ ہوتا ہے، وہ اس شر سے محفوظ رہنے کے لئے اس کی منّتیں، سماجتیں کرتا ہے۔ آسمان پر بادل گرجا۔ اور یہ گڑگڑانے لگ گیا۔ بجلی کڑکی اور یہ اس کے حضور سجدے میں جھک گیا۔ یہ تمام مظاہرِ فطرت اس کے نزدیک "خدا" تھے۔ زلزلہ آیا اور اس نے ڈنڈوت بجالانا شروع کردیا۔ یہی نہیں تمام بڑے بڑے پہاڑ، دریا، شیر، سانپ، حتّٰی کہ اونچے اونچے برگد اور پیپل کے درخت، سب دیوی دیوتا تھے جن کے چرنوں (قدموں) میں یہ اپنی عقیدت (شردھا) کے پھول چڑھاتا اور حمد و ستائش کے گیت گاتا۔ انسان کی یہ کیفیت بھارت جیسے جہالت میں ڈوبے ہوئے ملکوں اور قوموں ہی کی نہیں تھی، یونان جیسا خطّہ، جسے علم و حکمت کا اوّلین گہوارہ کہا جاتا ہے۔ وہاں کے اصنامیات کے افسانے بھی اسی قسم کے دیوی دیوتاؤں کے تذکروں سے معمور ہیں۔ آپ سوچیئے کہ کیا ان مہیب زنجیروں میں جکڑے ہوئے انسانوں کو آزاد سمجھا جائے گا؟

ان حالات میں قرآنِ کریم آیا اور اس نے اس انسان سے جس کا بال بال توہم پرستیوں کی ان زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا، للکار کر کہا کہ تو نے اپنے مقام اور فطرت کی ان قوتوں کے متعلق کس قدر غلط اندازہ لگایا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ:-

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا
مِّنْهُ ط (۴۵/۱۳)

کائنات کی پستیوں اور بلندیوں - ارض و سما - میں جو کچھ ہے - اُن سب کو خدا نے تمہاری خدمت گزاری کے لئے، قوانین کی زنجیروں میں جکڑ دیا ہے۔ تو آزاد ہے - یہ جکڑے ہوئے ہیں۔

اقبالؒ کی زبان میں :-

کیا چاند، سُورج کیا مہر و ماہی
نُوری، حضوری تیرے سپاہی

دُوسرے مقام پر :-

ہیں ترے تصرّف میں یہ بادل یہ گھٹائیں

قرآن نے بتلایا کہ فطرت کی یہی قوتیں (ملائکہ) ہیں جنہیں آدم (آدمی) کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ اس نے، فطرت کی ان قوتوں سے ڈرنے والے انسان سے کہا کہ، تم انہیں سجدے کر رہے ہو۔ حالانکہ انہیں پیدا ہی اس لئے کیا گیا ہے کہ یہ تمہیں سجدے کریں۔ اگر تم ان قوانین کا علم حاصل کر لو جن کے مطابق انہیں مسخّر کر دیا گیا ہے۔ تو یہ "جن" تمہاری بوتل کے اندر بند ہو جائے گا۔ کہ جب جی چاہے اس سے کام لو۔ اور پھر اسے بھی سُن رکھو کہ یہ قوانین جن کے تابع یہ اس تن دہی اور جانفروشی سے سرگرم عمل ہیں۔ اٹل اور غیر متبدل ہیں، ایسا کبھی نہیں ہوگا کہ آج قانون کوئی اور ہے اور کل کو کوئی اور ہو جائے۔ یہ قوانین ہمیشہ ایسے ہی رہیں گے۔ فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ۚ (۳۵/۴۳) تم ان میں کبھی تبدیلی نہیں پاؤ گے۔

سوچئے قارئین کرام! کہ قرآنِ عزیز کے اس اعلان نے اُن بے شمار زنجیروں کو کس طرح ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ جن میں انسان اس بُری طرح جکڑے چلا آ رہا تھا۔ یہ جو آج آپ سائنس کے اس قدر محیر العقول انکشافات دیکھ رہے ہیں۔ یہ قرآنِ کریم کے اسی اعلان کا نتیجہ ہیں، یہ جو انسان چاند پر اپنے گھوڑے دوڑا رہا ہے۔ اور مریخ پر کمندیں ڈال رہا ہے، یہ سب اُس کی اُسی پوزیشن کا صدقہ ہے جس سے اسے

قرآنِ کریم نے آگاہ کیا۔

## امیری اور غریبی کی زنجیریں

اَب آپ خارجی کائنات سے نیچے اُتر کر تمدّنی دُنیا کی طرف آئیے۔ ہندوؤں کے عقیدہ کی رُو سے انسان پیدائش کے لحاظ سے شودر (پستی) اور برہمنی (بالائی) کا مقام حاصل کر لیتا تھا۔ برہمن کے گھر میں پیدا ہونے والا بچّہ محض برہمن کے گھر میں پیدا ہونے کی وجہ سے، ہر قسم کی عزّت کا مستحق اور شودر کے گھر میں پیدا ہونے والا بچّہ، ذلّت و مسکنت کا مستوجب۔

عین اسی طرح کوٹھی میں پیدا ہونے والا بچّہ اور جھونپڑے میں پیدا ہونے والا بچّہ معاشرہ میں یکساں حیثیت کے مالک نہیں۔ امیر آدمی کا بچّہ، محض پیدائش کی رُو سے، اتنی کثیر دولت کا مالک اور عظیم عزّت کا مستحق سمجھا جاتا ہے۔ کامیابیوں کے تمام دروازے اس کے لئے کھلے اور کامرانیوں کی تمام راہیں اس کے لئے کشادہ ہوتی ہیں۔ اس کے برعکس غریب آدمی کا بچّہ، محض غریب کے گھر پیدا ہونے کے "جُرم" کی بنا پر عُمر بھر خدمت گذار اور ذلیل و خوار رہتا ہے۔ اسے عُمر بھر پیٹ کی فکر ہی سے نجات نہیں ملتی کہ وہ اس سطح سے بلند زندگی کا تصوّر بھی کر سکے۔ امیر آدمی کے گھر میں پیدا ہونے والے بچّے نے کون سے کارنامے سرانجام دئے تھے۔ جو اُسے ہر قسم کی آسائش اور تکریم کا مستحق سمجھ لیا گیا اور غریب کے ہاں جنم پانے والے بچّے نے کیا جُرم کیا تھا جس کی پاداش میں وہ عمر بھر جیل خانے کی سی زندگی بسر کرنے کا سزاوار پا گیا۔ کیا یہ ہندوؤں کے درنوں ہی کے عقیدے کی دُوسری شکل نہیں؟

قرآنِ کریم آیا اور اُس نے کہا کہ جب واقعہ یہ ہے کہ یہ اختیار کسی بچّے کو حاصل نہیں کہ وہ کس کے گھر میں پیدا ہوتا ہے.. .. .. تو امیر آدمی کے گھر میں پیدا ہونے والے اور غریب کے ہاں جنم لینے والے بچّے میں کسی قسم کی تفریق و تمیز پیدا کرنا جُرمِ عظیم ہے۔ اور اس کا نتیجہ تباہی و بربادی۔ اس نے کہا کہ

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ (۱۷/۷۰)

ہم نے ہر انسانی بچّے کو یکساں طور پر واجب التکریم بنایا ہے۔ پیدائش کی رُو سے ہر بچّہ یکساں حیثیت کا مالک ہے۔ معیارِ فضیلت اس کا جوہرِ ذاتی اور

اس کا کردارِ عمل ہونا چاہیئے نہ کہ اضافی نسبتیں۔ اس کے لئے اُصول یہ ہے کہ

وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا (۴۶/۱۹)

ہر ایک کا درجہ اس کے کام کے مطابق متعین ہونا چاہیئے۔

اقبالؒ کے الفاظ ہیں:۔

میراث نہیں ہے بلند نامی

وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ۝ (۵۳/۳۹)

انسان صرف اس کا حقدار ہے جس کے لئے وُہ محنت کرے

یہ زندانِ تقدیر نہیں۔ انسان اقدارِ حیات کے نقوش و خطوط اپنے اعمال و افعال کے پیمانے سے کھینچتا اور حسنِ کارکردگی سے انہیں مقبول و محمُود کی سند عطا کرتا ہے

تو اپنی سرنوشت خُود اپنے قلم سے لکھ

خالی رکھی ہے خامۂ حق نے تری جبین

محض پیدائش کے اعتبار سے کسی کو کروڑوں روپے کا مالک قرار دے دینا اور دُوسرے کو اتنا بھی نہ ملنا جس سے اس کا پیٹ پل سکے غلط اندازِ معاشرہ ہے۔ جو معاشرہ انسانی بچے کی خُداداد صلاحیتوں کی نشوونما روک دیتا ہے وُہ معاشرہ مُشرکانہ نظامِ زندگی کا حامل ہے۔ اور ایسا ہر اس معاشرہ میں ہوتا ہے جس میں معاشرتی و معاشی ناہمواریاں ہوں۔

جب کسی قوم پر تباہی آتی ہے۔ تو وہ گلہ کرتی ہے کہ خُدا نے ہمیں یُونہی بلاجُرم و خطا ذلیل و خوار کر دیا۔ سُورۂ فجر میں اس حقیقت کو بڑے ہی بلیغ اور مؤثر انداز میں بیان کیا ہے کہ خُدا کسی قوم کو بلاجُرم و خطا ذلیل نہیں کرتا۔ تم اس لئے ذلیل ہوئے کہ لَا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ (۸۹/۱۷) تم ان لوگوں کی عزّت نہیں کرتے تھے۔ جو معاشرہ میں تنہا رہ جاتے تھے۔ تم بڑے بڑے جتھے اور پارٹیوں والوں کی عزّت کرتے تھے۔ یہ وجہ ہے کہ تم ذلیل و خوار ہو گئے۔ باطل نظامِ معاشرہ کا نتیجہ تباہی و بربادی اور ذلّت و مسکنت کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا؟ تذلیلِ انسانیت میزانِ خُداوندی میں اتنا بڑا جُرم ہے۔ کہ اس کی سزا مرگ

مفاجات سے کم ہو ہی نہیں سکتی۔

قرآن کریم نے نوعِ انسانی کے لئے وُہ نظام عطا کیا ہے۔ جس کی رُو سے نہ کوئی فرد کسی دُوسرے فرد کا محتاج ہو سکتا ہے۔ اور نہ ہی کوئی کسی انسان کو ذلیل کر سکتا ہے۔ اس مقام پر اتنا اشارہ کافی ہوگا کہ یہ نظام جو خُدا کی ذمّہ داریاں پُوری کرنے کے لئے قائم ہوتا ہے۔ تمام افرادِ معاشرہ کو اس امر کی ضمانت دیتا ہے نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَ اِيَّاهُمْ (۶/۱۵۲) ہم تمہاری ضروریاتِ زندگی کے بھی ذمّہ دار ہیں اور تمہاری اولاد کی ضروریات کے بھی۔ اور اس کے بدلے میں۔ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا ٥ (۷۶/۹) ہم تم سے کوئی معاوضہ تو ایک طرف شکریہ کے بھی متمنی نہیں۔

## مذہبی پیشوائیت کی زنجیریں

جن زنجیروں کا اُوپر ذکر کیا گیا ہے۔ وُہ ایسی ہیں کہ جن میں جکڑا ہُوا انسان کم از کم اپنے آپ کو محکوم و مقہور تصوّر کرتا ہے۔ اس کی مستقل خواہش یہ ہوتی ہے۔ کہ ان زنجیروں کو توڑ کر آزاد ہو جائے۔

اب ہمارے سامنے ایسی زنجیریں آتی ہیں۔ جن میں جکڑے ہوئے انسان کی کیفیت یہ ہوتی ہے۔ کہ ان زنجیروں سے آزاد ہونے کا تصوّر تک بھی اس کی رُوح میں کپکپی پیدا کر دیتا ہے۔ اگر ان میں سے کوئی زنجیر کسی طرح ٹوٹ جاتی ہے۔ تو وُہ اس کے ٹکڑوں کو اپنی مژگانِ عقیدت سے چُنتا۔ حسنِ عقیدت سے انہیں پھر جوڑتا اور نہایت عجز و الحاح سے اُسے اپنے گلے میں ڈال لیتا ہے۔ اور اپنے اس جُرم کے کفارے ادا کرتا پھرتا ہے۔ کہ یہ زنجیر ٹوٹ کیوں گئی تھی۔ یہ زنجیریں مذہبی پیشوائیت کی پیدا کردہ ہیں۔ جنہیں شریعت اور طریقت کے نام پر ڈھالا جاتا ہے۔ اور ثواب اور عذاب کے خود ساختہ تصوّر (قرآن کا یہ تصوّر نہیں) کے زور پر پہنایا جاتا ہے۔ ان زنجیروں کو پہناتے وقت یہ عہد لیا جاتا ہے۔ کہ مجھے جو کچھ کہا جائے گا۔ بلا چون و چرا اس کی تعمیل کروں گا۔ کبھی نہیں پُوچھوں گا۔ کہ میں ایسا کیوں کروں۔ اور جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں اُس کی سند اور دلیل کیا ہے۔ مَیں کبھی اپنی عقل و فکر سے کام نہیں لوں گا۔ ہمیشہ آنکھیں

بند کیے آپ کے اشاروں پر چلتا جاؤں گا۔ جو کچھ ہوتا چلا آرہا ہے۔ اُسے وحی خداوندی کی طرح، شک و شبہ سے بالا سمجھوں گا۔ اور خواہ وہ کتنا ہی غیر معقول اور خرافات کا مجموعہ کیوں نہ ہو اس پر اعتراض نہیں کروں گا۔ اس مقدس عہد کے بعد وہ ان زنجیروں کو پہنتا ہے اور پھر ساری عمر اس کوشش میں رہتا ہے کہ ان میں سے کوئی زنجیر گھسنے نہ پائے نہ ٹوٹے۔ جس قدر یہ زنجیریں محکم اور مضبوط ہوں وہ اتنا ہی اپنے آپ کو خوش قسمت اور سعادت بخت سمجھتا ہے۔ کیوں کہ اُسے بتایا جاتا ہے کہ اس کی عاقبت سنور رہی ہے۔

قرآن آیا اور اُس نے مکڑی کے اس جالے میں پھنسے ہوئے انسان کو کہا کہ تم کس فریب میں مبتلا ہو رہے ہو؟ یہ احبار و رہبان۔ یہ علماء و مشائخ، جنہیں تم خدا کے نمایندے سمجھ رہے ہو، ان کی حالت یہ ہے کہ لَيَأْكُلُونَ أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ۔ یہ ناحق لوگوں کا مال کھا جاتے ہیں۔ دعویٰ ان کا یہ ہے۔ کہ یہ تمہیں خدا کی راہ بتاتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ وَيَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ ط ($\frac{9}{34}$) یہ اُس راستے میں روک بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ جو لوگوں کو خدا کی طرف لے جاتا ہے۔ یہ سارا کاروبار پیٹ کا دھندا ہے۔ ان مقدسین کی وضع کردہ زنجیریں اس وقت تک قائم رہتی ہیں جب تک انسان سمجھنے سوچنے سے کام نہیں لیتا۔ جونہی اس نے سوچنا شروع کر دیا۔ یہ زنجیریں ایک ایک کر کے گرنی شروع ہو گئیں۔ یہی وجہ ہے کہ نبی اکرمؐ نے لوگوں سے کہا تھا کہ إِنَّمَا أَعِظُكُم بِوَاحِدَةٍ ج میں تم سے کوئی لمبا چوڑا وعظ نہیں کہنا چاہتا۔ صرف ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ صرف ایک بات أَن تَقُومُوا لِلَّهِ مَثْنَىٰ وَفُرَادَىٰ۔ وہ ایک بات یہ ہے کہ ایک ایک، دو دو، کر کے خدا کے لئے کھڑے ہو جاؤ اور پھر ثُمَّ تَتَفَكَّرُوا ق ($\frac{34}{46}$) پھر سوچو۔ اگر تم نے سوچنا شروع کر دیا تو میرا کام بن گیا۔ پھر تم ان لوگوں کی فریب کاریوں میں مبتلا نہیں رہ سکتے، جو لوگ سوچتے نہیں۔ إِنَّا جَعَلْنَا فِي أَعْنَاقِهِمْ أَغْلَالًا ان کی گردنوں میں غلامی کی زنجیریں پڑی رہتی ہیں۔ وَجَعَلْنَا مِن بَيْنِ أَيْدِيهِمْ سَدًّا وَمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا۔ ان کے آگے اور پیچھے توہم پرستی کی دیواریں کھنچ

جاتی ہیں۔ فَاَغْشَيْنٰهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ ۝ (۳۶/۹) ان کی آنکھوں پر عقیدت مندیوں کے پردے پڑے رہتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ وہ آنکھیں رکھنے کے باوجود اندھے کے اندھے رہ جاتے ہیں۔ یہ تم سے کہتے ہیں کہ ہم تمہیں تمہارے اسلاف کے راستے پر چلاتے ہیں۔ وہ بڑے بزرگ تھے۔ دین کو تم سے زیادہ سمجھتے تھے۔ اس لئے تم ان کے راستے پر آنکھیں بند کرکے چلتے جاؤ یہی فلاح کی راہ ہے آؤ تمہیں میں بتاؤں کہ ان اسلاف کی پوزیشن کیا ہے۔ ان کی پوزیشن یہ ہے کہ تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ج یہ لوگ اپنے اپنے وقت میں دنیا سے چلے گئے لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ج جو کچھ انہوں نے کیا وہ اُن کے لئے تھا۔ جو تم کروگے وہ تمہارے لئے ہوگا۔

وَلَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ (۲/۱۳۴)

ہم تم سے پوچھیں گے ہی نہیں۔ کہ انہوں نے کیا کیا تھا۔

تم سے یہی پوچھا جائے گا کہ تم نے کیا کیا تھا۔ اور ایسا کیوں کیا تھا؟ خدا نے تمہاری راہ نمائی کے لئے ایک ضابطۂ حیات دیا ہے (جسے کتاب اللہ یا قرآن کریم کہتے ہیں) تمہارے ہر فیصلے اور عمل کے لئے سند اور حجت صرف یہ کتاب ہے۔ تم اس کا اتباع کرو۔ اس کے علاوہ اور کسی کا اتباع نہ کرو۔

اِتَّبِعُوْا مَا اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖ اَوْلِيَآءَ ط (۲/۱۳۴)

جو کچھ تمہارے رب نے تمہاری طرف نازل کیا ہے تم اس کا اتباع کرو۔ اور اس کے سوا کسی کا اتباع نہ کرو خواہ وہ کتنا ہی بڑا بزرگ کیوں نہ ہو۔

غور فرمایا آپ نے کہ قرآنِ کریم نے انسان کو شخصیت پرستی اور اندھی تقلید کی زنجیروں سے، جن سے رہا ہونے کا اُسے خیال تک نہیں آسکتا تھا، کس طرح نجات دلا کر اسے عقل و فکر کی روشنی میں، اپنے راستے آپ اختیار کرنے کے قابل بنا دیا۔ کتنی بڑی ہے آزادی جو نوعِ انسانی کو اس طرح نصیب ہوگئی۔

**سوسائٹی کی غلامی** مذہب پرستی کی طرح، ایک غلامی سوسائٹی کی بھی ہوتی ہے۔ آپ ایک عقیدہ اور نظریہ کو غلط سمجھتے ہیں، ایک

رسم اور مسلک کو بیہودہ خیال کرتے ہیں لیکن آپ اس باطل نظریہ اور غلط رسم کو محض اس لیے نہیں چھوڑ سکتے کہ آپ معاشرہ میں بدنام ہو جائیں گے۔ سوچئے کہ معاشرہ کا ڈر کتنی سخت زنجیر ہے۔ جس میں سمجھنے سوچنے والا انسان بھی جکڑا رہتا ہے۔ قرآنِ مجید آیا اور اس نے کہا کہ یاد رکھو! بلند سیرت اور کردار کے انسان وہ ہیں جو اس راہ کو بلا کھٹکے اختیار کر لیتے ہیں۔ جسے وہ صحیح سمجھتے ہیں۔ اور وَلَا یَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ ط (۵/۵۴) کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے قطعاً نہیں ڈرتے۔

قرآنِ کریم نے اس ایک راہنمائی سے انسان کے سینے میں کتنی بڑی جرأتوں کو بیدار کر دیا۔

## نظامِ حکومت کی زنجیریں

آزادی اور غلامی کے متعلق عام تصوّر یہ ہے کہ اگر کسی ملک کے باشندے اپنے ہاں خود اپنی حکومت قائم کرتے ہیں تو اُسے آزادی کہا جاتا ہے۔ اور اگر اس پر کوئی غیر قوم حکمران ہے تو اُسے غلامی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ آزادی کا یہ تصوّر ایسا آخری اور مکمل سمجھا جاتا ہے کہ جس قوم کو اس قسم کی آزادی حاصل ہو، وہ اپنی آزادی کی طرف سے کاملتہً مطمئن ہو جاتی ہے۔ اور اس کے لئے کسی اور جدّوجہد کی ضرورت نہیں سمجھتی لیکن قرآنِ کریم نے آکر کہا کہ آزادی کا یہ مفہوم ہی ناقص ہے۔ یہاں سوال اپنی قوم یا غیر قوم کا نہیں۔ خدا نے ہر فرد کو آزاد پیدا کیا ہے۔ اس لئے کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں (خواہ وہ اپنی قوم کا فرد ہو یا غیر قوم کا) کہ کسی دُوسرے انسان پر حکومت کرے۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ
ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ ...... (۳/۷۹)

کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں۔ خواہ اسے کتاب اور حکومت اور نبوّت بھی کیوں نہ مل گئی ہو۔ کہ وہ دُوسرے انسانوں سے کہے۔ کہ تم میرے محکوم بن جاؤ۔

یہاں سوال پیدا ہوگا۔ کہ حکومت کے بغیر انسان کا نظامِ تمدّن قائم نہیں رہ

سکتا۔ اس لئے یہ کیسے ممکن ہوگا۔ کہ انسان حکومت کے بغیر رہیں لیکن قرآن کریم نے نظامِ حکومت کی نفی نہیں کی۔ کہا یہ ہے کہ کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ دُوسرے انسانوں پر اپنا حکم چلائے۔ آیت مذکورہ کا باقی حصّہ یہ ہے۔ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰه۔ انسان کسی انسان کا محکوم نہیں ہو سکتا۔ وُہ صرف قوانینِ خداوندی کا محکوم ہو سکتا ہے اور یہ قوانین اس نے اپنی کتاب میں دے دیئے ہیں (۳/۷۸)

یہ قوانین مستقل اقدار ہیں جن کے مطابق زندگی بسر کرنے سے انسان کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما ہو جاتی ہے۔ یہی اقدار ہمارے فرائض، اور ذمّہ داریوں کو متعیّن کرتی ہیں، حقیقت یہ ہے کہ :۔

جب کوئی دُوسرا انسان میرے فرائض اور ذمّہ داریوں کا تعیّن کرے اور مجھے ان فرائض کو سرانجام دینا پڑے۔ تو اسے غلامی کہتے ہیں۔

قرآنِ کریم کی رُو سے یہ فرائض اور ذمّہ داریاں کوئی انسان، دُوسرے انسان کے لئے مقرّر نہیں کرتا بلکہ ان فرائض کو خُدا کی طرف سے عائد کردہ مستقل اقدار، تمام انسانوں کے لئے یکساں طور پر متعیّن کرتی ہیں۔ انسانی نظامِ معاشرہ کا فریضہ صرف اتنا ہے کہ ایسے حالات پیدا کرے جن میں ہر فرد معاشرہ ان اقدار کے مطابق زندگی بسر کرے۔ یہ معاشرہ اس مقصد کے لئے جو قواعد وضوابط مرتّب کرے گا۔ ان کا کام صرف اس قدر ہوگا کہ افرادِ معاشرہ کو ان کی یاددہانی کرادیں۔ کہ اس معاملہ میں وُہ مستقل قدر کونسی ہے۔ جس کے مطابق تمہیں قدم اُٹھانا ہے۔

قانون کا کام حکم دینا نہیں۔ یاددہانی کرانا ہے۔

قارئین کرام! قرآن کا پہلا ورق اُلٹیے اس پر پہلی سُورۃ (الفاتحہ) میں آپ کو مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ کے الفاظ نظر آئیں گے۔ یہ الفاظ درحقیقت نوعِ انسانی کے لئے منشورِ آزادی ہیں۔ اس کی تشریح اس نے دوسرے مقام پر ان الفاظ میں کردی ہے۔ وَمَآ اَدْرٰىكَ يَوْمُ الدِّيْنِ .. .. .. ... آؤ تمہیں بتائیں کہ يَوْمِ الدِّيْنِ کسے کہتے ہیں۔ يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْـًٔا۔ جس دور میں کوئی انسان کسی دُوسرے انسان پر کوئی اختیار نہیں رکھے گا۔ وَالْاَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ ۝ (۸۲/۱۹) اور اختیار واقتدار صرف قوانین خداوندی کا ہوگا۔

یہ ہے وُہ صحیح آزادی کا نقشہ جس کا اعلان و اقرار آپ ہر نماز کی رکعت میں کرتے ہیں۔ آپ نے غور فرمایا کہ قرآن کریم انسان کو آزادی کے کس مقام پر لے جاتا ہے؟

## سب سے بڑی غلامی

اس وقت تک غلامی کی جتنی شکلیں ہمارے سامنے آئی ہیں ان میں انسان، کسی نہ کسی شکل میں کسی دُوسرے انسان کا غلام اور محکوم ہوتا ہے۔ لیکن اب ہمارے سامنے غلامی کی ایک ایسی شکل آتی ہے۔ جس میں انسان کسی غیر کا نہیں، خُود اپنا غلام ہوتا ہے۔ اور اس سے اس کی ساری آزادیاں چھن جاتی ہیں:۔ اوّل الذکر غلامی کی زنجیریں انسان پر خارج سے وارد ہوتی تھیں لیکن اس غلامی کی زنجیریں انسان کے قلب سے اُبھرتی اور خُون میں حلول کر جاتی ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ غلامی کی یہ شکل کس قدر شدید، غیر مرئی اور غیر محسوس ہوتی ہے۔

کوئی شخص آپ سے جھگڑتا ہے۔ آپ کو غُصّہ آجاتا ہے۔ اور آپ اُسے تھپڑ رسید کر دیتے ہیں۔ چند ہی منٹ بعد آپ بے حد نادم ہوتے ہیں کہ مَیں نے کیا کر دیا۔ سوال یہ ہے کہ جس شخص نے غصّہ میں آکر یہ حرکت کی تھی اور جو شخص اب اس حرکت پر نادم ہے، کیا یہ دونوں ایک ہی شخص ہیں؟ ایک کیسے ہو سکتے ہیں؟ ایک نے کچھ حرکت کی، دُوسرا اب اسے اس حرکت پر نادم کر رہا ہے۔ ایک ہی فرد کے اندر دو شخصیتیں کیا ہیں؟ ہم ایک کا نام جذبات رکھتے ہیں۔ اور دُوسرے کا نام عقل، اور ایسے وقت میں کہتے ہیں کہ میرے جذبات میری عقل پر غالب آگئے۔ اسی لئے کہا کرتے ہیں کہ انسان کو اپنے جذبات ہمیشہ عقل کے تابع رکھنے چاہئیں۔

آپ کو کسی خاص کام میں فائدہ نظر آتا ہے۔ لیکن اس کے لئے آپ کو دھوکے سے کام لینا پڑتا ہے۔ آپ اس کے لئے اپنی عقل لڑاتے ہیں اور پھر ایک اسکیم بناتے ہیں۔ جسے نہایت غور و فکر سے چلاتے ہیں۔ اور آخر الامر آپ اس میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ کچھ عرصہ کے بعد آپ کو احساس ہوتا ہے۔ کہ مَیں نے غلط کام کیا۔ دھوکا دینا بہت بُرا ہے۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ اس مثال میں آپ دیکھئے کہ آپ نے اپنی عقل کو ماؤف نہیں ہونے دیا۔ بلکہ اس سے پُورا پُورا

کام لیا ہے۔لیکن اس کے بعد آپ کو خود اپنی عقل کے فیصلے پر ندامت ہوئی ہے۔اس میں آپ کی عقل آپ کے جذبات کا آلۂ کار بن گئی۔لیکن بعد میں آپ کے اندر ایک اور احساس اُبھرا۔یہ احساس کس چیز کا پیدا کردہ تھا۔آپ کے اس ایمان کا کہ فریب دینا بُری بات ہے۔انسان کو ہمیشہ دیانت داری سے کام لینا چاہیئے۔ دیانت داری ایک مستقل قدر ہے۔اس مثال میں آپ دیکھیئے کہ آپ اپنی اُس عقل کے تابع ہو گئے جو آپ کے جذبات کو بروئے کار لانے کا ذریعہ بن گئی تھی لہٰذا اس میں آپ کے جذبات عقل کے غلام بن گئے۔

یہ وُہ غلامی ہے۔جو بڑے بڑے آزاد، حاکم خود مختار، آمرِ مطلق زبردست صاحبِ اقتدار کو بھی آزاد نہیں رہنے دیتی، محکوم بنا دیتی ہے۔اس غلامی کی زنجیروں سے چھٹکارا حاصل کرنا بڑا مشکل ہے۔(جیسا کہ مَیں نے ابھی ابھی کہا ہے۔) غلامی کی یہ زنجیریں تو انسان کے خُون کے اندر حلول کیے ہوتی ہیں۔ان زنجیروں کے سامنے مذہب، ملّت، ملک، قوم، نسل کا کوئی امتیاز نہیں۔ان میں دُنیا کا ہر انسان جکڑا رہتا ہے (اِلاَّ مَاشَاءَ اللّٰه)

قُرآنِ کریم آیا اور اُس نے نوعِ انسانی کی، ان غیر مرئی اور غیر محسوس زنجیروں کو بھی توڑ کر الگ کر دیا۔اس نے کہا کہ اَفَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ۔ کیا تم نے اس شخص کی حالت پر بھی غور کیا ہے۔جس نے اپنے جذبات ہی کو اپنا معبود اور حاکم بنا لیا——؟ جذبات کو حاکم بنا لینے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰی عِلْمٍ۔وُہ علم و عقل رکھنے کے باوجُود صحیح راستے سے بھٹک گیا۔ وَّخَتَمَ عَلٰی سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰی بَصَرِهٖ غِشٰوَةً ؕ (۴۵/۲۳)

اس کے کانوں اور دل پر مُہریں لگ گئیں۔اس کی آنکھوں پر پردے پڑ گئے۔ وُہ صاحبِ علم و عقل انسان ہونے کے باوجود، بہرہ، گُونگا، اندھا ہو گیا۔انسان کے پاس صحیح فیصلہ کرنے کے لئے عقل ہی ایک ذریعہ تھی۔جب عقل کی یہ کیفیت ہو جائے۔ تو پھر انسان کیا کرے؟ یہاں انسان کو وحی کی راہ نمائی کی ضرورت پڑتی ہے اس لئے کہ وحی اس مقام (علمِ خُداوندی) سے ملتی ہے۔جو جذبات کے تابع ہو نہیں سکتا۔اس میں انسانی جذبات کی آمیزش تو ایک طرف، ذرا سی آلائش تک نہیں

ہوتی۔ اس لئے قرآن کریم کا عطا کردہ فارمولا یہ ہے کہ اپنے جذبات کو عقل کے تابع رکھو اور عقل سے وحی کی روشنی میں کام لو۔ اسے ہمیشہ مستقل اقدار کے تابع رکھو۔" یُوں تمہیں وُہ آزادی حاصل ہو جائے گی۔ جو انسان کو کسی اَور طریقے سے نہیں مل سکتی۔ یاد رکھئے انسان کے جذبات، بہترین خادم لیکن بدترین آقا ہیں۔ انہیں اپنا آقا نہ بننے دو۔ خادم رکھو۔ انہیں اپنی عقل کے تابع رکھو لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی سمجھ لو کہ عقل کو صحیح راستے پر چلنے کے لئے اسی طرح وحی کی روشنی کی ضرورت ہوتی ہے۔ جس طرح انسانی آنکھ کو سُورج کی روشنی کی ضرورت۔

لہٰذا جذبات، عقل اور وحی کو اپنے اپنے مقام پر رکھو۔ اس سے تم دیکھو گے کہ تم کس طرح خود اپنی "غلامی" سے بھی آزادی حاصل کر لیتے ہو۔ اور یہ سب سے بڑی آزادی ہے جو انسان کو میسّر آجاتی ہے۔ یہی وُہ سعادت مند انسان ہیں جن کے متعلق قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْن۔ انہیں نہ خارجی خطرات ڈرا سکتے ہیں اور نہ ہی داخلی جذبات ان کے لئے وجۂ افسردگی و پژمردگی بن سکتے ہیں۔

یہ ہے آزادی کی صحیح تعریف

## خُدا اَور بندے کا تعلّق

قارئین کرام! اب ہم اپنے سفر کی اس منزل میں داخل ہوتے ہیں۔ جہاں چلتے ہوئے فرشتوں کے پَر جلتے ہیں۔ یعنی خُدا کے حضور۔ انسان کی آزادی کی منزل۔ مذہب گزیدہ طبقہ کی طرف سے عام طور پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے۔ کہ جتنی آزادیوں کا آپ نے ذکر کیا ہے۔ بجا اَور دُرست۔ لیکن جب انسان اَور خُدا کے تعلّق کا سوال آتا ہے۔ تو وہاں اُسے ایک مجبُور اَور بے بس غلام کی طرح اپنے آقا کا ہر حکم ماننا پڑتا ہے۔ وہاں وُہ "نہ کیوں" پُوچھ سکتا ہے نہ تعمیلِ حکم سے انکار کر سکتا ہے۔ حتّٰی کہ وُہ تعمیل حکم کے بعد بھی آقا کے غصّہ (غضب) سے ہر وقت ڈرتا کانپتا رہتا ہے۔ یہاں اُس کا سارا شرفِ انسانیت ختم ہو جاتا ہے۔

اس قسم کے اعتراضات کرنے والے ایک طرح سچّے ہیں۔ اس لئے کہ "دُنیا کے مذاہب جس قسم کے خُدا کا تصوّر پیش کرتے ہیں۔ اس سے انسان اِسی نتیجہ پر پہنچتا

ہے۔ حتٰی کہ ہماری بدقسمتی سے خود ہمارے ہاں کے مذہب پرست طبقہ کی طرف سے دئے ہوئے تصوّر کے مطابق، خُدا ایک مستبد حاکم، ایک آمرِ مطلق، ڈکٹیٹر، ایک تلوّن مزاج آقا، ایک مغلوب الغضب بالادست کی حیثیت سے سامنے آتا ہے جو جس قسم کا چاہے حکم دیتا، اور جو جی میں آئے کرتا رہتا ہے۔ اس کا مزاج مطلق العنان بادشاہوں کا سا ہے۔ جن کی کیفیت بقول سعدیؒ یہ ہوتی ہے۔ کہ گاہے بہ سلامے برنجند و گاہے بہ دشنامے خلعت بخشند۔ وُہ کبھی سلام سے ناراض ہو جاتے ہیں اور کبھی گالی دینے والے کو خلعت عطا کر دیتے ہیں۔ "بے پرواہ" ہونا اس کی خاص صفت بتائی جاتی ہے۔ اور "قادرِ مطلق" اس کا امتیازی نشان۔ قادرِ مطلق کے معنی یہ بیان کیے جاتے ہیں کہ وہ نہ کسی قاعدے اور قانون کو ملحوظ رکھتا ہے نہ کسی ضابطے اور طریقے کا پابند ہے۔ ظاہر ہے کہ جو شخص اس قسم کے حاکم مطلق کا غلام ہو۔ اور غلام بھی ایسا جو اس کی مملکت سے بھاگ کر کہیں اور جا ہی نہ سکے۔ آزادی کا تصوّر تک اس کے قریب نہیں پھٹک سکتا۔ لیکن خدا کا یہ تصوّر قرآنِ کریم کا عطا کردہ نہیں۔ اُس کے عطا کردہ تصوّر کی رُو سے خُدا ایک اور ہی حیثیت سے سامنے آتا ہے۔ وُہ بیشک قادرِ مطلق ہے۔ اس کی لاانتہا قوتوں کا یہ عالم ہے کہ اس کے ایک ارادے سے یہ محیّر العقول حدُود نا آشنا، کارگہ کائنات عدم سے وجُود میں آگیا اور اب اس کے متعیّن کردہ پروگرام کے مطابق سرگرم عمل ہے۔ اس میں کسی شئے کو اس کے حکم کی تعمیل سے مجالِ انکار نہیں۔ یارائے تکلّم نہیں۔ وُہ چاہے تو ایک لمحہ میں اس تمام کاروبار کو پھر معدُوم کر دے۔ اس کے لئے نہ اس سے کوئی "کیوں"؟ پوچھ سکتا ہے نہ اُسے کسی کو اس کی وجہ بتانے کی ضرورت ہے۔ لیکن انسانوں کی دُنیا میں اس نے اپنے لئے ایک اور انداز اختیار کر رکھا ہے اس انداز کے اختیار کرنے پر اسے کسی نے مجبُور نہیں کیا۔ اس نے اپنی مرضی سے یہ انداز اختیار کر رکھا ہے۔ سب سے پہلے تو یہ دیکھئے کہ جس طرح کائنات کی ہر شئے کو باقی رہنے اور آگے بڑھنے کے لئے کسی نہ کسی قانون اور ضابطہ کی پابندی ضروری ہے۔ اسی طرح انسان کے لئے بھی ضروری ہے کہ وہ اپنی زندگی کو برقرار رکھنے اور اپنی ذات کو نشو و نما دینے کے لئے قوانین و ضوابط کی پابندی کرے۔

یہ قوانین خدا کی طرف سے متعین کردہ ہیں اور وحی (قرآن کریم) کے ذریعے انسانوں کو دیئے گئے ہیں۔ اس نے کتاب کے ساتھ حکمت بھی نازل کی ہے۔ کتاب "قانون" کو کہتے ہیں اور حکمت، اس قانون کی علّت، توجیہہ، غرض وغایت کو مختلف احکام و قوانین کی حکمت (علّت) بیان کرنے کے ساتھ اس نے لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (۲/۲۸۵) خدا نے تم پر جو پابندیاں عائد کی ہیں، ان سے اسے کوئی فائدہ مقصود نہیں۔ ان سے مقصد یہ ہے کہ تمہاری ذات میں وسعتیں پیدا ہو جائیں۔ جس طرح پتھروں کی ٹھوکر (FALLS) سے نہر کی روانی میں تیزی پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی طرح ان قوانین کی پابندی سے اگلی دُنیا میں خوشگواریوں کی زندگی بسر کرنے کے قابل ہو جاؤ گے۔

کہیئے کہ جو ہستی اس انداز سے احکام دے، اُسے آپ، مستبد حاکم تصوّر کریں گے؟

اب آگے بڑھیئے اس انداز سے قوانین دینے کے بعد بھی اس نے کہہ دیا۔ کہ ہم تمہیں ان کی پابندی پر مجبور نہیں کرتے۔ ہم نے یہ بتا دیا ہے کہ ان کی پابندی کرنے سے تمہیں یہ فائدہ ہوگا۔ اور ان کی خلاف ورزی سے یہ نقصان، اب یہ تمہاری اپنی مرضی ہے کہ چاہے انہیں اختیار کر لو۔ اور چاہے ان سے انکار کر دو۔ وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (۱۸/۲۹) ان سے کہہ دو کہ حق تمہارے رب کی طرف سے آگیا۔ اب جس کا جی چاہے اسے قبول کرے اور جس کا جی چاہے اس سے انکار کر دے۔ اُس نے کہا کہ خارجی کائنات میں ہمارا قانون (MUST) ہے۔ یعنی ہر شے کو اُس کی پابندی لازمی طور پر کرنی پڑتی ہے۔ لیکن انسانی دُنیا میں یہ قانون (OUGHT) ہے۔ یعنی انسان کو چاہیئے۔ کہ اس کی پابندی کرے۔ خارجی دُنیا میں خدا کی مشیّت کا عمل دخل ہے۔ اسی لئے اُس نے یہ قوانین دینے کے بعد انسانوں سے کہا کہ اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ (۴۱/۴۰) جو تمہارا جی چاہے کرو۔ ہم نے تمہیں صاحب اختیار و ارادہ پیدا کیا ہے۔ ہم کسی صورت میں تمہاری آزادی چھیننا نہیں چاہتے پھر یہ بھی نہیں کہ خدا کو معلوم نہیں کہ تم کیا کر رہے ہو اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (۴۱/۴۰)

جو کچھ تم کرتے ہو وہ اسے دیکھتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ تم زندگی کے دوراہے پر غلط سمت کو مڑ رہے ہو۔ وہ اس قدر قوتوں کا مالک ہے کہ چاہے تو تمہارے قدم وہیں جما دے اور تم ذرا بھی آگے نہ بڑھ سکو۔ لیکن وہ ایسا نہیں کرتا۔ اس لئے کہ ایسا کرنے سے تمہاری آزادی سلب ہو جائے گی۔

یہیں سے ہمیں اس سوال کا جواب بھی مل جاتا ہے جو اکثر دلوں کو وقفِ اضطراب رکھتا ہے۔ کہ دنیا میں ہم دیکھتے ہیں۔ کہ ظالم اور جابر انسان، کمزوروں اور ناتوانوں پر انتہا ظلم کرتے ہیں۔ اگر خدا عادل ہے تو وہ ظالم کی کلائی کیوں نہیں مروڑ دیتا؟ وہ اُسے کیوں کھلی چھٹی دیئے رکھتا ہے۔ کہ وہ ظلم پر ظلم کئے جائے۔ یہ اس لئے کہ خدا عادل ہے جابر نہیں ـــــ اگر اس نے انسان پر جبر کر کے اسے صحیح راستے پر چلانا ہوتا تو وہ اسے اشیائے کائنات کی طرح مجبور پیدا کرتا۔ اسے صاحبِ اختیار و ارادہ پیدا ہی نہ کرتا۔ باقی رہا عدل، تو اس کا تقاضا یہ ہے کہ ہر بات کا فیصلہ قانون کے مطابق ہو۔ ظلم کا انجام اس کے قانونِ مکافات کے مطابق مرتب ہوتا ہے۔ ہماری خواہش کے مطابق نہیں۔

قارئین کرام! خدا نے جو کچھ کہا ہے۔ اس میں ایسی شانِ عبودیت پائی جاتی ہے۔ کہ جوں جوں نگہ بصیرت اس پر غور کرتی ہے۔ وجد و مسرّت سے جھوم اٹھتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جب تم زندگی کے کسی دوراہے پر پہنچتے ہو۔ تو ہم چاہتے ہیں کہ تم ہماری طرف آنے والی راہ اختیار کرو۔ وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰہُ (۳۶/۳۰) سو تم بھی وہی چاہو جو ہم چاہتے ہیں۔ تو تم ویسا کیوں نہیں چاہتے؟ تم اپنی مرضی کو ہماری مرضی سے ہم آہنگ کیوں نہیں کرتے؟ تم ہماری آرزو کو پورا کیوں نہیں کرتے؟ تم ایسا کر کے دیکھو تو سہی۔ تمہارے سامنے کس طرح جنّت کی راہیں کشادہ ہو جاتی ہیں! لیکن جب اس کے باوجود انسان اس طرف قدم نہیں اٹھاتا۔ دوسری طرف نکل جاتا ہے۔ تو خدا اُسے تھپڑ رسید نہیں کرتا۔ نہ ہی اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے روک دیتا ہے۔ کہ اس سے اس کی آزادی چھن جاتی ہے۔ اُس کی اس غلط روی پر (مجازی الفاظ میں یوں کہیئے کہ) اس کا جی کڑھتا ہے۔ اُس کے سینے سے ہوک اُٹھتی ہے اور وہ غمگساری و غم گدازی کے عالم میں بیساختہ

کہتا ہے کہ

یٰحَسۡرَۃً عَلَی الۡعِبَادِ ۚ (۳۶/۳)

"اُف" تُو نے یہ کیا کیا؟ کس قدر تأسف انگیز ہے۔ تیرا یہ فیصلہ اور کیا حسرتناک ہوگا۔ اس کا انجام ـــــ اے کاش! تو ایسا نہ کرتا۔[۱]

غور کیجئے قارئین کرام! کتنی عظیم قوتوں کا مالک خُدا کس انداز سے بات کررہا ہے؟ ایسے لامحدود اقتدار کے باوجود! وُہ کیسی حسرت بھری نگاہ سے اس انسان کی طرف دیکھتا ہے۔ غور کیجئے کہ سینۂ یزداں میں ؎

بیقراری ہے کس قرار کے ساتھ
جبر ہے دل پہ اختیار کے ساتھ

یہ کیوں؟ ـــــ اس لئے کہ وُہ انسان کی آزادی کو سلب نہیں کرنا چاہتا۔ چھیننا نہیں چاہتا۔ حکیم الامّت کے الفاظ میں

جانے کہ داد نار دیگر نگیرند
آدم بمیرد از بے یقینی

انسان غلط راستے کی طرف مُڑ جاتا ہے۔ تو خُدا اس دوراہے پر کھڑا حسرت بھری نگاہ سے اس کی طرف تکتا رہتا ہے۔ اگر کسی وقت انسان کے دل میں یہ احساس بیدار ہوتا ہے کہ اس نے غلط راستہ اختیار کرلیا ہے۔ اور اس احساس سے وُہ پیچھے کی طرف لوٹتا ہے۔ تو خُدا لپک کر اُس کی طرف جاتا ہے۔ وُہ ایک قدم خُدا کی طرف آتا ہے۔ تو وُہ دو قدم اس کی طرف بڑھتا ہے۔ کیا آپ نے اس پر غور نہیں کیا۔ کہ خُدا نے اس طرح پلٹنے والے انسان کو تائب (پلٹنے والا) کہا ہے تو اپنے آپ کو (توّاب) کہا ہے یعنی بڑی تیزی سے پلٹ کر آنے والا۔

اس نہج سے دیکھئے، تو قارئین کرام! یُوں نظر آئے گا کہ انسان کی دُنیا میں خُدا نے انسان کو پُوری آزادی دے رکھی ہے۔ لیکن اپنی لامحدود قوتوں کے

---

[۱] قرآن کے خُدا کو ڈر اور خوف کا مجسمہ کہنے والوں سے پُوچھئے کہ اس سے محبت بھرا دل کسی اور کا ہو سکتا ہے؟

باوجود خدا نے جو پابندیاں خود اپنے اُوپر عائد کر رکھی ہیں۔ ان سے وُہ آزاد نہیں رہا مجبور ہوگیا ہے۔ (مثلاً) اُس نے انسان کے متعلق تو یہ کہا ہے کہ وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِينَ ٥ (۳۰/۴۷)

مومنین کی مدد کرنا ہم پر واجب ہوجاتا ہے۔ ہمیں تو اُس نے اس کا اختیار دے رکھا ہے کہ ہم آج کچھ فیصلہ کریں اور کل اس فیصلہ کو بدل ڈالیں۔ لیکن اپنے متعلق کہا کہ فَلَن تَجِدَ لِسُنَّتِ اللَّهِ تَبْدِيلًا ٥ (۳۵/۴۳)

تم ہماری روش میں کبھی تبدیلی نہیں پاؤ گے۔ اس کی غیر متبدل روش کو قانونِ خداوندی کہتے ہیں۔ جس میں کبھی تغیّر و تبدّل نہیں ہوتا۔ جو کچھ اُوپر خدا کے متعلق کہا گیا ہے۔ وُہ درحقیقت خدا کے قانون ہی کی خصوصیات کا ذکر ہے۔ اس نے ہم سے کہا کہ تم آج کوئی وعدہ کرکے کل ہی اس سے مُکر سکتے ہو۔ لیکن وَعْدَ اللَّهِ حَقًّا وَمَنْ أَصْدَقُ مِنَ اللَّهِ قِيلًا ٥ (۴/۱۲۲) خدا کے سب وعدے سچّے اور برحق ہوتے ہیں۔ اس سے زیادہ بات کا سچّا اور قول کا پکّا اور کون ہو سکتا ہے؟ اس نے تو یہانتک کہہ دیا ہے کہ كَانَ عَلَىٰ رَبِّكَ وَعْدًا مَّسْئُولًا ٥ (۲۵/۱۶) یہ وُہ وعدہ ہے جس کے متعلق سوال کیا جا سکتا ہے۔

قارئین کرام! ہم ہمیشہ ایسے دوست کی تلاش میں رہتے ہیں۔ جو بات کا پکّا اور وعدہ کا سچّا ہو۔ جس کی کیفیّت یہ نہ ہو کہ وُہ آج کچھ کہے اور کل کچھ یا ایک ہی بات پر آج اس کا ردِّ عمل کچھ ہو اور کل کچھ اَور۔ جو ہمارا انتہائی ہمدرد اَور غم خوار تو ہو۔ لیکن اپنے فیصلوں کو ہم سے خواہ مخواہ زبردستی نہ منوائے۔ جو ہمیں مخلصانہ مشورہ تو دے لیکن ہماری آزادی کو سلب نہ کرلے، جسے ہماری غلط روی سے دُکھ تو ہو لیکن اس پر غصّہ[۱] نہ آئے۔ اَور ہم سے بگڑ نہ بیٹھے۔

کہیئے کہ خدا سے بڑھ کر کوئی اور دوست بھی ایسا ہو سکتا ہے۔ جو اس معیار پر پُورا اُترے؟

---

[۱] جسے خدا کا غضب کہا جاتا ہے۔ وُہ درحقیقت اس کے قانون کی خلاف ورزی کے تباہ کن نتائج کا نام ہے۔ مومن اس سے ڈرتا اَور محتاط رہتا ہے۔

وَھُوَ الْوَلِیُّ الْحَمِیْدُ ۰ (۴۲/۲۸) اللہ انسان کا قابلِ حمد و ستائش دوست ہے۔

یہ ہے قارئین کرام! وہ پیامِ حریّت ۔ وہ منشورِ آزادی جو آج سے چودہ سو سال پہلے نبی اکرمؐ کی وساطت سے دُنیائے انسانیت کو ملا اور اس وقت ملا جب مشرق و مغرب میں ہر جگہ انسان کا بال بال غلامی اور محکومی کی زنجیروں میں جکڑا ہُوا تھا۔ اُن قوموں کے افراد کا بھی جن کی حکومت خود اپنے ہاتھوں میں تھی اور اُن کے افراد کا بھی جن پر دُوسری قومیں حکومت کرتی تھیں۔

سوچیے قارئین کرام کہ اگر ہم ہر سال ۱۴ ر اگست کو یوم آزادی کی تقریب منانے میں حق بجانب ہوتے ہیں تو کیا پوری نوع انسانی پر یہ واجب نہیں ہوجاتا کہ وہ اس قسم کے منشورِ آزادی ملنے پر جشنِ مسرّت منائے۔ جو اسے ہر قسم کی غلامی سے آزادی دلاتا ہے۔ اور جس آزادی کو اَور تو اَور خُدا بھی نہیں چھینتا؟ یہی ہے عالمگیر انسانیت کا وہ جشنِ مُسرت" نظریۂ پاکستان" جسے منانے کے لئے آپ کی ذہنی و فکری راہیں کشادہ کرتا ہے۔

ابھی تک دُنیا کو اس کا علم نہیں کہ صحیح آزادی کسے کہتے ہیں؟ جس دن اسے اس کا علم ہوجائے گا۔ وہ نظریۂ پاکستان کو اپنالے گی۔ اَور نسل و وطن، بتانِ رنگ و بُو اور شعوب و قبائل کے خود ساختہ بندھوں سے آزاد ہو کر دُنیائے انسانیت آزادی کی عالمگیر فضاؤں میں امن و سکون کا سانس لے گی۔ یہ اُسی وقت ہوگا۔ جب عالمِ انسانی اس پیامِ آخریں (قرآن عظیم) کو ضابطۂ حیات قرار دے گا۔ جو رحمۃ للعالمینؐ کی وساطت سے انسانی دُنیا کو ملا۔ یہ وہ دَور ہوگا جب زمین اپنے نشوونما دینے والے کے نُور سے جگمگا اُٹھے گی۔ اَور وہ انسان جس کا بال بال آج انواع و اقسام کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ حقیقی آزادی کی فضا میں سانس لینے کے قابل ہوگا۔ اور وہ سر اُٹھا کر آسمان سے کہہ سکے گا کہ :۔

دیدۂ آغاز ——— انجام بیں
جب قافلۂ آدمیّت میرِ قافلہ سالارِ انسانیتؐ کے لائے ہُوئے قانونِ

خداوندی (قرآنِ کریم) کی رہنمائی میں آگے بڑھے گا۔ تو اس وقت فروغِ آدمیت اور ارتقائے انسانیت کے لئے اسباب و مواقع میسّر آ جائیں گے۔ اس وقت صحیح معنوں میں انسان کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما ہوگی۔

قارئین کرام! اسلام جو اپنی مخصوص آئیڈیالوجی اور فلسفۂ زندگی رکھتا ہے۔ وہ اس کے مطابق افرادِ انسانیہ کی تربیت کے ذریعے ایسی فضا تخلیق کرتا ہے جس میں افراد اولاً اپنی جماعت میں اس فلسفۂ حیات کو عملاً آزماتے ہیں۔ اور اس کے بعد اس کے منافع کو تمام نوعِ انسانی تک پھیلاتے چلے جاتے ہیں۔ حکیم الامتؒ کے نظریۂ پاکستان سے وحدتِ خالق، وحدتِ انسانیت، اور وحدتِ قانون کا تصوّر محکم سے محکم تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ اور انسانی معاشرہ کی معاشی ناہمواریاں اور معاشرتی نا استواریاں مٹتی چلی جاتی ہیں۔

اس معاشرہ میں ہر فردِ امت، اپنے آپ کو خدا کی صفتِ رب العالمین کا مظہر سمجھتے ہوئے بلا مزد و معاوضہ انسانیت کی ربوبیتِ عامہ کا کفیل بن جاتا ہے۔ احترامِ آدمی کا معیار صرف آدمیت قرار پاتا ہے۔ اور وجۂ تکریم، قانونِ خداوندی کی زیادہ سے زیادہ اطاعت (اتقیٰ) ہوتی ہے۔ نظریۂ پاکستان کی رُو سے وطن، قومیت، حسب و نسب اور بُتانِ رنگ و بُو اور نسل و زبان وغیرہ کی اضافی نسبتیں کچھ اہمیت نہیں رکھتیں۔

انسان پیشوائیت کی رُوحانی غلامی اور ملوکیت و مفاد پرستی کی طبعی غلامی سے یکسر آزاد ہو جاتا ہے۔ یعنی اس نظریۂ حیات کی رُو سے خدا اور بندے کے درمیان کوئی طاقت حائل نہیں ہوتی اور کوئی دیوار حاجب نہیں بنتی۔ یہ تصوّرِ ارتقائے انسانیت کے ذریعہ سے دُنیا سے ہر قسم کے استبداد و استیلا ر اور سلب و نہب کے مٹانے کا موجب بن جائے گا اور تمام نوعِ انسانی کے ہر درد کا درماں ہو سکتا ہے۔ اس تصوّرِ زندگی کے مطابق تشکیل کردہ معاشرہ میں شرک، کسی انسانی بچّہ کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما روک دینا قرار پا جائے گا۔ نظریۂ پاکستان نسل و وطن کے نام پر انسانوں کے ہاتھوں کی کھنچی ہوئی امتیازی لکیروں کو ختم کر کے ایران و عرب، مصر و شام، چین و سوڈان کے توحید پرستوں

کو ایک پرچم کے نیچے جمع کر دیتا ہے۔ یہی نظریۂ دُنیا کے تمام انسانوں کو ایک مرکز (توحید) پر اکٹھا کر کے بھائی بھائی بنا دیتا ہے۔ میرا دعویٰ ہے کہ جب تک انسانی دُنیا نظریۂ پاکستان کو نہیں اپنائے گی ظلم و استبداد اور سلب و نہب کا شکار رہے گی۔

خُدا کی زمین سے فساد اس وقت ختم ہوگا۔ جب وُہ قرآنی فلسفہ اَلْاَرْضُ لِلّٰہِ۔ اَلْحُکْمُ لِلّٰہِ کا مفہوم سمجھ لے گی۔

ملّتِ پاکستانیہ پر یہ بہت عظیم ذمّہ داری اور نہایت اہم فریضہ عائد ہوتا ہے۔ کہ وُہ اس نُورِ حیات اس خورشیدِ جہاں تاب سے انسان کی دُنیائے تاریک کو منوّر کرے۔ بقول اقبالؒ

قوّتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسمِ محمدؐ سے اُجالا کر دے

یہی ہے وُہ شرارِ آرزُو اقبالؒ نے جس سے خاکسترِ انسانیت میں آتشِ حیات کی ظلم سوز چنگاریاں بھڑکانے کے لئے نظریۂ پاکستان پیش کیا۔ اور یہی ہے وُہ نظریۂ حیات جس سے عصرِ حاضر کے ابالیس اور عہدِ گذشتہ کے فرعون و قارُون لرزاں و ترساں رہے ہیں اور ہیں۔ اقبالؒ کے علم و شعور کے شعلے ہر نوعِ غلامی کے خس و خاشاک کو اس لئے جلا کر راکھ کرنا چاہتے ہیں کہ ایک ایسا جہانِ نَو پیدا ہو۔ جو انسانیت کے لئے امن و سکون کا گہوارہ ہو۔ ایسا "عالمے بے امتیازِ خُون و رنگ" جو سلاطین و عبید سے پاک ہو۔ جہاں تمیزِ بندہ و آقا فسادِ آدمیّت قرار دیا جائے۔ ایسا پاکیزہ خوشگوار اور خوشحال معاشرہ جس میں نہ تو عشرتِ خواجگی کی مسندیں جمی ہوں گی۔ اور نہ ہی ستمِ خواجگی کا نام و نشان نظر آئے گا۔ اس جہانِ تازہ میں زاری و قیصری کا کوئی اثر و دخل نہ ہوگا۔ اس میں خُدا اور بندے کے درمیان کوئی قوت حائل نہ ہوگی۔ یہ معاشرہ قرآنی نقوش و خطوط پر متشکل ہوگا۔ اس میں قانُونِ خُداوندی کا سکّہ جاری و ساری ہوگا۔ اس میں تمام انسانوں کا یکساں احترام اور بطور انسان ہر ایک کی عزّت و تکریم ہوگی۔ کوئی انسان نہ کسی کا حاکم اور نہ کوئی محکوم۔ چشمِ تصوّر دیکھ رہی ہے۔ جب ایسا عالمِ انسانی وجُود میں آجائے گا۔ اُس وقت ہر فرد معاشرہ درد آشنا اور فرض آشنا ہوگا۔

# حرفِ آخر

میرا سرِ نیاز اُس بے نیاز کی چوکھٹ پر سجدہ ریز ہے جس نے مجھے نظریۂ پاکستان حضورِ ملت پیش کرنے کی سعادت بخشی۔ اقبالؒ کی یہ فکرِ حکیمانہ انسانی زندگی کی شبِ تاریک کو سحر کر کے رہے گی۔ یہ عرض میں اس قدر وثوق سے اس لئے کر رہا ہوں۔ کہ اب پاکستان ایک زندہ حقیقت بن کر ارباب فکر و نظر کے لئے اسلامی مرکز کی حیثیت اختیار کرتا چلا جا رہا ہے۔ ذہنوں کے زاویئے بدل رہے ہیں۔ اندازِ اعمال میں نمایاں تغیر آ رہا ہے۔ جوانانِ ملت کے دلوں میں سطوتِ دین کے ارمان مچل رہے ہیں۔ مشرق و مغرب میں نیا زمانہ اور نئے صبح و شام پیدا ہو رہے ہیں۔ اب مسلمان رُومی و شامی۔ ترکی و ایرانی اور افغانی و تُورانی ہونے کے بجائے مسلمان کہلانے پر فخر و ناز کرتا ہے۔ اور شعورِ انسانی میں یہ حقیقت تیزی سے اُبھر رہی ہے کہ

امتیازِ قبائل تمام تر خواری

اب بُتانِ شعوب و قبائل کی پرستش کے بجائے انسانی ذہن انسان کے مسائلِ حیات پر زیادہ توجہ دے رہا ہے۔ اور وُہ عالمِ نَو جو ابھی پردۂ تقدیر میں ہے۔ اس کی جھلک بھی چشمِ جہاں بیں دیکھ رہی ہے۔ اب ریب و تشکیک اور مایوسیوں کے بادل چھٹ رہے ہیں۔ اور کئی ایک سینوں میں ایسے جذبے تڑپ اور کئی ایک دلوں میں ایسے ولولے بیدار ہو رہے ہیں کہ

مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر
فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کو

اَب کائناتِ پاکستان کے ذرّہ ذرّہ میں ذوقِ آشکارائی پیدا ہو رہا ہے۔ پاکستان کی فضائے سیاست نظریۂ پاکستان کے ذکر سے معمور ہے۔ مَیں یہ نہیں کہتا کہ مَیں نے اکیلے ہی ذہنوں کا رُخ تبدیل کیا ہے۔ اور یہ بھی نہیں کہتا کہ عالمانِ زنّار پوش کے سحر و طلسم کو ختم کرنے اور نقاب پوش مصلحین کو بے نقاب کرنے میں سب سے زیادہ تگ و تاز میری ہے۔ ہاں یہ عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ میری نوائے باطل سوز نے بھی ایک حد تک

فکری و نظری اور شعوری و عملی تبدیلی ضرور پیدا کی ہے۔

مَیں نے "نظریہ پاکستان" میں زیادہ تر مدد حکیم الامّت علاّمہ اقبال علیہ الرّحمۃ کی کتابوں اور جناب پرویز کے لٹریچر سے لی ہے۔ اقبالؒ کا یہ فکرِ عظیم (نظریہ پاکستان) پرویز صاحب کو وُہ مقامِ بلند عطا کر گیا۔ جہاں کوئی دُوسرا ان کا ہمسرو ہم مرتبہ نظر نہیں آتا۔

ادارہ طلوعِ اسلام نے ۱۹۳۸ء سے لے کر آج تک تحریکِ پاکستان اور نظریۂ پاکستان کے لیے جتنا قابلِ قدر اور وقیع لٹریچر فراہم کیا ہے۔ اس کے لئے پرویز صاحب حقیقی طور پر تحسین و آفرین کے مستحق ہیں۔ ان کا یہ گراں قدر اور عظیم کارنامہ مجھے یہ کہنے کے لئے مجبُور کرتا ہے۔ کہ اقبالؒ کے بعد یہی بندۂ حق اور مردِ خُدا نظر آتا ہے۔ جس نے برہمنی سیاست اور برہمو سماجی اسلام کو طشت از بام کیا۔ مَیں ناسپاس گزار ہوتا اگر اس حقیقت صادقہ کا اعتراف و اقرار کئے بغیر اس کتاب کو ختم کرتا۔

آخر میں حضُور ربِّ العزّت دُعا کرتا ہُوں کہ عالمِ انسانیت نظریۂ پاکستان کے مفہوم سے باخبر ہو کر ربّ العالمین، ذکر للعالمین اور رحمۃ للعالمینؐ کے مطالب و معانی سے آشنا ہو جائے۔ تاکہ خُدا کی زمین۔ خُدا کی مخلوق کے لئے امن و سکون کا گہوارہ بن سکے۔ آدم اپنے فردوسِ گُم گشتہ کو پھر سے پالے۔

خُدایا آرزُو میری یہی ہے۔ کہ اسلام کا وُہ عہدِ زرّیں تاریخ کی آنکھ نے جسے ایک بار دیکھا ہے۔ چشمِ آدم اس خوشحال و خوشگوار معاشرہ کا حسن و تاب پھر دیکھے۔ جنّت سے نکلا ہُوا آدم پھر اسی جنّت میں پہنچ جائے۔ یہ جہانِ تازہ اُسی وقت آباد ہو گا۔ جب عالمِ انسانی اس خورشیدِ جہانتاب (نظریۂ پاکستان) سے منوّر ہو گا۔ آؤ اس انسان ساز پروگرام کو زمین کے چپّہ چپّہ پر پھیلانے کا عزّم کریں۔

(چوہدری حبیب احمدؒ)